

For more urdu books visit www.4Urdu.com

A-PDF Watermark DEMO: Purchase from www.A-PDF.com to remove the watermark

اشفاق احمد

زاویہ





اشفاق احمد

گدریا، ایک محبت سو انسانے، وداع جنگ، ایک ہی بولی، صحاتے نہانے،
توتا کھانی، بندگی، طسم ہوش افزاء، اور ڈرائے، نگے پاؤں، مہماں رائے،
من چلے کا سودا، بابا صاحبا، سفر در سفر، آپے مردج لامور دے، تاہلی تھلے،
حضرت تعمیر، جنگ جنگ، ناویہ، سفرینا، ایک محبت سو ڈرائے، حیرت کدہ، ہشایہ اکوت،
کھیل تماشا، گلداں، کھٹیا وٹیا، دھینگا مشتی، شورا شوری، ڈھنڈورا،

بانو قدم سیہ

راجہ گدھ، شہر بے مثال، توجہ کی طالب، چھار چمن، بندھراں، آسے پاسے،
دوسرے قدم، آویگی پات، دست بست، جوا کے نام، سورج مکھی، پیٹا نام کا دیا،
آتش زیر پا، امرنیل، بیارگشت، مردابر شم، سامان وجود، ایک دن، پڑوا، سوم کی گلیاں،
لگن اپنی اپنی، تماشیں، فٹ پا تھک کی گھاس، دوسرا دروازہ، ناقابل ذکر، یکجا اور نہیں،
حاصل گھاٹ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

(بِسْمِ)

لِکِیانِ احمد

شاعرِ المُلْكِ مُسْلِمِ شاہِ المُلْكِ

زاویہ

(جلد دوم)

اشفاق احمد

سنگ سیل پبلی کیشنر، لاہور

فہرست

| | | |
|-----|--|-----|
| 1. | ”نیچا بار“ | 25 |
| 2. | ”بے خلا“ | 52 |
| 3. | ”دین کیوں“ | 54 |
| 4. | ”کام کا دینہ“ | 55 |
| 5. | ”لیجیں قلیل“ | 55 |
| 6. | ”تھنگی کی تھنگی“ | 56 |
| 7. | ”تھنگی کی تھنگی“ | 57 |
| 8. | ”ملئی نیشنل خواہشیں“ | 13 |
| 9. | ”وقت ایک تھنگ“ | 20 |
| 10. | ”چھوٹا کام“ | 26 |
| 11. | ”خوشی کاراز“ | 32 |
| 12. | ”ماضی کا ایم“ | 38 |
| 13. | ”دل و شنگ“ | 45 |
| 14. | ”دروازہ کھلا رکھنا“ | 51 |
| 15. | ”ایم اے پاس میںی“ | 56 |
| 16. | ”تنقید اور تائی کا قلف“ | 62 |
| 17. | ”سلطان سکھاڑے والا“ | 68 |
| 18. | ”میں کون ہوں؟“ | 75 |
| 19. | Psycho Analysis | 81 |
| 20. | ”ترقی کا ایمیسی ناج“ | 87 |
| 21. | HOT LINE | 94 |
| 22. | ”ٹکبر اور جمہوریت کا بڑھاپا“ | 100 |
| 23. | ”شک“ | 107 |
| 24. | ”رشوت“ | 113 |
| 25. | ”بیشرا“ | 119 |
| 26. | ”اسٹھن دسی کے عرق سے میں گن تک“ | 124 |
| 27. | ”پانی کی لڑائی اور سندھیلے کی طوائفیں“ | 130 |
| 28. | ”بندے کا دار و بندہ“ | 137 |
| 29. | ”عالم اصرت سے عالم اکبر بھک“ | 143 |
| 30. | ”انسانوں کا قرض“ | 149 |

| | |
|-----|---|
| 155 | - 25. بابے کی تلاش |
| 161 | - 26. "مخاورے" |
| 168 | - 27. ڈپریشن کا نش |
| 175 | - 28. "زندگی سے پیار کی اجازت درکار ہے" |
| 181 | - 29. "نظر بد" |
| 187 | - 30. "اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے" |
| 193 | - 31. چیلیس کے باعزت مجھے گاے |
| 200 | - 32. ذات کی تبلیبدی |
| 206 | - 33. رہبانیت سے انسانوں کی بستی تک |
| 212 | Salute to Non-Degree Technologists - 34 |
| 218 | - 35. تحری پیس میں ملبوس بابے اور چغلی مینگ |
| 225 | "Mind Over The Matter" - 36 |
| 230 | - 37. من کی آلو دگی |
| 235 | - 38. آن پڑھ تقراط |
| 241 | - 39. بوئنگیاں ماریں، خوش رہیں |
| 246 | - 40. آٹوگراف |
| 252 | - 41. "چاہیے" کاروگ |
| 258 | - 42. "چلاس کی محبتیں" |
| 263 | - 43. تسلیم درضا کے بندے |
| 270 | - 44. "بھائی والی" کارشٹ |
| 276 | - 45. "گھوڑا اُکٹھا اور بلوگنڑا" |
| 282 | - 46. "لڑن رات ہو و چھڑن رات نہ ہو" |
| 288 | - 47. توکل |
| 294 | - 48. بانسری |
| 299 | - 49. تحائف |
| 304 | - 50. جیر ایلیڈ ڈاکیا اور علم |
| 310 | - 51. فونگ شوئی |
| 315 | - 52. دھرتی کے رشتے |

پنجاب کا دو پٹہ

جب آدمی میری عمر کو پہنچتا ہے تو وہ اپنی وراثت آنے والی نسل کو دے کر جانے کی کوشش کرتا ہے۔ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جو انسان بد فستی سے ساتھ ہی سمیت کر لے جاتا ہے۔ مجھے اپنی جوانی کے واقعات اور اس سے پہلے کی زندگی کے حالات مختلف مکمل یوں میں ملتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اب وہ آپ کے حوالے کر دوں۔ حالانکہ اس میں تاریخی نوعیت کا کوئی بڑا واقعہ آپ کو نہیں ملے گا لیکن معاشرتی زندگی کے پہلو سامنے آئیں گے۔ اگر معاشرتی زندگی کو بے نظر غارہ دیکھا جائے تو اس میں ہماری سیاسی زندگی کے بھی بہت سے پہلو نمایاں نظراً کیں گے۔

آج سے کوئی میں باکیں برس پہلے کی بات ہے میں کسی سرکاری کام سے حیر آباد گیا تھا۔ سندھ میں مجھے تقریباً ایک ہفت کے لیے رہنا پڑا اس لیے میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ وہ بھی میرے ساتھ چلے چانا پچ وہ بھی میرے ساتھ تھی۔ دو دن وہاں گزارنے کے بعد میری طبیعت چیزے بے چین ہو گئی۔ میں اکثر اس حوالے سے آپ کی خدمت میں ”بابوں“ کا ذکر کرتا ہوں۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ بھٹ شاہ (شاہ عبداللطیف بھٹائی) کا مزار یہاں قریب ہی ہے اور آج جمعرات بھی ہے، اس لیے آج ہم وہاں چلتے ہیں۔ وہ میری بات مان گئی۔ میزبانوں نے بھی ہمیں گاڑی اور ڈرائیور دے دیا، کیونکہ وہ راستوں سے واقف تھا۔ ہم مزار کی طرف روادہ ہو گئے۔ جوں جوں شاہ عبداللطیف بھٹائی کا مزار قریب آ رہا تھا، مجھ پر ایک عجیب طرح کا خوف طاری ہونے لگا۔ مجھ پر اکثر ایسا ہوتا ہے۔ میں علم سے اتنا مثار نہیں ہوں، جتنا کریکٹر سے ہوں۔ علم کم تر چیز ہے، کردار بڑی چیز ہے۔ اس لیے صاحبان کردار کے قریب جاتے ہوئے مجھے بڑا خوف آتا ہے۔ صاحبان علم سے اتنا خوف نہیں آتا، ذر نہیں لگتا۔

جب ہم وہاں پہنچتے تو بہت سے لوگ ایک میلے کی صورت میں ان کے مزار کے باہر موجود تھے۔ گھوم پھر رہے تھے۔ ہم میاں بیوی کافی مشکل سے مزار کے گھن میں داخل ہوئے۔ بہت سے لوگ

وہاں بیٹھے ہوئے تھے اور شاہ عبداللطیف بھٹائی کا کلام سنارہے تھے۔ اس کلام میں جب شاہ کی شاعری میں موجود ایک خاص نکلا آتا تو سارے سازندے چوکس ہو کر بیٹھ جاتے اور گانے لگتے، کلام میں یہ خاص نکلا اس قدر مشکل اور پچیدہ ہے کہ وہاں کے رہنے والے بھی کم ہی اس کا مطلب سمجھتے ہیں، لیکن اس کی گہرائی زمانے کے ساتھ ساتھ کھلتی چلی جاتی ہے۔ ہم بھی وہاں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہاں کافی رش تھا۔ کچھ لوگ زمین پر لیٹئے ہوئے تھے۔ عورتیں مرد سب ہی اور پچھے بیٹھے کلام من رہے تھے۔ ہم بھی جا کر بیٹھ گئے۔ جب شاہ کی واپی (مخصوص نکڑی) شروع ہوتی تو ایک خادم دعات کے بڑے بڑے گلاسوں میں دودھ ڈال کر تقسیم کرتا۔ یہ رسم ہے وہاں کی کہ جب واپی پڑھتے ہیں تو تقسیم کیا جاتا ہے۔ گلاس بہت بڑے بڑے تھے، لیکن ان میں تولڈیڑھ توں دودھ ہوتا۔ جب اتنا بڑا گلاس اور اتنا سا دودھ لا کر ایک خادم نے میری بیوی کو دیا، تو اس نے دودھ لانے والے کی طرف بڑی جیربت سے دیکھا اور پھر جھانک کر گلاس کے اندر دیکھا۔ میں نے اس سے کہا کہ دودھ ہے پی لو۔ میں نے اپنے گلاس کو بھایا۔ میرے گلاس کے اندر دودھ میں ایک تنکا تھا۔ میں اس تنکے کو نظر انداز کرتا تھا، لیکن وہ پھر گھوم کر سامنے آ جاتا تھا۔ میں نے یہ فیصلہ کیا کہ میں دودھ کو تنکے سمیت ہی پی جاتا ہوں۔ چنانچہ میں نے دودھ پی لیا اور اپنی بیوی سے کہا کہ آپ بھی پیئیں، یہ برکت کی بات ہے۔

خیر! اس نے زبردستی زور لگا کر پی لیا اور قریب بیٹھے ہوئے ایک شخص سے کہا کہ آپ ہمیں تھوڑی سی جگہ دیں۔ اس شخص کی بیوی ایسٹ کر اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی۔ اس شخص نے اپنی بیوی کو ٹھوکا دیا اور کہا کہ مہمان ہے، تم اپنے پاؤں پیچھے کرو۔ میری بیوی نے کہا کہ نہیں، اس کو مت الشاہیں۔ لیکن اس شخص نے کہا، نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ اس کی بیوی ذرا سخت گئی اور ہم دونوں کو جگہ دے دی۔ انسان کا خاصا یہ ہے کہ جب اس کو بیٹھنے کی جگہ جائے تو وہ لیٹئے کی بھی چاہتا ہے۔ جب ہم بیٹھنے کے تو پھر دل چاہا کہ ہم بھی آرام کریں اور میں آہستہ آہستہ گھستتا ہوا پاؤں پسарنے لگا۔ فرش بڑا ٹھنڈا اور مزیدار تھا۔ ہوا چل رہی تھی۔ میں نہم دراز ہو گیا۔ میری بیوی نے تھوڑی دیر کے بعد کہا کہ میں چکر لگا کر آتی ہوں، کیونکہ یہ جگہ تو ہم نے پوری طرح دیکھی ہی نہیں۔ میں نے کہا تھیک ہے۔ وہ چلی گئی۔ وہ پندرہ منٹ گزر گئے وہ واپس نہ آتی تو مجھے اندر یہ شہ ہوا کہ کہیں گم ہی نہ ہو جائے، کیونکہ پچیدہ راستے تھے اور نبی جگہ تھی۔

جب وہ لوٹ کر آئی تو بہت پریشان تھی۔ کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ میں نے کہا، خیر ہے! کہنے لگی آپ انھیں میرے ساتھ چلیں۔ میں آپ کو ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔ میں انھکر اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں رات کو دربار کا دروازہ بند کر دیتے ہیں اور زائرین باہر بیٹھ رہتے ہیں۔ صبح جب دروازہ کھلتا ہے تو پھر لوگ دعا کیں وغیرہ مانگنا شروع کر دیتے ہیں۔ جب

ہم وہاں گئے تو اس نے میرا باتھ کپڑا لیا اور کہنے لگا، آپ ادھر آئیں۔ شاہ کے دروازے کے عین سامنے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے سر پر جیسے ہمارا دستِ خوان ہوتا ہے اس سائز کی چادر کا گلزار تھا اور اس کا اپنا جو دو پہ تھا وہ اس نے شاہ کے دروازے کے کندے کے ساتھ گانجھ دے کر باندھا ہوا تھا اور اپنے دوپے کا آخری کونہ باتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور بالکل خاموش تھی؛ اسے آپ بہت ہی خوبصورت لڑکی کہہ سکتے ہیں۔

اس کی عمر کوئی سولہ سترہ یا انٹھارہ برس ہوگی۔ وہ کھڑی تھی، لیکن لوگ ایک حلقة سا بنا کر اسے تھوڑی سی آسانیں عطا کر رہے تھے تاکہ اس کے گرد جمگھانہ ہو۔ کچھ لوگ، جن میں عورتیں بھی تھیں، ایک حلقة سا بنائے کھڑے تھے۔ میں نے کہا، یہ کیا ہے؟ میری بیوی کہنے لگی اس کے پاؤں دیکھیں۔ جب میں نے اس کے پاؤں دیکھے تو آپ یقین کریں کہ کوئی پانچ سات گلوکے۔ اتنا براہما تھی کا بالکل بھی نہیں ہوتا۔ بالکل ایسے تھے جیسے سینٹ پتھر یا اینٹ کے بنے ہوئے ہوں۔ حالانکہ لڑکی بڑی دھان پان کی اور دُبیٰ پتلی سی تھی۔ ہم جیرانی اور ذر کے ساتھ اسے دیکھ رہے تھے، تو وہ منہ ہی منہ میں کچھ بات کر رہی تھی۔ وہاں ایک سنڈھی بزرگ تھے۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ اس نے کہا، سائیں! کیا عرض کریں۔ یہ بیچاری بہت دکھیاری ہے۔ یہ بخاک کے کسی گاؤں سے آئی ہے اور ہمارے اندازے کے مطابق ملتان یا بہاولپور سے ہے۔

یہ گیارہ دن سے اسی طرح کھڑی ہے اور اس مزار کا بڑا خدمتگار وہ سفید داڑھی والا بزرگ، اس کی منت ماجست کرتا ہے تو ایک سمجھو رکھنے کے لیے یہ منہ کھولو دیتی ہے، چوپیں گھٹنے میں۔ میری بیوی کہنے لگی کہ اسے ہوا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس کے بھائی کو چھانی کی سزا ہوتی ہے اور یہ بیچارگی کے عالم میں وہاں سے چل کر بیہاں پہنچی ہے اور اتنے دن سے کھڑی ہے اور ایک ہی بات کہہ رہی ہے کہ ”اے شاہ! تو توالہ کے راز جانتا ہے تو میری طرف سے اپنے رب کی خدمت میں درخواست کر کے میرے بھائی کو رہائی ملے اور اس پر مقدمہ ختم ہو۔“ وہ بس یہ بات کہہ رہی ہے۔ شاہ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ ”اے لوگو! چودھویں کے چاند کو جو بڑا خوبصورت اور دلکش ہوتا ہے، پہلی کے چاند کو جو نظر بھی نہیں آتا اور لوگ چھتوں پر چڑھ کر انگلیوں کا اشارہ کر کے اسے دیکھتے ہیں۔ یہ کیا راز ہے تم میرے قریب آؤ میں تمہیں چاند کا راز سمجھاتا ہوں (یہ شاہ عبداللطیف بھٹائی کی ایک نظم کا حصہ ہے)۔

وہ لڑکی بھی بیچاری کہنیں سے چل کر چلتی چلتی پتا نہیں اس نے اپنے گھروالوں کو بتایا بھی ہے کہ نہیں، لیکن وہ وہاں پہنچنے کی ہے اور وہاں کھڑی تھی۔ چونکہ رات کو مزار کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اس لیے کوئی کشش نہیں رہتا، اس نے اپنا دوپہر اتار کر وہاں باندھ رکھا ہے۔ وہ بابا تارہ تھا کہ اس کا چنان مشکل ہے۔ بڑی مشکل سے قدم انٹھا کر چلتی ہے اور ہم سب لوگ اس لڑکی کے لیے دعا کرتے ہیں۔ ہم

اپنا ذاتی کام بھول جاتے ہیں اور ہم اس کے لیے اور اس کے بھائی کے لیے اللہ سائیں سے گزر گزا کر دعا کرتے ہیں کہ اللہ تو اس پر فضل کر۔ لتنی چھوٹی سی جان ہے اور اس نے اپنے اوپر کیا مصیبت ڈال لی ہے۔ میں کھڑا اس لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کا دوپٹا اگر سر سے اتر جاتا تو وہاں کے لوگ اپنے پاس سے اجر ک کایا کوئی اور کپڑا اس کے سر کے اوپر ڈال دیتے۔ میں اس کو دیکھتا رہا۔ مجھے باہر دیکھنا، والی سمنا اور دودھ پینا سب کچھ بھول گیا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے بات کروں، لیکن میرا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا، کیونکہ وہ اتنے بلند کردا اور طاقت کے مقام پر تھی کہ ظاہر ہے ایک چھوٹا، معمولی آدمی اس سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ ہمیں وہاں کھڑے کھڑے کافی دیر ہو گئی۔ ہم نے وہاں ساری رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے ساری رات اس لڑکی کے لیے دعائیں کیں۔ بس ہم اس کے لیے کچھ کمی دعائیں کرتے رہے۔

صحیح چلتے ہوئے میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ جب تک پنجاب کا دوپٹا شاہ عبداللطیف بھٹائی کے انڈے سے بندھا ہے پنجاب اور سندھ میں کسی قسم کا کریک نہیں آ سکتا۔ یہ تو اپنے مقصد کے لیے آئی ہے نا، لیکن مقصد سے ماوراء بھی ایک اور رشتہ ہوتا ہے۔ میری بیوی کہنے لگی، کیوں نہیں؟ آپ روز انکی خبریں پڑھتے ہیں کہ یہ سندھ کا رڈ ہے یہ پنجاب کا رڈ ہے۔ جب ایک چودھری دیکھتا ہے کہ لوگوں کی توجہ میرے اوپر ہونے لگی ہے اور میرے لوگ میرے بارے میں Critical ہوتے گے ہیں، تو پھر وہ کہتا ہے اے لوگو! میری طرف نہ دیکھو۔ تمہارا چور پنجاب ہے۔ دوسرا کہتا ہے، نہیں! میری جانب نہ دیکھو تمہارا چور سندھ ہے، تاکہ اس کے اوپر سے نکا ہیں نہیں، ورنہ لوگوں کے درمیان وہی اصل رشتہ قائم ہے جو ملتان یا بہاولپور سے جانے والی لڑکی کا شاہ کے مزار سے ہے، جو کلی، تن تھا، سو جے پاؤں بغیر کسی خواراک کے کھڑی ہوئی ہے اور اس کا اعتقاد اور پورا ایمان ہے کہ اس کا منسلک حل ہو گا۔ اپنی ایک نظم میں شاہ فرماتے ہیں کہ ”اے کمان کئے والے تو نے اس میں تیر رکھ لیا ہے اور تو مجھے مارنے لگا ہے، لیکن میرا تو سارا وجود ہی تیرا ہے، کہیں تو اپنے آپ کو نقصان نہ پہنچا لے۔“

چند سر دیاں پہلے کی بات ہے کہ ہمارے باغ جناح میں پرانے جھانے کے سامنے اندر وہنی شہر کی ایک خاتون نیچے کے اوپر بیٹھی تھی اور اپنے چھوٹے بچے کو اپنے گھنے کے اوپر ہلا رہی تھی۔ اس کی تین بچیاں کھلیتی ہوئی بااغ میں پھیل گئی تھیں اور ایک دوسری کے ساتھ لڑکی تھیں اور بار بار جھینکیں مارتی ہوئی ماں سے ایک دوسری کی شکایت کرتی تھیں۔ ذرا دری بعد پھر ماں کو شنگ کرنا شروع کر دیتیں اور پھر چلی جاتیں۔ آخر میں پھر لڑکی ہوئی تھی۔ آخر ماں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کہا کھوں دے مٹھی۔ جب اس نے مٹھی کھوئی تو اس میں سوکھا ہوا درخت سے گرا بھیڑہ تھا۔ ایک نے کہا، پہلے میں نے دیکھا تھا یہ میرا ہے۔ ان کی ماں نے دوسری سے کہا، اسے دے دو۔ پھر وہ صحیح صفائی کرتے ہوئے بھاگ کر چلی گئیں۔

جب میں نے ان کے درمیان اتنی زیادہ ملڑائی دیکھی تو میں نے اس خاتون سے کہا کہ آپ تو مشکل میں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ بچے آپ کو بہت تھنگ کرتے ہیں۔ تو اس نے کہا کہ بھائی! مجھے یہ بہت تھنگ کرتے ہیں، لیکن میں ان سے تھنگ ہوتی نہیں۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگیں یہ جو میرے بچے ہیں اپنی نانی کے مرنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر ان کی نانی زندہ ہوتی تو یہ بچیاں کتنی ہی شیطانیاں کرتیں، خد کرتیں، لا رہیاں کرتیں، لیکن پھر بھی اپنی نانی کی پیاریاں اور لاڈلیاں ہی رہتیں۔

جب میرے ذہن میں یہ خیال آتا ہے تو یہ کچھ بھی کریں۔ میں اپنی نانی کے حوالے سے انہیں معاف کر دیتی ہوں اور یہ مزے سے کھلیتی رہتی ہیں، حالانکہ جسمانی اور ذہنی وروحدانی طور پر مجھے تھنگ کرتی ہیں۔ جب اس نے یہ بات کی تو میں سوچنے لگا کہ کیا ہمارے سیاہی اور سماجی وجود میں کوئی نانی جیسا تصور نہیں آسکتا؟ کیا ہمیں ایسا لیڈر نہیں مل سکتا، یا سکا جس کے سہارے ہم اپنی مشکلات کو اس کے نام Dedicate کر کے یہ کہیں کہ اگر ایسی مشکلات ہوتیں اور اگر قائد عظم زندہ ہوتے تو ہم ان کے حوالے کر دیتے کہ جی یہ مشکلات ہیں اور وہ ان کو دیے ہی سمیت لیتے جیسا کہ وہ دوسرا مشکلات کو سمیٹا کرتے تھے بلکہ اسکیلے انہوں نے ہی تمام مشکلات کو سمیٹا تھا۔ لیکن شاید یہ ہماری قسمت یا مقدار میں نہیں تھا، لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر ایک دھان پان ہی، دلی پتلی لڑکی اتنی بہت کر کے اپنے ذاتی مقصد کے لیے اتنا بڑا کٹکشن میرے آپ کے اور سندھ کے درمیان پیدا کر سکتی ہے تو ہم جو زیادہ پڑھے لکھئے، انہم نہ اور انہوں لوگ ہیں یہ دل اور روح کے اندر مزید گھبراہی پیدا کرنے کے لیے کچھ کیوں نہیں کر سکتے؟

کوئی ایسی صبح طلوع ہو یا کوئی ایسی شام آئے، جب ہم دیوار سے ڈھونڈا کر ایک Meditation میں داخل ہوتے ہیں، تو کیا اس مرابتے میں یہ ساری چیزیں نہیں آتیں یا یہ کہ ہم اس مرابتے کے اندر کبھی داخل ہی نہیں ہو سکے؟ ایک چھوٹی سی لڑکی اس طرح سے ایک تھیہ کے اندر اور ایک ارادے کے اندر داخل ہو گئی تھی اور ہم جو بڑے ہیں ان سے یہ کام نہیں ہوتا۔ اس کے باوجود میں بہت پُر امید ہوں کہ یقیناً ایسا وقت آجائے گا جس کا کوئی جواز ہمارے پاس نہیں ہوگا، جس کی کوئی منطق نہیں ہوگی۔ لیکن وہ وقت ضرور آئے گا، کیوں آئے گا، کس لیے آئے گا، کس وجہ سے اور کیسے آئے گا؟ اس کا بھی کوئی جواب میرے پاس نہیں ہے۔ لیکن اتنی بڑی معاشرتی زندگی میں جان بوجھ کر بیا یو قوئی سے ہم جو نام لے پچھے ہیں، انہیں کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی مقام پر پیچ کر سفل ہونا ضروری ہے۔ یہ میرا ایک ذاتی خیال ہے، جس کے ساتھ میں وابستہ رہتا ہوں۔

مايوی کی بڑی گھٹائیں ہیں، بڑی بے چیزیاں ہیں، بڑی پریشانیاں ہیں۔ اکنا مکس کا آپ کے یو یقینی ملزکا ہی مسئلہ اتنا ہو گیا ہے کہ انسان اس سے ہی باہر نہیں نکلتا۔ آدمی رو تارہتا ہے، لیکن ہمارے

اس لاہور میں ہمارے اس ملک میں اور ہمارے اس ملک سے ماوراء و سری اسلامی دنیا میں کچھ نہ کچھ تو لوگ ایسے ضرور ہوں گے جو اکنامک کی تنگی کے باوصاف یہ کہتے ہوں گے جو میں نہیں کہہ سکتا۔ میں کسی نہ کسی طرح سے خوش ہو سکتا ہوں، کیونکہ خوشی کامال دولت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ ہمارے بابے کہا کرتے ہیں کہ اگر مال و دولت کے ساتھ جانیداد کے ساتھ خوشی کا تعلق ہوتا تو آپ اتنی ساری چیزیں چھوڑ کر بھی سوتے ناں! ان ساری چیزوں کو اپنی نگاہ کے سامنے چھوڑ کر آپ سو جاتے ہیں اور سونا اتنی بڑی نعمت ہے جو آپ کو راحت عطا کرتی ہے اور اگر آپ کو کوئی جگائے تو آپ کہتے ہیں کہ مجھے تنگ نہ کرو۔ اگر اس سے کہیں کہ تیری وہ کارڈ جانیداد اور بینک بیلنس پڑا ہے تو اس سونے والے کو اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ اس سے طے یہ پایا کہ یہ دولت یہ مال و متاع یہ سب کچھ آپ کو خوشی عطا نہیں کرتے، خوش آپ کے اندر کی ایک لہر ہے۔

مچھلی جس کو پکڑ لے وہ اس لہر پر ڈالن کی طرح سوار ہو کر ڈور جا سکتی ہے۔ اگر وہ لہر نہ پکڑی جائے تو پھر ہماری بد قسمی ہے۔ پھر ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اس لہر کو دیکھنا، جا چخنا اور پکڑنا اور اس پر سوار ہونا شہ سواروں کا کام ہے عام لوگوں کا نہیں۔ بڑی تکلیفیں اور توفیقیں ہیں، لیکن ان کے درمیان رہتے ہوئے بھی کئی آدمی گاتے ہوئے گزر جاتے ہیں اور ہم اپنے کافنوں سے ان کا گانا سننے ہیں اور ہم ان کی تحقیق نہیں کر سکتے کہ ان کے اندر کون سی چپ لگی ہوئی ہے، کس قسم کی پروگرامنگ ہوئی ہوتی ہے کہ یہ گاتے چلے جا رہے ہیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے اور بہت سی آسانیاں عطا فرمائے اور خداوند تعالیٰ آپ کو آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

”علمی نیشنل خواہشیں“

چھپلی گرمیوں کا آخری مہینہ میں نے اپنے بھائی جاوید کے گھر گزارا۔ اس کے گھر میں ایک بڑا چھاس سومنگ پول ہے اس کا ایک چھوتا بیٹا ہے اس کے بیٹے کا ایک چھوٹا سکتا ”جیکی“ ہے۔ میں کتوں کے بارے میں چونکہ زیادہ نہیں جانتا، اس لیے اتنا سمجھ سکا ہوں کہ وہ چھوٹے قد کا نہایت محبت کرنے والا اور تمیزی سے دم ہلانے والا کتابے۔ جیکی کی یہ کیفیت ہے کہ وہ سارا دن کھڑکی کی سل پر اپنے دونوں پخے رکھ کر کھڑکی سے باہر دیکھتا رہتا ہے اور جب آوارہ لڑکے اسے پھر مار کر گزرتے ہیں تو وہ بھوکلتا ہے۔ جب آئس کریم کی گاڑی آتی ہے تو اس کا باجانستہ ہی وہ اپنی کنی ہوئی دم بھی ”گندیری“ کی طرح ہلاتا ہے اور ساتھ بھوکلنے کے انداز میں ”چوس، چوس“ بھی کرتا ہے (شاید اس کی آرزو ہو کہ مجھے اس سے کچھ ملے گا)۔ پھر جب غبارے یعنی والا آتا ہے تو وہ اس کے لیے بھی ویسا ہی پریشان ہوتا ہے اور وہ منظر نامہ اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزرتا رہتا ہے۔ پھر جس وقت سکول سے اس کا محبوب ماںک توفیق آتا ہے تو پھر وہ سل چھوڑ کر بھاگتا ہے اور جا کر اس کی ناگلوں سے چھٹتا ہے۔

شام کے وقت جب وہ سومنگ پول میں نہاتے ہیں اور جب اس کے کاماںک اس کا ساتھی توفیق چھائیگ لگاتا ہے تو وہ (جیکی) خود تو اندر نہیں جاتا، لیکن جیسے جیسے وہ تالاب میں تیرتا ہوا آگے جاتا ہے۔ جیکی بھی اس کے ساتھ بھاگتا ہے اور تالاب کے ارد گرد ”پھرکی“ کی طرح چکر لگاتا ہے، غراتا ہے، بھوکلتا ہے، پھسلتا ہے اور پانی کے سبب دور تک پھسلتا چلا جاتا ہے۔ میں اس قیام کے سارے عرصہ میں اسے دیکھتا رہا کہ یہ کیا کرتا ہے۔ پھر میں نے بچوں کو اکٹھا کر کے ایک دن کہا کہ آؤ اس جیکی کو سمجھائیں کہ تم تو اس طرح بھاگ کے بلکاں ہو جاؤ گے زندگی بر باد کرو گے۔ بچوں نے کہا اچھا دادا۔ اور ان سب نے جیکی کو بلا کر بٹھایا اور اس سے کہا کہ جیکی میاں دادا کی بات سنو۔ میں نے جیکی سے کہا دیکھو وہ (توفیق) تو تیرتا ہے وہ تو انجوئے کرتا ہے، تم خواہ خواہ بھاگتے ہو پھسلتے ہو اور اپنا منہ تڑواتے ہو، تم اس عادت کو چھوڑ دیں کیونکہ وہ یہ بات سمجھائیں۔ اگلے روز پھر اس نے ایسے ہی کیا جب

اس کو میں سمجھا چکا اور رات آئی اور میں لیٹا لیکن بہت ساری کروٹیں بد لئے کے بعد بھی مجھے نیندنا آئی تو میں نے اپنا سردیوار کے ساتھ لگا کر یہ سوچنا شروع کیا کہ میرے بینے نے جوی ایس اس کا امتحان دیا ہے کیا وہ اس میں سے پاس ہو جائے گا؟ پوتا جو امریکہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے گیا ہے کیا اس کو درلڈ بینک میں کوئی توکری مل جائے گی؟ ہمارے اوپر جو مقدمہ ہے کیا اس کا فیصلہ ہمارے حق میں ہو جائے گا اور وہ انعامی باغہ جو ہم نے خریدا ہے وہ نکل آئے گا کہ نہیں؟

میری اتنی ساری بے چینی اور یہ سب کچھ جو میں میری آرزوئی Desires، میری تمنا میں اور خواہش گذمہ ہو گئیں تو میں نے کہا کہ میں بھی کسی صورت میں "بھکی" سے کم نہیں ہوں، جس طرح سے وہ بے چین ہے جیسے وہ ترتپا ہے جیسے وہ تاجھی کے عالم میں چکر لگاتا ہے تو حالات کے تالاب کے اردوگردو میں بھی چکر لگاتا ہوں تو کیا میں اس کو کسی طرح سے روک سکتا ہوں، کیا میں ایسے سیدھا چل سکتا ہوں جیسے سیدھا چلے کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ میں جیسے پہلے بھی ذکر کیا کرتا ہوں میں نے اپنے بابا جی سے پوچھا کہ جی یہ کیوں بے چینی ہے کیوں اتنی پریشانی ہے کیوں ہم سکون قلب کے ساتھ اور اطمینان کے ساتھ بیٹھنے میں سکتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ دیکھو تم اپنی پریشانی کی پوٹلیاں اپنے سامنے نہ رکھا کر، انہیں خدا کے پاس لے جایا کرو وہ ان کو حل کر دے گا۔ تم انہیں زور لگا کر خود حل کرنے کی کوشش کرتے ہو، لیکن تم انہیں حل نہیں کر سکو گے۔

میں جب چھوٹا تھا تو ہمارے گاؤں میں میری ماں کے پاس ایک بوڑھی عورت آیا کرتی تھی، ہم اسے تائی سوندھاں کہتے تھے۔ اس کے پاس چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں ہوتی تھیں۔ وہ میری ماں کے پاس بیٹھ جاتی اور ایک ایک پوٹلی کھول کے دکھاتی کہ بی بی یہ ہے۔ کسی پوٹلی میں سوکھے ہوتے، کسی میں سوکھی لکڑیاں جیسے ملٹھی ہوتی ہے وہ ہوتیں۔ وہ کہتی کہ اگر ان لکڑیوں کو جلاو تو پھر نہیں رہتا، کسی پوٹلی میں چھوٹے چھوٹے پتھر ہوتے تھے، کسی میں بڑے درخت سے گری ہوئی "گولیں" ہوتی تھیں۔ اس کے پاس ایسی ہی سوکھی چیزوں کی بے شمار پوٹلیاں ہوتی تھیں ان میں کوئی بھی کام کی چیز نہیں ہوتی تھی، میرا یہ اندازہ ہے اور میری ماں کا بھی یہ اندازہ تھا۔ میری ماں کہتی کہ نہیں سوندھاں مت کھول ان کو لٹھک ہے اور میری ماں اسے کچھ آٹھ آنے چار آنے دے دیتی تھی۔ اس زمانے میں آٹھ چار آنے بہت ہوتے تھے اور وہ دعا کیں دیتی ہوئی چلی جاتی تھی۔ اس کی کسی کے حضور پوٹلیاں کھل کر یا نکھل کر بھی اس کو فائدہ عطا کرتی تھیں۔ اور میرا بابا مجھ سے یہ کہتا تھا کہ تو اپنی پوٹلیاں اللہ کے پاس لے جا ساری مشکلات کسی وقت بیٹھ کر دیوار سے ڈھونگا کر کہو کہ اے اللہ یہ بڑی مشکلات ہیں یہ مجھ سے حل نہیں ہوتیں۔ یہ میں تیرے حضور میں لے آیا ہوں۔

میں چونکہ بہت ہی پڑھا لکھا آدمی تھا اور ولادت سے آیا تھا، میں کہتا، کہاں ہوتا ہے خدا؟

اس نے کہا، خدا ہوتا نہیں ہے، نہ ہو سکتا ہے، نہ جانا جاتا ہے، نہ جانا جاسکتا ہے اور خدا کے بارے میں تمہارا ہر خیال وہ حقیقت نہیں بن سکتا لیکن پھر بھی اس کو جانا جانا چاہیے۔ میں کہتا تھا کیوں جانا جانا چاہیے اور آپ اس کا کیوں بار بار ذکر کرتے ہیں، آپ ہر بار اس کا ذکر کرتے ہیں اور ساتھ یہ بھی فرماتے ہیں کہ نہ وہ جانا جاتا ہے، نہ جانا جاسکتا ہے، کہنے لگے پرندہ کیوں گاتا ہے اور کیوں چھپتا ہے، اس لیے نہیں کہ پرندے کے پاس کوئی خبر ہوتی ہے، کوئی اعلان ہوتا ہے، یا پرندے نے کوئی ضمیر چھاپا ہوا ہوتا ہے کہ "آج گئی آج کی تازہ خبر" پرندہ بھی ضمیر کی آواز نہیں لگاتا، پرندہ اس لیے گاتا ہے کہ اس کے پاس ایک گیت ہوتا ہے اور ہم خدا کا ذکر اس لیے کرتے ہیں کہ پرندے کی طرح ہمارے پاس بھی اس کے نام کا گیت ہے۔ جب تک آپ اس میں اتنے گھرے اتنے Deep اور اتنے عیق نہیں جائیں گے اس وقت تک تمہارا یہ مسئلہ حل نہیں ہو گا۔ لیکن میں اپنی تمام تر کوشش کے باوجود اور بہت زور لگانے کے باوصف "جیکی" کی طرح بے چین ہی رہا اور اپنے حالات کے تالاب کے ارد گرد دیے ہی بھاگتا رہا، چکر کا فنا رہا جیسے کہ جیکی میرے پوتے کے ارد گرد بھاگتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک چھوٹی مچھلی نے بڑی مچھلی سے پوچھا کہ "آپ یہ سمندر کہاں ہوتا ہے؟" اس نے کہا جاں تم کھڑی ہوئی ہو یہ سمندر ہے۔ اس نے کہا، آپ نے بھی وہی جا ہلوں والی بات کی یہ تو پانی ہے، میں تو سمندر کی تلاش میں ہوں اور میں صحیتی تھی کہ آپ بڑی عمر کی ہیں، آپ نے بڑا وقت گزارا ہے، آپ مجھے سمندر کا بتائیں گی۔ وہ اس کو آوازیں دیتی رہی کہ چھوٹی مچھلی شہر، شہرہ، میری بات سن کے جاؤ اور سمجھو کوئی میں کیا کہنا چاہتی ہوں لیکن اس نے پلت کر نہیں دیکھا اور چلی گئی۔ بڑی مچھلی نے کہا کہ کوشش کرنے کی بجدوجہد کرنے کی بھاگنے دوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، دیکھنے کی اور Straight آنکھوں کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔ مسئلے کے اندر اترنے کی ضرورت ہے۔ جب تک تم مسئلے کے اندر اتر کر نہیں دیکھو گے، تم اسی طرح بے چین و بے قرار ہو گے اور تمہیں سمندر نہیں ملے گا۔

میرے "بابا" نے کہایہ بڑی غور طلب بات ہے۔ جو شخص بھی گول چکروں میں گھومتا ہے اور اپنے ایک ہی خیال کے اندر "وی گھولتا" ہے اور جو گول گول چکر لگاتا رہتا ہے وہ کفر کرتا ہے، شرک کرتا ہے کیونکہ وہ احمد ناصر اطا استقیم (دکھا ہم کو سیدھا راستہ) پر عمل نہیں کرتا۔ یہ سیدھا راست آپ کو ہر طرح کے مسئلے سے نکالتا ہے لیکن میں کہتا ہوں سراس "ذبداء" (مسئلے) سے نکلنے کی آرزو بھی ہے اور اس بے چینی اور چیخیدگی سے نکلنے کو بھی بھی نہیں چاہتا، ہم کیا کریں۔ ہم کچھ اس طرح سے اس کے اندر گھرے ہوئے ہوتے ہیں، ہم یہ آرزو کرتے ہیں اور ہماری تمنا یہ ہے کہ ہم سب حالات کو سمجھتے جانتے پہچانتے ہوئے کسی نہ کسی طرح سے کوئی ایسا راستہ کوئی ایسا دروازہ ڈھونڈنا کیلیں، جس سے مخفی ہوا آتی ہو۔ یا ہم باہر نکلیں یا ہوا کو اندر آنے دیں، لیکن یہ ہمارے مقدار میں آتا نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہمارے

اوہ desire کے درمیان ایک عجیب طرح کا رشتہ ہے جسے بابا بدھا یہ کہتا ہے کہ جب تک خواہش اندر سے نہیں نکلے گی (چاہے اچھی کیوں نہ ہو) اس وقت تک دل بے چین رہے گا۔ جب انسان اس خواہش کو ڈھیلا چھوڑ دے گا اور کہنے گا کہ جو بھی راستہ ہے جو بھی طے کیا گیا ہے میں اس کی طرف چلتا چلا جاؤں گا، چاہے ایسی خواہش ہی کیوں نہ ہو کہ میں ایک اچھا رائز یا پینٹر بن جاؤں یا میں ایک اچھا "اچھا" بن جاؤں۔ جب انسان خواہش کی شدت کو ڈھیلا چھوڑ کر بغیر کوئی اعلان کیے بغیر خط کشیدہ کیے یا لائیں کھینچنے چلتا جائے گا تو پھر آسانی ملے گی۔

ایک گاؤں کا بندہ تھا اسے نمبردار کہہ لیں یا زیلدار اس کو خواب آیا کہ کل ایک شخص اس گاؤں کے باہر آئے گا، وہ جنگل میں ہو گا اور اس کے پاس دنیا کا سب سے قیمتی ہیرا ہو گا اور اگر کسی میں ہمت ہے اور اس سے وہ ہیرا لے سکتے تو حاصل کر لے۔ چنانچہ وہ شخص جنگل میں گیا اور جیرانی کی بات یہ ہے کہ ایک درخت کے نیچے واقعی ایک بدھوسا آدمی بیٹھا ہوتا ہے، اس نے جا کر اس شخص سے کہا کہ تیرے پاس ہیرا ہے، اس نے جواب دیا، نہیں میرے پاس تو کوئی ہیرا نہیں۔ اس نے کہا کہ مجھے خواب آیا ہے کہ تیرے پاس ایک ہیرا ہے۔ اس نے پھر فنی میں جواب دیا کہ نہیں اور کہا کہ میرے پاس میرا ایک تھیلا ہے "تھلہ" اس کے اندر میری ٹوپی، چادر، بنا نسی و اور کچھ کھانے کے لیے سوکھی روٹیاں ہیں، گاؤں کے شخص نے کہا، نہیں تم نے ضرور ہیرا چھپا ہوا ہے، اس پر اس پر دلی ہے کہا کہ نہیں میں کوئی چیز چھپا تا نہیں ہوں اور ہیرے کی تلاش میں آنے والے کی بے چینی کو دیکھا (جیسا مجھ میں اور جنکی میں بے چینی ہے) اور تھیلے میں ہاتھ ڈال کر کہا کہ جب میں کل اس طرف آ رہا تھا تو راستے میں مجھے یہ پھر کا ایک خوبصورت، پچکدار گلرا ملا ہے۔ یہ میں نے تھیلے میں رکھ لیا تھا۔ اس شخص نے بے قراری سے کہا، یہ تو ف آدمی یہی تو ہیرا ہے تو اس نے کہا، اس کا میں نے کیا کرنا ہے تو لے جا۔ وہ اس پھر کو لے گیا۔ وہ گاؤں کا شخص ہیرا پا کر ساری رات سونہ سکا، کبھی اسے دیکھتا، کبھی دیوار سے ڈھونکا کر پھر آنکھیں بند کر لیتا اور پھر اسے نکال کر دیکھنے لگتا۔ ساری رات اسی بے چینی میں گزر گئی۔

صحح ہوئی تو لوٹ کر اس شخص کے پاس گیا، وہ دیے ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس نے دیکھ کر کہا، اب میرے پاس کیا مانگنے آیا ہے۔ اس نے کہا، میں تیرے پاس وہ اطمینان مانگنے آیا ہوں جو اتنا بڑا، قیمتی ہیرا دے کر مجھے نصیب ہے اور تو آرام سے بیٹھا ہوا ہے، تیرے اندر بے چینی کیوں پیدا نہیں ہوئی۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے تو معلوم ہی نہیں کہ بے چینی کس طرح سے پیدا ہوئی ہے اور کیسے کی جاتی ہے! اس گاؤں کے شخص نے کہا تو آ جا اور ہمارے گاؤں میں رہ کے دیکھ۔ میں تھجے اس بات کی ٹریننگ دوں گا اور بتاؤں گا کہ بے چینی کس چیز کا نام ہے۔ لیکن وہ انکار کر گیا اور کہا کہ میرا اس تھے کچھ اور طرح کا ہے۔ تو یہ ہیرا رکھا پہنچ پاس۔ اس نے پھر کہا کہ گوئیں نے تم سے یہ ہیرا لے لیا ہے، لیکن

میری بے چینی کم ہونے کی بجائے بڑھنی ہے۔ میں اس پر بیٹانی میں بتا ہو گیا ہوں کہ ایسے کس طرح اور کیسے ہو سکتا ہے جیسے تو نے کر دیا ہے۔ اب میں وہاں سے آ تو گیا ہوں اور میں اپنے گھر میں ہوں لیکن میرے اندر کا ”جیکی“ وہ اس طرح سے آ دھا پانی میں بھی گیا ہوا، لعاب گرتا ہوا، اس بے چینی کے ساتھ گھوم رہا ہے اور اس کو وہ سکون نصیب نہیں ہوا، جو ہو جانا چاہیے تھا اور میں اپنی تمام تر کوشش کے باوصف اس خواہش سے اس آرزو سے اس تمنا سے چھڑکا راحا حاصل نہیں کر سکا، باہر نہیں نکل سکا جو اس عمر میں جو کہ ایک بڑی عمر ہے، نکل جانا چاہیے تھا۔ میں سڑک پر باہر نکل کر دیکھتا ہوں تو پر بیٹانی کے عالم میں بہت سارے جیکی میرے شہر کی سڑکوں پر بے چینی کے عالم میں بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ وہ بھی میرے جیسے ہی ہیں۔ ان کے اندر بھی یہ بیماری چلی جا رہی ہے اور بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ میں لوٹ کر آگیا ہوں اور اس وقت اپنے وجہ کی کھڑکی میں آرزو کے دونوں پیخے رکھ کر باہر دیکھ رہا ہوں اور ہر آنے جانے والی چیز کو دیکھ رہا ہوں اور حاصل کرنے والی چیز کے لیے بڑی شدت کے ساتھ دم ہلا رہا ہوں۔ میری کوئی مدد نہیں کرتا، کوئی آگے نہیں بڑھتا حالانکہ میری خواہش یہ ہے کہ ایسے لوگ مجھے بھی ملیں جن کے قابلے میں وہ من موہنا ہیرا ہو جو لوگوں کو دیکھ جعلنے کے بعد کچھ عطا کر دیتا ہے۔ اب جبکہ میں بڑا بے چین ہوں اور اس عمر میں یہ بے چینی زیادہ بڑھنی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس میں ایک بہت بڑا حصہ ملائی پیشناکی ہے۔ پہلے یہ چیز میں نہیں تھیں۔

ایک صبح جب میں جا گا اور میں باہر نکلا تو میرے شہر کے درود یوار بدلتے گے۔ ان کے اوپر اتنے بڑے بڑے ہورڈنگ سائنس پورڈ اور تصویریں لگ گئی ہیں جو میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھیں جو پاکار کر مجھے کہہ رہی تھیں کہ مجھے خریدو مجھے لا مجھے استعمال کرو میں ان کو نہیں جانتا تھا۔

آپ یقین کریں آج سے ستر برس پہلے بھی میں زندہ تھا۔ میں خدا کی قسم کہا کے کہہ سکتا ہوں کہ میں آج سے پہلے زندہ تھا اور بڑی کامیابی کے ساتھ زندہ تھا اور صحبت مندی کے ساتھ زندہ تھا اور اب اس بڑھاپے میں میری انگکار کا ستر فیصدی حصہ ان آنحضرت پر خرچ ہو رہا ہے جو آج سے 70 برس پہلے ہوتی ہی نہیں تھیں۔ 1960ء میں یہ آنحضرت ہوتی ہی نہیں تھیں۔ یہ ایک بڑی اڑیجہدی ہے۔ آپ یقین کریں کہ 1960ء میں فنوا اسٹیٹ مشین کا کوئی تصور نہیں تھا کہ یہ کیا ہوتی ہے۔ اب مجھے اتنا فنو اسٹیٹ کروانا پڑتا ہے کہ میں پیسے بچا بچا کر رکھتا ہوں۔ میرا پوتا کہتا ہے کہ دادا اس کی میں فنوا اسٹیٹ کروالا ہوں۔ فلاں چیز کی بھی ہو جائے۔ غیرہ وغیرہ۔ جب میں کسی دفتر میں جاتا ہوں اور میں وہاں جا کر عرضی دیتا ہوں کہ جناب مجھے اپنی Date of Birth چاہیے تو سب سے پہلے وہ کہتے ہیں کہ جیسے اس کی دو فنوا اسٹیٹ کروالا ہیں۔ بھی کیوں کرووالا ہیں؟ کہتے ہیں اس کا مجھے نہیں پہتہ، میں فنوا اسٹیٹ ہونا چاہیے۔ آپ یقین کریں کہ جب میں بی اے میں پڑھتا تھا بہت دیر کی بات ہے تو وہاں ہمارا ایک سکھ

دوسرا ہر دن سانچھے تھا اس نے مجھے کہا "تھیلی آگے بڑھا" میں نے تھیلی آگے بڑھا۔ اس نے ایک گندی لیس دار چیز میری تھیلی پر لگا دی۔ میں نے کہا: "خالما! یہ تو نے کیا کیا سکھا"۔ اس نے کہا اس پر پانی کرنا اور سر پر مل اور پھر دیکھ۔ میں نے اس پر پانی کر کر سر پر ملا تو "پچھا پھپ" جاگ ہو گئی کہنے لگا اس کو شیپو کہتے ہیں۔ ہم تو اس وقت لاں صابن سے نہاتے تھے۔ اس نے کہا یہ میرے چاچے نے لندن سے بیکی ہے۔

ہمارے ملک میں شام کے وقت جب میں اپنے فی وی پار Advertisemen دیکھتا ہوں تو مجھے یہ پتہ چلتا ہے کہ میرے ملک کا سب سے بڑا منہلہ یہ ہے کہ کون سا شیپوا استعمال کیا جائے۔ ایک لڑکی کہتی ہے، خبردار جو میں پڑ جائیں گی وہ شیپو نہیں لگانا۔ دوسرا کہتی ہے، نہیں میں تو "یکافوری" لگاتی ہوں۔ وہ کہتی ہے، مت لگا یکافوری خراب ہوتا ہے۔ "چوچا چوچی کا" اچھا ہے۔ میرے سارے بچ کہتے ہیں، میں فلاں شیپو چاہیے۔ میرا ایک پوتا مجھ سے کہتا ہے کہ دادا تم خدا کے فضل سے بڑے سخت منڈ آدمی ہو اُن اللہ کے واسطے یہ پانی مت پیو جو تم 78 برس سے پینتے آ رہے ہو۔ تم منزل واٹر پیو یہ بالکل Pure Water ہوتا ہے۔ اس کے کہنے کا مطلب شاید یہ ہوتا ہے کہ اس کے پینے والا زندہ رہتا ہے۔ دوسرے سب فوت ہوئے پڑے ہیں!! اس سب کے ساتھ ساتھ مجھے رونا بھی آ رہا ہے کہ میں اپنے یوں یعنی بلز پر دباؤ ذلتا ہوں اور ان پر کڑھتا ہوں۔ میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔ یوں یعنی بل بھینے والوں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ قصور میری خواہشات کا ہے، میری Desires کا دائزہ اتنی دور پھیل گیا ہے اور وہ میرے اختیار میں بالکل نہیں رہا۔ میں کتنی بھی کوشش کیوں نہ کروں؟ میں اس دائزے کے اندر نہیں آ سکتا۔ بار بار مجھے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ بھی تمہارے استعمال کی چیز ہے۔ وہ بھی تمہارے استعمال کی چیز ہے اور جب تک تم اسے استعمال میں نہیں لادے گے اس وقت تک کچھ نہیں ہو سکتا۔

1948ء میں ہم نے ایک فرتیج خریدا، کیونکہ میری بیوی کہتی تھی کہ فرتیج ضرور لینا یہ دنیا کی سب سے قیمتی اور اعلیٰ درجے کی چیز ہے۔ ہمارے خاندان میں کسی کے پاس فرتیج نہیں تھا۔ وہ ہمارے گھر سالم تا ٹلے کر واکر فرتیج دیکھنے آتے تھے کہ سچان اللہ کیا کمال کی چیز ہے۔ میری بیوی انہیں دکھاتی تھی کہ دیکھو، ہلکا کھلا بے اور اس میں ساری چیزیں پڑی ہیں اور ان پر دوٹی پڑھی ہے۔ ساری چیزیں مارتی تھیں کہ آپا جی بتی جلتی رہے گی۔ تو وہ کہتی "ہے ہے! جب دروازہ بند ہو گا تو می خود بخوبی بچھ جائے۔" اس میں یہ کمال ہے۔ تو وہ ساری بچاریاں دست بستہ ہو کر ڈر کے پیچھے ہو کر کھڑی ہو جاتیں۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ یہ فرتیج تو آ گیا ہے اس کے ساتھ اس کی ساری ٹنگیوں چیزیں بھی آئیں گی۔ اس نے کہا، "نہیں یہ بڑی مفید چیز ہے۔"

اگلے روز عید تھی۔ جب میں نمازِ عید پڑھ کے صوفی غلامِ مصطفیٰ قبسم کے گھر کے آگے سے

گزرات میں صفائی کرنے والی دو یہیں جا رہی تھیں، میں ان کے پیچے پیچے چل رہا تھا۔ ایک نے دوسری سے پوچھا کہ اس بی بی نے تجھے کتنا گوشت دیا ہے۔ تو اس نے کہا، دفع دور! اس نے مہنڈی الماری خرید لی ہے، سارا بکرا کاٹ کے اندر رکھ دیا ہے، کچھ بھی نہیں دیا۔ اب آپ لوگ میرا بندوبست کرو کر میں کیسے اپنے آپ کو بچاؤں۔ میں جتنی دیر بھی اور زندہ رہنا چاہتا ہوں، خوش دلی اور خوش بختی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر ایسا دباؤ نہ ڈالوں میں محسوس کرتا ہوں کہ جیکی میرے مقابلہ میں اب زیادہ پر سکون ہو گیا ہے، یہ بات شاید اب مجھ میں آگئی ہو جکہ میں اور گرد بھاگ پھرتا ہوں اور بے چین ہوں۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

وقت ایک تھفہ

میں وقت کے بارے میں بہت گلگل میں رہتا ہوں۔ میں کیا اور میری حیثیت کیا۔ میں کس باغ کی مولی ہوں۔ وقت کے بارے میں بڑے بڑے سائنسدان، بڑے فلسفی، بڑے نکتہ دان، وہ سارے ہی اس پیچیدگی کا شکار ہیں کہ وقت اصل میں ہے کیا؟ اور یہ ہماری زندگیوں پر کس طرح سے اثر انداز ہوتا ہے؟ حضرت علامہ اقبال اور ان کے بہت ہی محبوب فرانسیسی فلسفی برگسان بھی وقت کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ مولانا روم اپنی چھوٹی چھوٹی کہانیوں میں وقت کا ہی ذکر کرتے ہیں۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ آئین شائن نے بھی اپنی Theory of Reality میں سارا زور وقت پر دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ”شے“ کوئی چیز نہیں ہے ”وقت“ شے کی ماہیت کو تبدیل کرتا ہے۔ اس نے ہم لوگوں کی آسانی کے لیے ایک مثال دی ہے کہ اگر آپ ایک بہت گرم توے پر غلطی سے بیٹھ جاتے ہیں اور وہ بھی ایک سینڈ کے ہزارویں حصے تک اور آپ پھر پریشانی کی حالت میں یا تکلیف میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ پوری صدی آپ کے ساتھ چھٹ گئی ہے۔

اگر آپ اپنے محبوب کے انتظار میں بیٹھے ہیں اور اس نے کہا ہوا ہے کہ میں دس بجکر پندرہ منٹ تک بیٹھج جاؤں گا، یا پہنچ جاؤں گی، فلاں جگ جاؤں میں اگر ایک منٹ کی دری ہو جاتی ہے تو آپ کو یوں لگتا ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس گزر گیا ہے اور وہ ایک منٹ آپ کی زندگی سے جاتا ہی نہیں۔ یہ سارا وقت کا شاخابنہ ہے کہ آنے جانے ملنے اور گرم خنڈے کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ ساری بات وقت کی ہے پھر جو آئین شائن سے اختلاف رکھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ Sub-automic Particle Level پر جب ہم کو دیکھتے ہیں تو کبھی وہ ہم کو Wave نظر آتا ہے، تو کبھی وہ ہمیں Particle دکھائی دیتا ہے اور اگر اس میں سے وقت کو نکال دیا جائے تو پھر شاید اصل پتا چل سکے کہ Sub-Automic Level کے اوپر یہ پیزی کیا ہے۔ بہر کیف یہ ایسی پیچیدگیاں ہیں، جن کے بارے میں بات ہوتی رہتی ہے۔ میرے جو سمجھدار نوجوان اس نسل کے ہیں یہ بھی وقت کے بارے میں بہت بھی اور سوچ بچار کی بات کریں گے۔

وقت کا ایک پیچیدہ ساخا کہ ہر شخص کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ چاہے وہ اس پر غور کرے یا نہ کرے۔ میں جب اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو رہا تھا تو ریٹائرمنٹ کا بڑا خوف ہوتا ہے کہ اب کیا ہو گا؟ یعنی آدمی نے ایک نوکری کی کی ہوتی ہے اور اس میں پھنسا چلتا رہتا ہے، لیکن آخر میں آ کر کچھ لوگ تو Re-employment کی تیاری کر لیتے ہیں۔ ایک چھانسی سے نکلوں گا، دوسری چھانسی ان شاء اللہ تیار ہو گی۔ اس میں اپنا سردے دوں گا اور پھر آخوند کا سفر کر جاؤں گا۔

جب میں ریٹائرڈ ہونے کے قریب تھا تو مجھ پر بھی یہ خوف طاری ہوا۔ میں نے قدرت اللہ شہاب سے، جو بڑے ہی نیک اور عبادت گزار تھے، ان سے پوچھا کہ ”سر! میں ریٹائرڈ ہونے والا ہوں تو میں کیا کروں؟“ انہوں نے کہا کہ ریٹائرڈ ہونے کا جو خوف ہوتا ہے اس کا سب سے بڑا بادا آپ کی ذات پر یہ پڑتا ہے کہ پھر لوگ آپ پر توجہ نہیں دیتے یعنی اپنا وقت آپ کو نہیں دیتے۔ آپ ان کے وقت کی آنکھ سے نکل جاتے ہیں، پھر آپ کلب کی مجرش اخیر کرتے ہیں۔ گاف کھیلنے لگتے ہیں، زور لگاتے ہیں کہ نئے دوست نہیں۔ اس کا آسان سانس نہ یہ ہے کہ ہم متسلط درجے کے لوگوں کا کہ آپ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے لگ جائیں۔

میں نے کہا کہ اس کا کیا تعلق؟ یعنی ریٹائرڈ منٹ کا اور مسجد کا آپس میں کیا تعلق؟ میں نے کہا کہ خیر نماز پڑھ لون گا۔ کہنے لگے، نہیں مسجد میں جا کر جب میں ریٹائرڈ ہوا تو میں نے سوچا کہ انہوں نے کہا ہے اور یہ بات مانی جانی چاہیے کہ میں مسجد میں جا کر نماز پڑھوں۔ اب میں مسجد میں جا کر نماز پڑھنے کا، لیکن عصر اور مغرب کی۔ اس طرح کوئی دو مینیٹ گزر گئے۔ مجھے تو اس میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آئی۔ لیکن چونکہ انہوں نے کہا تھا اس لیے میں ان کی بات مانتا تھا۔ ایک دن میری بیوی یہ بیان کرتی ہے کہ کچھ عجیب و غریب جسم کے چار پانچ آدمی، جن کی شکلیں میں نے پہلے نہیں دیکھیں، ہاتھ میں چھڑیاں لے کر اور دوسرے ہاتھ میں تسبیحات لٹکائے ہوئے میرے گھر کے دروازے پر آئے اور انہوں نے گھنٹی بجائی اور جب میں باہر نکلی تو کہنے لگے: ”اشفاق صاحب خیریت سے ہیں!“ میں (بانو قدیسہ) نے کہا، ہاں ٹھیک ہیں۔ وہ کہنے لگے ان سے ملاقات نہیں ہو سکتی کیا؟ میں نے کہا کہ وہ پچھلے چھ دن سے اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔ کہنے لگے ”الحمد للہ، الحمد للہ! ہماری تسلی ہو گئی، اچھا ہم ان السلام علیکم!“ میری بیوی پوچھنے لگی وہ کون لوگ تھے؟ میں نے کہا، وہ میرے دوست تھے جو مسجد جانے کی وجہ سے میرے حلقہ احباب میں شامل ہوئے ہیں۔ میرے پاس تو اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں کلب کا مجرہ ہو کرنی دستیاں استوار کر سکوں۔ وہ مجھے وقت عطا کرتے ہیں اور اس وقت کی تلاش میں کہ میں اس میں شامل نہیں ہوں، پوچھنے آئے تھے کہ میں کہاں ہوں؟ انسان دوسرے انسان کو جو سب سے بڑا تھا عطا کر سکتا ہے وہ وقت ہے۔ اس سے قیمتی تحریک انسان انسان کو نہیں دے سکتا۔ آپ کسی کو کتنا بھی قیمتی تحریک

دے دیں اس کا تعلق گھوم پھر کروقت کے ساتھ چلا جائے گا۔ مثلاً آپ مجھے یا میں آپ کو نہایت خوبصورت قیمتی پانچ ہزار کا ”اوڈی گلوون“ دوں یا آپ مجھے قالین کا ایک خوبصورت گلکار دیں یا میرے آرشٹ بچے مجھے ایک بہت قیمتی پینٹنگ بطور تخفہ دیں یا موسنے کا انکن ایک خاتون کو دیا جائے یا میرے کا ایک طوطاً یا کوئی اور قیمتی چیز، تو آپ دیکھیں گے کہ یہ سارے تھے جو بظاہر اور حقیقت میں قیمتی ہیں، ان کے پیچھے وقت ہی کا فرمائے۔

پہلے میں نے وقت لیا، پھر میں نے کمالی کی۔ میں نے دس دیہاڑیاں لگائیں، جو مجھے ایک ہزار فی دیہاڑی ملتے تھے، پھر دس ہزار روپے کا میں نے قالین خریدا اور تھنے کے طور پر آپ کی خدمت میں پیش کیا۔ ٹائم پہلے لینا پڑتا ہے، پھر اس کو بیچنا پڑتا ہے، پھر اس کو تھنے میں Convert کرنا پڑتا ہے، پھر وہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ انسان کے پاس تھنہ دینے اور لینے کے لیے سب سے قیمتی چیز بس وقت ہی ہے۔ اکثر یہ ہو جاتا ہے جیسے آج نہستے یہ ہو گا اور میں مجبور ہوں ایسا کرنے پر کہ میں اپنا وقت اس شخص کو دینے کے بجائے جو میری آس میں اور میری امید میں ہبھتال کے ایک وارڈ میں موجود ہے، میں اسے پھولوں کا ایک گلدستہ بھیجوں گا، لیکن وہ شخص اس گلدستے کی آس میں نہیں ہو گا، بلکہ وہ میرے وجود میرے لس اور میرے لج کے لیے بے چین ہو گا کہ میں اس کے پاس آؤں اور اس کے ساتھ کچھ باتیں کروں۔ ڈاکٹر اس کی بہت غمہداشت کر رہے ہیں۔ نرمیں اس پر پوری توجہ دے رہی ہیں اور اس کے گھر کے لوگ بھی ظاہر ہے اس کے ساتھ بہت اچھا بتاؤ کر رہے ہیں، کیونکہ وہ بیمار ہے۔ لیکن ایک خاص کری پر اسے میرا تقاضا ہے، لیکن میں اس کے پاس اپنے وقت کا تھنے کے کرہیں جا سکتا۔

خواتین و حضرات! وقت ایک الیک انوشنٹ ہے، ایک الیک سرمایہ کاری ہے جو باہمی اشتراک رکھتی ہے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ جب میں آپ کو اپنا وقت دیتا ہوں تو سننے والا اور آپ سے ملاقات کرنے والا اور آپ کے قریب رہنے والا آپ کو اپنا وقت دیتا ہے اور باہمی الفاظ اور محبت کا یہ رشتہ اس طرح سے چلتا رہتا ہے۔ میرے بھتیجے فاروق کی بیوی کشور جب ساہیوال سے اپنے میکے اسلام آباد گئی تو کشور نے جاتے ہوئے (اس کا خاوند فاروق انکم تیکس افسر ہے اور اس نے ہی ایسیں کیا ہوا ہے، کشور بھی بڑی پڑھی لکھی ذہن لڑکی ہے) ایک کاغذ پر لکھا، یہ تمہارے لیے ایک Instruction Paper ہے کہ دھوپی کو تین سورپے دے دینا، دودھ والا ہر روز ایک گلودودھ لاتا ہے اس کو کم کر کے پوتا سیر کر دینا اور بلی کے لیے جو قیمه ہے یہ میں نے ڈیپ فریزر میں رکھ کر اس کی ”پڑیاں“ بنادی ہیں اور ان کے اوپر Date بھی لکھی ہوئی ہے روز ایک پڑیاں نکال کر اس کو صبح کے وقت دیتی ہے (اس کی سیاہی بلی ہے وہ قیمتی ہی کھاتی ہے)۔ اس نے اور دو تین Instructions لکھی تھیں

کہ مالی جب آئے تو اسے کہنا ہے کہ فلاں پودے کو کاٹ دے، فلاں کو ”وینگا“ (نیزِ حا) کر دے اور فلاں کی جان مار دے جو جو بھی اس نے لکھتا تھا، ایک کاغذ پر لکھ دیا۔ اس نے اپنے خادم سے کہا کہ ساری چیزیں ایمانداری کے ساتھ بیک کرتے رہنا کہ یہ کام ہو گیا ہے۔ جب وہ ایک مہینے کے بعد لوٹ کر آئی اور اس نے وہ کاغذ دیکھا تو اس کے Dutiful Process خادم نے ساری چیزوں کو بیک کیا ہوا تھا۔ اس نے آخر میں کاغذ پر یہ بھی لکھا تھا کہ ”مجھ سے محبت کرنا نہیں بھولنا“، جب اس نے ساری چیزیں بیک ہوئی ویکھیں اور آخری بیک نہیں ہوئی تو اس نے روشن، پہلنا شروع کر دیا کہ مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے باقی کام تو نہایت ذمہ داری سے کیئے ہیں یہ بیک کیوں نہیں کی؟ تب اس (فاروق) نے کہا کہ پیاری بیوی جان یہ تو میں بیک کرنے سکتا تھا، کیونکہ یہ تو Continues Process ہے۔ محبت کا عمل تو جاری رہتا ہے۔ یہ کہیں رکتا نہیں ہے۔ محبت گواہ کا دو دھنیں ہے یا اخبار والے کابل نہیں ہے اس کو میں کیسے بیک کر سکتا تھا؟ یہ تو چلتی رہے گی۔ یہ کاغذ ایسا ہی رہے گا۔ تم سوبار مجھے لکھ کر دے جاؤ، ہزار بار میں ہر آئٹم کو بیک کروں گا، لیکن یہ معاملہ تو ایسے ہی چلتا ہے گا۔ تو یہ ایک انوشنٹ ہے وقت کی۔ پلیز! خدا کے واسطے اس بات کو یاد رکھئے۔ بظاہر یہ بات بڑی سیدھی سی اور خنک سی نظر آتی ہے، لیکن آپ کو اپنا وقت دینا ہوگا، چاہے چھوڑا ہی بے حد تھوڑا ہو اور چاہے زندگی بڑی مصروف ہو گئی ہو۔

واقعی زندگی مصروف ہو گئی ہے، واقعی اس کے قاضے بڑے ہو گئے ہیں، لیکن جب انسان انسان کے ساتھ رشتے میں داخل ہوتا ہے تو سب سے بڑا تھا اس کا وقت ہی ہوتا ہے۔ وقت کے بارے میں ایک بات اور یاد رکھئے کہ جب آپ اپنا وقت کسی کو دیتے ہیں تو اس وقت ایک عجیب اعلان کرتے ہیں اور بہت اوپھی آواز میں اعلان کرتے ہیں جو پوری کائنات میں سن جاتا ہے۔ آپ اس وقت یہ کہتے ہیں کہ ”اس وقت میں اپنا وقت اس اپنے دوست کو دے رہی ہوں یاد رہا۔ اے پیاری دنیا! اے کائنات!! اس بات کو غور سے سنو کہ اب میں تم ساری کائنات پر توجہ نہیں دے سکتا یادے سکتی، کیونکہ اس وقت میری ساری توجہ یہاں مرکوز ہے۔“ آپ اعلان کریں نہ کریں، کہیں یا نہ کہیں جس وقت آپ ہم آہنگ ہوتے ہیں اور ایمانداری کے ساتھ وقت کسی کو دے رہے ہوتے ہیں تو پھر یہ اعلان بار بار آپ کے وجود سے آپ کی زبان سے آپ کے مسام سے آپ کی حرکت سے نکلا چلا جائے گا۔ توجہ ہی سب سے بڑا راز ہے۔

ایک دن ہمارا ذرا سیور نہیں تھا۔ میری بھودرس میں جاتی ہے تو میں نے اس سے کہا کہ تم پریشان کیوں ہوتی ہو؟ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ دن کے وقت میں گاڑی چلا لیتا ہوں۔ میں نے کہا۔ اس پر اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ ما موس آپ مجھے چھوڑ آئیں بڑی مہربانی۔ جب میں اس جگہ لے

گیا، جس مقام پر بیٹھ کر خواتین درس دیتی ہیں، تو ظاہر ہے میں تو آگے نہیں جا سکتا تھا، میں نے اسے اتنا را۔ اسی اشنا میں میں نے درس دینے والی خاتون کا ایک عجیب اعلان سن۔ جو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مردوں کی قسمت میں تو نہیں۔ میں نے مردوں کے بڑے بڑے جلسے دیکھے ہیں۔ ان میں میں نے اتنی خوبصورت بات نہیں سنی۔ وہ بی بی اندر کہہ رہی تھیں کہ ”اے پیاری بچیو اور بہنو! اگر تم اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہوئیا اپنے خاوند سے مخاطب ہوئیا اپنی ماں کی بات سن رہی ہو اور شیلیفون کی گھنٹی بیجے تو شیلیفون پر توجہ نہ دو، کیونکہ وہ زیادہ اہم ہے، جس کو آپ اپنا وقت دے رہی ہو۔ چاہے لکھتی ہی دیر وہ گھنٹی کیوں نہ بھتی رہے، کوئی آئے گا سن لے گا۔“ یہ بات میرے لیے نی تھی اور میں نے اپنے حلقہ احباب میں لوگوں یاد و ستون سے کبھی ایسی بات نہیں سی تھی۔

میں اس خاتون کی وہ بات سن کر بہت خوش ہوا اور اب تک خوش ہوں اور اگر یہ بات ان بیویوں نے کبھی ہے تو یہ بے حد تھی بات ہے اور غالباً انہوں نے اس سے قسمی بات اس روز کے درس میں اور نہیں دی ہوگی۔ اب آپ بڑے ہو گئے ہیں، آپ کو وقت کی پیچیدگی بارے سوچنا پڑے گا۔ ایک آپ کو چھپے چھپائے مسائل ملتے ہیں اور ایک وہ ہیں، جن کو آپ جیسے ذہین بنجے اپنے کالج کے برآمدوں میں ستونوں کے ساتھ نیک لگا کر سوچتے ہیں۔ آپ ان مسائل کو سوچیں، جو آپ کی زندگیوں کے ساتھ ہٹ کرتے ہیں۔ گزرتے، لمس کرتے اور میں پنجابی میں کہتے ہیں ”کھیہ“ کے جاتے ہیں، پھر آپ کی سوچ شروع ہو گی، ورنہ پے ہوئے سوال جو چلے آ رہے ہیں، انگریز کے وقت سے انہی کو آپ Repeat کرتے رہیں گے تو پھر آپ آئے والے زمانے کو وہ کچھ عطا نہیں کر سکیں گے، جو آپ کو عطا کرنا ہے۔ اس وقت کا تعلق حال سے ہے۔ جب آپ کسی کو وقت دیتے ہیں یا کوئی آپ کو وقت دیتا ہے اپنا الحمکھ عطا کرتا ہے تو آپ حال میں ہوتے ہیں، اس کا تعلق ماضی یا مستقبل سے نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی کبھی (یہ بات میں تفریخ کے طور پر کرتا ہوں) تاکہ اپنے استاد کو بہت داد دے سکوں اور ان کا مان بڑھانے کے لیے اور ان کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہونے کے لیے کہتا ہوں) جس زمانے میں ہمارے استاد پھرس بخاری ہمیں گورنمنٹ کالج چھوڑ کر ”یو این او“ میں چلے گئے تھے اور وہ نیو یارک ہی رہتے تھے، جس علاقے یا فلیٹ میں وہ تھے، وہاں پر استاد مکرم بتاتے ہیں کہ رات کے دو بجے مجھے فون آیا اور بڑے غصے کی آواز میں ایک خاتون بول رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ آپ کا کتاب مسئلہ آدھے گھنٹے سے بھونک رہا ہے، اس نے ہماری زندگی عذاب میں ڈال دی ہے۔ میرے بچے اور میرا شوہر بے چین ہو کر چار پائی پر بیٹھ گئے ہیں اور اس کی آواز بند نہیں ہوتی۔ اس پر بخاری صاحب نے کہا کہ میں بہت شرمند ہوں اور آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ میرا اکتا اس طرح سے Beheave کر رہا ہے۔ لیکن میں کیا کروں؟ میں مجبور ہوں۔ اس پر اس خاتون نے غصے میں آ کر فون بند کر دیا۔ اگلے ہی روز بخاری

صاحب نے رات ہی کے دو بجے میلیفون کر کے اس خاتون کو جگایا اور کہا کہ محترمہ! میرے پاس کوئی کتاب نہیں ہے، مجھے کتوں سے شدید نفرت ہے۔ کل رات جو کتنا بھون کا تھا، وہ میر انہیں تھا۔ اب دیکھئے کہ انہوں نے کس خوبصورتی سے حال کو مستقبل سے جوڑا یا میں یہ کہوں گا کہ ماضی کو مستقبل کے ساتھ جوڑا۔ یہ بخاری صاحب کا ہی خاصاً تھا۔

میں اب آپ سے بڑی عجیب و غریب بات عرض کرنے لگا ہوں۔ مجھے اپنا وہ زمانہ یاد آ گیا، جلدی میں وہ بات بھی بتا دوں۔ جب میں اٹلی میں رہتا تھا۔ روم میں ایک فوارہ ہے، جس میں لوگ پیسے پھینکتے ہیں۔ اس طرح سے وہ منت مانگتے ہیں کہ میں پھر بھی یہاں آؤں۔ میں یونیورسٹی سے گھر آ رہا تھا۔ میں وہاں راستے میں کھڑا ہو گیا۔ وہاں بہت سارے امریکن ٹورسٹ آئے تھے۔ ایک بدھا امریکی بھی اس میں پیسے پھینک رہا تھا۔ اس کی بیوی بنس کر اس سے کہنے لگی کہ ”جارج ایم انہیں خیال تھا کہ تم اس طرح کے دیوالیوں اور اتنے پرانی باقتوں کو مانتے والے ہو گے۔ اور کیا تم تسلیم کرتے ہو کہ اس طرح سے باقیں پوری ہوتی ہیں؟“ اس نے کہا کہ دیکھئے یہ جو میری بات یا منت تھی، یہ تو کب کی پوری ہو چکی ہے۔ اب تو میں اس کی قطیں ادا کر رہا ہوں۔“ یہ ساری محبت اور Attachment کی باتیں ہیں؛ جن کا ہمارے ہاں رواج کم ہی ہے۔

جس طرح سے میں وقت کی بات آپ کی خدمت میں عرض کر رہا تھا اور اسے تھنے کے طور پر ادا کرنے کے لیے آپ کو رائے دے رہا تھا، اسی طرح وقت ہی سب سے بڑا شمن بھی ہے، کیونکہ جب آپ کسی کو قتل کر دیتے ہیں تو اس سے کچھ نہیں لیتے، سوائے اس کے وقت کے۔ اس نے ابھی سو سال دیکھا تھا، ابھی ڈھا کہ جانا تھا۔ لیکن آپ نے اس سے اس کا وقت چھین لیا۔ جب آپ کسی انسان پر بہت ظلم کرتے ہیں، بڑی شدت کا تو آپ اس سے اس کا وقت چھین لیتے ہیں۔ ابھی اس نے نیو یارک دیکھا تھا، ابھی اس نے کئی پینٹنگز بنانی تھیں، ابھی اس نے گانے گانے تھا، ابھی اس نے ناچنا تھا اور وہ سب آپ نے چھین لیا۔

وقت کا بھید پکڑا نہیں جا سکتا۔ اس کی چیزیں کو آسانی سے سمجھایا نہیں جا سکتا، لیکن یہ بات یاد رکھئے یہ آپ کے میرے اور ہم سب کے اختیار میں ہے کہ ہم وقت دیتے ہیں تو ہمارا مدقابل زندہ ہے۔ اگر اس سے وقت لے لیتے ہیں تو روح اور قلب ہونے کے باوصاف وہ مر جاتا ہے۔ میں تو کسی کو وقت نہیں دے سکا اور نہ ہی آج شام ایسا کر سکوں گا۔ اپنے دوست کو پھولوں کا گلدستہ ہی بھیج دوں گا، جو میری بد قسمی اور کوتا ہی ہے۔ آپ دوسروں کو وقت دینے کی کوشش ضرور کریں گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ نگہبان!!

”چھوٹا کام“

رزق کا بندوبست کسی نہ کسی طور پر اللہ تعالیٰ کرتا ہے، لیکن میری پسند کے رزق کا بندوبست نہیں کرتا۔ میں چاہتا ہوں کہ میری پسند کے رزق کا انتظام ہونا چاہیے۔ ہم اللہ کے لاذے تو ہیں، لیکن استے بھی نہیں جتنے ہم خود کو سمجھتے ہیں۔

ہمارے بابا جی کہا کرتے تھے کہ اگر کوئی آدمی آپ سے سرد یوں میں رضائی مانگے تو اس کے لیے رضائی کا بندوبست ضرور کریں، کیونکہ اسے ضرورت ہو گی۔ لیکن اگر وہ یہ شرط عائد کرے کہ مجھے فلاں قسم کی رضائی دو تو پھر اس کو باہر نکال دو، کیونکہ اس طرح اس کی ضرورت مختلف طرح کی ہو جائے گی۔

وقت کا دباؤ بڑا شدید ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ برداشت کے ساتھ حالات ضرور بدل جائیں گے، بس ذرا سا اندر ہی اندر مسکرانے کی ضرورت ہے۔ یہ ایک راز ہے جو سکولوں، یونیورسٹیوں اور دیگر اداروں میں نہیں سکھایا جاتا۔ ایسی باتیں تو بس بابوں کے ذریعوں سے ملتی ہیں۔ مجھ سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کہ اشفاعی صاحب کوئی بابا بتائیں۔ میں نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ کیا کریں گے؟ کہنے لگے ان سے کوئی کام لیں گے۔ نمبر پوچھیں گے انعامی بانڈ زکا۔ میں نے کہا انعامی بانڈ زکا نمبر میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ بتاؤ کس کا چاہیے؟ کہنے لگے چالیس ہزار کے بانڈ کا۔ میں نے کہا کہ 931416، کیونکہ تم کبھی کہیں سے اسے خرید نہیں سکو گے۔ کہاں سے اسے تلاش کرو گے؟ آپ کو انعامی بانڈ کا نمبر آپ کی رضی کا تو نہیں ملے گا نا!

آپ بابوں کو بھی بس ایسے ہی سمجھتے ہیں جیسے میری بہو کو آج کل ایک خانسماں کی ضرورت ہے۔ وہ اپنی ہر ایک سیکل سے پوچھتی ہے کہ اچھا سامان کا تمہیں پتا ہو تو مجھے بتاؤ۔ اسی طرح سے میرے سارے چاہئے والے مجھ سے کسی اچھے سے بابے کی بابت پوچھتے ہیں کہ جیسے وہ کوئی خانسماں ہو۔ ان بابوں کے پاس کچھ اور طرح کی دولت اور سامان ہوتا ہے، جو میں نے بتھس ہو کر دیکھا، حالانکہ

میں تو ولایت میں تھا اور پروفیسری کرتا تھا۔ میں نے یہاں آ کر دیکھا کہ یہ بھی تو ایک علم ہے۔ یا اللہ! یہ کیسا علم ہے، اسے کس طرح سے آگے چلایا جاتا ہے کہ یہ مشکل بہت ہے۔ مثال کے طور پر ان کا (بابوں) حکم ہوتا ہے کہ چھوٹے چھوٹے کام کرو، بڑے کام نہ کرو۔ چھوٹے کاموں کو مت بھولیں، ان کو ساتھ لے کر چلیں۔ چھوٹے کاموں کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، لیکن ہم ان باتوں کو مانتے ہی نہیں کہ بھی کیسے ہو سکتا ہے کہ چھوٹا کام بھی اہمیت کا حامل ہو۔

جب ہم بابا جی کے پاس ڈیرے پر گئے تو انہوں نے ہمیں مژہ چھیلنے پر لگا دیا۔ میں نے تحری پیش کر دیں کہ ناٹی لگا رکھی تھی، لیکن مژہ چھیل رہا تھا، حالانکہ میں نے ساری زندگی کبھی مژہ نہیں چھیلے تھے۔ پھر انہوں نے ہم کو چھیلنے پر لگا دیا اور پا تھوں سے بوآ نا شروع ہو گئی۔ پھر حکم ہوا کہ میتھی کے پتے اور ”ڈھنڈل“ الگ الگ کرو۔ اس مشقت سے اب تو خواتین بھی گھبراتی ہیں۔ ہماری ایک بیٹی ہے زو نیڑا اس کو کوئی چھوٹا سا کام کہہ دیں کہ بھی یہ خط پہنچا دیتا تو کہتی ہے، بابا! یہ معمولی سا کام ہے۔ مجھے کوئی بڑا سا کام دیں۔ اتنا بڑا کہ میں آپ کو وہ کر کے دکھاؤں (کوئی شش میں جانے جیسا کام شاید)۔ میں نے کہا یہ خط تو پہنچا دیتی؟ کہنے لگی، یہ تو بابا بس پڑا ہی رہ گیا میرے پاس۔ چھوٹے چھوٹے کاموں سے بابوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس سے ہماری زندگی میں ڈپلن آئے۔

ہمارے دین میں سب سے اہم چیز ڈپلن ہے۔ میں تین چار برس پہلے کینیدا گیا تھا، وہاں ایک یورپی انڈر یونیورسٹی ریڈی یو اناڈا نسرا ہے۔ اب وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اس کی آواز بڑی خوبصورت آواز ہے۔ میں اس وجہ سے کہ وہ اچھا اناڈا نسرا ہے اور اب مسلمان ہو گیا ہے، اس سے ملنے گیا۔ وہ اپنے مسلمان ہونے کی وجوہات کے بارے میں بتاتا رہا۔ اس نے مسلمان ہونے کی وجہ تسلیم بتاتے ہوئے کہا کہ وہ سورہ روم پڑھ کر مسلمان ہوا ہے۔ میں پھر بھی آپ کو بتاؤں گا کہ اس کو سورہ روم میں کیا نظر آیا۔ میں نے کہا کہ اب ہمارے حالات تو بڑے کمزور ہیں۔ اس نے کہا نہیں۔ ہم تو ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ خاص طور پر جس طرح سے ہم کو گھیرا جا رہا ہے۔ اس نے کہا تھیک ہے گھیرا جا رہا ہے، لیکن اس صورت حال میں سے نکلنے کا بھی ایک انداز ہے۔ ہم نکلیں گے۔ میں نے کہا کہ ہم کیسے نکلیں گے؟ اس نے کہا کہ جب کوئی پانچ چھسات سوار میکی مسلمان ہو جائیں گے اور اسی طرح سے چھسات سو کینڈیں مسلمان ہو جائیں اور سازھے آٹھ نو سو کینڈے نیوین مسلمان ہو جائیں گے تو پھر ہمارا قافلہ چل پڑے گا، کیونکہ We are Disciplined۔ اسلام ڈپلن سکھاتا ہے، فتحہ بازی کو نہیں مانتا۔ میں بڑا مایوس، شرمende اور تھک سا گیا۔ اس کی یہ بات سن کر اور سوچا کہ دیکھو! ہر حال میں ان کی ”چڑھ“ جو جاتی ہے۔ یہ جو گورے ہیں یہ یہاں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

اسلام! جو ہم کو بہت پیارا ہے۔ ہم غرے مار مار کر زگانے کا گا کر یہاں تک پہنچے ہیں اور یہ ہمیں مل نہیں رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ اس میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہوگا؟ تو اس نے کہا کہ نہیں! آپ سے معافی چاہتا ہوں کہ آپ کا اس میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یا! ہمارا بھی جی چاہے گا کہ ہمارا بھی اس میں کوئی حصہ ضرور ہو۔ کہنے لگا، ایسا کریں گے کہ جب ہمارا قافلہ چلے گا تو تم بھی بسترے اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتے آنا اور کہا Sir we are also Muslims۔ لیکن آپ میں وہ ڈپلن والی بات ہے نہیں۔ اور دنیا جب بھی آگے بڑھی ہے تو وہ نظم سے اور ڈپلن سے ہی آگے بڑھی ہے۔ جب اس نے یہ بتایا کہ دیکھنے ہمارے دین میں اوقات مقرر ہیں۔ وقت سے پہلے اور بعد غماز نہیں ہو سکتی۔ اس کی رکعتاں مقرر ہیں۔ آپ مغرب کی تین ہی پڑھیں گے۔ آپ چاہیں کہ میں مغرب کی چار رکعتیں پڑھ لوں کہ اس میں اللہ کا بھی فائدہ، میرا بھی فائدہ، لیکن اس سے بات نہیں بنے گی۔ آپ کو فرمیم ورک کے اندر ہی رہنا پڑے گا۔ پھر آپ حج کرتے ہیں۔ اس میں کچھ عبادت نہیں کرنی، طشدہ بات ہے کہ آج آپ عرفات میں ہیں، کل مزادِ فدی میں ہیں۔ پرسوں مٹی میں ہیں اور بس حج ختم اور کچھ نہیں کرنا، جگہ بدلتی ہے کہ فلاں وقت سے پہلے وہاں پہنچ جانا ہے اور جو یہ کر گیا، اس کا حج ہو گیا۔ کچھ لہبڑا چوڑا کام نہیں۔ دین میں ہر معاملے میں ڈپلن سکھایا گیا ہے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ ڈپلن چھوٹے کاموں سے شروع ہوتا ہے۔ جب آپ معمولی کام کو اہمیت نہیں دیتے اور ایک لمبا سامنہ ویہ بنا کر بیٹھ جاتے ہیں، اپنا ذاتی اور افرادی تو پھر آپ سے الگا کام چلتا نہیں۔ کافی عرصہ پہلے میں جیں گیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب جیں نیا نیا آزاد ہوا تھا۔ ہم سے وہ ایک سال بعد آزاد ہوا۔ ان سے ہماری تھیں بڑھ رہی تھیں اور ہم ان سے ملنے چلے گئے۔ افریقہ اور پاکستان کے کچھ رائٹر جنی حکام سے ملے۔

ایک گاؤں میں بہت دور پہاڑوں کی اوٹ میں کچھ عورتیں بھٹی میں دانے بھون رہی تھیں۔ دھوائیں نکل رہا تھا۔ میرے ساتھ شوکت صدیق تھے۔ کہنے لگے، یہ عورتیں ہماری طرح سے ہی دانے بھون رہی ہیں۔ جب ہم ان کے پاس پہنچ تو دو عورتیں دھڑکن پھوس، لکڑی جو کچھ ملتا تھا، بھٹی میں جھوک رہی تھیں اور اپنے رومال باندھ کر اسے میں کوئی لیکوڈ (مانع) ساتیار کر رہی تھیں۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ آپ یہ کیا کر رہی ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ ہم سٹیل بنارہی ہیں۔ میں نے کہا کہ سٹیل کی تو بہت بڑی فیکٹری ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہم غریب لوگ ہیں اور جیں ابھی آزاد ہوا ہے۔ ہمارے پاس کوئی سٹیل مل نہیں ہے۔ ہم نے اپنے طریقے کا سٹیل بنانے کا ایک طریقہ اختیار کیا ہے کہ کس طرح سے سندور ڈال کر لو ہے کو گرم کرنا ہے۔ یہ عورتیں صحیح اپنے کام پر لگ جاتیں اور شام تک محنت اور جان ماری کے ساتھ سٹیل کا ایک ”ڈلا“، یعنی پانچ چھ سات آٹھ سیر سٹیل تیار کر لیتیں۔ مڑک والا آتا اور ان

سے آکر لے جاتا۔

انہوں نے بتایا کہ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے ہم اس سلسل کے بدالے لے لیتے ہیں۔ میں اب بھی کبھی جب اس بات کو سوچتا ہوں کہ سبحان اللہ ان کی کیا بہت تھی۔ ان کو کس نے ایسے بتا دیا کہ یہ کام ہم کریں گی تو ملک کی کمی پوری ہو گی۔ چھوٹا کام بہت بڑا کام ہوتا ہے۔ اس کو چھوڑنیں جا سکتا، جو کوئی اسے انفرادی یا اجتماعی طور پر چھوڑ دیتا ہے، مشکل میں پڑ جاتا ہے۔

اثلیٰ میں ایک مسٹر کا ڈاؤن ایک بڑا سخت قسم کا یہودی تھا۔ اس کی کوئی تیرہ چودہ منزل عمارت تھی۔

صحیح جب میں یونیورسٹی جاتا تو وہ واپسے کرات کی بارش کا پانی نکال رہا ہوتا اور فرش پر ”ٹائکی“ لگا رہا ہوتا تھا یا سڑک کے کنارے جو پڑی ہوتی ہے اسے صاف کر رہا ہوتا۔ میں اس سے پوچھتا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اتنے بڑے آدمی ہو کر۔ اس نے کہا یہ میرا کام ہے، کام بڑا یا چھوٹا نہیں ہوتا، جب میں نے یہ ذیوں لے لی ہے اور میں اس ڈپلمن میں داخل ہو گیا ہوں تو میں یہ کام کروں گا۔ میں نے کہا کہ آپ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ اس نے کہا کہ یہ انبیاء کی صفت ہے، جو انبیاء کے دائرے میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ چھوٹے کام ضرور کرے۔ ہم کو یہ نوکری ملی ہے۔ حضرت موعی علیہ السلام نے نکریاں چرانی تھیں اور ہم یہود یوں میں یہ نکریاں چرانا اور اس سے متعلقہ نچلے لیوں کا کام موجود ہے تو ہم خود کو حضرت موعی علیہ السلام کا پیرو دکار تھیں گے۔ اس نے کہا کہ آپ کے بنی اپنا جو تک خود کا نہتھ تھے۔ تمیض کو پیدا نہیں کیا تھا کہ خود رکھتا تھے۔ کپڑے دھولیتے تھے۔ راستے سے ”جہاڑ جہنکار“ صاف کر دیتے تھے، تم کرتے ہو؟ میں کہنے لگا مجھے تو ناٹکا لگا ناٹکا نہیں آتا، مجھے سکھایا نہیں گیا۔ وہ آدمی بات بڑی تول کے کرتا تھا۔ مجھے کہتا تھا دیکھوا شفاق تم استاد تو بن گئے ہو، لیکن بہت سی چیزیں تمھیں نہیں آتیں۔ جب بھی کرو چھوٹا کام شروع کرو۔ اب تم پیچھا رہو کل پر و فیسر بن جاؤ گے۔ تم جب بھی کلاس میں جانا یا جب بھی لوگوں کو خطاب کرنے لگنا اور کبھی بہت بڑا جمع تمہارے سامنے ہو تو کبھی اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں کو مخاطب نہ کرنا۔ ہمیشہ اپنی آواز کو دور پیچھے کی طرف پھینکنا۔ وہ لوگ جو بڑے شر میلے ہوتے تھے شرمندہ سے جھکل جھکلے سے ہوتے ہیں اور ہمیشہ پچھلی قطاروں میں بیٹھتے ہیں۔ آپ کا صفت یہ ہونا چاہیے کہ آپ اپنی بات ان کے لیے کہیں۔ جب بات چھوٹوں تک پہنچے گی تو بڑوں تک خود بخوبی جائے گی۔ میں اس کی باتوں کو کبھی بھلا نہیں سکتا۔ جب میں اپنے بابا جی کے پاس آیا تو میں نے کلاؤ کی یہ بات نہیں بتائی، انہوں نے کہا کہ دیکھ کچھ ہماری ڈیوٹیاں ہوتی ہیں، مثلاً یہ کہ مجھے یہ سکھایا گیا کہ سوئی میں دھاگہ ڈالنا سکھو۔ بزریاں چھیلنے کی تو میری پریکش ہو چکی تھی۔ اب بابا جی نے فرمایا کہ سوئی میں دھاگہ ڈالنا سکھو۔ اب یہ بڑا مشکل کام ہے۔ میں کبھی ایک آنکھ بند کرتا اور کبھی دوسرا آنکھ کافی کرتا، لیکن اس میں دھاگہ نہیں ڈالتا تھا۔

خبر! میں نے ان سے کہا کہ اچھا جی دھاگہ کہ ڈال لیا، اس کا فائدہ؟ کہنے لگے اس کا یہ فائدہ ہے کہ اب تم کسی کا پھٹا ہوا کپڑا، کسی کی پھٹی ہوئی پکڑی سی سکتے ہو۔ جب تک تمہیں لباس یعنی کافی نہیں آئے گا، تم انہوں کو کیسے سمجھو گے۔ تم تو ایسے ہی رہو گے، جیسے لوگ تقریریں کرتے ہیں۔ بندہ تو بندے کے ساتھ جڑے گا ہی نہیں۔ یہ سوئی دھاگے کافی آنا چاہیے۔ ہماری ماں میں مکہم پیباں جو لوگوں کو جوڑ کے رکھتی تھیں، وہ یہ چھوٹے چھوٹے کاموں سے کرتی تھیں۔

آپ ایک لمحہ کے لیے یہ بات سوچیں کہ اس ملک کی آبادی 14 کروڑ ہے اور ان 14 کروڑ بندوں کو کس طرح سے کھانا مل رہا ہے۔ کیا کوئی فیکٹری انہیں کھانا فراہم کرتی ہے یا کوئی ٹرک آتا ہے؟ آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں گے اور خندماں بسا، میگن گرم کر کے یاماں سے کہیں کہ دال ڈال دین، مکس کر دیں گھی ڈال دیں، اس طرح ہمیں کھانا مل رہا ہے اور ان چھوٹے کاموں سے کتنی بڑی آبادی پل رہی ہے۔ آپ اس بارے ضرور سوچیے کہ اگر کام فیکٹریوں اور بڑی بڑی چیزوں سے ہی ہوتے تو پھر تو سب بھوکے رہ جاتے۔ یہ تو خواتین کا ہی خاصا ہے کہ وہ سب کو کھانا بنا کر دیتی ہیں۔

آپ ان چند بڑے بڑے اشتہاروں کی طرف نہ دیکھیں، جن میں لڑکیاں برگر کھارہ ہوتی ہیں۔ ان کے ہونٹ آدھے لپ اشک سے لال ہوتے ہیں، آدمی کچپ سے لال۔ بڑا خوبصورت اشتہار ہوتا ہے، جیسے شیرنی ہرن کا ”پٹھا“ کھارہ ہو۔ گھر کے لوگوں کو نام اللہ پڑھ کر کھانا دینے کا سارا درجہ خواتین کو ہی حاصل ہے۔ جب گھروں میں یہ خواتین کھانا پکانے کے لیے نہ ہوں تو مردوں تو بھوکے رہ جائیں۔ ان مردوں کو تو نہ کھانا پکانا آتا ہے نہ گھر چلانا۔

یہ ضرور یاد رکھئے کہ انہیاء کی غلامی میں یا ان کی فوکری میں شامل ہونے کے لیے چھوٹے کام کو ضرور اختیار کریں۔ اگر آپ ان کی فوکری چاہتے ہیں تو! کیونکہ انہوں نے یہ کام کئے ہیں۔ میرا منجھلا بیٹا جب ایف اے میں تھا، تو کہنے لگا مجھے دو بکریاں لے دیں، پیغمبروں نے بکریاں چراں ہیں میں بھی چڑاؤں گا۔ ہم نے اس کو دو بکریاں لے دیں، لیکن وہ پانچویں چھٹے دن روتا ہوا آگیا اور کہنے لگا یہ تو بڑا مشکل کام ہے۔ میں ایک کوکھیت سے نکالتا ہوں تو دوسرا بھاگ کر ادھر چلی جاتی ہے۔ پھر اس نے دونوں کے گلے میں رسی ڈال دی۔

میں نے بابا جی سے پوچھا کہ انہیاء کو بکریاں چرانے کا کیوں حکم دیا جاتا تھا، تو بابا جی نے فرمایا کہ چونکہ آگے چل کر زندگی میں ان کو نہ مانتے والے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ ان کا کفار سے واسطہ پڑنا تھا، اس لئے ان کو بکریوں کے ذریعے سے سکھایا جاتا تھا، کیونکہ دنیا میں جانوروں میں نہ مانتے والا جانور بکری ہی ہے۔ اپنی مرضی کرتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اب ہمارا کرکٹ کا موسم ہے جو کہ ہمیشہ ہی رہتا ہے، اس پر آپ بھی غور کریں۔ میں تو اتنا اچھا Watcher Watcher نہیں ہوں، لیکن میں محسوس کرتا

ہوں کہ ہر شخص میں اپنے مخفوط ہاتھوں اور مضبوط کندھوں اور پر استقلال جمائے ہوئے قدموں، اپنے سارے وجود اور اپنے سارے Self کی طاقت کے ساتھ ہٹ نہیں لگاتا بلکہ اس کے سر کی ایک چھوٹی جنہیں ہوتی ہے، جو نظر بھی نہیں آتی۔ اس جنہیں کے نہ آنے تک نہ چوکا لگتا ہے نہ چکا لگتا ہے جب وہ بیلنٹس میں آتی ہے، تب شارت لگتی ہے۔ سرکس کی خاتون جب تار پر چلتی ہے وہ بیلنٹس سے یہ سب کچھ کرتی ہے۔ میں انہی جس راستے سے آیا ہوں مجھے آدھ گھنٹہ کھڑا رہتا ہے، کیونکہ ہماری حق تو سبز تھی لیکن دوسرا طرف سے آنے والے ہمیں گزر نہ نہیں دیتے تھے اور راستہ دے کر کہہ رہے تھے کہ کرو جو کرنا ہے، ہم تو اس ڈپلٹ کو نہیں مانتے۔

یہ سوچ خطرناک ہے، بظاہر کچھ باتیں چھوٹی ہوتی ہیں، لیکن وہ نہایت اہم اور بڑی ہوتی ہیں۔ میں نے تھوڑے دن ہوئے ایک نیکی ڈرائیور سے پوچھا (جیسا کہ میری عادت ہے ہر ایک سے پوچھتا رہتا ہوں، کیونکہ ہر ایک کا اپنا اپنا علم ہوتا ہے) کہ آپ کو سب سے زیادہ کرایہ کہاں سے ملتا ہے۔ اس نے کہا سر مجھے یہ تو یاد نہیں کہ کسی نے خوش ہو کر زیادہ کرایہ دیا ہو، البتہ یہ مجھے یاد ہے کہ میری زندگی میں کم سے کم کرایہ مجھے کب ملا اور کتنا ملا۔ میں نے کہا کتنا کہنے لگا آٹھ آنے۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ کہنے لگا جی بارش ہو رہی تھی یا ہو چکی تھی، میں لا ہور میں نسبت روڑ پر کھڑا تھا بارش سے جگہ جگہ پانی کے چھوٹے چھوٹے جو ہڑ سے بنے ہوئے تھے تو ایک بڑی پیاری سی خاتون وہ اس پہلوی سے دوسرا پہلوی پر جانا چاہتی تھی، لیکن پانی کے باعث جانہیں سکتی تھی۔ میری گاڑی درمیان میں کھڑی تھی، اس خاتون نے گاڑی کا ایک دروازہ کھولा اور دوسرا سے نکل کر اپنی مطلوبہ پہلوی پر چل گئیں اور مجھے اٹھنی دے دی۔

ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں، مسکرانا سیکھنا چاہیے اور اپنی زندگی کو اتنا "چیڑا" (خت) نہ بنا لیں کہ ہر وقت دانت ہی بھینچتے رہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ڈپلٹ کے راز کو پالیں گے اور خود کو ڈھیلا چھوڑیں گے اور Relex رکھیں گے۔ اللہ آپ سب کو اور آپ کے عزیز و اقارب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

خوشی کاراز

ماں خدا کی فتحت ہے اور اس کے پیار کا انداز سب سے الگ اور نرالا ہوتا ہے۔ بچپن میں ایک بار باد و باراں کاخت طوفان تھا اور جب اس میں بھلی شدت کے ساتھ کڑکی تو میں خوفزدہ ہو گیا۔ ذر کے مارے تھر تھر کا تپ رہا تھا۔ میری ماں نے میرے اوپر کمل ڈالا اور مجھے گود میں بٹھایا، تو محسوں ہوا گویا میں امان میں آگئیا ہوں۔

میں نے کہا، ماں! اتنی بارش کیوں ہو رہی ہے؟ اس نے کہا، بیٹا! پودے پیاسے ہیں۔ اللہ نے انہیں پانی پلانا ہے اور اسی بندوبست کے تحت بارش ہو رہی ہے۔ میں نے کہا، ہمیک ہے! پانی تو پلانا ہے، لیکن یہ بھلی کیوں بار بار چھکتی ہے؟ یہ اتنا کیوں کڑکتی ہے؟ وہ کہنے لگیں، روشنی کر کے پودوں کو پانی پلاجیا جائے گا۔ اندھیرے میں تو کسی کے منہ میں، تو کسی کی ناک میں پانی چلا جائے گا۔ اس لیے بھلی کی کڑک چمک ضروری ہے۔

میں ماں کے سینے کے ساتھ الگ کر سو گیا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ بھلی کس قدر چھکتی رہی، یا نہیں۔ یہ ایک بالکل چھوٹا سا داعر ہے اور اس کے اندر پوری دنیا پوشیدہ ہے۔ یہ ماں کا فعل تھا جو ایک چھوٹے سے بچے کے لیے جو خوفزدہ ہو گیا ہے۔ اسے خوف سے بچانے کے لیے پودوں کو پانی پلانے کی مثال دیتی ہے۔ یہ اس کی ایک اپروچ تھی۔ گودہ کوئی پڑھی لکھی عورت نہیں تھیں۔ دولت منڈ بہت عالم فاضل کچھ بھی ایسا نہیں تھا، لیکن وہ ایک ماں تھی۔ میں جب تو سال کا ہوا تو میرے دل میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا کہ سرکس میں بھرتی ہو جاؤں اور کھیل پیش کروں، کیونکہ ہمارے قبصے میں ایک بہت بڑا میلا لگتا تھا۔ تمہرہ چودہ پندرہ جنوری کو اور اس میں بڑے بڑے سرکس والے آتے تھے۔ مجھے وہ سرکس دیکھنے کا موقع ملا، جس سے میں بہت متاثر ہوا۔ جب میں نے اپنے گھر میں اپنی یہ خوبیش بیان کی کہ میں سرکس میں اپنے کمالات دکھاؤں گا، تو میری تانی ”چھا“ کر کے بھسی اور کہنے لگیں، ذرا شکل تو دیکھو! یہ سرکس میں کام کرے گا۔ میری ماں نے بھی کہا، دفع کر تو بڑا ہو کر ذپی کشز بنے گا۔ تو نے سرکس

میں بھرتی ہو کر کیا کرنا ہے۔ اس پر میرا دل برا بجھ سا گیا۔ وہی ماں جس نے مجھے اتنی محبت سے اس بادوباراں کے طوفان میں امان اور آسانش عطا کی تھی۔ وہ میری خواہش کی مخالفت کر رہی تھی۔ میرے والد سن رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، کیوں نہیں؟ اگر اس کی صلاحیت ہے تو اسے بالکل سرکس میں ہونا چاہیے۔ تب میں بہت خوش ہوا۔ اب ایک میری ماں کی مہربانی تھی۔ ایک والد کی اپنی طرف کی مہربانی۔ انہوں نے صرف مجھے اجازت ہی نہیں دی بلکہ ایک ڈرم جو ہوتا ہے تارکوں کا، اس کو والی نیلا اور پیلا پینٹ کر کے بھی لے آئے اور کہنے لگے اس پر چڑھ کر آپ ڈرم کو آگے پیچھے روں کیا کریں۔ اس پر آپ کھیل کریں گے تو سرکس کے جانباز کھلاڑی بن سکیں گے۔ میں نے کہا منظور ہے۔

چنانچہ میں اس ڈرم پر پریکٹس کرتا رہا۔ میں نے اس پر اس قدر اور اچھی پریکٹس کی کہ میں اس ڈرم کو اپنی مرضی اور مرضی کے مطابق کہیں بھی لے جاسکتا تھا۔ گول چکر کاٹ سکتا تھا۔ بغیر پیچھے دیکھے ہوئے آگے پیچھے آ جاسکتا تھا۔ پھر میں نے اس ڈرم کے اوپر چڑھ کر ہاتھ میں تین گینڈیں ہوا میں اچھالنے کی پریکٹس کی۔ وہاں میرا ایک دوست تھا۔ ترکھانوں کا لڑکا محمد رمضان۔ اس کو بھی میں نے پریکٹس میں شامل کر لیا۔ وہ اچھے چھریرے بدن کا تھا۔ وہ مجھ سے بھی بہتر کام کرنے لگا۔ بجائے گینڈوں کے وہ تین چھریاں لے کر ہوا میں اچھال سکتا تھا۔ ہم دونوں ڈرم پر چڑھ کر اپنا یہ سرکس لگاتے۔ ایک ہماری بکری تھی، اس کو بھی میں نے ٹرینڈ کیا۔ وہ بکری بھی ڈرم پر آسانی سے چڑھ جاتی۔ ہمارا ایک ”بُشی“، نامی کتا تھا وہ لمبے بالوں والا روئی نسل کا تھا۔ اس کو ہم نے کافی سکھایا، لیکن وہ نہ سکھ سکا۔ وہ یہ کام ٹھیک سے نہیں کر سکتا تھا۔ حالانکہ کتا کافی ذہن ہوتا ہے۔ وہ بھونکتا ہوا ہمارے ڈرم کے ساتھ بھاگتا تھا، مگر اوپر چڑھنے سے ڈرتا تھا۔ ہم نے اعلان کر دیا کہ یہ کتا ہماری سرکس ہی کا ایک حصہ ہے، لیکن یہ جو کر کتا ہے اور یہ کوئی کھیل نہیں کر سکتا۔ صرف جو کر کا کروارا دا کر سکتا ہے۔

خیر! ہم یہ کھیل دکھاتے رہے۔ ہم اپنا شوکر تے تو میرے اباجی، ہمیشہ ایک روپیہ والا لکٹ لے کر کری ڈال کر ہماری سرکس دیکھنے میٹھے جاتے تھے۔ ہمارا ایک ہی تمثاشی ہوتا تھا اور کوئی بھی دیکھنے نہیں آتا تھا۔ صرف اباجی ہی آتے تھے۔ ہم انہیں کہتے کہ آج جمعرات ہے۔ آپ سرکس دیکھنے آئیے گا۔ وہ کہتے، میں آؤں گا۔ وہ ہم سے ایک روپے کا لکٹ بھی لیتے تھے جو ان کی شفقت کا ایک انداز تھا۔ زندگی میں کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے اور آپ اس بات کو مانند نہ کیجیے گا۔ اگر آپ کو وحاظنیت کی طرف جانے کا بہت شوق ہے تو اس بات کو برانہ کجھے گا کہ بعض اوقات مان باپ کے اثرات اس طرح سے اولاد میں منتقل نہیں ہوتے؛ جس طرح سے انسان آرزو کرتا ہے۔ اس پر کسی کا

جب آپ زندگی میں داخل ہوتے ہیں اور باطن کے سفر کی آزو کرتے ہیں تو جب تک آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا خیال نہ کریں گے اور بڑے میدان تک پہنچنے کے لیے بگڈنڈی نہ تیار کریں گے وہاں نہیں جاسکیں گے۔ آپ ہمیشہ کسی ”بابے“ کی بابت پوچھتے رہتے ہیں۔ ہمارے بابا جی سے فیصل آباد سے آنے والے صاحب نے بھی یہی پوچھا اور کہنے لگے کہ سامیں صاحب! آپ کو تم اشاء اللہ خداوند تعالیٰ نے بڑا درجہ دیا ہے۔ آپ ہم کو کسی ”قطب“ کے بارے میں بتلادیں۔ بابا جی نے ان کی یہ بات نظر انداز کر دی۔ وہ صاحب پھر کسی وقت کے قطب بارے دریافت کرنے لگے۔ جب انہوں نے تیسری بار یہی پوچھا تو بابا جی نے اس سے کہا کہ کیا تم نے اس کو قتل کرنا ہے؟ آدمی کاشاید اس سے بھی مطلب یا مقصد ہوتا ہے کہ کوئی بابا ملے اور میں اس کی غلطیاں نکالوں۔ اگر روح کی دنیا کو شو لنے کا کوئی ایسا ارادہ ہو یا اس دنیا میں کوئی اوپنچی پکار کرنے کی خواہش ہو کہ ”میں آ گیا“ تو اس کے لیے ایک راستہ متعین ہونا چاہیے، تیاری ہونی چاہیے۔ تھجی انسان وہاں تک جا سکتا ہے۔ ہم ڈاٹریکٹ کبھی وہاں نہیں جا سکتے۔ آپ کو اس دنیا کے اندر کوئی پیرا شوٹ لے کر نہیں جائے گا۔ جب یہ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں رونما ہوں گی تو جا کر کہیں بات بنے گی۔

میرے بھائی نے ایک بار مجھ سے کہا کہ اگر آپ نے کچھ لکھنے لکھانے کا کام کرنا ہے تو میرے پاس آ کر مہینے دو گزار لیں (ان کا رینال خورد میں ایک مرغی خانہ ہے)۔ میں وہاں گیا، بچھ بھی ساتھ تھے۔ وہاں جا کر تو میری جان بڑی اذیت میں پھنس گئی۔ وہ اچھی سربراہ جگہ تھی۔ نہر کا کنارہ تھا، لیکن وہ جگہ میرے لیے زیادہ Comfortable ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ آسائش میسر نہیں تھیں۔ ایک تو وہاں مکھیاں بہت تھیں، دوسرا مرغی خانے کے قریب ہی اصطبل تھا، وہاں سے گھوڑوں کی بوآتی تھی۔ تیسرا وہاں پر مشکل یہ تھی کہ وہاں ایک چھوٹا فریق تھا، اس میں ضرورت کی تمام چیزیں نہیں رکھی جاسکتی تھیں اور بار بار بازار جانا پڑتا تھا۔ یہ مجھے خفت ناگوار گزرتا تھا۔

اب دیکھنے خدا کی کیسی مہربانی ہوتی ہے۔ وہی مہربانی جس کا میں آپ سے اکثر ذکر کرتا ہوں۔ میں اصطبل میں یہ دیکھنے کے لیے گیا کہ اس کی بوروکنے کے لیے کسی دروازے کا بندوبست کیا جاسکے۔ وہاں جا کر کیا دیکھتا ہوں کہ میرے تینوں بچے گھوڑوں کو دیکھنے کے لیے اصطبل کے دروازے کے ساتھ چھٹے ہوئے ہیں۔ وہ صحیح جائے تھے تو سب سے پہلا آ کر گھوڑوں کو دیکھتے۔ انہیں گھوڑوں کے ساتھ اتنا عشق ہو گیا تھا۔ ان میں ایک گھوڑا ایسا تھا جو بڑا چھا تھا۔ وہ انہیں ہمیشہ ہنہنا کر پہنچاتا تھا اور اگر وہ ”ئینے مینے“ بچے وقت پر نہیں پہنچتے تھے تو شاید انہیں بلا تھا، اس گھوڑے کی ہنہنا بہت سے یہ اندازہ ہوتا تھا۔ اب میں نے کہا کہ نہیں یہ خوبصورا بدبوی اصطبل اور گھوڑے اور ان بچوں کی دوستی مجھے دارے میں ہے اور اب مجھے یہ گھوڑے پیارے ہیں۔ لیکن ایسے ہی تھیک ہے۔

ہم شہر کے صفائی پسند لوگ جو مکھی کو گوار نہیں کرتے۔ ایک بار میرے دفتر میں میرے بابا جی (سائیں صاحب) تشریف لائے تو اس وقت میرے ہاتھ میں مکھیاں مارنے والا فلیپ تھا۔ مجھے اس وقت مکھی بڑی تنگ کر رہی تھی۔ میں مکھی مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لیے مجھے بابا جی کے آنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ اچانک ان کی آواز سنائی دی۔ وہ کہنے لگئے یہ اللہ نے آپ کے ذوق کشتن کے لیے پیدا کی ہے۔ میں نے کہا جی یہ مکھی گند پھیلاتی ہے، اس لیے مار رہا تھا۔ کہنے لگئے یہ انسان کی سب سے بڑی محنت ہے اور تم اسے مار رہے ہو۔ میں نے کہا جی یہ مکھی کیسے محنت ہے؟ کہنے لگئے یہ بغیر کوئی کرایہ لیے بغیر کوئی نیکس لیے انسان کو یہ بتانے آتی ہے کہ یہاں گند ہے۔ اس کو صاف کر لو تو میں چل جاؤں گی اور آپ اسے مار رہے ہیں۔ آپ پہلے جگہ کی صفائی کر کے دیکھیں یہ خود بخوبی چلی جائے گی۔ سو وہاں بابا جی کی کہی ہوئی وہ بات میرے ذہن میں اٹ کر آئی اور میں نے سوچا کہ مجھے اس کرے میں کوئی فریش چیزیں پھول یا سپرے وغیرہ رکھنی چاہئیں اور یہاں کی صفائی پر دھیان دینا چاہیے۔ وہ فرش جیسا بھی تھا اس کو گیلا کر کے میں نے جھاڑو لے کر خود خوب اچھی طرح سے صاف کیا۔ آپ یقین کریں پھر مجھے مکھیوں نے تنگ نہیں کیا۔

جب میں سودا لینے کے لیے (جس سے میں بہت گھبرا تا ہوں) ایک میل کے فاصلے پر بازار گیا تو میں نے وہاں اپنے بچپن کے کئی سال گزارنے کے بعد لباس طبوں کی دکانیں دیکھیں جو ہمارے بڑے شہروں میں نہیں ہوتیں۔ وہاں پر میں نے بڑی دیر بعد دھونکنی کے ساتھ برتن قلعی کرنے والا ایک بندہ دیکھا، پھر عجیب بات، جس سے آپ سارے لوگ محروم ہیں اور آپ نہیں جانتے کہ وہاں ایک کسان لڑکا دیکھا، جو گندم کے باریک "ناڑ" جو تقریباً چھانچ لمبا تھا، اسے کاث کراس کے ساتھ "الغوزہ" بجا تھا۔ وہ اتنا خوبصورت الغوزہ بجا تھا کہ اگر آپ اسے منٹ لگیں تو آپ بڑے بڑے استادوں کو بھول جائیں۔ پھر میں آرزو کرنے لگا کہ مجھے ہر شام بازار جانے کا موقع ملتے۔ یہ چیزیں بہت چھوٹی چھوٹی ہیں اور بظاہر یہ معمولی لگتی ہیں، لیکن ان کی اہمیت اپنی جگہ بہت زیادہ ہے۔

اگر آپ معمولی باتوں کی طرف دھیان دیں گے، اگر آپ اپنی "کنکری" کو بہت دوستک جھیل میں پھینکیں گے تو بہت بڑا اداڑہ پیدا ہوگا، لیکن آپ کی آرزو یہ ہے کہ آپ کو بنا بنا یا بڑا اداڑہ کہیں سے مل جائے اور وہ آپ کی زندگی میں داخل ہو جائے ایسا ہوتا نہیں ہے۔ قدرت کا ایک قانون ہے کہ جب تک آپ چھوٹی چیزوں پر معمولی باتوں پر جو آپ کی توجہ میں کبھی نہیں آئیں اپنے بچے پر، اپنے بھائیجے پر اور اپنی بھتیجی پر آپ جب تک اس کی چھوٹی سی بات کو دیکھ کر خوش نہیں ہوں گے تو آپ کو دنیا کی کوئی چیز یا دولت خوشی عطا نہیں کر سکے گی، کیونکہ روپیہ آپ کو خوشی عطا نہیں کر سکتا۔ روپے پیسے سے آپ کوئی کیسرہ خرید لیں، خواتین کپڑے خرید لیں اور وہ یہ چیزیں خریدتی چلی جاتی ہیں کہ یہ ہمیں

خوش عطا کریں گی۔ لیکن جب وہ چیز گھر میں آ جاتی ہے تو اس کی قدر و قیمت گھٹنا شروع ہو جاتی ہے۔ خوش تو اسی چیزیاے جو آپ کی کوشش کے بغیر آپ کے دامن پر اتر آتی ہے۔ اس کے لیے آپ نے کوشش بھی نہیں کی ہوتی، تیار بھی نہیں ہوئے ہوتے، لیکن وہ آ جاتی ہے۔ گویا اس رُخ پر جانے کے لیے جس کی آپ آ رزو رکھتے ہیں، جو کہ بہت اچھی آرزو ہے، کیونکہ روحانیت کے بغیر انسان تکمیل نہیں ہوتا، مگر جب تک اسے تلاش نہیں کرے گا، جب تک وہ راستہ یا پگڈہ ٹڑی اختیار نہیں کرے گا، اس کی وقت تک اسے اپنے تکمیل ہونے کا حق نہیں پہنچتا۔ انسان یہ کوشش کرتا ضرور ہے، لیکن اس کی Methodology مختلف ہوتی ہے۔ وہ چھوٹی چیزوں سے بڑی کی جانب نہیں جاتا۔ آپ جب ایک بار یہ فن سیکھ جائیں گے، پھر آپ کو کسی بابے کا ایڈریس لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پھر وہ چھوٹی چیز آپ کے اندر بڑا بابا بن کر سامنے آ جائے گی اور آپ سے ہاتھ ملا کر آپ کی گائیڈ بن جائے گی اور آپ کو اس منزل پر یقیناً لے جائے گی، جہاں آپ جانے کے آرزو مند ہیں۔

سو ایک بار کبھی چھوٹی چیز سے آپ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ کبھی کسی نالائق پرودی سے خوش ہونے کی کوشش کر کے ہی یا کسی یوقوف آدمی سے خوش ہو کر یا کبھی اخبار میں خوفناک خبر پڑھ کر دعا مانگیں کہ یا اللہ! تو اسی خبریں کم کر دے، تو آپ کا راستہ آپ کا چھانک گھٹنا شروع ہو گا اور مجھے آپ کے چیزوں سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ یہ کوشش ضرور کریں گے۔ اللہ آپ کو بہت خوش رکھے۔ بہت آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین!!

ماضی کا ایام

انسانی زندگی میں بعض اوقات ایسے واقعات پیش آتے ہیں کہ آدمی کو کسی چیز سے ایسی چڑھاتی ہے کہ اس کا کوئی خاص جواز نہیں ہوتا مگر یہ ہوتی ہے۔ اور میں ان خاص لوگوں میں سے تھا جس کو اس بات سے بڑی چڑھتی کہ ”دروازہ بند کر دو۔“ بہت دیر کی بات ہے کہی سال پہلے کی جب ہم سکول میں پڑھتے تھے تو ایک انگریز ہیڈ ماسٹر سکول میں آیا۔ وہ تجھے روز اور طلباء کی خاص تربیت کے لیے معین کیا گیا تھا۔ جب بھی اس کے کمرے میں جاؤ وہ ایک بات ہمیشہ کہتا تھا۔

“Shut The Door Behind You”

پھر پلٹنا پڑتا تھا اور دروازہ بند کرنا پڑتا تھا۔

ہم دیسی آدمی تو ایسے ہیں کہ اگر دروازہ کھلا چھوڑ دیا تو بس کھلا چھوڑ دیا، بند کر دیا تو بند کر دیا، قیص اتار کے چار پائی پر چینک دی، غسل خانہ بھی ایسے ہی کپڑوں سے بھرا پڑا ہے، کوئی قاعدہ طریقہ رواج ہمارے ہاں نہیں ہوتا کہ ہر کام میں اہتمام کرتے پھریں۔

یہ کہنا کہ دروازہ بند کر دیں، ہمیں کچھ اچھا نہیں لگتا تھا اور ہم نے اپنے طور پر کافی ٹریننگ کی اور انہوں نے بھی اس بارے کافی سکھایا لیکن یہ بات دماغ میں نہیں آئی کہ بھی دروازہ کیوں بند کر دیا جائے؟ اور نہ دو کھلا کیا کہتا ہے، آپ نے بھی اپنے بچوں پتوں بھیجوں کو دیکھا ہو گا وہ ایسا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ بہت سال پہلے جب میں باہر چلا گیا اور مجھے روم میں رہتے ہوئے کافی عمر میں گزر گیا وہاں میری لینڈ لیڈی ایک ”درزن“ تھی جو سلامی کا کام کرتی تھی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ درزن کی کام بہت معمولی سا ہے لیکن وہاں جا کر پستہ چلا کہ یہ عزت والا کام ہے۔ اس درزن کی وہاں ایک بوتیک تھی اور وہ بہت باعزت لوگ تھے۔

میں ان کے گھر میں رہتا تھا۔ ان کی زبان میں درزن کو سارہ کہتے ہیں میں جب اس کے کمرے میں داخل ہوتا اس نے ہمیشہ اپنی زبان میں کہا ”دروازہ بند کرنا ہے“ وہ چڑھپن سے میرے

ساتھ چلی تھی وہ ایم اے پاس کرنے کے بعد یونیورسٹی کا پروفسر لگنے کے بعد بھی میرے ساتھ رہی۔ یہ بات بار بار سختی پر تھی تو بڑی تکلیف ہوتی، اور پھر لوٹ کے دروازہ بند کرنا، تمیں تو عادت ہی نہیں تھی۔ کبھی ہم آرام سے دھستے انداز میں گروبا پائی سے کمرے میں داخل ہی نہیں ہوئے، کبھی ہم نے کمرے میں داخل ہوتے وقت دستک نہیں دی جیسا کہ قرآن پاک میں بڑی تھی سے حکم ہے کہ جب کسی کے ہاں جاؤ تو پہلے اس سے اجازت لو اور اگر وہ اجازت دے تو اندر آؤ، ورنہ واپس چلے جاؤ۔ پتہ نہیں یہ حکم اٹھا رہو ہیں پارے میں ہے کہ انہیں ویس میں کہ ”اگر اتفاق سے تم نے اجازت نہ لی ہو اور پھر کسی ملنے والے کے گھر چلے جاؤ اور وہ کہہ دے کہ میں آپ سے نہیں مل سکتا تو ماٹھے پر بل ڈالے بغیر واپس آ جاؤ۔“

کیا پیارا حکم ہے لیکن ہم میں سے کوئی بھی اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ ہم کہتے ہیں کہ اندر گھسا ہوا ہے اور کہہ رہا ہے کہ میں نہیں مل سکتا، ذرا باہر نکلے تو اس کو دیکھیں گے وغیرہ وغیرہ، ہماری انا اس طرح کی ہے اور یہ کہنا کہ ”دروازہ بند کروں،“ بھی عجیب سی بات لگتی ہے۔ ایک روز میں نے بار بار یہ سننے کے بعد روم میں زیج ہو کر اپنی اس لینڈلیڈی سے پوچھا کہ آپ اس بات پر اتنا کیوں زور دیتی ہیں۔ میں ایک بات تو سمجھتا ہوں کہ یہاں (روم میں) سردی بہت ہے برف باری بھی ہوتی ہے کبھی کبھی اور تیز ”ویشنو“ (رومی زبان کا لفظ مطلب خنثی ہوا میں چلانا) بھی ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ کھلے ہوئے دروازے سے میں بالکل شمشیر زنی کرتی ہوئی کمروں میں داخل ہوتی ہیں۔ یہاں تک تو آپ کی دروازہ بند کرنے والی فرمائش بجا ہے لیکن آپ اس بات پر بہت زیادہ زور دیتی ہیں۔ چلو اگر کبھی دروازہ کھلا رہ گیا اور اس میں سے اندر رہا اسی ہوا آگئی بیرون کی بوچھاڑ ہو گئی تو اس میں ایسی کون سی بڑی بات ہے۔

اس نے کہا کہ تم ایک سوول لو اور یہاں میرے سامنے بینچ جاؤ (وہ مشین پر کپڑے سی رہی تھی) میں بینچ گیا وہ بولی کہ دروازہ اس نئے بند نہیں کرایا جاتا اور ہم بچپن سے بچوں کو ایسا کرنے کی ترغیب اس نئے نہیں دیتے کہ خنثی ہوانہ آجائے یا دروازہ کھلا رہ گیا تو کوئی جانور اندر آ جائے گا بلکہ اس کا فلسفہ بہت مختلف ہے اور یہ کہ اپنا دروازہ اپنا وجود ماضی کے اوپر بند کرو، آپ ماضی میں سے نکل آئے ہیں اور اس جگہ پر اب حال میں داخل ہو گئے ہیں۔ ماضی سے ہر قسم کا تعلق کاٹ دو اور بھول جاؤ کہ تم نے ماضی کیسے گزارا ہے اور اب تم ایک نئے مستقبل میں داخل ہو گئے ہو۔ ایک نیا دروازہ تمہارے آگے کھلنے والا ہے، اگر وہی کھلا رہے ہے گا تو تم پلٹ کر چھپے کی طرف ہی دیکھتے رہو گے۔ اس نے کہا کہ ہمارا سارے مغرب کا فلسفہ یہ ہے اور دروازہ بند کر دو کا مطلب لکڑی، لو ہے یا پلاسٹک کا دروازہ نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب تمہارے وجود کے اوپر ہر وقت کھلا رہنے والا دروازہ ہے۔ اس وقت میں ان کی یہ بات نہیں سمجھ سکا جب تک میں لوٹ کے یہاں (پاکستان) نہیں آگیا اور میں اپنے جن ”بابوں“ کا ذکر

کیا کرتا ہوں ان سے نہیں ملنے لگا۔ میرے ”بابا“ نے مومن کی مجھے یہ تعریف بتائی کہ مومن وہ ہے جو ماضی کی یاد میں بیتلانہ ہوا اور مستقبل سے خوفزدہ نہ ہو۔ (کہ یا اللہ پتہ نہیں آگے چل کے کیا ہونا ہے) وہ حال میں زندہ ہو۔

آپ نے ایک اصلاح اکٹھنی ہو گئی کہ فلاں بزرگ بڑے صاحب حال تھے۔ مطلب یہ کہ ان کا تعقیل حال سے تھا وہ ماضی کی یاد اور مستقبل کی فکر کے خوف میں بیتلانی نہیں تھے۔ مجھے اس لینڈ لیڈی اور نے بتایا کہ دروازہ بند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تم ایک نئے عبید، ایک نئے دور ایک نئے era اور ایک اور وقت اور زمانے میں داخل ہو چکے ہیں اور ماضی پیچھے رہ گیا ہے۔ اب آپ کو اس زمانے سے فائدہ اٹھانا ہے اور اس زمانے کے ساتھ نہ برا آزمائی کرنی ہے جب میں نے یہ مطلب سناتے ہم پکا چوند ہو گیا کہ میں کیا ہم سارے ہی دروازہ بند کرنے کا مطلب یہی لیتے ہیں جو عام طور پر ہو یا عام اصطلاح میں لیا جاتا ہے۔ بچوں کو یہ بات شروع سے سمجھانی چاہیے کہ جب تم آگے بڑھتے ہو، جب تم زندگی میں داخل ہوتے ہو، کسی نئے کمرے میں جاتے ہو تو تمہارے آگے اور دروازے ہیں جو کھلتے چاہئیں۔ یہ نہیں کہ تم پیچھے کی طرف دھیان کر کے بیٹھے رہو۔

جب اس نے یہ بات کہی اور میں نے سنی تو پھر میں اس پر غور کرتا رہا اور میرے ذہن میں اپنی زندگی کے واقعات، اردو گرد کے لوگوں کی زندگی کے واقعات بطور خاص اجاگر ہونے لگے اور میں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ ہم لوگوں میں سے بہت سے لوگ آپ نے ایسے دیکھے ہو گئے جو ہر وقت ماضی کی فائل بلکہ ماضی کے الیم بغل میں دبائے پھرتے ہیں۔ اکثر کے پاس تصویریں ہوتی ہیں۔ کہ بھائی جان میرے ساتھ یہ ہو گیا، میں چھوٹا ہوتا تھا تو میرے ابا جی مجھے مارتے تھے سوتی مان تھی فلاں فلاں، وہ نکتے ہی نہیں اس یاد ماضی سے۔ میں نے اس طرح ماضی پر رو نے دھونے والے ایک دوست سے پوچھا آپ اب کیا ہیں؟ کہنے لگے جی میں ڈپی کمشٹ ہوں لیکن رونا یہ ہے کہ جی میرے ساتھ زمانہ بڑا ظلم کرتا رہا ہے۔ وہ ہر وقت یہی کہانی سناتے۔ ہمارے مشرق میں ایشیا، فارس تقریباً سارے ملکوں میں یہ روان بہت عام ہے اور ہم جب ذکر کریں گے اس ”ورونا کی“ کا ذکر کرتے رہیں گے۔ ہماری ایک آپا سکیاں ہیں جو کہتی ہیں کہ میری زندگی بہت بر بادی میں گز ری بھائی جان، میں نے بڑی مشکل سے وقت کاٹا ہے۔ اب ایک بینا تو ولڈ بینک میں ملازم ہے ایک یہاں چارڑا اکاؤنٹنٹ ہے۔ ایک بینا سرجن ہے (اونکے خاوند کی بھی اچھی تجوہ تھی، اچھی رشوت بھی لیتے رہے، انہوں نے بھی کافی کامیاب زندگی بسر کی)

میں نے ایک بار ان سے پوچھا تو کہنے لگے بس گزارا ہو، ہی جاتا ہے، وقت کے تقاضے ایسے ہوتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آدمی رشوت تو آپ سرکاری افسر ہونے کے ناطے دیکر سرکاری سہولتوں کی

مد میں وصول کرتے ہیں مثلاً آپ کی اخبارہ ہزار روپے تنواہ ہوگی تو ایک کار ایک دوسرا کار، پانچ نوکر، گھر، یہ اللہ کے فضل سے بہت بڑی بات ہے کیا اس کے علاوہ بھی چاہیے۔ وہ بولے ہاں اس کے علاوہ بھی ضرورت پڑتی ہے لیکن ہم نے بڑا کھلی وقت گزارا ہے، مشکل میں گزارا، ہمارا ماضی بہت دردناک تھا۔ وہ ماضی کا دروازہ بند ہی نہیں کرتے۔ ہر وقت یہ دروازہ نہ صرف کھلارکھتے ہیں بلکہ اپنے ماضی کو ساتھ اٹھائے پھرتے ہیں۔ میں نے بہت سے ایسے لوگ دیکھے، آج کے بعد آپ بھی غور فرمائیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ ان کے پاس اپنے ماضی کی رنگیں اٹھیں ہوتی ہیں۔ ان میں فونو لگے ہوئے ہوتے ہیں اور دکھ درد کی کہانیاں بھری ہوتی ہیں۔ اگر وہ دکھ درد کی کہانیاں بند کر دیں، کسی نہ کسی طور پر ”مگرے“ ہو جائیں اور یہ تہبیر کر لیں کہ اللہ نے اگر ایک دروازہ بند کیا تو وہ اور کھولے گا، تو یقیناً اور دروازے کھلتے جائیں گے۔

اگر آپ پلٹ کر پیچھے دیکھتے جائیں گے اور اسی دروازے میں سے جھاٹک کے وہی گندی مندی، گری پڑی چیزوں کو اکھا کرتے رہیں گے تو آگے نہیں جا سکتے۔ اس طرح سے مجھے پتہ چلا کہ Shut behind the door کا مطلب یہ نہیں ہے جو میں بختار ہاں ہوں۔ وہ تو اچھا ہو گیا کہ میں اتفاق سے وہاں چلا گیا ورنہ ہمارے جوانگریز استاد آئے تھے انہوں نے اس تفصیل کے ساتھ نہیں بتایا تھا۔ آپ کو تم کو سب کو یہ کوشش ضرور کرنی چاہیے کہ ماضی کا چیچھا چھوڑ دیں۔

ہمارے بابے، جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں بار بار کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا، ان کے ڈیروں پر آپ جا کر دیکھیں وہ ماضی کی باتیں نہیں کریں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ نعم اللہ آپ یہاں آگئے ہیں یعنی زندگی شروع ہو گئی ہے، آپ بالکل روشن ہو جائیئے، چک جائیے۔ جب ہمارے میں نالائق بربی ہیئت رکھنے والے آدمی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، تو وہ فخرہ مار کے کہتے ہیں ”واہ! واہ! رونق ہو گئی“ برکت ہو گئی، ہمارے ڈیرے کی کہ آپ جیسے لوگ آگئے۔ آپ آپ دیکھتے ہمارے اوپر مشکل وقت ہے، لیکن سارے ہی اپنے اپنے انداز میں مستقبل سے خوفزدہ رہتے ہیں کہ پتا نہیں جی کیا ہو گا اور کیا ہو گا؟ میں یہ کہتا ہوں کہ نہیں سوچنا چاہیے۔ ہم کوئی ایسے گرے پڑے ہیں، ہم کوئی ایسے مرے ہوئے ہیں، ہمارا پچھلا دروازہ تو بند ہے، اب تو ہم آگے کی طرف چلیں گے اور ہم کبھی ما یوں نہیں ہوں گے اس لیے کہ اللہ نے بھی حکم دے دیا ہے کہ ما یوں نہیں ہونا، اس لیے حالات مشکل ہوں گے، تکلیفیں آئیں گی، بہت چھیں لکھیں گی۔ لیکن ہم ما یوں نہیں ہوں گے، کیونکہ ہمارے اللہ کا حکم ہے اور ہمارے نبی کے ذریعے یہ فرمان دیا گیا ہے کہ لا تقطنو من رحمته اللہ ”یعنی اللہ کی رحمت سے ما یوں نہ ہوں۔)

بعض اوقات یہ پتا نہیں چلتا کہ اللہ کی رحمت کے کیا کیا روپ ہوتے ہیں۔ آدمی یہ سمجھتا ہے کہ میرے ساتھ یہ زیادتی ہو رہی ہے، میں Demote ہو گیا ہوں، لیکن اس Demote ہونے میں کیا راز

ہے؟ یہ ہم نہیں سمجھ سکتے۔ اس راز کو پکڑنے کے لیے ایک ڈائریکٹ کوشش اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے اور اس سے پوچھنا چاہیے کہ جناب اللہ تعالیٰ میرے ساتھ یہ جو مشکل ہے، میرے ساتھ یہ تنزلی کیوں ہے؟ لیکن ہمیں اتنا وقت نہیں ملتا اور ہم پریشانی میں اتنا گم ہو جاتے ہیں کہ ہمیں وقت ہی نہیں ملتا، ہمارے ساتھ یہ بڑی بد قسمتی ہے کہ ہمیں بازاروں میں جانے کا وقت جاتا ہے، تفریح کے لیے مل جاتا ہے، دوستوں سے ملنے بات کرنے کا وقت مل جاتا ہے۔ لیکن اپنے ساتھ بیٹھنے کا، اپنے اندر جھانکنے کا کوئی وقت میسر نہیں آتا۔

آپ ہی نہیں، میں بھی ایسے لوگوں میں شامل ہوں۔ اگر میں اپنی ذات سے پوچھوں کہ ”اے اشراق احمد صاحب! آپ کو اپنے ساتھ بیٹھنے کا کتنا وقت ملتا ہے؟“ کبھی آپ نے اپنا احتساب کیا ہے؟“ تو جواب ظاہر ہے کہ کیا ملے گا۔ دوسروں کا احتساب تو ہم بہت کر لیتے ہیں۔ اخباروں میں، کالموں میں، اداریوں میں لیکن میری بھی تو ایک شخصیت ہے، میں بھی تو چاہوں گا کہ میں اپنے آپ سے پوچھوں کہ ایسا کیوں ہے، اگر ایسا ممکن ہو گیا، تو پھر خفیہ طور پر اس کا کوئی اعلان نہیں کرنا ہے، یہ بھی اللہ کی بڑی مہربانی ہے کہ اس نے ایک راستہ رکھا ہوا ہے تو بے کاری آدمی تو کہتے ہیں کہ نظر پر ہیں، ورود وظیفہ کریں، لیکن یہ اس وقت تک نہیں چلے گا، جب تک آپ نے اس کی ہوئے برے کام سے تو بہ نہیں کر لی، تو بے ضروری ہے۔ جیسا آپ کاغذ لے کے نہیں جاتے کہ ”ٹھپے“، ”لگوانے“ کے لیے۔ کوئی ”ٹھپے“ لگا کر دھخنڈ کر دے گا اور پھر آپ کا کام ہو جاتا ہے، اس طرح تو بہ وہ ”ٹھپے“ ہے، جو لگ جاتا ہے اور بڑی آسانی سے لگ جاتا ہے، اگر آپ تھائی میں، دروازہ بند کر کے بیٹھیں اور اللہ سے کہیں کہ: ”اللہ میاں پڑھنے نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا، مجھ سے یہ غلطی، گناہ ہو گیا اور میں اس پر شرم مند ہوں۔“ (میں یہ Reason نہیں دیتا کہ Human Being کمزور ہوتا ہے یہ انسانی کمزوری ہے یہ بڑی فضول بات ہے ایسی کرنی ہی نہیں چاہیے)۔ بس یہ کہے کہ مجھ سے یہ کوتا ہی ہوئی ہے اور میں اے خداوند تعالیٰ آپ سے اس کی معافی چاہتا ہوں اور میں کسی کو یہ بتانہیں سکتا، اس لیے کہ میں کمزور انسان ہوں۔ بس آپ سے معافی مانگتا ہوں۔

اس طرح سے پھر زندگی کا نیا، کامیاب اور شاندار راستہ چل لکھتا ہے۔ لیکن اگر آپ اپنے ماضی کو ہی اٹھائے پھریں گے، اس کی فائلیں ہی بغل میں لیے پھریں گے اور یہی روناروئے رہیں گے کہ میرے ابا نے دوسرا شادی کر لی تھی، یا میرے ساتھ بختی کرتے رہے یا انہوں نے بڑے بھائی کو زیادہ دے دیا، مجھے کچھ کم دے دیا، چھوٹے نے زیادہ لے لایا، شادی میں کوئی گز بڑی ہوئی تھی۔ اس طرح تو یہ سلسہ کبھی ختم ہی نہیں ہو گا، پھر تو آپ وہیں کھڑے رہ جائیں گے، دلیز کے اوپر اور نہ دروازہ کھولنے دیں گے، شہ بند کرنے دیں گے، بس پھنسنے ہوئے رہیں گے۔ لیکن آپ کو چاہیے کہ آپ Shut

کر کے زندگی کو آگے لے کر چلیں۔ آپ زندگی میں یہ تحریر کر کے دیکھیں۔ Behind The Door ایک مرجبہ تو ضرور کریں۔ آپ میری یہ بات سننے کے بعد جو میری نہیں میری لینڈ لیدی، اس اطاولی درزان کی بات ہے اس پر عمل کر کے دیکھیں۔ اس کے بعد میں نے رونا چھوڑ دیا اور ہر ایک کے پاس جا کر حرم کی اور ہمدردی کی بھیک مانگنا چھوڑ دی۔ آدمی اپنے ذکر کی الیم دکھا کر بھیک ہی مانگتا ہے تا! جسے سن کر کہا جاتا ہے کہ بھی! غلام محمد، یار نور محمد یا سالم احمد تیرے ساتھ بڑی زیادتی ہوتی۔ اس طرح دونوں آپ کیا حاصل کر لیں گے اور سمجھیں گے کہ میں ان سے بہت کچھ سر کر لیا، لیکن وہ قاعدہ بدستور قائم رہے گا، جسے فتح کرنا ہے۔ اگر آپ تھیہ کر لیں گے کہ یہ ساری مشکلات یہ سارے بل، یہ سارے یوں یعنی کے خوفناک بل تو آتے ہی رہیں گے یہ تکلیف ساتھ رہے گی، بچے بھی بیمار ہوں گے، بیوی بھی بیمار ہوگی، خاوند کو بھی تکلیف ہوگی، جسمانی عارضے بھی آئیں گے، روحانی بھی، نفسیاتی بھی۔ لیکن ان سب کے ہوتے ہوئے ہم تھوڑا اسا وقت بکال کر اور مغرب کا وقت اس کے لیے براہ بہتر ہوتا ہے کیونکہ یوں تو سارے ہی وقت اللہ کے ہیں اس وقت الگ بینچہ کر ضرور را پنی ذات کے ساتھ کچھ گفتگو کریں اور جب آپ اپنے آپ سے وہ گفتگو کر چلیں تو پھر غصیہ طور پر وہی گفتگو اپنے اللہ سے کریں، چاہے کسی بھی زبان میں، کیونکہ اللہ ساری زبانیں سمجھتا ہے، انگریزی میں بات کریں، اردو، پنجابی، پشتو اور سندھی جس زبان میں چاہے اس زبان میں آپ کا یقیناً اس سے رابطہ قائم ہو گا اور اس سے آدمی تقویت پکرتا ہے، بجائے اس کے آپ مجھ سے آ کر کسی بابے کا پوچھیں، ایسا نہیں ہے۔ آپ خود بابے ہیں۔ آپ نے اپنی طاقت کو پیچانا ہی نہیں ہے۔ جس طرح ہمارے جوگی کیا کرتے ہیں کہ ہاتھی کی طاقت سارے جانوروں سے زیادہ ہے، لیکن چونکہ اس کی آنکھیں چھوٹی ہوتی ہیں، اس لیے وہ اپنی طاقت، وجود کو پیچانا ہی نہیں۔ ہاتھی جانتا ہی نہیں کہ میں کتنا بڑا ہوں۔ اس طرح سے ہم سب کی آنکھیں بھی اپنے اعتبار سے چھوٹی ہیں اور ہم نے اپنی طاقت کو اپنی صلاحیت کو جانا ہی نہیں۔

اللہ میاں نے تو انسان کو بہت اعلیٰ وارفع بنا کر اور بجود و ملائک بنا کر کر بھیجا ہے۔ یہ باقی میاں رکھتے کی ہیں کہ اب تک جتنی بھی مخلوق نے انسان کو سجدہ کیا تھا، وہ انسان کے ساتھ ویسا ہی نباہ کر رہی ہے۔ یعنی شجر، جنگیات، جمادات اور فرشتے وہ بدستور انسان کا احترام کر رہے ہیں۔ انسان سے کسی کا احترام کم ہوتا ہے۔ اب جب ہم یہاں پہنچے ہیں، تو اس وقت کروڑوں شریف کے نو پر پڑی آوازیں دے کر پکار پکار سورج کی منیں کر رہی ہے کہ ”ذرادھر کر نہیں زیادہ ڈالنا“ سندھ میں پانی نہیں ہے۔ ہلمن، چناب خشک ہیں اور مجھے وہاں پانی پہنچانا ہے اور نوع انسان کو پانی کی ضرورت ہے۔ برف اپنا آپ پکھلاتی ہے اور آپ کو پانی دے کر جاتی ہے۔ صبح کے وقت اگر غور سے سوئی گیس کی آواز نہیں

اور اگر آپ اس درجے یا جگہ پر بیٹھ جائیں کہ اس کی آوازیں سن سکیں تو وہ جیچ جیچ کر اپنے سے نیچے والی کو کہہ رہی ہوتی ہے ”نی کڑیو! چھستی کرو۔ باہر تکلو جلدی کرو تم تو ابھی ہار سکھار کر رہی ہو۔ بچوں نے سکول جانا ہے۔ ماڈل کو انہیں ناشتہ دینا ہے۔ لوگوں کو دفتر جانا ہے۔ چلو اپنا آپ قربان کرو۔“ وہ اپنا آپ قربان کر کے جل بھن کر آپ کا ناشتہ روٹیاں تیار کرواتی ہے۔

یہ سب پھل، سبزیاں اپنے وعدے پر قائم ہیں۔ یہ آم دیکھ لیں، آج تک کسی انور انھور یا کسی شرب بہشت درخت نے اپنا پھل خود کھا کر یا چوں کرنیں دیکھا۔ بس وہ تو انسانوں سے کیے وعدے کی فکر میں رہتا ہے کہ میرا پھل توڑ کر بلوچستان ضرور بھیجو وہاں لوگوں کو آم کم ملتا ہے۔ اس کا اپنے اللہ کے ساتھ رابطہ ہے اور وہ خوش ہے۔ آج تک کسی درخت نے افسوس کا اخبار نہیں کیا۔ شکوہ نہیں کیا کہ ہماری بھی کوئی زندگی ہے، جی جب سے گھڑے ہوتے ہیں، وہیں گھڑے ہیں۔ نہ کبھی ادکاڑہ گئے نہ کبھی آگے گئے ملتا ہے لکھے ہی نہیں۔ میرا پوتا کہتا ہے ”دادا! ہو سکتا ہے کہ درخت ہماری طرح ہی روتا ہو۔ کیونکہ اس کی باتیں اخبار نہیں چھاپتا۔“ میں نے کہا کہ وہ پریشان نہیں ہوتا۔ نہ روتا ہے وہ خوش ہے اور ہوا میں جھوموتا ہے۔ کہنے لگا، آپ کو کیسے پتا ہے کہ وہ خوش ہے؟ میں نے کہا کہ وہ خوش ایسے ہے کہ ہم کو باقاعدگی سے پھل دیتا ہے۔ جونا راض ہو گا، تو وہ پھل نہیں دے گا۔

میں اگر اپنے گریبان میں منہڈاں کر دیکھوں، میں جو اشراق احمد ہوں، میں پھل نہیں دیتا۔ میرے سارے دوست میرے قریب سے گزر جاتے ہیں۔ میں نہ انور انھور بن سکا، نہ شرب بہشت بن سکا، نہ میں سوئی گیس بن سکا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ !!

ویل و شنگ

میں اکثر عرض کرتا ہوں کہ جب وقت ملے اور گھر میں کوئی دیوار ہو تو اس کے ساتھ نیک لگا کر زمین پر بیٹھ کر اپنا تجویز یہ ضرور کیا جانا چاہیے۔ یہ ہے تو ذرا سا مشکل کام اور اس پر انسان اس قدر شدت کے ساتھ عمل پیر انہیں ہو سکتا، جو در کار ہے، کیونکہ ایسا کرنے سے بہت سی اپنی باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ آپ نے سا ہو گا کہ یہ جو روگر ہیں، کشمیر میں برف باری کے دنوں میں اپنا سوئی دھاگہ لے کر چلے جاتے ہیں اور وہاں کپڑے کے اندر ہو جانے والے بڑے بڑے شگافوں کی روگری کا کام کرتے ہیں؛ جن میں خاص طور پر گرم کپڑوں کے شگاف اور "لگاز" اور چٹاخ جو ہوتے ہیں، ان کی روگری کرتے ہیں وہ کہاں سے دھاگہ لیتے ہیں اور کس طرح سے اس کو اس دھاگے کے ساتھ مہارت سے ملاتے ہیں کہ ہم "ٹریس" نہیں کر سکتے کہ یہاں پر اتنا بڑا (Gape) سوراخ ہو گیا تھا، کیونکہ وہ بالکل ایسا کر دیتے ہیں جیسے کپڑا کا رخانے سے بن کر آتا ہے۔

یہ روگروں کا کمال ہے۔ وہ غریب لوگ اپنی چادر لے کر اور اپنی کانگروی (منی کی بھٹی) سلاگا کر اس میں کوئے ڈال کر دیوار کے ساتھ لگ کر بیٹھے ہوتے ہیں اور بہت بھلے لوگ ہیں یہ کشمیری لوگ بڑی ہی بھلی کیوٹی ہیں، کیونکہ وہ اپنا تجویز کرتے ہیں اور ان کو پتہ چلتا رہتا ہے اپنے اس Self کا جو لے کر انسان پیدا ہوا تھا، محفوظ رکھا ہوا ہے یا نہیں۔ گوہم نے تو اپنی Self کے اوپر بہت بڑے بڑے سائیں بورڈ لگائے ہیں اپنے نام تبدیل کر لئے ہیں اپنی ذات کے اوپر ہم نے پینٹ کر لیا ہے۔ ہم جب کسی سے ملتے ہیں، مثلاً میں آپ سے اس اشفاق کی طرح نہیں ملتا، جو میں پیدا ہوا تھا، میں تو ایک رائز ایک دانشور ایک سیاستدان ایک مکار ایک پیچر بن کر ملتا ہوں۔ اس طرح جب آپ مجھ سے ملتے ہیں تو آپ اپنے سائیں بورڈ مجھے دکھاتے ہیں۔ اصل Self کہاں ہے وہ نہیں ملتی۔ اصل جو اللہ نے دے کر پیدا کیا ہے وہ تب ہی ملتا ہے جب آدمی اپنے نفس کو پیچاتا ہے، لیکن اس وقت جب وہ اکیلا بیٹھ کر غور کرتا ہے، کوئی اس کو بتا نہیں سکتا اپنے نفس سے تعارف اس وقت ممکن ہے جب آپ اس

کے تعارف کی پوزیشن میں ہوں اور اسکیلے ہوں۔ جس طرح خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: ”جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا، اس نے اپنے رب کو پہچان لیا۔“

جس انسان نے خود کو پہچان لیا کہ میں کون ہوں؟ وہ کامیاب ہو گیا اور وہ لوگ خوش قسمت ہیں جو باوجود اس کے کہ علم زیادہ نہیں رکھتے، ان کی تعلیم بھی سچھے زیادہ نہیں، لیکن علم ان پر دار ہوتا رہتا ہے، جو ایک خاموش آدمی کو اپنی ذات کے ساتھ دیری تک بیٹھنے میں عطا ہوتا ہے۔

میں پہلے تو نہیں اب بھی بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اور عمر کے اس حصے میں میری طبیعت پر ایک عجیب طرح کا بوجھ ہے، جو کسی طرح سے جاتا نہیں۔ میں آپ سے بہت سی باتیں کرتا ہوں۔ اب میں چاہوں گا کہ میں اپنی شکل آپ کے سامنے بیان کروں اور آپ بھی میری مدد کریں، کیونکہ یہ آپ کا بھی فرض بتتا ہے کہ آپ مجھے چیزے پر بیشان اور درمیاندار آدمی کا سہارا بن جائیں۔ ہمارے بابے جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں، کہتے ہیں کہ اگر آپ کسی محفل میں کسی پوئیورٹی، سیمینار، اسٹبلی میں، کسی اجتماع میں یا کسی بھی انسانی گروہ میں بیٹھے کوئی موضوع شدت سے ڈسکل کر رہے ہوں اور اس پر اپنے جواز اور دلائل پیش کر رہے ہوں اور اگر آپ کے ذہن میں کوئی ایسی دلیل آجائے جو بہت طاقتور ہو اور اس سے اندر یہ رہو کے اگر میں یہ دلیل دوں گا تو یہ بندہ شرمندہ ہو جائے گا کیونکہ اس آدمی کے پاس اس دلیل کی کافی نہیں ہو گی۔ خطرناخ کی ایسی چال میرے پاس آگئی ہے کہ یہ اس کا جواب نہیں دے سکے گا۔ اس موقع پر ”بابے“ کہتے ہیں کہ ”اپنی دلیل روک لاؤ بندہ چوالو اے ذنگ نہ ہونے دو، کیونکہ وہ زیادہ قیمتی ہے۔“

ہم نے تو ساری زندگی بھی ایسا کیا ہی نہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ ”میں کھڑکار پا دیاں گا۔“ ہماری بیہیں جس طرح کہتی ہیں کہ ”میں تے آپا جی فیر سدھی ہو گئی، اوہ نوں ایسا جواب دتا کہ اوہ تھرھر کئیں لگ پئی، میں اوہ نوں اک اک سنائی، اوہ بڑی ماں دیاں کر تو تاں اوہ صی پھوپھی دیاں وغیرہ وغیرہ۔“

(باجی میں نے تو اس کو کھری کھری سنادیں، جس سے وہ تھرھر کا پہنچنے لگی۔ اس کو اس کی خالہ پھوپھی سب کی باتیں ایک ایک کر کے سنائیں۔)

خیر انسان کمزور ہے، ہم بھی ایسے ہی کرتے ہیں۔ بڑی دیر کی بات ہے، 1946ء کی جب پاکستان نہیں بناتھا۔ میں اس وقت بی اے کر پکا تھا اور تازہ تازہ ہی کیا تھا۔ ہمارے قبیلے کے ساتھ ایک گاؤں تھا۔ اس میں ایک ڈسٹرکٹ بورڈ مل سکول تھا، وہاں کا ہیڈ ماسٹر چھٹی پر گیا۔ اس کی جگہ تین ماہ کے لیے مجھے ہیڈ ماسٹر بنادیا گیا۔ اب میں ایک پدا سا (چھوٹے قد کا) نوجوان بڑے فخر کے ساتھ ایک سکول کو ہینڈل کر رہا ہوں۔ گوئی میں زیادہ تجربہ نہیں ہے، لیکن میں زور لگا کے یہ تانا چاہتا ہوں دوسرے

ماشروں کو کہ بی اے کیا ہوتا ہے، کیونکہ وہ بیچارے نارمل سکول پڑھے ہوئے تھے۔ جیسا کہ ہر نئے آدمی کی عادت ہوتی ہے یا جو بھی کسی جگد نیا آتا ہے وہ ہمیشہ سُمْ ٹھیک کرنے پر لگ جاتا ہے۔ یہ بندے کے اندر ایک عجیب بلاء ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ میں سکول کا سُمْ ٹھیک کروں گا، حالانکہ مجھے چاہیے تو یہ تھا کہ میں پڑھاتا اور بہتر طور پر پڑھاتا اور جیسا نظام چل رہا تھا، اسے چلنے دینا، لیکن میں نے کہا نہیں، اس کا سُمْ بدلتا چاہیے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ یہ گلما اور ہر نہیں اوہر ہونا چاہیے۔ وہ جو سن فلاور (سورج مکھی) ہوتا ہے وہ مجھے بہت برا لگتا ہے۔ اس پیلے پھول کو میں نے وہاں سے نکال دینے کا حکم دیا۔ اب اگلا پھٹا (ڈیک) پیچھے کر کے پچھلا آگے گر کے سُمْ تبدیل ہو رہا ہے۔ گلمولوں کو گیر لوگا دوسرا خرگ کا، سفیدی کر دو، تمام ماشر صاحب جان پیڑی باندھ کر آئیں۔ اس طرح سکول میں سُمْ کی تبدیلی جاری تھی۔ ماشر بیچارے بھی عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ سکول میں چھٹی کے وقت پہاڑے کھلوائے جاتے تھے۔ چھکا پہاڑہ ماشر صاحب کھلوار ہے تھے۔

”چھ اکیم چھ چھ دونی بارہ
چھ تیا اخہارہ چھ چوکے چووی“

میں نے سکول میں ایک شرط عائد کر دی کہ بچوں میں شرمندگی اور خفت دور کرنے کے لیے ان کو ٹنچ پر آنا چاہیے اور بلیک بورڈ (تحت سیاہ) کے سامنے کھڑے ہو کر یہ پہاڑہ لکھنا چاہیے۔ چوتھی جماعت کا ایک لڑکا تھا، اب مجھے اس کا نام یاد نہیں صادق تھا یا صدیق۔ اس نے تختہ سیاہ پر لکھنے سے انکار کر دیا کہ میں نہیں لکھوں گا۔ استاد نے کہا کہ یہ ہمیڈ ماشر صاحب کا حکم ہے، تمہیں وہاں جا کر لکھنا پڑے گا، لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہ شر ماتا ہو گیچارہ گاؤں کا لڑکا۔ اسے میرے سامنے پیش کیا گیا۔ ہتایا گیا کہ لڑکا پہاڑہ تو ٹھیک جاتا ہے، لیکن بورڈ پر لکھتا نہیں۔ میں نے پوچھا، تم کیوں نہیں لکھتے؟ اس نے کہا میں نہیں لکھوں گا۔ میں نے اس کا کان پکڑ کر مروڑا اور کہا کیا تجھے معلوم ہے کہ میں تجھے سخت سزا دوں گا، کیونکہ تم میرے اصول کے مطابق کام نہیں کر رہے۔ اس نے کہا کہ جی میں نہیں کر سکتا، مجھ سے لکھا نہیں جاتا شرمیلا تھا شاید۔ میں نے ماشر صاحب سے کہا کہ آپ ایسا کریں کہ اسے ساری کلاسوں میں پھرائیں اور سب کو بتائیں کہ یہ نافرمان بچہ ہے اور اس نے ہمیڈ ماشر صاحب کی بات نہیں مانی۔ ماشر صاحب اسے میرے حکم کے مطابق لے گئے اور اسے گھماتے رہے۔ دیگر استادوں نے بھی بادل تجوہ است اپنی طبیعت پر بوجھ تجھے کر میرے اس حکم کو قبول کیا، تاہم انہوں نے میری یہ بات پسند نہیں کی جسے میں اپنی انتظامی صلاحیت خیال کرتا تھا۔ اس کے بعد وہ لڑکا چلا گیا۔ اس کے بعد بھی سکول نہیں آیا۔ اس کے والدین نے بھی کہا کہ جی وہ سکول نہیں جاتا۔ گھر پر ہی رہتا ہے۔ میں نے اپنے ایک فیصلے اور حکم سے اسے اتنا بڑا ازخم دے دیا تھا کہ وہ اس کی تاب نلا سکا۔ گوئیں نے بد نیتی سے ایسا نہیں

کیا تھا، لیکن اب میں بیجھ کر سوچتا ہوں، تو دیکھتا ہوں کہ میں نے اتنے اچھے صحت مند پیارے بچے کے ساتھ کیا حماقت کی ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں Scar یعنی زخم کا الفاظ نہیں آیا۔ جب میں سمجھتا تھا کہ پڑھانے کے لیے ایسا ہی سخت روایہ ہونا چاہیے۔

وہ زمانہ گزر گیا، پاکستان ہن گیا۔ ہم ادھر آگئے۔ وہ لوگ پہاڑیں کہڑ ہوں گے۔ ایسے ہی مجھے پڑھا کہ وہ گھر انہ سا ہیوال چلا گیا تھا۔ باپ کو اسے پڑھانے کا بڑا شوق تھا، خواہش تھی۔ اس نے بچے کو پہر سکول داخل کر دیا، لیکن وہ سکول سے بھاگ جاتا تھا۔ ڈرتا تھا اور کامپتا تھا۔ وقت گزرتا گیا۔ بہت سال بعد مجھے پھر معلوم ہوا کہ اس لڑکے نے بڑی بھلی تعلیم حاصل کر لی ہے اور لاہور سے انجینئرنگ یونیورسٹی سے بی ایس سی بھی کر لی ہے۔ ایک اندازہ تھا لوگ مجھے آ کر یہ بتاتے تھے کہ شاید وہی لڑکا ہے کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ پچھلی سے پچھلی عید پر جب ہم نماز پڑھ چکے، تب عید کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملتے ہیں۔ معافہ کرتے ہیں ”چھپی“، ”ڈالتے ہیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں ہوتا کہ آپ اس بندے کو جانتے ہیں یا نہیں۔ آپ کی صفت میں جو بھی ہو اس سے معافہ کیا جاتا ہے۔ کوئی واقف کا رہ ہو یا نہ ہو۔ میرے ساتھ لوگ ملتے رہے اور ہم بڑی محبت سے ایک دوسرے سے پچھلی ڈالتے رہے۔ وہاں ایک نوجوان کھڑا تھا وہ بھی کسی سے مل رہا تھا۔ میں نے کہا کہ یہ میری طرف تو متوجہ نہیں ہوتا، میں ہی اس کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا اور جب میں نے آگے بڑھ کر اسے پچھی ڈالنے کی کوشش کی تو اس نے دونوں ہاتھوں سے مجھے پرے دھکیل دیا۔ اب میرا یقین ہے کہ یہ وہی لڑکا تھا۔ میں تو اس وقت بڑا تھا۔ وہ چھوٹا تھا اور وہ مجھے پیچانتا تھا۔ میں اسے نہیں پیچان سکتا تھا۔ اب میں اس کو تلاش کرتا ہوں اور بہت تکلیف میں ہوں اور اس بات کا آرزو مند ہوں کہ اسی طرح سے مجھے اس سے معافی مل جائے۔

بظاہر تو یہ اتنی بڑی کوتا ہی نہیں تھی، لیکن جو واقعہ گزر اور جس طرح سے اس کے دل کے اوپر لگا اور وہ زخم کرنے والی سال گزرنے کے بعد بھی اس کے دل پر چلا آ رہا ہے اور اب وہ واقعہ ایک نئے روپ میں مجھے پریشان کرتا ہے، دکھ دیتا ہے۔ میں آپ سب سے درخواست کروں گا کہ بظاہر یہ بات معمولی لگتی ہے، بظاہر ہم یہ بات کہہ دیتے ہیں کہ میں نے اس کو ایسا پوچھتا مارا کہ اس کی پھٹکری پھٹکل کر دی، لیکن ایک بندہ زندہ رہتے ہوئے بھی اپنے اندر کی لاش ساتھ اٹھائے پھرتا ہے اور آپ اس کے قاتل ہیں۔ اس کا دین، اس کی ویت، اس کا قصاص اسی طرح سے ادا کیا جائے، یہ سمجھ سے باہر ہے۔ وہ کشمیری جن کو بھارتی گورنمنٹ اپنا انٹوٹ ایگ کہتی ہے کہ یہ ہمارے بدن کا ایک حصہ ہیں، مگر ان بھارتیوں نے گزشتہ 56 برسوں میں کتنے زخم کشمیریوں کو دیے ہیں۔ جسمانی بھی، روحانی بھی، نفیاتی بھی اور ہر طرح کے زخم اور وہ ساری کی ساری قوم بھارت کے سامنے ایسی ہی ہو گئی ہے جیسے وہ زخم

لیے پھرتی ہو۔ کچلی ہوئی اننا کا زخم، زبان کا زخم، ہاتھ کا زخم، اسلخ باروں کا زخم اور ان کی یہ کیفیت اجتماعی طور پر ہے۔ لوگ اکثر بیٹھے یہ باتیں کرتے ہیں کہ بھارتی فلموں کے بہت اچھے ناج گانے ہوتے ہیں۔ وہ دھمکے انداز کی پیشان ماتھے پر بندی لگاتی ہیں، تو اچھی لگتی ہیں۔ لیکن جس طرح کشمیریوں کا ذکر محسوس کرتے ہوئے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں۔ میں اتنی بڑی قوم کو ملاحظہ کرتا ہوں تو سارے کشمیری میں کوئی گھر ایسا نہیں، جس میں بھارت کی فوج نے کوئی جانی نقصان نہ کیا ہوا اور پھر ساختھوں ہی وہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے بہت پیارے ہیں اور ہمارے بدن کا حصہ ہیں اور ہمارا اللوٹ اگک ہیں۔ شاید ان کی کشمیریوں کے لیے محبت کا بھی انداز اور طریقہ ہے کہ وہ چھسات لاکھ کی فوج کشمیر کے اندر بھی کر قلم ڈھارہ ہے ہیں۔ ایسی کوتا ہیاں انفرادی طور پر بھی آدمی سے ہوتی ہیں، اجتماعی طور پر بھی ہوتی ہیں۔ لیکن جب مسلسل اجتماعی رنگ میں ہونے لگیں تو اس کے باوجود بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ کامیاب ہیں، لیکن یہ کامیاب نہیں ہوتی۔

ہمارے اور اللہ کے نام میں برا فرق ہے۔ ہمارا جو ایک دن ہے وہ اللہ کے لیے تو کچھ بھی نہیں۔ پتا نہیں ہمارا کتنا نام لگ جائے تو پھر اللہ کا ایک دن بنے۔ اللہ نے کہیں فرمایا بھی ہے کہ وقت کیا ہیں۔ میرا مطلب ہے ہمارے وقت سے مختلف۔ اب ہم اپنے ان کشمیری بھائیوں کا اور میں اپنے اس بچے کا، جس کا میں ہیڈ ماسٹر بن گیا تھا، اس طرح سے ”پراچوت“ کر سکتے ہیں ایسی تلافی کر سکتے ہیں کہ ہم ان کی بہتری چاہیں دل سے انہیں اچھا Wish کریں۔ یہ ایسی بات ہے جو دعا سے بھی طاقتور ہوتی ہے۔ ہم ان کے ساتھ جا کر لڑ تو نہیں سکتے۔ میں اس کے اوپر یعنی Well Wishing پر کسی اگلے پروگرام میں بات کروں گا۔ دعا الفاظوں کے ساتھ مانگی جاتی ہے، لیکن جب آپ کسی کے لیے Wish نیک خواہشات کے اظہار کے طور پر کریں، آرزو اچھی رکھیں اور آپ کسی کو کہہ دیں کہ غلام محمد بڑا اچھا آدمی ہے، اللہ اس کو بھاگ لگائے۔ چاہے آپ کسی کو بے خیالی میں کہہ دیں، پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ آپ کی وہ دعا قبول نہ ہو۔

ہمارے قدرت اللہ شہاب صاحب کا بھی شامل تھا۔ جو بھی ان سے دعا کرنے کی درخواست کرتا آپ اسے Wish Well کرتے۔ اکثر اس کا کام بن جاتا۔ آپ سب ان لوگوں کے لیے جو بڑے ذکھ سے گزر رہے ہیں اور بڑی تکلیف میں ہیں، ان کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتے تو Wish Well ضرور کریں اور اگر آپ کے گھر کے اندر کوئی دیوار ہے اور کبھی آپ کو مغرب کا وقت میراۓ تو آپ اس کے ساتھ ڈھو (نیک) لگا کر بینچیں اور اپنے اللہ سے یہ ضرور کہیں کہ ”میں اپنے ان بھائیوں اور بہنوں کے لیے، جن پر صریحًا ظلم ہو رہا ہے، محض اس لیے کہ وہ مسلمان ہیں، خدا ان پر حرم کرے اور کہیں

کہ اے اللہ! میں ان کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا، صرف Wish Well کر سکتا ہوں۔ اے اللہ! تو مدد فرم۔“ لیکن آپ کو اس کے لیے وقت نکالنا پڑے گا۔ یہ نہیں کہ آپ چلتے ہوئے رسمًا پڑھ لیں اس طرح سے Well Wish اثر نہیں کرے گی۔ جو ہاتھوں کی زنجیر بنتی ہے وہ تصویر کھینچنے کے لیے ہوتی ہے۔ یہ تصویر جو الگ بیٹھ کر آپ کھینچیں گے یہ اللہ کے دربار میں کھینچ گی اور اللہ اس کی طرف متوجہ ہو گا۔ میرے لیے بھی یہ دعا ضرور تکمیل گا کہ وہ نو جوان اب ماشاء اللہ اس کے پیچے ہوں گے، مل جائے اور اتنا ناراض تر رہے، جتنا تاراض ہونے کا اسے حق پہنچتا ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

”دروازہ کھلارکھنا“

آج سے چند ہفتے پہلے یا چند ماہ پہلے میں نے ذکر کیا تھا کہ جب بھی آپ دروازہ کھول کے اندر کمرے میں داخل ہوں تو اسے ضرور بند کر دیا کریں اور میں نے یہ بات پیشتر مرتبہ و لایت میں قیام کے دوران سی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ Shut Behind The Door میں سوچتا تھا کہ وہ یہ کیوں کہتے ہیں کہ اندر داخل ہوں تو دروازہ پیچھے سے بند کر دو، شاید وہاں برف باری کے باعث ٹھنڈی ہوا، بہت ہوتی ہے اس وجہ سے وہ یہ جملہ کہتے ہیں۔ لیکن میرے پوچھنے پر میری لینڈ لیڈی نے بتایا کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ”آپ اندر داخل ہو گئے ہیں اور اب ماضی سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہا، آپ صاحب حال ہیں، اس لیے ماضی کو بند کر دو اور مستقبل کا دروازہ آگے جانے کے لیے کھول دو۔“

ہمارے ہا بے کہتے ہیں کہ صاحب ایمان اور صاحب حال وہ ہوتا ہے جو ماضی کی یاد میں بنتا نہ ہو اور مستقبل سے خوفزدہ نہ ہو۔ اب میں اس کے ذرماں اکثر بات آپ سے کرنا چاہ رہا تھا کیونکہ پیچھے کی یادیں اور ماضی کی باتیں لوٹ کے میرے پاس آتی رہتی ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اس میں سے کچھ حصہ بٹائیں۔

ابن اثاثے نے کہا تھا کہ ”دروازہ کھلارکھنا۔“ آپ دوسروں کے لیے ضرور دروازہ کھول کے رکھیں اسے بند نہ رہنے دیں۔ آپ نے اکثر پیشتر دیکھا ہو گا کہ ہمارے ہاں یہیں کوئی کھول کے دروازے شیشے والے ہوتے ہیں وہاں دروازوں پر موٹا اور بڑا Thick قسم کا شیشہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ اگر اسے کھول دیا جائے تو بلاشبہ اندر آنے والے کے لیے بڑی آسانی ہو گی اور اگر آپ کسی کے لیے دروازہ کھولتے ہیں اور کسی دوسرا سے کو اس سے آسانی پیدا ہوتی ہے تو اس کا آپ کو بڑا انعام ملے گا، جس کا آپ کو اندازہ نہیں ہے۔ کسی کے لیے دروازہ کھولنا بڑے اجر کا کام ہے۔ ہمارے گھروں میں یہیں کو زیادہ اس کا علم نہیں ہے وہ پیشی ہی کہہ دیتی ہے ”اچھا ماسی سلام، فیر ملاں گے“ اور اپنی جگہ پر پیشی کہہ دیتی ہیں نیہیں کہ اٹھ کے دروازہ کھول کے کہا، مم اللہ اور جانے کے لیے دروازہ خود کھولیں اور خدا حافظ کہیں۔ اس

میں بہت ساری برکات ہیں اور بہت سارے دنیاوی فوائد سے آپ مستفید ہو سکتے ہیں اور ایسا نہ کر کے آپ ان سے محروم رہ جاتے ہیں۔

میں جب اٹی میں رہتا تھا تو جب ہمیں صینی کی پہلی تاریخ کو تجوہ ملتی تھی تو میں ایک بہت اچھے ریسٹوران میں جہاں امراء آتے تھے خاص طور پر اداکار اور اداکارائیں بھی آتی تھیں چلا جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب میں بیٹھا کافی پی رہا تھا تو ایک شخص بڑے وجود اور بڑے بڑے ہاتھوں والا آکر میرے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے کہا کہ میں نے گزشتہ ماہ آپ کو کسی آدمی سے باتیں کرتے ساتھا تو آپ ہر یہ روایا اتنا لین زبان بول رہے تھے۔ لیکن آپ Conditional verb اور Subjective verb میں تھوڑی سے غلطی کر جاتے ہیں جیسے wish I cold have been doing do I۔ اس طرح تو مشکل اور پیچیدہ ہو جاتا ہے نا؟ میں نے کہا، جی! آپ کی ہر یہی مہربانی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں بھی آپ کو جانتا ہوں (اب ان کا جو حوالہ تھا وہ تو میں نے ان سے نہیں کہا) آپ اس دنیا کے بہت بڑے امیر آدمی ہیں یہ مجھے معلوم ہے (اس کا پہلا حوالہ یہ تھا کہ وہ ایک بہت بڑے مافیا کا چیف تھا) اس شخص نے مجھے سے کہا کہ میں آپ کو ایک بڑی عجیب و غریب بات بتاتا ہوں جو میری امارت کا باعث نہیں اور میں اس قدر امیر ہو گیا۔ وہ یہ کہ مجھے ہارس رینگ کا شوق تھا اور میں گھوڑوں پر جو الگا گاتا تھا۔ میری مالی حالت کبھی اونچی ہو جاتی تھی اور کبھی بیچی جیسے ریس کھینے والے لوگوں کی ہوتی ہے۔

ایک بار میں نے اپنا سارا مال و متاع ایک ریس پر لگاویا اور کہا کہ اب اس کے بعد میں ریس نہیں کھیلوں گا۔ خدا کا کرنایہ ہوا کہ میں وہ ریس ہار گیا، میری جیسیں بالکل خالی تھیں اور میں بالکل مفلس ہو گیا تھا۔ جب میں وہاں سے پیدل گھر لوث رہا تھا تو مجھے شدت سے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی، لیکن وہاں جانے کے لیے میرے پاس مقامی کرنی کا سکن نہیں تھا جو واش روم کا دروازہ کھونے کے لیے اس کے لاک میں ڈالا جاتا ہے وگرنہ دروازہ کھلتا نہیں ہے۔ میں بہت پریشان تھا اور مجھے جسمانی ضرورت کے تحت تکلیف بھی محسوس ہو رہی تھی۔ میں وہاں قریب پارک میں گیا۔ وہاں نچ پر ایک شخص بیٹھا ہوا اخبار پڑھ رہا تھا۔ میں نے بڑی لجاجت سے اس سے کہا کہ ”کیا آپ مجھے ایک سکن عنايت فرمائیں گے؟“ اس شخص نے میری شکل و صورت کو دیکھا اور کہا کیوں نہیں اور سکن دے دیا۔ لیکن اس سے قبل میری جسمانی صحت پر غور ضرور کیا۔ اسے کیا خبر تھی کہ میں بالکل چھانگ (مفلس) ہو چکا ہوں۔

جب میں وہ سکن لے کر چلا اور واش روم کے دروازے تک پہنچا، جہاں لاک میں سکن ڈالنا تھا تو اچانک وہ دروازہ کھل گیا جبکہ وہ سکن بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ جوان درآدمی پہلے موجود تھا وہ باہر نکلا اور اس نے سکرا کر بڑی محبت شرافت اور نہایت استقلالیہ انداز میں دروازہ پکڑا رکھا اور مجھے سے کہا، یہ ایک روپے کا سکن کیوں ضائع کرتے ہو؟ میں نے اس کا شکر یہاں کیا اور میں اندر چلا گیا۔ اب جب میں

باہر نکلا تو میرے پاس وہ ایک روپے کی قدر کا سکنے بھی گیا تھا۔ تو میں قریب کسیوں میں چلا گیا، وہاں پر ایک اور جواہر ہو رہا تھا کہ ایک روپیہ لگاؤ ہزار روپے پاؤ۔ میں نے وہ روپے کا سکنے اس جوئے میں لگا دیا اور سکے بکس میں ڈال دیا۔ وہ سکنے کھڑا کھڑا اور ہزار کا نوٹ کڑک کر کے باہر آگیا۔ (جو اری آدمی کی بھی ایک اپنی زندگی ہوتی ہے)۔ میں نے آگے تکھاد کیا کہ ایک ہزار روپے کا نوٹ ایک لاکھ پاؤ۔ میں نے ہزار کا نوٹ دہاں لگا دیا۔ رولر گھوما دلوں گیندیں اس کے اوپر چلیں اور نک اور نک کر کے ایک نمبر پر آ کر وہ گریں اور میں ایک لاکھ جیت گیا (آپ غور کریں کہ وہ ابھی وہیں کھڑا ہے جہاں سے اس نے ایک سکنے مانگا تھا) اب میں ایک لاکھ روپیے لے کر ایک امیر آدمی کی حیثیت سے چل پڑا اور گھر آگیا۔

اگلے دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ بیہاں پر اگر کوئی Sick Industry میں انویسٹ کرنا چاہے، تو حکومت انہیں مالی مدد بھی دے گی اور ہر طرح کی انہیں رعایت دے گی۔ میں نے ایک دو کارخانوں کا انتخاب کیا، حکومت نے ایک لاکھ روپیے فیس داخل کرنے کا کہا اور کہا کہ ہم آپ کو ایک کارخانہ دے دیں گے (شاید وہ جرایں بنانے یا اندر رکار منش کا کارخانہ چلا تو اس سے دوسرا تیسرا اور میں لکھ پتی سے کروڑ پتی اور ارب پتی ہو گیا۔ آپ اب غور کریں کہ یہ سب کچھ ایک دروازہ کھلا رکھنے کی وجہ سے ممکن ہوا) اس نے کہا کہ میری اتنی عمر گزر چکی ہے اور میں تلاش کرتا پھرتا ہوں اس آدمی کو جس نے مجھ پر یہ احسان کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس آدمی کو جس نے آپ کو ایک روپیہ دیا تھا؟ اس نے کہا، نہیں! اس آدمی کو جس نے دروازہ کھلا رکھا تھا۔ میں نے کہا کہ آپ اس کا شکر یہ ادا کرنے کے لیے اس سے ملتا چاہتے ہیں؟ تو اس نے جواب دیا، نہیں! یہ دیکھنے کے لیے اس سے ملتا چاہتا ہوں کہ وہ شخص کن کیفیات سے گزر رہا ہے اور کس اونچے مقام پر ہے اور مجھے یقین ہے کہ دروازہ کھولنے والے کا مقام روحانی، اخلاقی اور انسانی طور پر ضرور بلند ہو گا اور وہ ہر حال میں مجھ سے بہتر اور بلند تر ہو گا لیکن وہ آدمی مجھے مل نہیں رہا ہے۔

میں اس کی یہ بات سن کر بڑا جیراں ہوا اور ارب مجھے انشا جی کی دروازہ کھلا رکھنا کی بات پڑھ کر وہ شخص یاد آیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ بڑھاپے میں گزشتہ چالیس پنیسہ بائیس برس کی باتیں اپنی پوری جزویات اور تفصیلات کے ساتھ یاد آ جاتی ہیں اور کل کیا ہوا تھا یہ یاد نہیں آتا۔ بڑھاپے میں بڑی کمال کمال کی چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ آدمی چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ بڑا شریف آدمی ہوں۔ میں تو چڑچڑا نہیں ہوں۔ پرسوں ہی مجھے گیس کا چولہا Pleasant جلانے کے لیے ماچس چاہیے تھی، میں اتنا چیخنا، اوه! آخر کدر ہرگز تی ماچس! میرا پوتا اور پوتی کہنے لگ کر الحمد للہ دادا بوزہا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کیوں؟ تو کہنے لگے، آپ چڑنے لگے ہیں اور اسی تو آپ کبھی دنچی۔ میں نے کہا، بھی آخر بڑھاپے میں تو داخل ہونا ہی ہے، کیا کیا جائے؟ Language

لیکن پھر بھی میں تم سے بہت طاقتور ہوں۔ کہنے لگے، آپ کیسے طاقتور ہیں؟ میں نے کہا، جب تمہاری کوئی چیز میں پر گرتی ہے تو تم اُسے اٹھایتے ہو، لیکن اللہ نے مجھے یہ قوت دی ہے ایک بوڑھے آدمی میں کہ جب اس کی ایک چیز گرتی ہے تو وہ نہیں اٹھاتا اور جب دوسرا گرتی ہے تو میں کہتا ہوں اکٹھی دو اٹھائیں گے، اسی لیے ہمیشہ انتظار کرتا ہے کہ وہ ہو جائیں تو اچھا ہے۔

خواتین و حضرات! دروازہ کھلا رکھنے کے حوالے سے مجھے یہ بھی یاد آیا ہے اور اپنے آپ کو جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک زمانہ تھا (جس طرح سے ماشاء اللہ آپ لوگ جوان ہیں) 1947ء میں جب ہم فرے مار رہے تھے، تو ہمارا ایک ہی فرہ ہوتا تھا "لے کے رہیں گے آزادی" لے کے رہیں گے پاکستان، "ہم اس وقت فرے لگاتے ہوئے گلیوں بازاروں میں گھوما کرتے تھے اور اپنے مخالفین اور دشمنوں کے درمیان بالکل اس طرح چلتے تھے، جیسے شیراپی کچھار میں چلتا ہے اور اب جب کچھ وقت گزرا ہے اور ہم ہی پر یہ وقت آیا ہے اور ہم جو کہتے تھے کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" لے کے رہیں گے آزادی، "اب ہربات پر کہتے ہیں کہ" لے کے رہیں گے سکیورٹی، "ہم کہتے ہیں کہ ہمیں سکیورٹی نہیں ہے۔

کسی آدمی کی تبدیلی لا ہو رہے ملنا کر دی جائے تو وہ کہتا کہ جی بس سکیورٹی نہیں ہے (ایسے ہی کہتے ہیں نا، تو سکیورٹی کے لیے اتنے بے جھن ہو گئے ہیں، ہم اتنے ڈر گئے ہیں اور آخر کیوں ڈر گئے؟ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ ہم تو وہی ہیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہم نے اپنی بات پر اتنے دروازے بند کر لیے ہیں اور ہم دروازے بند کر کے اندر رہنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ ذہنی طور پر روحانی طور پر اور جسمانی طور پر۔ ہم نے ہر لحاظ سے خود کو ایسا بند کر دیا ہے کہ اب وہ آواز نہیں سنائی دیتی کہ "لے کے رہیں گے پاکستان" جب چاروں طرف سے دروازے بند ہوں گے تو یہی کیفیت ہوگی۔ پھر آپ اس حصہ سے یا کمرے سے باہر نکل نہیں سکیں گے اور نہ کسی کو دعوت دے سکیں گے نہ تازہ ہواں کو اپنی طرف بلا سکیں گے۔ ایسی چیزوں پر جب نظر پڑتی ہے اور میری عمر کا آدمی سوچتا ہے، تو پھر جیران ہوتا ہے کہ یہ وقت جو آتے ہیں یہ اللہ کی طرف سے آتے ہیں، یا پھر تو میں ایسے فیصلے کر لیتی ہیں، یا مختلف گروہ انسانی اس طرح سے سوچنے لگتے ہیں۔ اس کا کوئی حقیقی یا یقینی فیصلہ کیا نہیں جاسکتا۔

میں ایک دن ناشتے کی میز پر اخبار پڑھ رہا تھا اور میری بہو کچھ کام کا ج کر رہی تھی باور پچی خانے میں۔ وہ کہنے لگی، ابو! میں آپ کو کافی کی ایک پیالی بنادوں؟ میں نے کہا، بنا تو دو، لیکن چوری بنانا، اپنی ساس کو نہ پہنچانے دینا، وہ آکر لے گی کہ ابھی تو تم نے ناشتہ کیا ہے اور ابھی کافی پی رہے ہو۔ اس نے کافی بنا کر مجھے دے دی۔ ہمارے باور پچی خانے کا ایک ایسا دروازہ ہے، جس کو کھولنے کی کبھی ضرورت نہیں پڑتی، میری بہو کو وہ دروازہ کھولنے کی ضرورت پڑتی اور وہ کھولنے لگی اور جب وہ میرے

لیے کافی بنا رہی تھی تو کہنے لگی ابو یہ آپ مانس گے کہ عورت بے بدل ہوتی ہے اس کا کوئی بدل نہیں ہوتا، میں نے کہا، ہاں بھی! میں تو مانتا ہوں، وہ دروازہ کھولنے لگی اور کوشش کرنے لگی، کیونکہ وہ کم مکھنے کے باعث کچھ پھنسا ہوا تھا اور بڑا اخت تھا وہ کافی دیر زور لگاتی رہی، لیکن وہ نہ کھلا تو مجھے کہنے لگی، ابو اس دروازے کو ذرا دیکھئے گا، بھل ہی نہیں رہا۔ میں گیا اور جا کر ایک بھر پور جھنکا دیا تو وہ بھل گیا جب کھل گیا تو پھر میں نے بھی کہا کہ دیکھا (انسان خاص طور پر مرد بڑا کمیہ ہوتا ہے اپنے انداز میں) تم تو کہتی تھی کہ میں بے بدل ہوں اور عورت کا کوئی بدل نہیں ہوتا۔ کہنے لگی، ہاں ابو! یہی تو میں اب بھی کہتی ہوں کہ عورت بے بدل ہوتی ہے۔ دیکھیں میں نے ایک منت میں دروازہ کھلوالیا (تقبہ)۔ میں نے کہا، ہاں یہ بڑی پیاری بات ہے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ دوسروں کے لیے دروازہ کھولنا، ایک جادو چالا کی ایک تعویذ اور ایک وظیفے کی بات ہے، اگر آپ میں بھجی میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے تو یہ عجیب سی بات لگے گی کہ ہم دروازہ کھولنے لگیں، لوگوں کے لیے تو یہ ایک رہبری عطا کرنے کا کام ہو گا۔ آپ لوگوں کو رہبری عطا کریں گے، اپنے اس عمل سے جس نے دروازہ کھول کے اندر جانا ہے، آخر سے جانا تو ہے ہی، لیکن آپ اپنے عمل سے اس شخص کے رہنمابیں جاتے ہیں اور جب آدمی رہنمائی کرتا ہے تو اس کا انعام اسے ضرور ملتا ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ رواج ذرا کم ہے۔ ہم تو دروازہ وغیرہ اس اہتمام سے نہیں کھولتے ہیں کہ نہیں کیا ضرورت پڑی ہے کسی کا دروازہ کھولنے کی، جب وہ چلا جائے گا، دفع ہو جائے گا تو کھول کر اندر چلے جائیں گے۔ اگر ہم میں دروازہ کھولنے کی عادت پیدا ہو جائے۔ اگر ہم اپنے دفتر، بینک یا درس گاہ میں دروازہ خود کھولیں، چاہے ایک استاد ہی اپنے شاگردوں کے لیے کاس روم کا دروازہ کیوں نہ کھولے۔ یہ کام برکت اور آگے بڑھنے کا ایک بڑا چھا تعویذ ثابت ہو گا۔

یہ بات واقعی توجہ طلب ہے۔ اس سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے اور ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا تعلق ذاتی فائدے سے بھی ضرور ہوتا ہے۔ اس میں چاہے روحاںی فائدہ ہو یا جسمانی یا پھر اخلاقی ہو، ہوتا ضرور ہے اور انسان سارے کا سارا بھض بیزوں اور اشیاء سے ہی نہیں پہچانا جاتا۔ ہمارے ایک استاد تھے میرے کوئی بڑے بزرگ قسم کے وہ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ Rich آدمی وہ ہوتا ہے، جس کی ساری کی ساری Richness اس کی امارت، اس کی دولت، سب کی سب خانع ہو جائے اور وہ اگلے دن کیسا ہو؟ اگر وہ اگلے دن گر گیا تو اس کا سہارا اور امارت جو تھی وہ جھوٹی تھی۔ میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھی اس پروگرام کے بعد دروازے کھولنے والوں میں ہوں گا، چاہے میں ڈگ کھاتا ہو یا اسے کھولوں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں قیمت کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!!

ایم اے پاس بلی

آج صبح کی نماز بھی ویسے ہی گزر گئی اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میرے ساتھ اکثر دوپیشتر ایسے ہو جاتا ہے کہ آنکھ تو کھل جاتی ہے، لیکن اٹھنے میں تا خیر ہو جاتی ہے اور پھر وہ وقت بڑا بھول بن کر وجود پر گزرتا ہے۔ میں لینا ہوا تھا۔ میں نے کہا اور کوئی کام نہیں چلوکل کا اخبار ہی دیکھ لیں۔ میں نے بیدل پیپ آن کیا، تی جلائی اور اخبار دیکھنے لگ پڑا اور آپ جانتے ہیں اخبار میں کتنی خوفناک خبریں ہوتی ہیں، وہ برداشت نہیں ہوتیں۔ مثلاً یہ کہ سرحد کے پار سے تیس گاڑیاں مزید چوری ہو گئی ہیں۔ دو بیٹوں نے کاغذات پر انگوٹھے لگو کر باپ کو قتل کر کے اس کی لاش گندے نالے میں پھینک دی۔ تاداں کے لیے بچا غنوکرنے والے نے بچے کو کسی ایسی جگہ پر رکھا کہ وہ والدین کی یاد میں تین دن تک روتا ہوا انتقال کر گیا۔ غیرہ۔

ایسی خبریں پڑھتے ہوئے دل پر بوجھ پڑتا ہے۔ ظاہر ہے سب کے دل پر پڑتا ہوگا۔ میں یہ سب کچھ پڑھ کر بہت زیادہ پریشان ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ ٹھیک ہے خود کش حرام ہے، لیکن ایسے موقع پر اس کی اجازت ہونی چاہیے یا مجھ سے پہلے جو لوگ اس دنیا سے چلے گئے ہیں، وہ کتنے اچھے تھے۔ خوش قسمت تھے کہ انہوں نے یہ ساری چیزیں نہیں دیکھی تھیں۔ میں یہ دردناک باشیں سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک دواڑھائی کلوکا ایک گولہ میرے پیٹ پر آن گرا اور میں ہڑ بڑا گیا۔ اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے غور سے دیکھا تو میری پیاری بلی کنہر وہ فرش سے اچھلی اور اچھل کر میرے پیٹ پر آن گری تھی اور جب میں نے گھبراہٹ میں اس کی طرف دیکھا تو وہ چلتی چلتی میں پہنچ گئی۔ اس نے پیارے میرے منہ کے قریب اپنا منہ لا کر زور سے میاؤں کی، چیخ ماری اور کہا کہ ”بیوقوف آدمی! لیئے ہوئے ہوئے تو میرے دودھ کا نامم ہے اور تم مجھے اس وقت دودھ دیا کرتے ہو۔“

میں تھوڑی دیر کے لیے اسے پیار کرتا رہا اور وہ ویسے ہی میرے سینے کے اوپر آکھیں بند کر کے مراقبے میں چلی گئی۔ جب ”کہر“ مراتبے میں گئی تو میں سوچنے لگا کہ جس طرح اس کنہر کو اعتماد

ہے مجھ پر میرے وجود پر اور میری ذات پر کیا مجھ کو میرے اللہ پر نہیں ہو سکتا؟ یعنی یہ مجھ سے کتنی "Superior" ہے، برتہ ہے اور کتنی ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کو پڑھنے ہے کہ مجھے گھر بھی ملے گا، حفاظت بھی ملے گی Care بھی ملے گی Protection بھی ملے گی اور میں آرام سے زندگی بسر کروں گی، لیکن میرے اندر یہ چیز اس طرح سے موجود نہیں ہے جیسے میری بلی کے اندر موجود ہے۔ میرا العین کیوں ڈال گاتا ہے۔

خیر! میں انھا اور باور پری خانے میں گیا، وہاں میری بیٹی نے اس کو ایک تھامی میں دودھ دیا اور وہ تھامی سے دودھ پر نے لگی۔ میں درستک سوچتا رہا۔ بہت سارے خوف ابھی تک میرے ساتھ ساتھ چھٹے ہوئے تھے۔ خوف انسان کو آخری دم تک نہیں چھوڑتا اور یہ بڑی ظالم چیز ہے۔ میں نے اس کا اپنے طور پر ایک طریقہ نکالا ہوا ہے۔ میں سوچتا رہتا ہوں اور جو میرے دل کا خوف ہوتا ہے، اسے میں ایک بڑے اچھے خوبصورت کاغذ پر لکھتا ہوں۔ ایک نئے مارکر کے ساتھ کہ "اے اللہ! میرے دل کے اندر جو خوف ہے کہ مجھ سے اس مقام تک نہیں پہنچا جائے گا، جس مقام تک پہنچنے کے لیے تو نہ ہمیں رائے دی ہے، پھر میں یہ لائن بڑی دفعہ لکھتا ہوں۔ کوئی ذاتی خوف، بچے کے پاس نہ ہونے کا خوف یا پچی کی شادی نہ ہونے کا، میں اسے پہلے ایک کلر میں لکھتا ہوں، پھر کرنی اور کلر زمیں لکھتا ہوں اور جب میں اسے بار بار پڑھتا ہوں اور بالکل اس کا وظیفہ کرتا ہوں تو عجیب بات ہے کہ آہستہ آہستہ میرے ذہن سے وہ خوف کم ہونے لگتا ہے اور جب وہ کم ہونے لگتا ہے تو پھر میں اس کا غذہ کو پھاڑ کر ردی کی توکری میں ڈال دیتا ہوں، ہر روز میرے خوف اور میرے ڈر جو ہیں وہ نئی نئی Shape اختیار کر کے آگے ہی آگے چلتے رہتے ہیں۔

میری ایک تھنا آرزو اور بہت بڑی Desire یہ ہے کہ میں اللہ پر پورے کا پورا اعتماد کروں، ویسا نہیں جیسا ہم عام طور پر کیا کرتے ہیں "اچھا جی! اللہ جو بھی کرائے ٹھیک ہے۔ اللہ نے جیسا چاہا جی ان شاء اللہ و یے ہی ہوگا۔ اللہ کو جو منظور ہو اونتی ہوگا۔" یہ تو اللہ کے ساتھ کوئی تعلق کی بات نہیں ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق تو ایسے ہونا چاہیے کہ آدمی اپنے کمرے کے اندر پینگ کے بازو پر بیٹھا ہو اس کے ساتھ باتیں کر رہا ہو اور اپنی مشکلات بیان کر رہا ہو اپنی زبان میں اپنے انداز میں کہاے خدا! مجھے یہ مشکل درپیش ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق تو اس وقت ہوتا ہے جب آپ ایک بہت بڑے کھلے میدان میں جہاں بچے کر کر کھیل رہے ہوں، اس کے کارزیا کو نے میں بچ پر بیٹھے ہوئے ان کو دیکھ رہے ہیں اور اللہ کے ساتھ آپ کا تعلق چل رہا ہے، اتنا ہی وسیع جتنا بڑا امیدان آپ کے سامنے ہے اور اتنا ہی قربت کے ساتھ جتنا بچوں کا واسطہ اپنے کھیل سے ہے۔ اللہ کے ساتھ تعلق تو ایسے ہوتا ہے۔

جب آپ حضرات یا خواتین بازار جاتے ہیں سو دلینے اور اس کے بعد آپ بس کے انتظار

میں نہیں شنید پر بیٹھ جاتے ہیں تو اس وقت آپ اللہ سے کہیں کہاے اللہ! شازیہ نے بی اے کر لیا ہے، اب اس کے رشتے کی تلاش ہے، اب یہ بوجہ تیراہی ہے تو جانے۔ یہ تعلق جو ہے یہ مختلف مدارج میں ہوتا ہوا چلتے رہنا چاہیے۔ یہ جو ہم خدا سے تعلق کے حادرے بول جاتے ہیں کہ اچھا جی جو اللہ چاہے کرے گا۔ اللہ کی مرضی!! کبھی بھی وقت نکال کر اللہ کے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور پیدا کرنا چاہیے جیسے پالتوبی کو گھر کے افراد کے ساتھ ہوتا ہے کہ میری ساری ذمہ داریاں انہوں نے اخہائی ہوئی ہیں اور میں مزے سے زندگی بسر کر رہی ہوں۔ کبھی نہ کبھی تو ہمارا بھی دل چاہتا ہے مزے سے زندگی بسر کرنے کا، ہم بھی تو اس بات کے آرز و مدنہ ہوں گے کہ ہم بھی مزے کے ساتھ زندگی بسر کریں اور اپنے اللہ کے اوپر سارا بوجہ ڈال دیں۔

ہم نے تو بہت سارا بوجہ خود اپنے کندھے پر اخخار کھا ہے۔ ہم اتنے سیانے ہو جاتے ہیں جیسے میں کئی دفعہ اپنے دل میں کہتا ہوں کہ نہیں یہ تو میرے کرنے کا کام ہے اسے میں اللہ کے حوالے نہیں کر سکتا، کیونکہ میں ہی اس کی باریکیوں کو سمجھتا ہوں اور میں نے ہی ابھی Statistics کا مضمون پاس کیا ہے اور یہ نیا علم ہے۔ اسے ہی جانتا ہوں۔ لیکن یہ قسم والوں کا خاصا ہوتا ہے کہ وہ اپنا سارا بوجہ اس (اللہ) کے حوالے کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے ہاں ایک نماش ہوئی تھی، بڑی دیر کی بات ہے، میرا بچہ اس وقت بہت چھوٹا تھا۔ اس نماش میں بہت ساری چیزیں تھیں۔ خاص طور پر کھلونوں کے شال تھے اور چائے جو نیا نیا ابھر رہا تھا، اس کے بنے ہوئے بڑے کھلونے ادھر موجود تھے۔ میرے سارے بچے اسی کھلونوں کے شال پر ہی جا کر جمع ہو گئے۔ ظاہر ہے میں اور ان کی ماں بھی وہاں ان کے ساتھ تھے۔ وہاں پر چائے کا بنا یا ہوا ایک پھول، بہت اچھا اور خوبصورت پھول، جو کپڑے اور مصالحے کا بنا ہوا تھا اور شال والے کا دعویٰ تھا کہ یہ پھول رات کے وقت روشنی دیتا ہے، یعنی اندر ہرے میں رکھو تو روشن ہو جاتا ہے۔ میرے چھوٹے بیٹے نے کہا کہ ابو یہ پھول لے لیتے ہیں۔ وہ اس پھول کے بارے میں بڑا مجس تھا۔ میں نے کہا تھیک ہے، لے لیتے ہیں۔ وہ اتنا قیمتی بھی نہیں تھا۔ ہم نے پھول لے لیا۔ اب وہ (میرا بیٹا) بیچارا سارا دن اسی آرز و اور انتظار میں رہا کہ کب رات آتی ہے اور کب میں اس کو روشن دیکھوں گا۔

رات کو اپنے کرے میں وہ پھول لے گیا اور بچارا آدمی رات تک بیٹھا رہا، لیکن اس میں سے کوئی روشنی نہیں آئی تھی۔ صبح جب میں اخھا تو وہ میرے بستر کے پاس کھڑا "پھس پھس" رورہا تھا اور پھول اس کے ہاتھ میں تھا اور کہہ رہا تھا کہ ایوس میں کوئی روشنی نہیں تھی یہ تو ویسا ہی کالے کالا ہے۔ یہ تو ہمارے ساتھ دھوکا ہو گیا۔ میں نے کہا، نہیں! تم ابھی تھوڑا انتظار کرو اور صبر کی کیفیت پیدا کرو۔ اگر اس شال والے نے دعویٰ کیا ہے تو اس میں سے کچھ ہو گا۔ میں نے اس سے وہ پھول لے لیا اور اسے

اپنے کو بھٹے (گھر کی چھت) پر لے جا کر (وہاں کڑی دھوپ تھی) دھوپ میں رکھ دیا۔ مجھے پڑتا تھا کہ اس میں جونا چمکنے والا مصالت انہوں نے لگایا تھا وہ جب تک سورج کی کرنیں جذب نہیں کرے گا، اس وقت تک اس میں روشنی نہیں آئے گی۔ بالکل ویسے ہی جیسے گھریاں ہوتی تھیں کہ وہ دن کو روشنی میں رہتی تھیں، تو رات کو پھر جملگا تی تھیں۔ جب شام پڑی تو میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ اب تم اس پھول کو لے جاؤ۔ جب رات گھری اندھیری ہو گئی تو جیسا میں نے اسے بتایا تھا کہ اس کے اوپر کالا کپڑا رکھنا اور فلاں فلاں وقت میں اسے دیکھنا (میں نے اسے اس انداز میں سمجھایا جیسے جادوگر کرتے ہیں)۔ اس نے ایسے ہی کیا اور خوشی کا نغمہ اور جیخ ماری۔ اس کا سارا کمرہ جملگ رہش جو ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی ماں کو اور چھوٹے بھائیوں کو بلا بیا اور وہ جگلگتا ہوا پھول دکھانے لگا۔ ہمارے گھر میں ایک جشن کا سامان ہو گیا۔

جب اس کی ماں اور اس کے بھائی اس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے اس کے ساتھ ہاتھیں کر رہے تھے تو میں اپنے بستر پر لیٹا ہوا سوچ رہا تھا کہ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم بھی وہ روشنی جو اللہ خداوند تعالیٰ ہمیں عطا کرتا ہے اور جسے وہ بطور خاص نور کرتا ہے اللہ نورِ السموات والارض کہتا ہے کیا ہم اس کو اپنی ذات میں نہیں سو سکتے؟ کیا ایسے نہیں ہو سکتا کہ میں اپنی بلی کی طرح اپنی ساری چیزیں اس کی روشنی میں رکھ دوں، جیسے میں نے وہ پھول چھپت پر رکھا تھا تاکہ وہ روشنی جذب کر کے چک سکے۔ میری شادی، میری ملازamt، میری زندگی، میری محنت، میرے بچے، میرے عزیز واقارب، میرے رشتہ دار تھی کہ میں اپنا ملک بھی جسے بڑی محبت، محنت کے ساتھ اور بڑی قربانیاں دے کر ہم نے آزادی دلوائی ہے، اس کو اٹھا کر اس روشنی کے اندر رکھ دوں اور پھر یہ سارا دن رات اسی طرح جملگا تے رہیں، جیسے میرے بچے کا وہ پھول رات کے اندر ہیرے میں جملگا رہا تھا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ہم کو ظلمات سے اتنا پیار ہو گیا ہے، کس وجہ سے ہوا ہے۔ میں یہ الزام آپ پر بھی نہیں لیتا، آپ کو خیر کیسے دے سکتا ہوں کہ اندھیرے سے اتنا پیار کیوں ہے؟

ہم اندھیرے کی طرف کیوں ناٹل ہیں اور جب اللہ بار بار کہتا ہے، واضح کرتا ہے کہ میں تم کو ظلمات سے نور کی طرف لانا چاہتا ہوں، تم ظلمات سے نور کی جانب آؤ اور جن کے آذہاں اور روئیں بند ہیں، وہ روشنی کی طرف نہیں آتے اور ایسے ہو نہیں پاتا، جیسے رب تعالیٰ چاہتا ہے اور آزادی رہتی ہے کہ انسان اپنے کام اپنی ہمت اور اپنی محنت سے کرے۔ انسان اپنے کام اپنی ہمت اور محنت سے صرف اسی حد تک کرے، جس کا وہ مکلف ہے، یعنی جس کی وہ تکلیف اٹھاسکتا ہے۔ لیکن اللہ کو بھی کچھ نہ پکھ ذمہ داری عطا کرنی چاہیے۔ اگر آپ تفریحا (میری ایسی ہی باتیں ہیں، جو ایک ڈرائیکٹ میشنری سمجھتے ہیں، وہ کرتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی تعلق پیدا کرنا چاہیے) کچھ وقت نکال کر آپ اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں

اور میرے کہنے پر ہی تھوڑے وقت کے لیے کہ آپ کسی بھی زبان میں، اپنے اللہ کے ساتھ کچھ فتنگو شروع کر دیں (جس طرح آج کل آپ اپنے سیلوارون پر کرتے ہیں) تو چند رنوں کے بعد آپ کو ایک آنے لگ جاتا ہے جو واضح تو نہیں ہوتا۔ ایسے تو نہیں ہوتا جیسے آپ میلیفون پر سنتے ہیں، لیکن آپ کا دل آپ کی ذات اور آپ کا ضمیر اس کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ زیادہ وقت صرف کرنے سے کہ میں کچھ وقت نکال کر اپنا ہل چھوڑ کر یا قلم چھوڑ کر لکھتے ہوئے یادفتر میں اپنے اوقات کے دوران میں اگر آپ کا کرہ الگ ہے تو اپنی بیبل چھوڑ کر سامنے والے صوف پر جو مہمانوں کے لیے رکھا ہوتا ہے، وہاں جا کر بیٹھیں اور اپنے جوتے اتار دیں، پاؤں آرام سے قالین پر رکھیں۔ پھر آپ کہیں کہ میں خاص نیت کے ساتھ آپ سے (خدا سے) وابستہ ہونے کے لیے یہاں آ کر بیٹھا ہوں۔ مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ وائیگی کس طرح سے ہوتی ہے، مجھے یہ بھی پتہ نہیں ہے کہ آپ کو کس طرح سے پکارا جاتا ہے۔ میں صرف یہ بوجھ آپ پر ڈالنے کے لیے یہاں آیا ہوں کہ جس طرح جانور کو اپنے مالک پر اعتماد ہوتا ہے۔ اسی طرح میں یعنی اس جانور کی حیثیت سے اپنا بوجھ آپ پر ڈالنے کے لیے یہاں بیٹھا ہوں۔

مجھے سارے طریقے نہیں آتے ہیں، جو طریقے بزرگوں کو معلوم ہیں۔ اس طرح آپ کے اندر اور اس ماحول کے اندر سے اور اس مقام کے اندر سے اور جو کام کرنے والی جگہ چھوڑ کر آپ اور جگہ پر آ کر بیٹھے ہیں اس جگہ کے حوالے سے اور اس جگہ کی تقدیم سے یقیناً آپ InLine ہوں گے۔ جس طرح آپ نے شاید کبھی ابھن گاڑی کے ساتھ جوختے ہوئے دیکھا ہو گا کہ کس طرح جب ابھن کو گاڑی کے پاس لایا جاتا ہے، تو وہ ”کر کر“ کر کے گاڑی کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور گاڑی کو بھی پتہ نہیں چلتا کہ وہ ساتھ جڑ گیا ہے۔ یہ مشاہدہ آپ ضرور کریں کہ کس طرح سے آدمی اللہ کے ساتھ جڑ جاتا ہے اور پھر وہ اپنا سارا بوجھ اللہ پر ڈال کر اور ساری ذمہ داری اس کے حوالے کر کے چلتا رہتا ہے۔

ایک روز میں جمعہ پڑھنے جا رہا تھا۔ راستے میں ایک چھوٹا سا کتا تھا وہ پلاریزیرے کی زد میں آگیا اور اسے بہت زیادہ چوت آگئی۔ وہ جب بھر اکر گھوما تو وسری طرف سے آنے والی جیپ اس کو لگی، وہ بالکل مرنے کے قریب پہنچ گیا۔ سکول کے دو پچھے یونیفارم میں آرہے تھے۔ وہ اس کے پاس بیٹھ گئے دیں بھی ان کے قریب کھڑا ہو گیا۔ حالانکہ بھنے کا وقت ہو گیا تھا۔ ان بچوں نے اس رُخی پلے کو اٹھا کر گھاس پر رکھا اور اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک بچے نے جب اس کو چھپتھا یا تو اس پلے نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ وہاں ایک فقیر تھا۔ اس نے کہا کہ واہ واہ واہ! وہ سارے منظر کو دیکھ کر بڑا خوش ہوا جبکہ تم کچھ آبدیدہ اور نم دیدہ تھے۔ اس فقیر نے کہا کہ یہاں اس سرحد کو چھوڑ کر وسری سرحد کی طرف چلا گیا۔ وہ کہنے لگا کہ موت یہ نہیں تھی کہ اس کے نے آنکھیں بند کر لیں اور یہ ہرگیا۔ اس کی

موت اس وقت واقع ہوئی تھی جب یہ زندگی ہوا تھا اور لوگ اس کے قریب سڑک کراس کر رہے تھے اور کوئی زکا نہیں تھا۔ پھر اس نے سندھی کا ایک دوہر آپڑا حدا۔ اس کا مجھے بھی نہیں پتہ کہ کیا مطلب تھا اور وہ آگے چلا گیا۔ وہ کوئی پیسے مانگنے والا نہیں تھا۔ پتہ نہیں کون تھا اور وہاں کیوں آیا تھا؟

وہ پردوگی جو اس سکول کے بچے نے بڑی دل کی گھر انی سے اس پلے کو عطا کی، ویسی ہی پردوگی ہم جیسے پلوں کو خدا کی طرف سے بڑی محبت اور بڑی شفقت سے اور بڑے رحم اور بڑے کرم کے ساتھ عطا ہوتی ہے۔ لیکن یہ ہے کہ اسے Receive کیسے کیا جائے؟ کچھ جاندار تو اتنی ہست وائل ہوتے ہیں کہ وہ رحمت اور اس شفقت کو اور اس Touch کو حاصل کرنے کے لیے جان تک دے دینے ہیں۔ آپ نے بزرگان دین کے ایسے بیشمار قطے پڑھے ہوں گے۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میرا چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے، لیکن ان تجربات میں سے گزرتے ہوئے میں نے یہ ضرور محسوس کیا ہے کہ اللہ کی طرف رجوع کیا جائے اور اپنا سارا سامان جتنا بھی ہے، اس کی روشنی میں رکھ دیا جائے اور جب اس کی پوری کی پوری روشنی سے وہ پورے کا پورا الحضر جائے تو پھر کوئی خطرہ کوئی خوف باقی نہیں رہتا۔

کتابی علم جو میرے پاس بھی ہے وہ تول جائے گا، لیکن وہ روح جو سفر کرتی ہے وہ داخل نہیں ہوگی۔ میری بلی کنسر نے آج صح سے مجھے بہت متاثر کیا ہے اور میں بار بار قدم پر یہ سوچتا ہوں کہ کیا میں اس جیسا نہیں بن سکتا؟ اب مجھے اپنی بلی پر غصہ بھی آتا ہے اور پیار بھی آتا ہے اور میں اس سے چڑھا گیا ہوں کہ یہ تو اتنے بڑے گریدی حاصل کر گئی اور فرست ڈویژن میں ایک اے کرگئی ہے اور میں جو اس کا مالک ہوں میں بالکل پیچھے ہوں۔ یہ ساری بات غور کرنے کی ہے۔ آپ میری نسبت باطن کے سفر کے معمول میں بہت بہتر ہیں اور جو جذبہ اور جو محبت اور لگن آپ کی روحوں کو عطا ہوتی ہے وہ مجھے عطا نہیں ہوئی۔ لیکن میں آپ کے ساتھ ساتھ بھاگنے والوں میں شریک رہنا جاہتا ہوں کہ کچھ کرنیں جب بٹ جائیں، آپ کے سامان سے تو وہ مجھے مل جائیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!!

تلقید اور تائی کا فلسفہ

(نوت: یہ پروگرام اشراق احمد کے انتقال سے چند روز قبل نشر ہوا)

ان دنوں میراپوتا جواب بڑا ہو گیا ہے، محیب عجیب طرح کے سوال کرنے لگا ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں کو بڑا حق پہنچا ہے سوال کرنے کا۔ اس کی ماں نے کہا کہ تمہاری اردو بہت کمزور ہے، تم اپنے دادا سے اردو پڑھا کرو۔ وہ انگریزی سکول کے بچے ہیں، اس لیے وہ زیادہ اردو نہیں جانتے۔ خیر! وہ مجھ سے پڑھنے لگا۔ اردو سیکھنے کے دوران میں وہ کچھ اور طرح کے سوالات بھی کرتا ہے۔ پرسوں مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ دادا! یہ آمدورفت جو ہے؟ اس میں عام طور پر کتنا فاصلہ ہوتا ہے؟ (اس نے یہ لفظ نیانیا پڑھا تھا)۔ اب اس نے ایسی کمال کی بات کی تھی کہ میں اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ دادا! کیا نفیات کی ایسی کوئی کتاب ہے؟ جس میں آدمی کو پرکھنے کے اچھے سے اور آسان سے طریقے ہوں؟ تو میں نے کہا کہ بھی انہیں آدمی کو پرکھنے کی کیا ضرورت پیش آ رہی ہے؟ اس نے کہا کہ پہنچ تو چلے کہ آخر م مقابل کیسا ہے؟ کس طرز کا ہے؟ جس سے میں دوستی کرنے جا رہوں یا جس سے میری ملاقات ہو رہی ہے۔ میں اس کو کسوٹی پڑھنے پر کے ساتھ چیک کروں۔ میں نے کہا کہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کو چیک کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن اگر تم ایسا چاہتے ہیں ہو تو ظاہر ہے علم نفیات میں بہت ساری ایسی کتابیں ہیں کہ:

HOW TO UNDERSTAND PEOPLE? HOW TO CHECK HUMAN BEINGS?

ایسی بیٹھا رکتا میں ہیں، لیکن وہ ساری کی ساری اتنی ٹھیک نہیں جتنی ہمارے ہاں عام طور پر سمجھی جاتی ہیں۔ ہماری استاد تو ہماری تائی تھی۔ میں نے پہلے بھی اس کے بارے میں آپ لوگوں کو بتایا ہے، لیکن آپ میں سے شاید بہت سے لوگ نئے ہیں اور ان کو "تائی" کے بارے میں پتہ نہ ہو جسے سارا گاؤں ہی "تائی" کہتا تھا۔ بڑے کیا، چھوٹے کیا، سمجھی۔ وہ ہمارے گاؤں میں ایک بزرگ تیلی جو

میری پیدائش سے پہلے فوت ہو گئے تھے ان کی بیوہ تھیں۔ ہماری تائی تیل نکاتی تھی اور کبھی گھانی کا خالص برسوں کا تیل بیچتی تھی۔ سارے گاؤں والے اس سے تیل لیتے تھے۔ خود ہی تیل چلاتی تھی، بڑی لٹھ جو بہت مشکل ہوتی ہے، بیلوں سے وہ اکیلی نکال لیتی تھی۔

میں جب اس سے ملا تو اس کی عمر 80 برس کی تھی۔ میں اس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا، لیکن مجھے اس تائی کی شخصیت نے متاثر بہت کیا۔ وہ اتنی خوش مزاج، اتنی خوشی عطا کرنے والی اور خوش بخی کا سامان مہیا کرنے والی تھی کہ جس کا حساب نہیں۔ شام کے وقت گاؤں کے لوگ بزرگ ہندو سکھ اس کے پاس جمع ہو جاتے تھے کہ ہمیں کوئی داش کی بات اس کے ہاں سے ملے گی۔ ایک طرح سے یوں سمجھتے کہ اس کا گھر ”کامی ہاؤس“ تھا، جس میں زیندگار لوگ اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ایک بار میں نے تائی سے پوچھا کہ یہ تیری زندگی جو گزری ہے، اس کا میں تو شاہد نہیں ہوں، وہ کس قسم کی تھی؟ اس نے بتایا کہ میں چوبیس برس کی عمر میں بیوہ ہو گئی اور پھر اس کے بعد اب میری ہمدردی کی لذت ہمارے سامنے ہے۔ اسی برس ہے۔ میں ایسے ہی رہی، لیکن میں کڑوی بہت تھی اور تخلی طبیعت کی ہو گئی۔ جب میں بیوہ ہو گئی۔ میں خدا پر بھی تقدیم کرتی تھی حالات پر بھی، وقت پر بھی، لوگوں پر بھی اور میری کڑواہت میں مزید اضافہ ہوتا رہتا تھا۔

میری شخصیت کو وہ سکون نہیں ملتا تھا، جس کی میں آرزو مند تھی، لیکن میں ہر بندے کو اچھی طرح سے ”کھڑکا“ دیتی تھی اور وہ شرمندہ ہو کر اور گھبرا کر میرے ہاں سے رخصت ہوتا تھا۔ تو میں نے ایک اور یہ فیصلہ کیا کہ (اس عورت میں اللہ نے فیصلے کی بڑی صلاحیت رکھی ہوئی ہے) اگر مجھے آدمیوں کو لوگوں کو سمجھنا ہی ہے، اگر مجھے ان کی روحوں کے اندر گھبرا لانا ہے، تو میرا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ مجھے ان پر Criticism کرنا، تقدیم کرنا، تکلیف چینی کرنا، چھوڑنا ہو گا۔ جب آپ کسی شخص پر عکتہ چینی کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس پر تقدیم کرنا چھوڑ دیتے ہیں، اس میں نقص نکالنا چھوڑ دیتے ہیں تو وہ آدمی سارے کا سارا آپ کی سمجھ میں آنے لگتا ہے اور ایکسرے کی طرح اس کا اندر اور باہر کا وجود آپ کی نظر وہ کے سامنے آ جاتا ہے۔

اب یہ اس کا بھی فلسفہ تھا اور کچھ بڑوں سے بھی اس نے حاصل کیا تھا، وہ بھی تھا۔ جب بھی مجھے کوئی ایسا مشکل مسئلہ ہوتا تو میں ضرور اس سے ڈسکس کرتا کہ اس کو کیسے کرنا ہے، اکیلا میں ہی نہیں، سارے ہی اس سے ڈسکس کرتے تھے، کیونکہ اس کا فالسہ یہ تھا کہ کسی کی خرابیاں تلاش کرنے کے بجائے اس کی خوبیوں پر نظر رکھنی چاہیے اور ظاہر ہے کہ آدمی کسی کی خوبیوں پر نظر نہیں رکھ سکتا، کیونکہ اس کو بڑی تکلیف ہوتی ہے، لیکن ڈھونڈنی چاہتیں۔ وہ تائی واحد ایسی فرد تھی جو کہ برے سے برے آدمی میں، برے سے برے وجود میں سے بھی خوبی تلاش کر لیتی تھی۔ میرا بھائی، جو مجھے سے دو جماعتیں آگے

تھا وہ بھی تائی کے اس روئے سے بڑا تنگ تھا۔ وہ ذہین آدمی تھا۔ ایک دن اس نے ایک ترکیب سوچی۔ اس نے کہا کہ یار! میں ابھی تائی کو پھانستا ہوں، کیونکہ وہ بالکل آن پڑھ ہونے کے باعث ہم سے بہت آگے چلی جا رہی ہے۔ میں نے آج ایک معمد بنایا ہے، اسے لے کرتا تائی کے پاس چلتے ہیں۔ لیکن تم بہت سنجیدہ رہنا اور مخصوص سے ”حسنسے“ بن کر کھڑے ہو جاتا۔ یہ تائی ہر چیز کی تعریف کرتی ہے، بھی آج تک اس کو کسی میں نقص نظر نہیں آیا۔ پھر زندگی کا مزہ کیا ہے کہ آدمی کسی نقص کے بغیر ہی زندگی بسر کرتا چلا جائے اور اردوگر پڑوں میں عورتیں آباد ہوں اور آدمی ان میں نقص ہی نہ کالے یہیں تو فوراً کھڑکی کھول کر دیکھتی ہیں کہ اس کے گھر میں کون آیا ہے؟ کون گیا؟ فنا ف نقش نکالنے اور خرابی کی وضاحت پیش کرنے کے لیے ان کو موقع چاہیے ہوتا ہے۔

خیرا! ہم گئے۔ میرے بھائی نے بہت ادب کے ساتھ اس سے کہا (اور وہ خوش تھا کہ اب تائی پھنس جائے گی) تائی! یہ شیطان کیسا ہے؟ تائی کہنے لگی پت۔ ا! میں؟ وہ کہنے لگا بان۔ تائی کہنے لگی ہائے ہائے صدقے جاؤں وہ بڑا ہی مختی ہے جس کم و انتہی کر لے اس کو چھوڑتا ہی نہیں پورا کر کے دم لیتا ہے۔ کیا کہنے اس کے وہ ہماری طرح سے نہیں ہے کہ کسی کام میں آحدا دل ادھر اور آ دھا دل اور ہر اس نے جس کام کی شان لی، پورا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ میں نے بھائی سے کہا کہ آ جاؤ یہاں ہماری دال نہیں گلے گی یہ اور طرح کی یونیورسٹی ہے اور اس یونیورسٹی کے پڑھنے ہوئے جو لوگ ہیں، ہم ان کے ساتھ نہیں کھڑے ہو سکتے۔

میں اپنے پوتے سے یہ کہہ رہا تھا (ظاہر ہے کہ بہت عرصہ بیت گیا) اب تائی اس جہاں میں موجود نہیں ہے، لیکن میں اس سے اپنے حوالے سے اور حیثیت سے بات کر رہا تھا) کہ آدمی کو اپنے آپ کو جانتے کے لیے دوسرے آدمی کے آئینے میں اپنی مشکل دیکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ جب تک آپ دوسرے آئینے کو نہیں بنائیں گے، آپ کو اپنی ذات کی مشکل نظر نہیں آئے گی۔ اگر آپ اس کے اوپ کا کل ملتے رہیں گے تو پھر بڑی مشکل ہو جائے گی۔

اتفاق سے اب ہمارے ہاں Criticism کچھ زیادہ ہی ہونے لگا ہے اور کچھ ہمیں پڑھایا بھی جاتا ہے۔ کچھ ہماری تعلیم بھی ایسی ہے۔ کچھ ہم ایسے West Oriented Educated لوگ ہو گئے ہیں کہ ہم کہتے ہیں کہ ہربات کا اختساب کرو، اس پر تنقید کرو اور ہر چیز کو تسلیم کرتے ہوئے اور ایسے ہی آگے چلتے ہوئے زندگی بسر رہ کرو۔

جب میں لکھنے لکھا نے لگا اور میں چھوٹا سا ادیب بن رہا تھا، یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے، اس وقت ہمارے لاہور میں ایک ”کافی ہاؤس“ ہوتا تھا، وہاں بڑے سینئر ادیب رات گئے تک نشست کرتے تھے تو ہم بھی ان کے پاس بیٹھ کر ان سے باتیں سمجھتے تھے۔ ان سے بات کرنے کا شور

حاصل کرتے تھے اور اپنے مسائل بھی ان سے بیان کرتے تھے۔ اس زمانے میں راجندر سنگھ بیدی بیہاں ڈاکھانے میں کام کرتے تھے۔ پریم چند بھی ”کافی ہاؤس“ میں آ جاتے تھے اور اس طرح بہت بڑے لوگ وہاں آ جاتے تھے۔ میں رات دیر سے گھر آتا تھا، میری ماں ہمیشہ میرے آنے پر ہی اٹھ کر چولہا جلا کر روٹی پکاتی تھی (اس زمانے میں گیس ولیک تو ہوتی نہیں تھی) اور میں ماں سے ہمیشہ کہتا تھا کہ آپ روٹی رکھ کر سو جایا کریں تو وہ کہتیں تو رات کو دیر سے آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تجھے تازہ پکا کر روٹی دوں۔ جیسا کہ ماڈل کی عادت ہوتی ہے۔ میں ان سے اس بات پر بہت تنگ تھا اور میں نے ان سے بیہاں تک نہ کہ دیا کہ اگر آپ اسی طرح رات دیر سے اٹھ کر روٹی پکاتی رہیں تو میں پھر کھانا ہی نہیں کھاؤں گا۔ ایک دن یونہی رات دیر سے میرے آنے کے بعد ”چھاکا“ (تازہ روٹی) پکاتے ہوئے انہوں نے مجھ سے پوچھا ”کہاں جاتا ہے؟“ میں نے کہا، ماں! میں ادیب بن رہا ہوں۔ کہنے لگیں وہ کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا، ماں! لکھنے والا، لکھاری۔ وہ پھر گویا ہوئیں تو پھر کیا کرے گا؟ میں نے کہا، میں کتابیں لکھا کروں گا۔ وہ کہنے لگیں، اینیاں اگے پیاں جیہو یاں کتابیں اونہاں دا کی بننے گا؟ میں نے کہا، نہیں! نہیں! وہ تو جھوٹ پیں، کچھ نہیں۔ میں اور طرح کارائیزرنوں کا اور میں حق اور حق کے لیے لڑوں کا اور میں ایک بچی بات کرنے والا ہوں گا۔

میری ماں کچھ درگئی۔ بیچاری آن پڑھ عورت تھی گاؤں کی۔ میں نے کہا، میں حق بولا کروں گا اور جس سے ملوں گا۔ حق کا پرچار کروں گا اور پہلے والے لکھاری بڑے جھوٹے رائز ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اس وقت ماں کے ہاتھ میں پکڑے چھٹے میں روٹی اور قلتی (دیکھی) تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگی، اگر تو نے یہی بننا ہے، جو تو کہتا ہے اور تو نے حق ہی بولنا ہے تو اپنے بارے میں حق بولنا۔ لوگوں کے بارے میں حق بولنا نہ شروع کر دینا۔ یہ میں آپ کو بالکل آن پڑھ عورت کی بات بتا رہا ہوں۔ حق وہ ہوتا ہے جو اپنے بارے میں بولا جائے جو دوسروں کے بارے میں بولتے ہیں وہ حق نہیں ہوتا۔ ہماری یہ عادت بن چکی ہے اور کبھی بھی ان کے سامنے میرے منہ سے یہ بات نکل جاتی تھی۔

جب ہم بابا جی کے پاس گئے اور کبھی بھی ان کے سامنے میرے منہ سے یہ بات نکل جاتی تھا کہ میں بچی اور حق کی بات کروں گا، تو وہ کہا کرتے تھے، حق بولا نہیں جاتا، حق پہننا جاتا ہے، حق اور رہا جاتا ہے، حق واپرتا (اور حصہ) کی پیز ہے، بولنے کی پیز نہیں ہے۔ اگر اسی طرح اور یوں ہی حق بولو گے تو جھوٹ ہو جائے گا۔ جب تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن اب جوں جوں جوں وقت گزرتا ہے اور یہ حرست اور آرزو ہی رہی ہے اور ہمراجی چاہتا ہے کہ مرنے سے پہلے میں کم از کم ایک دن حق اور رہا کر باہر نکلوں اور ساری دنیا کا درشن کر کے پھر واپس لوٹوں، اور ہا ہوا حق معلوم نہیں کتنا خوبصورت ہوتا ہوگا، بولا ہوا تو آپ کے سامنے ہی ہے وہ اچھا نہیں ہوتا۔ جب آدمی کسی کو Criticise کرتا ہے اور کسی کے

اوپر تقدیم کرتا ہے تو حکم تو یہ ہے کہ پہلے آپ دیکھ لیں اور اس کی عینی شہادت لیں کہ آیا اس میں اسی کوئی خرابی ہے بھی کرنہیں۔ اگر وہ نظر بھی آجائے اور خرابی ہو بھی تو پھر بھی اس کا اعلان نہ کریں۔ آپ کو کیا ضرورت ہے کسی کی خرابی کا اعلان کرنے کی اللہ ستار العیوب ہے۔ اگر اللہ خداوند تعالیٰ ہماری چیزوں کو اجاگر کرنے لگے تو تو یہ قویہ ہم تو ایک سینڈ بھی زندہ نہ رہیں، لیکن وہ ہمارے بھید ”لکو“ کر چھا کر رکھتا ہے۔ تو ہمیں اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ہم لوگوں کی خرابیوں کا ڈھنڈ و راپتہ پھریں۔ اگر آپ کو کسی میں خرابی نظر آئے تو یہ دیکھیں کہ اگر میں اس کی جگہ پڑھتا میں انہی Circumstances میں ہوتا اور میں ایسے حالات میں سے گزرنا ہوا ہوتا، پچھن میں تیکم ہو گیا ہوتا، یا کسی کے گھر پلا ہوتا تو میری شخصیت کیسی ہوتی؟ یہ ایک بات بھی غور طلب ہے۔

ممکن ہے آپ کی آنکھیں ٹیڑھ میں ٹیڑھ ہو اور اس بندے میں ٹیڑھ نہ ہو۔ ایک واقعہ اس حوالے سے بھج نہیں بھولتا، جب ہم سکن آباد میں رہتے تھے۔ یہ لاہور میں ایک جگہ ہے۔ وہ ان دنوں نیائیا آباد ہو رہا تھا۔ اچھا پوش علاقہ تھا۔ وہاں ایک بی بی بہت خوبصورت مادرن قسم کی بیوہ عورت نو عمر وہاں آ کر رہتے تھیں۔ اس کے دو بچے بھی تھے۔ ہم جو سکن آباد کے ”نیک“ آدمی تھے، ہم نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب کردار آ کر ہمارے درمیان آباد ہو گیا ہے اور اس کا انداز زیست ہم سے ملتا جاتا نہیں ہے۔ ایک تو وہ انتہائی اعلیٰ درجے کے خوبصورت پکڑے پہنچتی تھی، پھر اس کی یہ خرابی تھی کہ وہ بڑی خوبصورت تھی۔ تیری اس میں خرابی یہ تھی کہ اس کے گھر کے آگے سے گزرو تو خوشبو کی نیش آتی تھیں۔ اس کے جودو بچے تھے وہ گھر سے باہر بھاگے پھرتے تھا اور کھانا گھر پر نہیں کھاتے تھے۔ لوگوں کے گھروں میں چلے جاتے تھے اور جن گھروں میں جاتے، وہیں سے کھاپی لیتے تھے، یعنی گھر کی زندگی سے ان بچوں کی زندگی کچھ کٹ آف تھی۔

اس خاتون کو کچھ عجیب و غریب قسم کے مرد بھی ملنے آتے تھے۔ گھر کی گاڑی کا نمبر تو روز دیکھ دیکھ کر آپ جان جاتے ہیں، لیکن اس کے گھر آئے روز مختلف نمبروں والی گاڑیاں آتی تھیں۔ ظاہر ہے اس صورتحال میں ہم جیسے بھلے آدمی اس سے کوئی اچھا نتیجہ نہیں اخذ کر سکتے۔ اس کے بارے میں ہمارا ایسا ہی روایہ تھا جیسا آپ کو جب میں یہ کہانی سنارہا ہوں تو آپ کے دل میں لا محالہ اس جیسے ہی خیالات آتے ہوں گے۔ ہمارے گھروں میں آپس میں چمیکو یاں ہوتی تھیں کہ یہ کون آ کر ہمارے علاقے میں آباد ہو گئی ہے۔ میں کھڑکی سے اسے جب بھی دیکھتا، وہ جا سوی ناول پڑھتی رہتی تھی۔ کوئی کام نہیں کرتی تھی۔ اسے کسی چو لہے چو کے کا کوئی خیال نہ تھا۔ بچوں کو بھی کئی بار باہر نکل جانے کو کہتی تھی۔

ایک روز وہ بہزی کی دکان پر گرگٹی لوگوں نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینے و پیٹھے مارے

زادیہ ۲

تو اسے ہوش آیا اور وہ گھر گئی۔ تین دن کے بعد وہ فوت ہو گئی، حالانکہ اچھی صحت میں وہ کھائی پڑتی تھی۔ جو بندے اس کے ہاں آتے تھے انہوں نے ہی اس کا لفظ دفن کا سامان کیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ان کے ہاں آنے والا ایک بندہ ان کا فیلمی ڈاکٹر تھا۔ اس عورت کو ایک ایسی بیماری تھی جس کا کوئی علاج نہیں تھا۔ اس کو کینسر کی ایسی خوفناک صورت لاحق تھی Skin وغیرہ کی کہ اس کے بدن سے بدبو بھی آتی رہتی تھی۔ جس پر زخم ایسے تھے اور اسے خوبیوں کے لیے پرے کرنا پڑتا تھا، تاکہ کسی قریب کھڑے کو تکلیف نہ ہو۔ اس کا بالاں اس لیے بلکہ ہوتا تھا اور غالباً اسی تھا جو بدن کو نہ چھپے۔ دوسرا اس کے گھر آنے والا اس کا وکیل تھا، جو اس کے حقوق کی نگہبانی کرتا تھا۔ تیسرا اس کے خاوند کا چھوٹا بھائی تھا، جو اپنی بھائی کو ملنے آتا تھا۔ ہم نے ایسے ہی اس کے بارے میں طرح طرح کے اندازے لگائے اور متناسخ اخذ کر لیے اور اس نیک پاک دامن عورت کو جب دورہ پڑتا تھا، تو وہ بچوں کو دھکے مار کر باہر نکال دیتی تھی اور ترے پنے کے لیے دہاپنے دروازے بند کر لیتی تھی۔

میرا یہ سب کچھ عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہم تقید اور نقص نکالنے کا کام اللہ پر چھوڑیں وہ جانے اور اس کا کام جانے۔ ہم اللہ کا بوجھا پیے کندھوں پر ناخاٹھائیں، کیونکہ اس کا بوجھا اٹھانے سے آدمی سارے کام سارا ”چھپ“ ہو جاتا ہے، کمزور ہو جاتا ہے، مر جاتا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!

”سلطان سنگھاڑے والا“

انسانی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب اس کی آرزویہ ہوتی ہے کہ وہ اب بڑے پر سکون انداز میں زندگی پس رکرے اور وہ ایسے جھیلوں میں نہ رہے؛ جس طرح کے جھیلوں میں اس نے اپنی گزرشہ زندگی پر کی ہوئی ہوتی ہے اور یہ آرزو بڑی شدت سے ہوتی ہے۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ جو لوگ اللہ کے ساتھ دوستی لگا لیتے ہیں وہ بڑے مزے میں رہتے ہیں اور وہ بڑے چالاک لوگ ہوتے ہیں۔ ہم کو انہوں نے بتایا ہوتا ہے کہ ہم اور ہمارے دوستوں کے ساتھ دوستی رکھیں اور وہ خود بیچ میں سے نکل کر اللہ کو دوست بنائیتے ہیں۔ ان کے اوپر کوئی تکلیف، کوئی بوجھ اور کوئی پہاڑ نہیں گرتا۔ سارے حالات ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے میرے آپ کے ہیں، لیکن ان لوگوں کو ایک ایسا سہارا ہوتا ہے ایک ایسی مدد حاصل ہوتی ہے کہ انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچتی۔

میں نے یہ بہت قریب سے دیکھا ہے۔ ہمارے گھر میں دھوپ سینکتے ہوئے میں اپنی ایک چڑیا کو دیکھا کرتا ہوں، جو بڑی دیر سے ہمارے گھر میں رہتی ہے اور غالباً یہ اس چڑیا کی یا تو بیٹی ہے یا نواسی ہے جو بہت بھی دیر سے ہمارے مکان کی چھت کے ایک کونے میں رہتی رہی ہے۔ ہمارا مکان دیسے تو بڑا اچھا ہے اس کی ”آرزوی“ کی چھتیں ہیں، لیکن کوئی نہ کوئی کونا کھدر را ایسا رہا ہی جاتا ہے جو ایسے گھنکنے والیں کو بھی جگہ فراہم کر دیتا ہے۔ یہ چڑیا بڑے شوق بڑے سجاو اور بڑے ہی ماں وس انداز میں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔ ہمارے کمرے کے اندر بھی اور فرش پر بھی چلی آتی ہے۔ کل ایک فاختہ آئی جو میلیوں کی تار پر بیٹھی تھی اور یہ چڑیا اڑ کر اس کے پاس گئی، اس وقت میں دھوپ سینک (تپ) رہا تھا۔ اس چڑیا نے فاختہ سے پوچھا کہ ”آپا یہ جو لوگ ہوتے ہیں انسان؟ جن کے ساتھ میں رہتی ہوں یا اتنے بے چین کیوں ہوتے ہیں؟ یہ بھاگے کیوں پھرتے ہیں؟ دروازے کیوں بند کرتے اور کھولتے ہیں؟ اس کی وجہ کیا ہے؟“ فاختہ نے کہا کہ ”میرا اخیال ہے کہ جس طرح ہم جانوروں کا ایک اللہ ہوتا ہے، ان کا کوئی اللہ نہیں ہے اور ہمیں یہ چاہیے کہ ہم لکر کوئی دعا کریں کہ ان کو بھی ایک اللہ مل جائے۔ اس طرح انہیں

آسانی ہو جائے گی، کیونکہ اگر ان کو اللہ نہ مل سکا تو مشکل میں زندگی بس رکریں گے۔“
اب معلوم نہیں میری چڑیا نے اس کی بات مانی یا نہیں، لیکن وہ بڑی دیر تک لفت و شنید کرتی
رہیں اور میں بھی اپنے تصور کے زور پر یہ دیکھتا رہا کہ ان کے درمیان اگلگو کاشاید کچھ ایسا ہی سلسلہ
جاری ہے۔ تو ہم کس وجہ سے ہمارا اتنا برا اقصوہ بھی نہیں ہے، ہم کمزور لوگ ہیں جو ہماری دوستی اللہ کے
ساتھ ہو نہیں سکتے۔ جب میں کوئی ایسی بات محسوس کرتا ہوں یا سنتا ہوں تو پھر اپنے ”بابوں“ کے پاس
بھاگتا ہوں۔ میں نے اپنے بابا جی سے کہا کہ جی! میں اللہ کا دوست بننا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی ذریعہ
چاہتا ہوں۔ اس تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ یعنی میں اللہ والے لوگوں کی بات نہیں کرتا۔ ایک اسی دوستی
چاہتا ہوں، جیسے میری آپ کی اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ ہے، تو انہوں نے کہا ”اپنی شکل دیکھ اور اپنی
حیثیت پہچان، تو کس طرح سے اس کے پاس جا سکتا ہے، اس کے دربار تک رسائی حاصل کر سکتا ہے اور
اس کے گھر میں داخل ہو سکتا ہے یہ نامکن ہے۔“

میں نے کہا، جی! میں پھر کیا کروں؟ کوئی ایسا طریقہ تو ہونا چاہیے کہ میں اس کے پاس
جا سکوں؟ بابا جی نے کہا، اس کا آسان طریقہ یہی ہے کہ خود نہیں جاتے اللہ کو آواز دیتے ہیں کہ ”اے
اللہ! تو آ جا میرے گھر میں“، کیونکہ اللہ تو کہیں بھی جا سکتا ہے بندے کا جانا مشکل ہے۔ بابا جی نے کہا
کہ جب تم اس کو بلااؤ گے تو وہ ضرور آئے گا۔ اتنے سال زندگی گزر جانے کے بعد میں نے سوچا کہ واقعی
میں نے بھی اسے بلا یا ہی نہیں، کبھی اس بات کی رحمت ہی نہیں کی۔ میری زندگی ایسے ہی رہی ہے، جیسے
بڑی دیر کے بعد کافی کے زمانے کا ایک کلاس فیلوں جائے بازار میں، تو پھر ہم کہتے ہیں کہ جزا چھا ہوا
آپ مل گئے۔ کبھی آنا۔ اب وہ کہاں آئے، کیسے آئے اس بیچارے کو قوتیا ہی نہیں۔

ہمارے ایک دوست تھے۔ وہ تب ملتے تھے جب ہم روپیمنڈی بجاتے تو کہتے کہ جی آنا، کوئی
ملنے کا پروگرام ہنانزیہ بہت اچھی بات ہے، لیکن ایڈر لیں نہیں بتاتے تھے۔ جیسے ہم اللہ کو اپنا ایڈر لیں نہیں
بتاتے کسی بھی صورت میں کہ نہیں سچ یا نہ سچ جائے۔ ایک دھڑکا لگا رہتا ہے۔ وہ مجھے کہا کرتے
تھے کہ بس مہینے کے آخری دیک کی کسی ڈیٹ کو ملاقات کا پروگرام بنالیں گے۔ Sunset کے قریب ان
ڈیٹ بتاتے تھے نام بتاتے تھے Determine۔ نہیں کرتے تھے تو ایسا ہی اللہ کے ساتھ ہمارا اعلان
ہے۔ ہم نہیں چاہتے بلکہ کسی حد تک ڈر جاتے ہیں کہ خدا غواست اگر ہم نے اللہ سے دوستی لگائی اور وہ
آگیا تو ہمیں تو ہرے کام کرنے پڑیں گے۔ دوپٹہ چتنا ہوتا ہے بوث پاش کرنا ہوتے ہیں، مہندی پر
جانا ہوتا ہے۔ اس وقت اللہ میاں آگئے اور انہوں نے کہا کہ ”کیا ہو رہا ہے؟“ تو مشکل ہو گی۔ ہم نے
آخر زندگی کے کام بھی نہیں نہیں۔ باقی جوبات میں سوچتا ہوں اور میں نے اپنے بابا کو یہ جواب دیا
کہ میں سمجھتا ہوں کہ اللہ کی عبادت کرنا بہت اچھی بات ہے اور ہے بھی اچھی بات۔ انہوں نے کہا کہ

عبادت کرنا ایک اور چیز ہے، تم نے تو مجھ سے کہا کہ میں خداوند کریم کو بلا واسط طور پر مانا چاہتا ہوں۔ عبادت کرنا تو ایک گراہر ہے جو آپ کر رہے ہیں اور اگر آپ عبادت کرتے بھی ہیں تو پھر آپ اپنی عبادت کو Celebrate کریں، جس نہ منائیں جیسے ہندوی پرلاکیاں حال لے کرنا جتی ہیں ناموں بتیاں جلا کر اس طرح سے ورنہ تو آپ کی عبادت کسی کام کی نہیں ہوگی۔

جب تک عبادت میں Celebration نہیں ہوگی، جشن کا سامان نہیں ہوگا، جیسے وہ بابا کہتا ہے ”تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا“، چاہے حق نہ ناچیں لیکن اندر سے اس کا وجود اور روح ”تھیا تھیا“ کر رہی ہے، لیکن جب تک Celebration نہیں کرے گا، بات نہیں بنے گی۔ اس طرح سے نہیں کہ نماز کو پیش کر ”چارستاں“ فیر چار فرض فیر دوستاں فیر دو نفل، تن و تر، سلام پھیرا، چلو، جی رات گزری فکر اُتر۔ نہیں جی! یہ تو عبادت نہیں۔ ہم تو ایسی ہی عبادت کرتے رہے ہیں اس لیے تال میل نہیں ہوتا۔ جشن ضرور منایا جانا چاہیے عبادت کا دل لگی، محبت اور عقیدت کے ساتھ عبادت۔ ہمارے یہاں جہاں میں رہتا ہوں وہاں دو بڑی ہاکی اور کرکٹ گرواؤندز ہیں وہاں سندھے کے سندھے بہت سویرے جب ہم یہاں سے لوٹ رہے ہوتے ہیں، منہ اندر ہر گذی اڑانے والے آتے ہیں۔ وہ اس کا بڑا اہتمام کیے ہوئے ہوتے ہیں، ان کے بڑے بڑے قلبیے ہوتے ہیں اور بہت کار میں ہوتی ہیں، جن میں وہ اپنے بڑے والے قلبی رکھ کر پینگ اڑانے کے لیے کھلے میدان میں آتے ہیں۔ اب وہ خالی پینگ نہیں اڑاتے بلکہ اہتمام کے ساتھ اس کا جشن مناتے ہیں۔ جب تک اس کے ساتھ جشن نہ ہو وہ پینگ نہیں اڑتی اور نہ ہی پینگ اڑانے والا سال بندھتا ہے کھانے پینے کی بیٹھار چیزیں باجا جانے کے ”بھوپو“ اور بہت کچھ لے کر آتے ہیں وہاں جشن زیادہ ہوتا ہے، کاشٹ فلاںگ کم ہوتا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں عبادت زیادہ ہوتی ہے Celebration، اللہ کو مانا کم ہوتا ہے۔

میں نے سوچا یہ گذی اڑانے والے بہت اچھے رہتے ہیں ہمارے پاس بابا جی کے ہاں ایک گذی اڑانے والا آیا کرتا تھا موبی دروازے کے اندر علاقے سے بڑی خوبصورت دھوپی (تہینہ) باندھتا تھا، جیسے انہم فلموں میں باندھا کرتی تھی، لبے لڑچھوڑ کر باندھا کرتی تھی، وہ جب آتا تو ہمارے بابا جی اسے کہتے گذی اڑاؤ (اس طرح بابا جی، میں Celebrate کرنے کا حوصلہ دیتے تھے، جو بات اب سمجھ میں آئی ہے) وہ اتنی اوپنی پینگ اڑاتا تھا کہ نظر سے او جھل ہو جاتی تھی اور میرے جیسا آدمی تو اس لمبی ڈور کو سنھمال بھی نہیں سکتا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ بھا صدیق! تم یہ گذی کیوں اڑاتے ہو؟ کہنے لگا جی! یہ گذی اڑانا بھی اللہ کے پاس پہنچنے کا ایک ذریعہ ہے۔ کہنے لگا، نظر نہیں آتی، لیکن اس کی کھجھ بیاتی رہتی ہے کہ میں ہوں اللہ نظر نہیں آتا لیکن آپ کے دلوں کی دھڑکن یہ بتاتی ہے کہ ”میں ہوں“۔ نہیں کہ وہ آپ کے زور پر آ کر موجود ہو۔

جب میں ریڈیو میں کام کرتا تھا تو ہمیں ایک Assignment ملی تھی۔ وہ یہ کہ پتا کریں چھوٹے دکانداروں سے کہ وہ کس طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ چھوٹے دکانداروں سے مراد چھابڑی فروش۔ یہ کچھ دیر کی بات ہے، میں نے بہت سے چھابڑی فروشوں کا انٹرویو کیا۔ ان سے حال معلوم کیے۔ پسیے کا ہی سارا اونچ نیچ ہے اور ہم جب بھی تحقیق کرتے ہیں یا تحلیل کرتے ہیں یا Analysis کرتے ہیں تو Base Economics کی پر ہی کرتے ہیں کہنے امیر ہیں، کتنے غریب ہیں، کیا تناسب ہے کہ وہ کس Ratio کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں؟ ان کے کیا مسائل ہیں؟ ولی (ولی) دروازے کے باہر اگر آپ لوگوں میں سے کسی نے ولی دروازہ دیکھا ہوا اس کے باہر ایک آدمی کھڑا تھا تو جو ان وہ کوئی تمیں بتیں برس کا ہوگا۔ وہ سنگھازے نیچ رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا۔ میں نے پوچھا، آپ کا نام کیا ہے؟ کہنے لگا، میرا نام سلطان ہے! میں نے کہا کب تک تم یہ سنگھازے بچتے ہو؟ کہنے لگا، شام تک کھڑا رہتا ہوں۔ میں نے پوچھا اس سے تمہیں کتنے روپے مل جاتے ہیں؟ اس نے بتایا ستر بھتر روپے ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا، انہیں کالے کیسے کرتے ہیں؟ (میری بیوی پوچھتی رہتی ہے، مجھ سے کیوں کہ وہ دیکھے میں ڈال کر ابھتی ہے تو وہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں)۔ اس نے کہا کہ جی پنساریوں کی دکان سے ایک چیز ملتی ہے، چچپ بھراں میں ڈال دیں تو کالے ہو جائیں گے اُب کراور آپ جا کر کسی پنساری سے پوچھ لیں کہ سنگھازے کالے کرنے والی چیز دے دیں وہ دیدے گا۔ جب اس نے یہ بات کی تو میں نے کہا، یہ اندر کے بھید بتانے والا آدمی ہے اور کوئی چیز پوشیدہ نہیں رکھتا۔ کھلی نیت کا آدمی ہے۔ یقیناً یہ ہم سے بہتر انسان ہوگا۔

میں نے کہا، جب آپ ستر بھتر روپے روز بنا لیتے ہیں تو پھر ان روپوں کا کیا کرتے ہیں؟ کہنے لگا، میں جا کر ”رضیہ“ کو دے دیتا ہوں۔ میں نے کہا، رضیہ کون ہے؟ کہنے لگا، میری بیوی ہے۔ میں نے کہا کہ شرم کرواتی محنت سے پسیے کماتے ہو اور صارے کے سارے اسے دے دیتے ہو۔ کہنے لگا، جی اسی کے لیے کماتے ہیں۔ (اللہ کہتا ہے ناقرآن پاک میں کہ الرَّجَالُ قَوْمُونَ عَلَى النِّسَاءِ يَوْمَدُ ہیں، یہ عورت کے Provider ہیں)۔ میں نے اس سے کہا، اچھا تو نیچ میں سے کچھ نہیں رکھتے؟ کہنے لگا، نہیں، جی! مجھے کبھی ضرورت نہیں پڑی۔ میں نے کہا، اس وقت رضیہ کہاں ہے؟ (وہ خوبصورت inside خوبصورت آدمی تھا اس لیے مجھے اس میں دیپی پیدا ہوئی) کہنے لگا، رضیہ کہیں بازار وغیرہ گئی ہوگی۔ اس کی دو سہیلیاں ہیں اور وہ تینوں صبح سوریے نکل جاتی ہیں بازار۔ اس نے بتایا کہ وہ کبھی کبھی گلوکوز لگوواتی ہیں، ان کو شوق ہے (اس طرح مجھے تو بعد میں پتا چلا کہ اندر وہ شہر کی عورتیں گلوکوز لگووانا پسند کرتی ہیں، گلوکوز لگووانا نہیں اچھی سی چیز لگاتی ہے کہ اس کے لگوانے سے جسم کو تقویت ملے گی)۔ میں نے کہا، اچھا تم خوش ہواں اس کے ساتھ؟ کہنے لگا، ہاں جی! ہم اپنے اللہ کے ساتھ بڑے راضی ہیں۔ میری تو اللہ کے ساتھ ہی

آشائی ہے۔ میں تو کسی اور آدمی کو جانتا نہیں۔ اس پر میں چونکا اور سمجھتا۔ اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ایک بڑا آدمی ہے لاہور کا۔ میں نے اگر کوئی حاکم دیکھا ہے تو وہ ”سلطانِ سُلْطَانِ افروش“ ہے۔ اس کو کسی چیز کی پرواہ نہیں تھی۔ کوئی واردات، واقعہ اس کے اوپر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔

میں اس سے جب بھی ملتا رہا کوئی شکایت اس کی زبان پر نہیں ہوتی تھی۔ اب تو تین سال سے جانے والے کہاں غائب ہے۔ مجھے نظر نہیں آیا، لیکن میں اس کے حضور میں حاضری دیتا ہی رہا۔ اس کا درجہ چونکہ اس اعتبار سے بلند تھا کہ اس کی دوستی ایک بزرگ ترین ہستی سے تھی۔ میں ذرا اپنی گفتگو اور باتوں میں تھوڑا سا با ادب ہو گیا۔ میں نے اس سے کہا، یا رَسُولُ اللَّهِ! کیا تم اللہ کے ساتھ گفتگو بھی کرتے ہو؟ کہنے لگا، ہم تو شام کو جاتے، صبح کو آتے ہوئے منڈی سے سودا خریدتے ہوئے اس کے ساتھ ہی رہتے ہیں اور اسی کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں۔ میں نے کہا، کون اسی زبان میں؟ وہ کہنے لگا: ”اوہ پنجابی وی جاندے اے اردو جاندے ہے سنگھی جوہی بولی بولیں اوس بے جاندے اے!“ میں نے کہا تو مجھے بتایا تھا ایک دن کہ گیارہ برس ہو گئے تمہاری شادی کو اور تمہارا بچہ کوئی نہیں ہے؟ کہنے لگا، بچہ کوئی نہیں میں اور رضیہ کیلے ہیں۔ میں نے کہا، اللہ سے کہو کہ اللہ تجھے ایک بچہ دے۔ کہنے لگا، نہیں جی! تو ایک بڑی شرم کی بات ہے۔ بزرگوں سے ایسی بات کیا کرنی، ہر اسالگتا ہے۔ وہ خداوند تعالیٰ کو ایک بزرگ ترین چیز سمجھ کر کہہ رہا تھا کہ جی! بڑوں کے ساتھ ایسی بات نہیں کرنی۔ میں یہ کہتا فضول سا آدمی لوگوں کا کہ اللہ مجھے بچہ دے۔

میں نے کہا کہ کیا ایسے ہو سکتا ہے کہ ہماری بھی اس کے ساتھ دوستی ہو جائے؟ کہنے لگا، اگر آپ چاہیں تو ہو سکتا ہے۔ اگر آپ نہ چاہیں تو نہیں ہو سکتا۔ میں نے جیسا کہ میں پہلے عرض کر رہا تھا اپنے سارے برسوں کا میں نے جائزہ لیا، سارے دنوں کا، میں نے کبھی نہیں چاہا۔ میرا ایک خیال تھا کہ میں عبادت کروں گا اور عبادت ہی اس کا راز ہے اور عبادت کو ہی پیٹ کر رکھ دوں گا اپنے مصلے کے اوپر اور دن اور رات اسی طرح عبادت کرتا رہوں گا۔ لیکن وہ جو میرا منہماً ہے، وہ جو میرا محظوظ ہے، اس کی طرف جانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں یہی سمجھتا رہا اور آج تک یہی سمجھتا رہا ہوں کہ عبادت ہی یہ سارا راز اور سارا بھی ہے، حالانکہ عبادت سے ماوراء (میں یہ جو بات عرض کر رہا ہوں) یہ اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے کر رہا ہوں) عبادت سے پرے ہٹ کر ایک آرزو کی بھی تلاش ہے کہ میں اپنے آپ کو سمجھانے کے لیے کر رہا ہوں) عبادت سے نہ نظر میں آنے والی، اس کے ساتھ کوئی رابطہ قائم کروں، جیسا سلطان نے کیا تھا۔ جیسے اس کے علاوہ چار پانچ بندے اور بھی ہیں میری نظر میں۔ میں نے اس بات سے اندازہ لگایا کہ اتنا خوش آدمی میں نے زندگی میں کوئی نہیں دیکھا۔ جتنے بھی اللہ کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ تھے وہ انتہائی خوش تھے۔

1965ء کی جگہ میں اس (سلطان) کے پاس گیا، لوگ گھرائے بھی ہوئے تھے جذباتی بھی تھے۔ وہ ٹھیک تھا ویسے ہی، بالکل اسی انداز میں جیسے پہلے مل کرتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم مجھے کوئی ایسی بات بتاؤ جس سے میرے دل میں چلوکم از کم یہ خواہش ہی پیدا ہو جائے، خدا سے دوستی کی اور میں کم از کم اس پلیٹ فارم سے اُتر کر دنبر کے پلیٹ فارم پر آ جاؤ۔ پھر میں وہاں سے میرھیاں چڑھ کر کہیں اور چلا جاؤں۔ میری نگاہ اوپر ہو جائے تو کہنے لگا (حالانکہ ان پڑھ آدمی تھا، اب لوگ مجھ سے باہوں کا ایڈر لیں پوچھتے ہیں، میں انہیں کیسے بتاؤں کہ ایک سلطان سنگھاڑے والا دلی دروازے کے باہر جہاں تا نگے کھڑے ہوتے ہیں، ان کے پیچے کھڑا ہے جو بہت عظیم "بابا" ہے اور نظر آنے والوں کو شاید نظر آتا ہوگا، مجھے پورے کا پورا تو نظر نہیں آتا) بھاگی! بات یہ ہے کہ جب ہم اوپر مناخاتے ہیں تو ہم کو آسمان اور ستارے نظر آتے ہیں۔ اللہ کے جلوے دکھانی دیتے ہیں۔ کہنے لگا، آپ کبھی مری گئے ہیں؟ میں نے کہا، ہاں میں کبھی بار مری گیا ہوں۔ کہنے لگا، جب آدمی مری جاتا ہے ناپہاڑی پر تو پھر حال کا نظارہ لینے کے لیے وہ نیچے بھی دیکھتا ہے اور اوپر بھی۔ پھر اس کا سفر Complete ہوتا ہے۔ خالی ایک طرف مند کرنے سے نہیں ہوتا۔ جب آپ نیچے کو اور اوپر کو ملاتے ہیں، تو پھر ساری دسعت اس میں آتی ہے۔

اس نے کہا کہ یہ ایک راز ہے جب آدمی یہ سمجھنے لگ جائے کہ میں دسعت کے اندر داخل ہو رہا ہوں (وہ پنجابی میں بات کرتا تھا، اس کے الفاظ تو اور طرح کے تھے) پھر اس کو قربت کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن حوصلہ کر کے وہی پڑتا ہے جیسا کہ ببا جی کہتے تھے کہ "اے اللہ! تو میرے پاس آ جا مجھے میں تو اتنی بہت نہیں کہ میں آ سکوں" اور وہ یقیناً آتا ہے۔ بقول سلطان سنگھاڑے والے کے کہ اس کے لیے کہیں جانا نہیں پڑتا، اس لیے کہ وہ تو پہلے سے ہی آپ کے پاس موجود ہے اور آپ کی شرگ کے پاس کری ذال کر بیٹھا ہوا ہے۔ آپ اسے دعوت ہی نہیں دیتے۔ میں نے اس سے کہا اس کا مجھے کوئی راز بتا، مجھے کچھ یہی بات بتا کہ جس سے میرے دل کے اندر کچھ محسوس ہو۔ کہنے لگا، جی! آپ کے دل کے اندر کیا میں تو سارے پاکستان کے لاہور کے لوگوں سے کہنا چاہتا ہوں کہ جب وہ باہر نکلا کریں تو پورا بس پہن کر نکلا کریں۔ میں نے کہا، سارے ہی پورا بس پہننے ہیں۔ کہنے لگا، یہ دیکھتا نگے میں چار بندے بیٹھے ہوئے ہیں۔ پورا بس نہیں پہننا ہوا۔ میں نے کہا، یہ باوگز را ہے تھری پیس سوت پہنچا ہوا ہے اس نے تائی بھی لگائی ہوئی ہے۔ کہنے لگا، نہیں جی آدمی جب کم از کم باہر نکلے تو جس طرح لڑکیاں میک آپ کرتی ہیں، خاص طور پر باہر نکلنے کے لیے تو اس طرح آدمی کو بھی اپنے بس کے اوپر خصوصی توجہ دینی چاہیے۔

میں بھی سمجھتا رہا کہ وہ کوئی اخلاقی بات کرنا چاہتا ہے بس کے بارے میں جیسے ہم آپ

لوگ کرتے ہیں۔ کہنے لگا، لوگ سارے کپڑے تو پہن لیتے ہیں، لیکن اپنے چہرے پر مسکراہٹ نہیں رکھتے اور ایسے ہی آجاتے ہیں لڑائی کرتے ہوئے اور لڑائی کرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ توجب تک آپ چہرے پر مسکراہٹ نہیں جائیں گے، بس مکمل نہیں ہو گا۔ یہ جوتائے پر بیٹھے ہوئے ہیں چار آدمی کہنے لگا یہ تو برہمنہ جار ہے ہیں۔ مسکراہٹ اللہ کی شکرگزاری ہے اور جب آدمی اللہ کی شکرگزاری سے نکل جاتا ہے، تو پھر وہ کہیں کا نہیں رہتا۔ میں نے کہا، یا را! ہم تو بہت عبادت گزار لوگ ہیں۔ باقاعدگی سے نماز پڑھتے ہیں، روزے رکھتے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگا، جی! میں لاں قدی میں رہتا ہوں وہاں بابا اور یام ہیں۔ وہ رات کوبات (لبی کہانی) سنایا کرتے ہیں۔

انہوں نے میں ایک کہانی سنائی کہ پیر ان پیر کے شہر بغداد میں ایک بندہ تھا جو کسی پر عاشق تھا۔ اس کے لیے ترپنا تھا، روتا تھا، چھیں مارتا اور زمین پر سر پختا تھا۔ لیکن اس کا محبوب اسے نہیں ملتا تھا۔ اس شخص نے ایک بار خدا سے دعا کی کہ اے اللہ! ایک بار مجھے میرے محبوب کے درشن تو کرادے۔ اللہ تعالیٰ کو اس پر حرم آ گیا اور اس کا محبوب ایک مقررہ مقام پر جہاں بھی کہا گیا تھا، پہنچ گیا۔ دونوں جب ملے تو عاشق چھیلوں کا ایک برابر بندل لے آیا۔ یہ وہ خط تھے جو وہ اپنے اس محبوب کے بھر میں لکھتا رہا تھا۔ اس نے وہ کھول کر اپنے محبوب کو سنا نا شروع کر دیئے۔ پہلا خط سنایا اور اپنے بھر کے دھڑے بیان کیے۔ اس طرح دوسرا خط پھر تیر اخط اور جب وہ گیارہویں خط پر پہنچا تو اس کے محبوب نے اسے ایک تھہر رسید کیا اور کہا "گدھے کے پنج! میں تیرے سامنے موجود ہوں اپنے پورے وجود کے ساتھ اور تو مجھے چھیلیں سنارہا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی۔" سلطان کہنے لگا، بھاجی! عبادت ایسی ہوتی ہے۔ آدمی چھیلیں سناتا رہتا ہے، محبوب اس کے گھر میں ہوتا ہے، اس سے بات نہیں کرتا۔ جب تک اس سے بات نہیں کرے گا، چھیلیں سنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ایسے لوگ بڑے مزے میں رہتے ہیں۔ میں بڑا خخت حاصل ہوں ان کا، میں چاہتا ہوں کہ کچھ کیے بغیر کوشش Struggle کیے بغیر مجھے بھی ایسا ہی مقام مل جائے، مثلاً جی چاہتا ہے کہ میرا بھی ایک پرائز بانڈ نکل آئے ساڑھے تین کروڑ والا۔ لیکن اس سے پہلے میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ چاہے وہ پرائز بانڈ نکلے نہ لکلے (ایمانداری کی بات کرتا ہوں) مجھے وہ عیاشی میسر آجائے، جو میں نے پانچ آدمیوں کے چہرے پر ان کی روحوں پر دیکھی تھی، کیونکہ ان کی دوستی ایک بہت اوپنے مقام پر تھی۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ!!

میں کون ہوں؟

بہت دیر کا وعدہ تھا، جو جلد پورا ہونا چاہیے تھا، لیکن تاخیر اس لیے ہو گئی کہ شاید مجھ پر بھی کچھ اٹھ میرے پڑو سی ملک کا ہے کہ اس نے کشمیر یوں کے ساتھ بڑی دیر سے وعدہ کر رکھا تھا کہ ہم وہاں رائے شماری کرائیں گے لیکن آج تک وہ اسے پورا نہیں کر سکے۔ حالانکہ وہ وعدہ یو این او کے فورم میں کیا گیا تھا، لیکن میری نیت ان کی طرح خراب نہیں تھی۔ میں اس دیر کے وعدے کے بارے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انسانی وجود اس کی پرکھ جانچ اور اس کی آنکھ دیگر تمام جانداروں سے مختلف بھی ہے اور مشکل بھی۔ جتنے دوسرے جاندار ہیں ان کو بڑی آسانی کے ساتھ جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے، لیکن انسان واحد مخلوق ہے جس کے بارے میں کوئی حقیقی فیصلہ نہ تو باہر کا کوئی شخص کر سکتا ہے اور نہ خود اس کی اپی ذات کر سکتی ہے۔ انسانی جسم کو مانپنے تو نے کے لیے جیسے فوجیوں کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ آپ کا قدما پیش گئے وزن کریں گے، جسم کی محنت کو ملاحظہ کریں گے، بینائی دیکھیں گے یعنی باہر کا جو سارا انسان ہے، اس کو جانچیں اور پرکھیں گے اور پھر انہوں نے جو بھی اصول اور ضابطے قائم کیے ہیں، اس کے مطابق چلتے رہیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اندر کی مشینی کو جانچنے کے لیے بھی انہوں نے پیکانے بنائے ہیں۔ اگر آپ خدا نخواست کسی عارضے میں بمتلا ہیں تو اس کو کیسے جانچیں گے؟

ڈاکٹر اپنا اسٹیجنھو سکوب یعنی پرکھ کر دل کی دھڑکنیں اور گزگز اٹھیں منتظر ہے، تھرا میٹر استعمال کرتا ہے ایکسرے اٹر اساؤ ٹھ اوری ٹی سکین، یہ سب چیزیں انسان کے اندر کی بیماریوں کا پاتا دیتی ہیں۔ پھر اس کے بعد تیسری چیز انسان کی دماغی اور نفسیاتی صورت حال کا جائزہ لینا ہوتا ہے۔ تفیيات دا ان اس کو جانچتے ہیں۔ انہوں نے کچھ تصویری خاکے اور معنے بنائے ہوتے ہیں۔ ایک مشین بنا کر ہی ہے، جو آدمی کے سچ یا جھوٹ بولنے کی کیفیت بتاتی ہے۔ کچھ ایسی مشینیں بھی ہیں جو شعاعیں ڈال کر پتلی کے سکڑنے اور پھیلنے سے اندازہ لگاتی ہیں کہ اس شخص کا اندازہ تکم اور اندازہ زیست کیسا ہے؟

تفیيات کے ایک معروف ٹیسٹ میں ایک بڑے سے سفید کاغذ پر سیاہی گردادی جاتی ہے اور

اس کا غذ کی تہ رکھ دیتے ہیں۔ جب اس کو گھولا جاتا ہے تو اس پر کوئی تصور یہ چڑیا، طوطا یا تلی بنی ہوئی ہوتی ہے اور پوچھا جاتا ہے کہ آپ کو یہ کیا پیز نظر آتی ہے؟ اور پھر دیکھنے والا اس کو جیسا محسوس کرتا ہے بتلاتا ہے۔ کوئی اسے خوبصورت چڑیا سے تعبیر کر کے کہتا ہے اسے ایک چڑیا نظر آرہی ہے، جو گاتی ہوئی اڑی جا رہی ہے۔

ایک اور مزانج کا بندہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ اس میں ایک بڑھیا ہے، جوڈ ندا پکڑے بیٹھی ہے اور اس کی شکل میرے جیسی ہے۔ اس طرح سے دیکھنے والے کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگایا جاتا ہے۔ جانوروں کو بھی اسی معیار پر کھا جا سکتا ہے۔ قصائی جس طرح بکرے کو دیکھ کر پیارا یا مندرست کا پتا چلا لیتا ہے۔ بھینس کو دیکھ کر بھی اندازہ لگایا جاتا ہے کہ یہ اچھی بھینس ہے یا نہیں۔ گھوڑوں کو بھی چیک کر لیا جاتا ہے۔ جانوروں کا چیک کرنا اس لیے بھی آسان ہے کہ اگر ہم جانور کے ساتھ کسی خاص قسم کا برداشت کریں گے تو وہ بھی جواب میں دیساہی برداشت کرے گا۔ لیکن انسان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ممکن ہے کہ آپ ایک آدمی کو زور کا تھپٹہ ماریں اور وہ پستول نکال کر آپ کو گولی مار دے۔ ممکن ہے کسی کو ایک تھپٹہ ماریں اور وہ جھک کر آپ کو سلام کرے یا ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جائے۔ اس لیے انسان کے حوالے سے کچھ طے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو جانچنا ہمارے صوفیائے کرام اور ”بابے“ جن کا میں اکثر ذکر کرتا ہوں، ان کے لیے ہمیشہ ایک مسئلہ رہتا ہے کہ انسان اندر سے کیا ہے؟ اور جب تک وہ اپنے آپ کو نہ جان سکے اس وقت تک وہ دوسروں کے بارے میں کیا فیصلہ کر سکتا ہے۔

آپ کے جتنے بھی ایم این اے اور ایم پی اے ہیں یہ ہمارے بارے میں بیٹھ کر فیصلے کرتے ہیں، لیکن وہ خود یہ نہیں جانتے کہ وہ کون ہیں؟ یہ ایسے تیراک ہیں جو ہم کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کو خود تیرنا نہیں آتا۔ سیکھا ہی نہیں انہوں نے۔ جو گھری نظر رکھنے والے لوگ ہیں وہ جاننا چاہتے ہیں۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ کبھی اگر آپ نے غور کیا ہو یا نہ کیا ہو، لیکن آپ کے لاشور سے یہ آواز آتی ہی رہتی ہے کہ ”میں کون ہوں؟“ اور ”میں کہاں ہوں؟“ اور اس سارے معاملے اور کائنات میں کہاں فٹ ہوں، اس کے لیے ہمارے بابوں نے غور کرنے اور سوچنے کے بعد اور بڑے لمبے وقت اور وقتنے سے گزرنے کے بعد اپنی طرز کا طریق سوچا ہے، جس کے کئی رنخ ہیں۔ آسان لفظوں میں وہ اس نے طریق کو ”فکر“ یا ”مراقبی“ کا نام دیتے ہیں۔

اب یہ مراقبہ کیوں کیا جاتا ہے، اس کی کیا ضرورت ہے، کس لیے وہ بیٹھ کر مراقبہ کرتے ہیں اور اس سے ان کو آخرا حل کیا ہوتا ہے؟ مراقبہ کی ضرورت اس لیے محسوس ہوتی ہے کہ کوئی ایسی مشین یا آئل ایجاد نہیں ہوا، جو کسی بندے کو لگا کر یہ بتایا جاسکے کہ what am i? who am i? کیسی کیا ہوں؟ اس کے لیے انسان کو خود ہی مشین بننا پڑتا ہے، خود ہی سمجھیاں بننا پڑتا ہے اور خود ہی جانچنے والا۔

اس میں آپ ہی ڈاکٹر ہے، آپ ہی مریض ہے۔ یعنی میں اپنا سراغ رسال خود ہوں اور اس سراغ رسالی کے طریقے مجھے خود ہی سوچنے پڑتے ہیں کہ مجھے اپنے بارے میں کیسے پتا کرنا ہے۔ بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں بڑے ہی پیارے لیکن ان سے کچھ ایسی باتیں سرزد ہوتی رہی ہیں کہ وہ جیران ہوتے ہیں کہ میں عبادت گزار بھی ہوں میں بھلا، اچھا آدمی بھی ہوں۔ لیکن مجھے یہیں معلوم کہ میں ہوں کون؟ اور پتا اسے یوں نہیں چل پاتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے انسان کے اندر اپنی پھونک ماری ہوئی ہے اور وہ چل آرہی ہے۔ اس کو آپ Erase نہیں کر سکتے۔ اس کو آپ پر وہ کھوں کر دیکھ نہیں سکتے، آپ ایک لفظ یا درکھی گا Self یعنی "ذات" کا۔ اقبال جسے خودی کہتا ہے۔ خودی کیا ہے؟ اس لفظ خودی کے لیے کتنی الفاظ ہیں، لیکن "ذات" زیادہ آسان اور معنی خیز ہے۔

حضرت علام اقبال نے اس لفظ کو بہت استعمال کیا اور اس پر انہوں نے بہت غور بھی کیا۔ اب اس ذات کو جانے کے لیے جس ذات کے ساتھ بہت سارے خیالات چھٹ جاتے ہیں، جیسے گز کی ڈلی کے اوپر تکھیاں آجیتی ہیں یا پرانے رخم پر بھجناتی ہوئی تکھیاں آکر چھٹ جاتی ہیں۔ خیال آپ کو کنڑوں کرتا ہے اور وہ ذات وہ خوبصورت پارس جو آپ کے میرے اندر رہ سب کے اندر موجود ہے وہ کستوری جو ہے وہ چھپی رہتی ہے۔ اس کو تلاش کرنے کے لیے اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگ (مراقب) کرتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی خوش قسمت کے پاس ایسا گرا جاتا ہے کہ وہ چند سینڈ کے لیے اس خیال کی تکھیوں کی بھجنناہٹ کو دو کر دیتا ہے اور اس کو وہ نظر آتا ہے۔ لیکن خیال اتنا خالم ہے کہ وہ اس خوبصورت قابلِ رشتہ زریں چیز کو ہماری نگاہوں کے سامنے آنے نہیں دیتا۔

جب آپ دو تین چار مینے کے تھے تو اس وقت آپ اپنی ذات کو بہت اچھی طرح سے جانتے تھے۔ جو محضہ میت دے کر اللہ نے آپ کو پیدا کیا تھا، اس کا اور آپ کی ذات کا رشتہ ایک ہی تھا۔ آپ وہ تھے وہ آپ تھا۔ ایک چیز تھا دوپونے دو سال یا کوئی ہی بھی مدت مقرر کر لیں۔ جب خیال آکر آپ کو پکڑا نے لگا تو وہ پھر یہ ہوا کہ آپ گھر میں بیٹھتے تھے۔ ماں کی گود میں۔ کسی کی بہن آئی انہوں نے آ کر کہا کہ اوہ ہوانسین یہ جو تمہارا بیٹا ہے یہ تو بالکل بھائی جان جیسا ہے۔ س بیٹا صاحب نے جب یہ بات سن لی تو اس نے سوچا میں تو ابھی ہوں۔ ایک خیال آ گیا تاذہن میں، حالانکہ وہ ہے نہیں ابھی۔ پھر ایک دوسری پھوپھی آگئیں۔ انہوں نے آ کر کہا کہ اس کی تو آ کا یہیں بڑی خوبصورت ہیں، تو اس پھر نے سوچا میں تو خوبصورت آنکھوں والا ہیر ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ انسان نے اپنی ذات کے آگے سائیں بورڈ لیکا نے شروع کر دیئے ہیں، پھر اسٹر لینڈ پر ایم منسٹر خوبصورت اور طاقتور وغیرہ۔ اس طرح کے کتنے سارے سائیں بورڈ لیکا کر رہم آپ سارے جتنے بھی ہیں نے اپنے سائیں بورڈ لیکا کھے ہیں اور جب ملنے کے لیے آتے ہیں تو تم اپنا ایک سائیں بورڈ آنگے کر دیتے

ہیں کہ میں تو یہ ہوں اور اصل بندہ اندر سے نہیں نکلا اور اصل کی خلاش میں ہم مارے مارے پھر رہے ہیں۔

خداعالی نے اپنی روح ہمارے اندر پھونک رکھی ہے۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ اس سے فائدہ اٹھائیں اس کی خوبیاں باریں، اس کے لیے لوگ ترقے ہیں اور لوگ جان مارتے ہیں۔ وہ ذات جو اللہ کی خوبیوں سے معطر ہے اس کے اوپر وہ خیال جس کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا بڑا بوجھ پڑا ہوا ہے۔ وہ خیال کسی بھی صورت میں چھوڑنا نہیں ہے، اس خیال کو اس کستوری سے ہٹانے کے لیے مراقبہ کی ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ اس لیے کہ آدمی ذرا تھیک ہو۔ اس کو پتا چلے کہ وہ کیا ہے، اس سے پھر اسے نماز میں بھی مرا آتا ہے۔ عبادت، گفتگو ملنے مانے میں ایک دوسرے کو سلام کرنے میں بھی مرا آتا ہے۔ ایک خاص تعقیل پیدا ہوتا ہے اس کے لیے جس کا بتانے کا میں نے وعدہ کیا تھا۔

آسان ترین نسخہ یہ ہے کہ دو اوقات صبح اور شام صحیح فجر پڑھنے کے بعد اور شام کو مغرب کے بعد (یہ اوقات ہی اس کے لیے زیادہ اچھے ہیں) آپ نہیں منت نکال کر گھر کا ایک ایسا کونہ تلاش کریں، جہاں دیوار ہو جو عمودی ہو، وہاں آپ چارز انو ہو کر ”چوکری“ مار کر بیٹھ جائیں۔ اپنی پشت کو بالکل دیوار کے ساتھ سیدھا لگائیں، کوئی جھکاؤ، ”کب“ نہ پیدا ہو۔ یہ بہت ضروری ہے، کیونکہ جو کرنٹ چلانا ہے، نیچے سے اور پتک وہ سیدھے راستے سے چلتا ہے۔

اب ماڈرن زندگی ہے، بہت سے لوگ چوکری مار کر نہیں بیٹھتے۔ انہیں اجازت ہے کہ وہ کرسی پر بیٹھ جائیں، لیکن اس صورت میں پاؤں زمین کے ساتھ لگدے رہنے چاہیں اور آپ کو Earth ہو کر رہتا چاہیے۔ جب تک آپ ارتحا نہیں ہوں گے اس وقت تک آپ کو مشکل ہو گی۔ پاؤں کے نیچے دری قالین بھی ہوتا کوئی بات نہیں، لیکن زمین ہوتا بہت ہی اچھا ہے۔ چونکہ فقری لوگ جنگلوں میں ایسا کرتے تھے وہ ذاڑیکٹ، ہی زمین کے ساتھ وابستہ ہو جاتے تھے۔ ہماری زندگی ذرا اور طرح کی ہے۔ جب آپ دہاں بیٹھ جائیں گے تو پھر آپ کو ایک سہارے کی ضرورت ہے، جس کو آپ پکڑ کر اس سیڑھی پر چڑھکیں، جو لگالی ہے، صرف یہ جھانکنے کے لیے کہ ”ذات“ کیا چیز ہے؟ اس کے لیے ہر کسی کے پاس ایک ”ڈیوائس“ ایک آلات ہے، جو سانس ہے، جو ساتھ ہے، بیٹھنے کے بعد آپ اپنے سانس کے اور ساری توجہ مرکوز کر دیں اور یہ دیکھیں کہ ہر چیز سے ذور ہٹ کر جس طرح ایک بلی اپنا شکار پکڑنے کے لیے دیوار پر بیٹھی ہوتی ہے۔ اپنے شکار یعنی سانس کی طرف دیکھیں کہ یہ جا رہا ہے اور آ رہا ہے۔

اس کام میں کوتا ہی یا غلطی یہ ہوتی ہے کہ آدمی سانس کو ضرورت سے زیادہ توجہ کے ساتھ لینے لگ جاتا ہے، یہ نہیں کرنا۔ آپ نے اس کو چھوڑ دینا ہے بالکل ڈھیلا صرف یہ محسوس کرنا ہے کہ یہ کس طرح سے آتا ہے اور جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ پہلے دن تقریباً ایک سینٹڈ یا ڈریٹھ سینٹڈ تک

سنس کے ساتھ چل سکیں گے اس کے بعد خیال آپ کو بھاگ کر لے جائے گا۔ وہ کہے گا کہ یہ بنده تو اللہ کے ساتھ واصل ہونے لگا ہے میں نے تو بڑی محنت سے اس کو خیالوں کی دنیا میں رکھا ہے (وہ خیال چلتا رہتا ہے موت تک۔ لوگ اکثر شکایت کرتے ہیں کہ جی نماز پڑھنے لگتے ہیں تو بڑے خیال آتے ہیں) وہ خیال آپ کو کہیں کافی ذور تک لے جائے گا۔ جب آپ کو یہ خیال آئے کہ میں تو پھر خیال کے بغیر گھیرے یا چگل میں آ گیا چاہے اسے میں من بھی گزر چکے ہوں، آپ پھر لوٹیں اور پھر اپنے سانس کے اوپر توجہ مرکوز کریں اور جتنی دیر ہو سکے سانس کو دیکھیں محسوس کریں۔

لیکن زیادہ کوشش نہیں کرنی اس میں جنگ و جدل اور جدوجہد نہیں ہے کہ آپ نے کوئی کشتی لڑنی ہے۔ یہ ڈھیلے پن کا ایک کھیل ہے اور اسی مخصوصیت کو واپس لے کر آتا ہے جب آپ ایک سال کے تھے اور جو آپ کے اندر تھی، یا چلنے لگے تھے، تو تھی۔ اس میں بچہ مخصوصیت کو لینے کے لیے زور تو نہیں لگاتا ہے نا! جب یہ پروس آپ کرنے لگیں گے تو آپ کا عمل ایسا ہونا چاہیے یا ہو جیسا کہ ٹینس کے کھلاڑی کا ہوتا ہے۔ ٹینس کھیلنے والا یا کھیلنے والی کی زندگی ٹینس کے ساتھ وابستہ ہے (یہ بات میں نے مشاہدے سے محسوس کی ہے)۔ آپ یعنی گمان نہیں کر سکتے کہ ٹینس کا کھلاڑی آپ کو ہر حال میں ٹینس کو روث میں اپنی گیم Improve کرتا ہی ملے گا۔ اگر غور سے دیکھیں تو ٹینس کا کھلاڑی ہم سے آپ سے بہت مختلف ہوتا ہے، کیونکہ وہ ہمیشہ ٹینس ہی کھاتا ہے، ٹینس ہی پہنتا ہے، ٹینس ہی پہنتا ہے اور ٹینس ہی چلتا ہے۔ یہ اس قدر اس پر حاوی اور طاری ہو جاتی ہے اس معاملے میں بھی آپ چاہے مراثی کے اندر ہوں یا باہر نکل آئے ہوں، آپ نے دفتر جانا، منڈی جانا ہے، کام پر جانا ہے، دکان پر جانا ہے، لیکن ٹینس کے کھلاڑی کی طرح آپ کے اندر یہ ایک طلب ہونی چاہیے دل گلی ہونی چاہیے کہ میں نے ذات کے ساتھ ضرور واصل ہونا ہے۔

یہ سراغِ رسانی کا ایک کھیل ہے۔ مثلاً میں اب آپ کے سامنے ہوں، فوت ہو جاؤں گا، بکری کی طرح۔ بکری آتی اس نے بچہ دینے دو دھپیا، ذبح کیا۔ زندگی میں کوئی کام ہی نہیں تو یہ جاندار جو دوسرے جاندار ہیں، ان میں جان ضرور ہے، سب میں لیکن روح نہیں ہے۔ دیکھئے اتنا سافر قت ہوتا ہے کہ لوگ کہہ دیتے ہیں ہمارے غیر مسلم دوست کہ جانوروں پر ظلم کرتے ہیں آپ ان کو کھا جاتے ہیں۔ کھاتے ہم اس لیے ہیں کہ ظلم تو جب ہوتا کہ اس کے اندر روح ہوتی اور اس میں ایک Sensibility ہوتی، وہ تو ہے ہی نہیں۔ جب وہیں مجھلی اپنا منہ کھلوتی ہے تو تقریباً ساری ہے تین ہزار مچھلیاں ایک لمحے کے اندر اس کے منہ میں چلی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا فلموں میں چھلانگ مار کر خود ہی جا رہی ہوتی ہے تو یہ اس کی کیفیت ہے۔ اب آپ جاندار تو ہیں، لیکن آپ کے ساتھ روح ہے۔ اس روح کی تلاش کے لیے اس کی اثراساؤڈ بننے کے لیے آپ کو خود مشکل میں جانا پڑتا ہے۔

اس کے بغیر چارہ نہیں۔

یہ ایک بڑا پلطف تجربہ یوں ہے۔ اچھا اس سے آپ کو کچھ ملے گا نہیں کہ جب آپ مر اقہ کریں گے تو آپ کو انعامی بانڈ کا نمبر ل جائے گا، نہیں ایسی بات نہیں۔ لیکن آپ آسودہ ہونے لگیں گے۔ اتنے ہی آسودہ جتنے آپ بچپن میں تھے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ یہاں آپ اپنے بچوں کو پوتوں کو بخوبی کو دیکھیں گے۔ آج کے بعد دیکھیں گے کہ یہ کتنی آسودگی کے ساتھ بجا گا پھرتا ہے۔ اس کو کچھ پتا نہیں اور اللہ بھی یہ فرماتا ہے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں ان کا ایک اندازہ ہے کہ جب آپ جنت میں داخل ہوں گے یا جنت میں جانے لگیں گے تو اللہ گیث کے باہر کھڑا ہو گا اور یہیے گیث کیپر گیث پاس نہیں مانگا کرتا، آپ باہر جا کر کھڑے ہیں تو اللہ کہے گا کہ وہ معصومیت جو دے کر میں نے تمہیں پیدا کیا تھا وہ واپس کر دو اور اندر چلو اور ہم سارے کہیں گے کہ سلام نے تو بی اے بڑی مشکل سے کیا ہے اور بڑی چالاکی سے ایم اے کیا تھا۔ ہم تو معصومیت بینتے رہے ہیں۔ وہ تواب ہمارے پاس نہیں۔ اس معصومیت کی تلاش میں اس روح کی تلاش کی ضرورت ہے۔ اس میں اگر کوئی اور کوتا ہیاں دغیرہ ہو گئی ہیں اس میں تو آئیں گی ضرور کیونکہ سب سے نجک کرنے والی چیز وہ خیال ہے وہ ماں نہ ہے۔ بابے کہتے ہیں کہ جو وہ جو دے ہے ذات کا اور جو ذات ہے اللہ کی وہ قلب ہے۔ یعنی ہمارا یہ ہارت جس کا ہاتھ پاس ہوتا ہے۔ نہیں قلب اس کے قریب ہی اس کے ڈاؤن پر ایک ذیور ہائچ کے فاصلے پر قلب کا ایک مقام ہے جو کہ یہ بھی نظر نہیں آتا ہم کو روح کا معاملہ اور اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے تم کو علم دیا ہے ”القلیل“ تھوڑا ہے نہیں جان سکو گے روح کے بارے میں تو وہ اندازہ یہ لگاتے ہیں، ماں نہ جو ہے وہ اس کے اوپر حملے کرتا رہتا ہے اور وہ دیکھتا رہتا ہے کہ میں نے کس طرح سے آدمی کو پکڑ کے پھر پھرے میں قید کرنا ہے۔ یہ وعدہ تھا بڑی دری کا وہ آخر کار پورا ہوا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔

Psycho Analysis

کبھی بھی زندگی میں یوں بھی ہوتا ہے کہ بہت زیادہ خوشیوں اور بڑی راحتوں کے ساتھ ان کے پیچے چھپی ہوئی مشکلات بھی آ جاتی ہیں اور پھر ان مشکلات سے جان چھڑانی یوں مشکل ہوتی ہے کہ انسان کچھ گھبرا یا ہوا ملا گتا ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے ہاں بہت بارشیں ہوئیں۔ بارشیں جہاں خوشیوں کا پیغام لے کر آئیں، وہاں کچھ مشکلات میں بھی اضافہ ہوا۔ ہمارے گھر میں ایک راستہ جو چھوٹے دروازے سے ڈرائیکٹ روم میں کھلتا ہے اور پھر اس سے ہم اپنے گھر کے سین میں داخل ہوتے ہیں، بارشوں کی وجہ سے وہ چھوٹا دروازہ کھول دیا گیا، تاکہ آنے جانے میں آسانی رہے۔ آسانی تو ہوئی، لیکن اس میں ایک پیدا ہو گئی۔ وہ یہ کہ باہر سے جو جوتے آتے تھے وہ کچھ سے لختے ہوئے ہوتے تھے اور باہر جو دکوش کے اور انہیں صاف کرنے کے، پیچھے تو اندر آئی جاتا تھا اور اس سے سارا قائم خراب ہو جاتا تھا۔

میں چونکہ اب تیزی سے بوڑھا ہو رہا ہوں اور بوڑھے آدمی میں کنٹروں کی صلاحیت کم ہوتی جاتی ہے۔ تو میں چیختا چلاتا تھا اور ہر اندر آنے والے سے کہتا کہ جوتا اتار کر آؤ اور اسے پہننے کے بجائے ہاتھ میں پکڑ کر آؤ۔ اس سے میرے پوتے اور پوچیاں بہت جیران ہوتے تھے کہ اس جوتے کا فائدہ کیا، جو گھر کے دروازے پر پہنچ کر اتارا جائے اور ہاتھ میں پکڑ کر گھر میں داخل ہوا جائے۔ وہ بیچارے کوئی جواز تو پیش نہیں کرتے تھے، لیکن جوتے اتارتے بھی نہیں تھے۔ جس سے میری طبیعت میں پہنچی اور ختنی بڑھتی گئی اور میں سوچتا تھا کہ یہ مسئلہ صرف اسی طرح سے ہی حل ہو سکتا ہے: جس طرح میں سوچتا ہوں۔ میری ہونے کوئی اعتراض تو مجھ پر نہیں کیا اور نہ ہی اس نے مجھے کوئی جواب دیا۔ وہ شام کو بازار گئی اور اس نے دو میٹ خریدے۔ ایک تاروں کا بنا ہوا اور دوسرا موٹا بالوں والا۔ اب جب تاروں کے میٹ سے پاؤں رگڑے جاتے تو وہ ”رندے“ کی طرح صاف کر دیتا اور پھر موٹے بالوں کا موٹا دیز میٹ مزید صفائی کر دیتا تھا۔ یہ بعد میں رکھا گیا تھا۔ جب میں نے یہ عمل دیکھا اور میں اس پر غور کرتا رہا تو مجھے کافی شرمدی ہوئی کہ میں جو اپنی دلنش کے زور پر اپنے علم اور عمر کے تجزے پر بیات کہہ

رہا تھا، وہ اتنی ٹھیک نہیں تھی اور اس لڑکی (بہو) نے اپنا آپ اپلاں کر کے اس مسئلے کا حل نکال دیا اور ہمارے درمیان کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا۔

مجھے خیال آیا کہ انسان اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے دوسروں پر تقدیز یادہ کرتا ہے اور خود میں تبدیلی نہیں کرتا۔ اس مسئلے سے آپ خود بھی گزرتے ہوں گے۔ ہم نے یہ وظیرہ ہنا لیا ہے کہ چونکہ مجھے ماں اس طرح سے کہتی ہے اور فلاں اس طرح سے کہتا ہے اس لیے یہ کام نہیں ہو سکتا۔ ماں بھی میں خرابی ہے یا چاچا ٹھیک نہیں یا پھر محلے والے یا حکومت خراب ہے۔ ٹرانسپرنسی نہیں ہے اور سُسُم ہی ٹھیک نہیں، اس لیے جعلہ گندہ ہے۔ اگر کہیں پانی کھڑا ہوتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ گورنمنٹ اس پر توجہ نہیں دیتی اور اپنی خرابی سے ہٹ کر ہمارے پاس بہت سارے جواز اور بہانے موجود ہوتے ہیں اور یہ ہماری زندگی میں پھیلتے رہتے ہیں۔

کچھ خوش قسمت ملک ہیں جہاں لوگ اپنے سائل اپنے طور پر یا خود ہی حل کر لیتے ہیں۔ جو ان کے کرنے کے ہوتے ہیں۔ میری ایک نوای ہے اس نے ڈرائیورگ لائنس کے لیے اپلاں کیا۔ وہ ایک سکول سے دو تین ماہ ڈرائیورگ کی تعلیم بھی لیتی رہی۔ لائنس کے لیے ڈرائیک پولیس والوں نے اس کا ٹائمیٹ لیا، لیکن وہ بیچاری ٹیل ہو گئی۔ وہ بڑی پریشان ہوئی اور مجھ سے آکر لڑائی کی کہ نانا یہ کیسی گورنمنٹ ہے لائنس نہیں دیتی۔ وہ خود میں خرابی تسلیم نہیں کرتی تھی بلکہ اسے سُسُم کی خرابی قرار دیتی تھی۔ ایک ماہ بعد اس نے دوبارہ لائنس کے لیے اپلاں کیا اب مجھے جتنی آیات آتی تھیں، میں نے پڑھ کر اللہ سے دعا کی کہ اس کو پاس کردے گرئے میری شامت آجائے گی۔ لیکن وہ ٹائمیٹ میں پاس نہ ہوئی اور ڈرائیک والوں نے کہا کہ بی بی آپ کو ابھی لائنس نہیں مل سکتا تو وہ رونے لگی، شدت سے اور کہنے لگی تم بے ایمان آدمی ہو اور تمہارا ہمارے خاندان کے ساتھ کوئی یہر چلا آ رہا ہے اور چونکہ تمہاری ہمارے خاندان کے ساتھ لگتی ہے اس لیے ڈرائیک والوں مجھے لائنس نہیں دیتے۔ وہ بڑے جیران ہوئے اور کہنے لگدے کہ ہم تو آپ کے خاندان کو نہیں جانتے۔ وہ کہنے لگی ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے اور میں اس ظلم پر احتجاج کروں گی۔ اخبار میں بھی لکھوں گی کہ آپ لوگوں نے مجھے لائنس دینے سے انکار کیا، ایسا میری ایسی کے ساتھ اور ایسا ہی سلوک میری نانی کے ساتھ بھی کیا، جو پرانی گریجو ایسٹ تھیں اور اس طرح ہماری تین ”پیڑھیوں“ (سلوک) کے ساتھ ظلم ہوتا چلا آ رہا ہے۔ جس سے آپ کا ہمارے ساتھ ہیرو اسخ ہوتا ہے۔

وہ ابھی تک اپنے ذہن میں یہ بات لیے بیٹھی ہے کہ چونکہ ڈرائیک پولیس والوں کی میرے خاندان کے ساتھ ناچاقتی ہے اور وہ اس کو برآ بھجتے ہیں، اس لیے ہمیں لائنس نہیں دیتے۔ اپنی کوتا ہی دُور کرنے کے بجائے آدمی ہمیشہ دوسرے میں خرابی دیکھتا ہے۔ بندے کی یہ خامی ہے۔ میں اپنے

آپ کو فہیک کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں اور ہمیشہ دوسرے کی خامی بیان کروں گا، جیسا کہ میں قالمیں پر کچھ کے حوالے سے اپنے فیصلے کو آخري قرار دے دیا تھا کہ مواعی جو تے ہاتھ میں پکڑنے کے اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ اگر کوئی گروہ انسانی اپنے آپ کو Search کرتا چاہتا ہے اور راست روی پر قائم ہونا چاہتا ہے تو پھر اسے اپنا تجزیہ اور Analysis کرنا پڑے گا۔ میں اپنا تجزیہ کرنے کے لیے برازو زور لگاتا ہوں، لیکن کرنیں پاتا۔ حالانکہ دوسرے کا تجزیہ فوراً کر لیتا ہوں۔ میں ایک سینئنڈ میں بتا دیتا ہوں کہ میرے محلے کا کون سا آدمی کر پڑتے ہے۔ میرے دوست میں کیا خرابی ہے، لیکن مجھے اپنی خرابی نظر آتی ہی نہیں۔ میں نے برازو زور لگایا ہے بڑے دم درود کروائے ہیں۔ Psycho Analysis کروایا، پہنچا نرم کروایا کہ میرا کچھ تو باہر آئے اور مجھے اپنی خامیوں کا پتہ چلے۔ مجھے لگتا ہے کہ میں تو ایک بہت بکھدار عاقل، فاضل ہوں۔ مجھ سے زیادہ بڑا دانشمند آدمی تو ہے ہی نہیں۔ اگر آپ مطالعہ کریں اور کھلی نظر وہ دیکھیں تو آپ پر یہ کیفیات عجیب و غریب طریقے سے وارد ہوں گی کہ بنہدہ اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے اور اصل میں ہوتا کیا ہے۔

میرے ایک کزن ہیں۔ وہ قصور میں رہتے ہیں۔ جب ہم جوان تھے اور نئی نئی ہماری شادی ہوئی تھی، یہ ان دنوں کی بات ہے۔ اس کے ہال بچہ ہونے والا تھا۔ وہ رات کے ایک بجے قصور سے لاہور کے لیے چل پڑا۔ بالکل عین وقت پر بجائے اس کے کہ وہ اس کا قبل از وقت بند و بست کرتا، اب ایک بجے وہ گاڑی میں چلے اور سارا راست طے کر کے پریشانی کے عالم میں لاہور پہنچے اور اللہ نے کرم کیا کہ وہ وقت پر لاہور پہنچ گئے۔ صحیح میں نے اس سے کہا کہ اے جاہل آدمی! تجھے اتنی عقل ہونی چاہیے کہ پہلے اپنی بیوی کو لاہور لے آتا۔ اس نے کہا نہیں نہیں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ میں خود اندازہ لگا سکتا ہوں کہ اسے کب لے جانا ہے اور اللہ نے مجھے یہ فہم دی ہے۔ میں نے کہا فرض کرو رات کے ایک بجے گاڑی چلاتے ہوئے کوئی ایسی پیچیدگی یا مشکل پیدا ہو جاتی اور ریحانہ (بیوی) کی تکلیف بڑھ جاتی، تو پھر تم کیا کرتے؟ کہنے لگا کہ اگر تکلیف بڑھ جاتی تو میں اس کو ڈرائیور گ سیٹ سے اٹھا کر پچھلی سیٹ پر ڈال دیتا اور خود ڈرائیور کرنے لگ جاتا۔ پتہ یہ چلا کہ صاحب زادہ ڈرائیور بھی اسی سے کرواتا آیا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میری دانش اور میری سوچ یہ بالکل آخری مقام پر ہے اور اس سے آگے سوچنے کی کوئی محنت نہیں۔

ہمارے سیانے یہ کہا کرتے ہیں کہ دیواروں سے بھی مشورہ کر لینا چاہیے۔ یہ ناظم اور کونسلر زکی کیشیاں تو اب بنی ہیں۔ پندرہ سال پہلے ہماری ریڈ یوکی ایک یونین ہوا کرتی تھی۔ اس میں ہم کچھ نئی باتیں سوچتے تھے۔ اپنے آپ کو یا کار کر دگی بہتر بنانے کے لیے اور سننے والوں کو آسانیاں عطا کرنے کے لیے۔ اس دور میں ریڈ یوکا خاصا کام ہوا کرتا تھا۔ ہماری یونین کے ایک

صدر تھے۔ انہوں نے ایک روز مینگ میں یہ کہا کہ ظاہر ہے کہ اجلاس میں آپ خرایاں ہی بیان کریں گے اور میں آپ لوگوں سے یہ درخواست کروں گا کہ آپ تیرہ اور پندرہ منٹ تک جتنی براہیاں بیان کر سکتے ہیں، کریں۔ لیکن پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں اور جو اصحاب اپنا موقف تقریر میں بیان نہیں کر سکتے، وہ یہ آسان کام کریں کہ تیرہ گالیاں دیں اور کھڑے ہو کر اچھی گندی بری گالیاں کھٹا کھٹ دے کر بیٹھ جائیں، کیونکہ کسی نے ہمیں کوئی تعمیری چیز تو بتانی نہیں، بعض ہی نکالنے ہیں اور بہتر سی ہے کہ آپ ایسا کر لیں۔ ہم نے کہا کہ اگر انہوں نے اجازت دے دی ہے تو ایسا ہی کریں اور واقعی پیشہ لوگوں نے گالیوں پر ہی اتفاق کیا، کیونکہ آسان کام ہی تھا، آپ لوگوں نے اب بھی اخبارات میں دیکھا ہو گا کہ تعمیری کام کیسے کیا جائے کے بجائے ہم زیادہ تنقید ہی کرتے ہیں اور حل پر زور کم دیتے ہیں۔

یہ مشکلات بہت چھوٹی اور معمولی ہیں، لیکن انہیں کس طرح سے اپنی گرفت میں لیا جائے۔ یہ کام بظاہر تو آسان نظر آتا ہے، حقیقت میں بہت مشکل ہے۔ جب ہمارا یہ یوٹیشن نیا نیا بناتھا تو بارش میں اس کی پچھتوں پر ایک توپانی کھڑا ہو جاتا تھا اور دوسرا کھڑکی کے اندر سے پانی کی اتی دھاریں آ جاتیں کہ کاغذ اور ہم خود بھی بھیگ جاتے۔ ایک روز ایسی ہی بارش میں ہم سب بیٹھ کر اس کو تعمیر کرنے والے کو صلوٰتیں سنانے لگے کہ ایسا ہی ہونا تھا۔ بیچ سے پیسے جو کھالیے ہوں گے وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے ساتھ ہمارے ایک ساتھی قدری ملک وہ صوتی اثرات کے ماہر تھے۔ وہ سائیکل بڑی تیز چلاتے تھے۔ دلبے پتے آدمی تھے۔ وہ تیز بارش میں سائیکل لے کر غائب ہو گئے۔ ان کے گھر میں پرانا کنٹر کا ایک ٹکڑا پڑا تھا۔ وہ اسے لے آئے اور چھٹت پرانہوں نے نسٹر کے ٹکڑے کو تیز حاکر کے ایک اینٹ نکال کر فرخ کر دیا۔ اس طرح پر نالہ بن گیا اور چھٹت کا اور بارش کا پانی کر کرے میں آئے بغیر شر رر... کرتا باہر گرنے لگا۔ ہم نے کہا کہ بھی یہ کیا ہو گیا۔ بھی بوچھاڑ اندر کو آ رہی تھی، تو قدری ملک کنبے لگا، پتہ نہیں کیا ہو گیا۔ لیکن اب تو نہیک ہو گیا ہے۔ بیٹھ کر کام کرو۔ بڑے برسوں کے بعد جب ریٹائرمنٹ کے بعد بھی چائے والے پتے ان سے کسی شخص نے اس جوابے سے پوچھا، تو اس نے اصل بات بتائی۔

عرض کرنے کا مطلب یہ تھا کہ جب ہم رو حافی دنیا میں داخل ہوتے ہیں تو جب تک پہلے زندگی کے رو و مرہ کے مسائل حل نہیں ہوں گے، تو آپ رو حافی دنیا میں داخل ہو ہی نہیں سکیں گے، اس لیے کہ یہ مرحلہ گزار کر پھر راستہ آگے چلے گا۔ رفوا آپ جب ہی کر سکیں گے جب نانی اماں کی سوتی میں دھا گئے وال کر دیں گے، اس کو تو نظر نہیں آ رہا، پھر رفوا ہو گا پھر وہ اماں وڈھی آپ کو رو کر کے دے گی۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہم رو حافی دنیا میں کوئی ایسا فعل اختیار کر لیں۔ کوئی ایسا ورد

وظیفہ کر لیں کہ قافٹ دودھ کی بارش ہونے لگے اور ہم کو روشنیاں نظر آنے لگیں، ایسا ہوا نہیں کبھی۔ جانا اسی روزمرہ کی زندگی کے راستے سے پڑتا ہے۔ چھوٹے دروازے کے قالین کے اوپر سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے اور کپڑی جائے گی گردن اشFAQ صاحب کی کرم نے کیا غلط راستہ نکالتا ہے، قالین صاف رکھنے کا۔ اگر کسی مقام پر بھی لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے تو آپ روحانی دنیا میں داخل نہیں ہو سکتے، کیونکہ اللہ کریم کو اپنی مخلوق بڑی پیاری ہے۔ جب تک مخلوق کا احترام نہیں ہوگا، بات نہیں بنے گی۔

آپ اکثر دیکھتے ہیں آس پاس کہ احترام انسانیت اور احترام آدمیت کا فندان ہے۔ اس میں پاکستان بھارت کی کوئی خرابی نہیں ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ہم ان لوگوں سے سیکھ کر آئے ہیں، جہاں چھوٹ، چھات مذہب کی حیثیت رکھتا ہے۔ بھارت میں 32 کروڑ کے قریب انسان ہیں، جو Untouchable کہلاتے ہیں، یعنی اچھوٹ۔ ان کو ہاتھ نہیں لگا سکتے۔ وہ بھی عام بندے ہیں۔ عام لوگوں جیسے ان کے ہاتھ منہ ناک کان ہیں۔ بڑی محنت سے کام بھی کرتے ہیں، لیکن ان کے لیے حکم ہے کہ انہیں ہاتھ نہیں لگانا اور جب ان کے قریب سے گزرنا ہے تو ناک پر رومال رکھنا ہے۔ ہم نے پاکستان تو بنایا ہے، لیکن ہم یہ تصور ساتھ لے کر آگئے ہیں۔ احترام آدمیت کا جو اللہ نے پہلا حکم دیا تھا، اس پر کار بند نہیں رہ سکے۔ جب یہی نہیں ہوگا تو پھر آپ اگر روحانیت کی دنیا میں داخل ہونا چاہیں گے، کسی بابے کو ملنا چاہیں گے، کسی اعلیٰ ارفع سطح پر ابھرننا چاہیں گے تو ایسا نہیں ہوگا، کیونکہ درجات کو پانے کے لیے بڑے بڑے فضول نالائق بندوں کی جو تیاں سیدھی کرنا پڑتی ہیں اور یہ اللہ کو بتانا پڑتا ہے کہ جیسا کیسا بھی انسان ہے، میں اس کا احترام کرنے کے لیے تیار ہوں، کیونکہ تو نے اسے شکل دی ہے۔

دیکھنے والے جو شکل و صورت ہوتی ہے، میں نے تو اسے نہیں بنایا، یا آپ نے اسے نہیں بنایا، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔ میری بیٹیاں بھوئیں جب بھی کوئی رشتہ دیکھنے جاتی ہیں تو میں ہمیشہ ایک بات منتدا ہوں کہ بابا جی! لڑکی بڑی اچھی ہے، لیکن اس کی "چبب" پیاری نہیں ہے۔ پتہ نہیں یہ "چبب" کیا بلا ہوتی ہے۔ وہ ان کو پسند نہیں آتی اور انسان سے کوئی نہ کوئی نقش نکال دیتی ہیں۔ میں انہیں کہا کرتا ہوں کہ اللہ کا خوف کرو۔ شکل و صورت سب کچھ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ یہ کسی جو تاکہمی نہیں بنائی ہے۔ انسان کو تم ایسا ملت کہا کرو ورنہ تمہارے نمبر کٹ جائیں گے اور ساری نمازیں، روزے کٹ جائیں گے کیونکہ اللہ کی مخلوق کو آپ نے چھوٹا کیا ہے تو یہ مشکلات ہیں۔ گویہ چھوٹی سی باتیں تھیں، لیکن چھوٹی باتوں میں سے بڑی باتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جب تک میں اور آپ احترام آدمیت کا خیال نہیں رکھیں گے اور اپنے لوگوں کو پاکستانیوں

کو عزت نفس نہیں دیں گے، روٹی کپڑا پچھنہ دیں ان کی عزت نفس نہیں لوٹا دیں۔ مثال کے طور پر آپ اپنے ڈرائیور کو سراج دین صاحب کہنا شروع کر دیں اور اپنے ملازم کے نام کے ساتھ ”صاحب“ کا لفظ لگا دیں۔ جب تک یہ نہیں ہو گا، اس وقت تک ہماری روح کے کام تو بالکل ہر کے رہیں گے اور دنیا کے کام بھی پھنسنے ہی رہیں گے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے آمین !!

”ترقی کا ابلیسی ناقچ“

آج سے چند روز پہلے کی بات ہے، میں ایک الیکٹرونکس کی شاپ پر بیٹھا تھا تو وہاں ایک نوجوان لڑکی آئی۔ وہ کسی شیپ ریکارڈر کی تلاش میں تھی۔ دو کانڈا رانے اسے بہت اعلیٰ درجے کے نئے نو میلے شیپ ریکارڈر دکھائے لیکن وہ کہنے لگی مجھے وہ مخصوص قسم کا مخصوص Made نمبر والا شیپ Generation ہے، اس شیپ ریکارڈر کی اور جو اب نئے آئے ہیں، وہ اس کی نسبت کار کر دیگی میں زیادہ بہتر ہیں۔ لڑکی کہنے لگی کہ یہ نیا ضرور ہے لیکن میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ یہ اس سے بہتر نہیں۔ میں بیٹھا غور سے اس لڑکی کی باتمیں سننے لگا کیونکہ اس کی باتمی بڑی ولچپ پتھیں اور وہ الیکٹرونکس کے استعمال کی ماہر معلوم ہوتی تھی، ان جیسے تو نہیں تھی لیکن اس کا تجربہ اور مشاہدہ خاصا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ آپ مجھے مطلوبہ شیپ ریکارڈر تلاش کر کے دیں، میں آپ کی بڑی شکر گزار ہوں گی۔ میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔ بی بی! آپ اس کو ہی کیوں تلاش کر رہی ہیں؟ اس نے کہا کہ ایک تو اس کی میشن بہتر تھی اور اس کو میری خالہ مجھ سے مانگ کر دینی لے گئی ہیں اور میں ان سے واپس لینا بھی نہیں چاہتی لیکن اب جتنے بھی نئے بننے والے شیپ ریکارڈر ہیں، ان میں وہ خصوصیات اور خوبیاں نہیں ہیں جو میرے والے میں تھیں۔ اس واقعہ کے دوسرے تیسرا روز مجھے اپنے ایک امیر دوست کے ساتھ کاروں کے ایک بڑے شوروم میں جانے کا اتفاق ہوا۔ شوروم کے مالک نے ہمیں کار کا ایک ماذل دکھاتے ہوئے کہا کہ یہ ماذل تواب بھی بعد میں آئے گا لیکن ہم نے اپنے مخصوص گاہکوں کے لیے اسے پہلے ہی منگوالیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ اس ماذل میں پہلے کی نسبت کافی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور یہ کمال کی گاڑی بھی ہے۔ میں نے استفسار کیا کہ کیا پچھلے سال کی گاڑی میں کچھ خرابیاں تھیں جو آپ نے اب ذور کر دی ہیں؟ وہ خرابیوں کے ساتھ ہی چلتی رہی ہے! اس میں کیا اتنے ہی نقص تھے جو آپ نے ذور کر دیئے؟ کہنے لگے نہیں اشتقاچ صاحب یہ بات نہیں ہے۔ ہم کوشش کرتے رہتے ہیں کہ اس میں جدت آتی رہے اور اچھی، با سہولت تبدیلی آتی رہے۔ تو یہ سن کر میرا

دماغ پچھے کی طرف چل پڑا اور مجھے یہ خیال آنے لگا کہ ہر نئی چیز، ہر پیچیدہ چیز، ہر مختلف شے یقیناً بہتر نہیں ہوتی۔ اس مرتبہ میری ساگرہ پر میری بیوی نے مجھے کافی پر کویٹر دیا اور وہ اسے خریدنے کے بعد گھر اس قدر خوش آئیں کہ بتانیں سکتا، کہنے لگیں میں بڑے عرصے سے اس کی تلاش میں تھی۔ یہ بالکل آپ کی پسند کا ہے اور یہ آپ کو اٹلی کی یاد دلاتا رہے گا۔ آپ اس میں کافی بنایا کریں۔ میں نے دیکھا، وہ بالکل نیا تھا اور اس میں پلاسٹک کا استعمال زیادہ تھا لیکن اس کا پیندا اکثر ورخا اور وزن زیادہ تھا۔ دوسرا اس کی بجلی کے پلگ تک جانے والی تار بھی چھوٹی تھی اور جب میں نے اسے لے گرا استعمال کیا تو اس میں پانی کو کھولانے کی استطاعت تو زیادہ تھی لیکن کافی بھایا نے کی طاقت اس میں بالکل نہیں تھی۔ چنانچہ میں ان کا (بانو قدیسہ) دل تو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا اور میں نے کہا، ہاں یہ اچھا ہے لیکن فی الحال میں اپنے پرانے پر کویٹر سے ہی کافی بنا تاہم ہوں گا۔ جب وہ پلی گیس تو اس وقت میں نے کہا ”یا اللہ (میں نے اللہ سے دعا کی جو میری دعاؤں میں اب بھی شامل ہے) مجھے وہ صلاحیت اور استطاعت عطا فرم ا کہ اگر تو نیچیز اور طرح نوکی کوئی اختراع وہ بہتر ثابت ہو بینی نوع انسان کے لیے اور تیری بھی پسند کی ہو تو وہ تو میں اختیار کروں، لیکن صرف اس وجہ سے کہ چونکہ یہ نہیں ہے، کیونکہ لوگوں کا گھیر اس کے گرد نگہ ہوتا جا رہا ہے، کیونکہ یہ توجہ طلب ہے تو اس لیے میں اس سے دور ہوں۔“ چنانچہ یہ بات میرے دل میں اترتی گئی اور میں Progress کے بارے میں سوچتا رہا کہ ترقی جس کے پیچھے ہم سارے بھاگے پھرتے ہیں اور جس کے بارے میں جگہ بے جگہ، گھروں میں، گھروں سے باہر، محلوں شہروں میں، حکومتوں اور اس کے باہر ترقی کی جانب ایک بڑی نظام دوڑ جا رہی ہے۔ اس دوڑ سے مجھے ڈر لگتا ہے کہ حاصل تو اس سے کچھ بھی نہیں ہو گا کیونکہ ترقی میں اور فلاج میں بڑا فرق ہے۔ میں اور میرا معاشرہ، میرے اہل و عیال اور میرے بال بچے فلاج کی طرف جائیں تو میں ان کے ساتھ ہوں، خالی ترقی نہ کریں۔ خواتین و حضرات! یہ انتہائی غور طلب بات ہے کہ کیا ہم ترقی کے پیچھے بھاگیں یا فلاج کی جانب پکیں اور اپنی جھولیاں فلاج کی طرف پھیلا کیں۔ لا ہور کے قریب گوجرانوالہ شہر ہے۔ اس میں Adult Education ایجوکیشن (تعلیم بالغاء) کے بڑے نامی گرامی سکول ہیں۔ مجھے ان Tعلیم حاصل کر رہے تھے اور سکول میں ایک دفعہ جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں کسان، زمیندار، گاڑی بان Tعلیم حاصل کر رہے تھے اور اس بات پر بڑے خوش تھے کہ چونکہ انہوں نے Tعلیم حاصل کر لی ہے اور وہ فقروں اور ہندسوں سے شناسا ہو گئے ہیں۔ اس لیے اب انہوں نے ترقی کر لی ہے۔ چنانچہ وہاں ایک بہت مضبوط اور بڑا بنس مکھ سا گاڑی بان تھا۔ میں نے کہا کیوں جتاب گاڑی بان صاحب! آپ نے علم حاصل کر لیا؟ کہنے لگا، ہاں جی میں نے علم حاصل کر لیا۔ میں نے کہا، اب آپ پڑھ لکھ سکتے ہیں، کہنے لگے لکھنے کی تو مجھے پریکش نہیں ہے البتہ میں پڑھ ضرور لیتا ہوں۔ میں نے کہا آپ کیا پڑھتے ہیں؟ کہنے لگا جب میں سڑک پر

سے گزرتا ہوں تو جو سنگ میل ہوتا ہے میں اب اسے پڑھنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس سنگ میل پر کیا کچھ لکھا ہوتا ہے، کہنے لگا میں ہر سنگ میل پر یہ تو پڑھ لیتا ہوں کہ اسی میل یا ستر میل لیکن کہاں کا اسی میل، کہاں کا ستر میل۔ یہ مجھے کبھی پتہ نہیں لگا کہ کس طرف کا ہے۔ یہ ستر میل کہاں کے ہیں۔ اس کے باوجود وہ کہہ درہ ما تھا کہ میں ترقی یافتہ ہو گیا ہوں اور میں نے اب ترقی کرنی ہے۔ یہ اس قسم کی ترقی ہے (مُکْرَاتِهٗ ہوئے) یہ راہ میں غنی چیز ہونے کے باوصاف بڑی حائل ہوتی ہے۔ میں اس پر کافی حد تک سوچتا اور غور کرتا رہتا ہوں کہ اے میرے اللہ کیا ہم ہر فنی شے کو ہر Modern چیز کو اپنائیں۔ یہ تو وہ تھا جو گزشتہ دونوں میرے ساتھ پیش آیا اور میں نے اس کی دعا کی کہ یا اللہ میں تھے سے اس بات کا آرز و مند ہوں کہ کچھ پرانی چیزیں جو ہیں، میں ان کا ساتھ دیتا رہوں مثلاً میں پرانی زمین کا ساتھ دیتا رہوں، میں پرانے چاند ستاروں کا ساتھ دیتا رہوں۔ اے اللہ میں اپنے پرانے دین کے ساتھ دیستہ رہوں اور یادا میری بیوی سے جو 38 سال پر اپنی شادی ہے، میری آرزو ہے کہ وہ بھی پرانی ہی رہے اور اسی طرح چلتی رہے۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے دوست اور میرے جانے والے مجھ پر ضرور نہیں گے اور مجھے ضرور ایک دقیانوں انسان سمجھیں گے اور میرا مذاق، تھنھے اڑائیں گے اور مجھے بہت Fundamentalist سمجھیں گے، بنیاد پرست خیال کریں گے لیکن میں کوشش کر کے، جرأت کر کے بہت ساری پرانی چیزوں کے ساتھ دیستہ رہتا ہوں۔ انہیں چاہتا ہوں اور کچھ نئی چیزیں جو میری زندگی میں داخل ہو کر میرے پہلوؤں سے ہو کر گزر رہی ہیں، ان میں جو ٹھیک ہے، جو مناسب ہے، جو مجھے فلاح کی طرف لے جاتی ہوں، میں ان کی طرف مائل ہونا چاہتا ہوں اور مجھے یہ یقین ہے کہ خدا میری دعایقیناً قبول کر لے گا۔ جہاں تک تبدیلی کا تعلق ہے تو اس حوالے سے اگر آپ غور کریں تو ایسی کوئی تبدیلی آتی ہی نہیں ہے یا آتی نہیں جیسی کہ آپنی چاہیے۔ اگر آپ تاریخ کے طالب علم ہیں بھی تو یقیناً آپ تاریخ کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ آپ نے ضرور پڑھا ہو گا یا کسی داستان گو سے یہ کہانی سنی ہو گی کہ پرانے زمانے میں جب شکاری جنگل میں جاتے تھے اور شکار کرتے تھے، کسی ہرلن، نیل گائے کا یا کسی خونخوار جانور کا تو وہ ڈھوول اور تاشے بجاتے تھے اور اس اوپنی گھنی فصلوں میں نیچے نیچے ہو کر چھپ کر اپنے ڈھوول اور تاشے کا دائرہ ٹنگ کرتے جاتے تھے اور اس دائرے کے اندر شکار گھبرا کر، بے چین ہو کر، نیل آ کر بھاگنے کی کوشش میں پکڑا جاتا تھا اور دیوچ لیا جاتا تھا۔ ان کا یہ شکار کرنے کا ایک طریقہ تھا۔ ہاتھی سے لے کر خرگوش تک اسی طرح سے شکار کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ چلتا رہا اور وقت گزرتا رہا۔

خواتین و حضرات! بڑی عجیب و غریب باتیں میرے سامنے آ جاتی ہیں اور میں پریشان بھی ہوتا ہوں لیکن شکر ہے کہ میں انہیں آپ کے ساتھ Share بھی کر سکتا ہوں۔ میرے ساتھ ایک واقعہ

یہ ہوا کہ میں نے سینما میں، اُٹی وی پر اور باہر دیواروں پر کچھ اشتہار دیکھی، کچھ اشتہار تحرک تھے اور کچھ ساکن، کچھ بڑے بڑے اور کچھ چھوٹے چھوٹے تھے اور میں کھڑا ہو کر ان کو غور سے دیکھنے لگا کہ یہ پرانی شکار پکڑنے کی جو رسم ہے، وہ ابھی تک محدود نہیں ہوئی ویسی کی ویسی ہی چل رہی ہے۔ پہلے ڈھول تاشے بجا کر، سورچا کر ”رولا“ ڈال کے شکاری اپنے شکار کو گھیرتے تھے اور پھر اس کو دبوچ لیتے تھے۔ اب جو اشتہار دینے والا ہے وہ ڈھول تاشے بجا کے اپنے سلوگن، نفرے، دعوے بیان کر کے شکار کو گھیرتا ہے، شکار بچارہ تو معصوم ہوتا ہے۔ اسے ضرورت نہیں ہے کہ میں یہ مخصوص صابن خریدوں یا پاؤ ڈر خریدوں، اسے تو اپنی ضرورت کی چیزیں چاہئیں ہوتی ہیں لیکن چونکہ وہ شکار ہے اور پرانے زمانے سے یہ رسم چلی آ رہی ہے کہ اس کا گھیراؤ کس طرح سے کرنا ہے تو وہ بظاہر تو تبدیل ہو گئی ہے لیکن ہبھاڑنے کا رخ اور اس کی سوچ ویسی کی ویسی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا، آپ خود روز شکار بنتے ہیں۔ میں بتا ہوں اور ہم اس زخم اور دائرے سے نکل نہیں سکتے۔ پھر جب ہم شکار کی طرح پکڑے جاتے ہیں اور جیختے چلاتے ہیں تو پھر اپنے ہی گھروالوں سے بخبرے کے اندر آ جانے کے بعد لڑنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنے ہی عزیزہ واقارب سے جھکڑا کرتے ہیں کہ تمہاری وجہ سے خرچہ زیادہ ہو رہا ہے۔ دوسرا کہتا ہے نہیں تمہاری وجہ سے یہ مسئلہ ہو رہا ہے۔ حالانکہ ہم تو شکاری کے شکار میں پھنسنے ہوئے لوگ ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ترقی ہو گئی ہے اور وہ شکار کا پرانا طریقہ گزر چکا ہے تو میں سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ کام ترقی کی طرف مائل نہیں ہوا ہے بلکہ ہم اسی نجی پر اور اسی ڈھب پر چلتے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ میں نے بتایا کہ ایسے عجیب و غریب واقعات یہ رے ساتھ وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں اور میں ان پر حیران بھی ہوتا رہتا ہوں اور کہیں اگر انہیں جب ڈسکس کرنے کا مناسب موقع نہیں ملتا تو میں آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔ پھر مجھے کئی خطوط ملتے ہیں اور لوگ، خط لکھنے والے مجھے راست اور درست قدم انہانے پر مائل کرتے ہیں۔ میں آپ سب کا شکر گزار ہوں۔

بادشاہت کے زمانے اور اس سے پہلے پھر اور دھات کے زمانے سے لے کر آج تک جتنے بھی ادوار گزرے غلاموں کی تجارت کو بہت بڑا فضل سمجھا جاتا رہا ہے۔ لوگ غلام لے کر جہازوں میں پھرتے تھے۔ انہیں بالآخر فروخت کر کے اپنے پیسے کھرے کر کے چلے جاتے تھے اور اس سے بڑا اور کیا دکھ ہو گا کہ انسان بکتے تھے اور کہاں کہاں سے آ کر بکتے تھے اور وہ اپنے نئے مالکوں کے پاس کیے رہ جاتے تھے۔ یہ ایک بڑی دردناک کہانی ہے، کی مہاراجوں کی حکومت میں ”داسیاں“ بکتی تھیں جو مندوں میں ناچ اور پوچاپاٹ کرتی تھیں۔ یہ ”داسیاں“ دور دراز سے چل کر آتی تھیں، انہیں زیادہ تر مندوں میں رکھا جاتا تھا۔ کپل و ستو کے راجہ شدؤ دن کا بینا سدھاک جو اپنے بآپ کو بہت ہی پیارا تھا

اور وہ بعد میں مہاتم بادھ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا دل لگانے کے لیے اس کے باپ نے ایک ہزار لوندنیاں خرید کے محل میں رکھی تھیں تاکہ صاحبزادے کو دکھ، غم، بیماری، بڑھائے اور موت سے آشنا نہ ہو۔ یہ لوندنیاں شہزادے کا دل بہلاتی تھیں اور یہ رسم پہلے سے ہی چلتی آرہی تھی کہ ایک وقت ایسا بھی آیا اور اس بات کی تاریخ گواہ ہے کہ ایک جیل القدر پیغمبر اور ان کے والدین بھی پیغمبر تھے۔ وہ دنیا کے سین تین شخص تھے۔ وہ بھی بک گئے۔ میں یہ حضرت یوسفؑ کی بات کر رہا ہوں، ان کی بھی باقاعدہ بولی گئی تھی۔ یہ دوناں کہانیاں چلی آتی رہی ہیں اور ایسے واقعات مسلسل ہوتے رہے ہیں۔ حضرت عیسیٰ، حضرت موسیٰ کے زمانے میں غلامی کا دور اور رسم بھی تھی۔ غلامی اور انسانی تجارت کے خلاف سب سے پہلی آواز جو بھی وہ نبی کریم محمدؐ تھی۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ نہایت فتح رسم ہے، چلتی تو زماں سے آ رہی ہے اور اسے پورا کا پورا درکنباہت مشکل ہو جائے گا لیکن میں درخواست کرتا ہوں کہ جب بھی موقع ملے تو چلو اپنے سو غلاموں میں سے کسی ایک غلام کو رہا اور آزاد کر دیا کرو، اللہ تمہارے لیے زیادہ آسانیاں پیدا کرے گا۔ پھر جب کسی سے کوئی گناہ کبیرہ سرزد ہو جاتا تو آپؐ فرماتے کہ ”سب گناہ معاف ہو جائیں گے اگر قدم یہ غلام آزاد کر دو۔“ اگر وہ شخص کہتا کہ حضورؐ میں تو غریب آدمی ہوں، میرے پاس کچھ نہیں تو آپؐ نے فرمایا غلام کسی سے قسطوں پر لے لو (کوئی پانچ روپے مہینہ، تین روپے مہینہ ادا کرتے رہنا) لیکن غلام آزاد کر دو۔ یہ غلام کی اسی فتح رسم تھی جس سے انسان آہستہ آہستہ نکلنے کی کوشش کرتا رہا لیکن پھر امر یکہ میں تو اس نے باقاعدہ کھیل کی صورت اختیار کر لی، افریقہ سے غلاموں کے جہاز بھر بھر کر لائے جاتے تھے اور ان افریقی لوگوں کو امر یکہ کے شہروں میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ آپؐ نے سات قسطوں میں چلنے والی فلم ”روش، تو دیکھی ہی ہوگی۔ اس کو دیکھ کر پڑتے چلتا ہے کہ گورے کس طریقے سے کیسے ظلم و تم کے ساتھ کا لے (سیاہ فام) غلاموں کو لا کر منڈیوں میں فروخت کرتے تھے۔ چند دن پہلے کی بات ہے یہ دکھ جوڑ ہن کے ایک خانے میں موجود ہے، اسے لے کر میں چلتا رہتا تھا جیسا کہ آپؐ بھی چلتے رہتے ہیں تو مجھے ایک امنڑو یو کمپنی میں بطور Subject Expert رکھا گیا۔ میں وہاں چلا گیا۔ اس کمپنی میں کل آٹھ افراد تھے، وہ آٹھ افراد کا پیٹل تھا جس میں خواتین اور مرد بھی تھے اور وہاں ایک ایک کر کے Candidate آ رہے تھے اور ہم ان سے سوال کرتے تھے، براؤ کا سٹنگ اور لکھنے لکھانے کے حوالے سے سوال پوچھنا میرے ذمہ تھا۔ وہ بہت بڑا امنڑو یو ہر ایک سے لیا جا رہا تھا۔ وہاں کسی صاحب نے باہر سے آ کر مجھے کہا کہ ایک صاحب آپؐ سے ملنے آئے ہیں۔ گھر سے انہیں پتہ چلا کہ آپؐ یہاں ہیں تو ہماب پہنچ گئے۔ میں اپنے دیگر کمپنی کے ارکان سے اجازت لے کر اور معدنرٹ کر کے باہر گیا کہ براؤ کرم ذرا دیر کے لیے اس امنڑو یو کے سلسلے کو روک لیا جائے۔ میں ہال میں ان صاحب سے ملنے کے لیے گیا۔ وہ صاحب ملے، بات ہوئی اور وہ چلے گئے

لیکن میں تھوڑی دیر کے لیے ہاں میں ان امیدواروں کو دیکھنے لگا جو بڑی بے چینی کی حالت میں اپنی باری آنے کا انتظار کر رہے تھے اور جو باری بھگتا کے باہر نکلتا تھا۔ اس سے بار بار پوچھتے تھے کہ تم سے اندر کیا پوچھا گیا ہے اور کس کس قسم کے سوال ہوئے ہیں؟ اور ان باہر بیٹھے امیدواروں کے چہروں پر تردد اور بے چینی اور اضطراب عیان تھا۔ میں کھڑا ہو کر ان لوگوں کو دیکھتا رہا اور حیران ہوتا رہا کہ اگلے زمانے میں تو لوٹدی، غلام بیچنے کے لیے منڈی میں تاجر بہر سے لایا کرتے تھے۔ آج جب ترقی یافتہ دور ہے اور چیزیں تبدیل ہو گئی ہیں، یہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں خود اپنے آپ کو بیچنے اور غلام بنانے کے لیے بہاں تشریف لائے ہیں اور چیخیں مار مار کر اور ترپ ترپ کر اپنے آپ کو، اپنی ذات، وجود کو، جسم و ذہن اور روح کو فروخت کرنے آئے ہیں اور جب اشتروپی میں ہمارے سامنے حاضر ہوتے ہیں اور کہتے ہیں، سریں نے یہ کمال کا کام کیا ہے، میرے پاس یہ سرٹیکیٹ ہے۔ میرے پرانے مالک کا جس میں لکھا ہے کہ جناب اس سے اچھا غلام اور کوئی نہیں اور یہ لوٹدی اتنے سال تک خدمت گزارو ہی ہے اور ہم اس کو پورے غبردیتے ہیں اور اس کی کارکردگی بہت اچھی ہے اور سراب آپ خدا کے واسطے ہمیں رکھ لیں اور ہم خود کو آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ کیا وقت بدلت گیا؟ کیا انسان ترقی کر گیا ہے؟ کیا آپ اور میں اس کو ترقی کہیں گے کہ کسی معیشت کے بوجھ تسلی، کسی اقتصادی وزن تسلی ہم اپنے آپ کو خود بیچنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں لے جا کر یہ کہتے ہیں کہ جناب اس کو رکھ لو، اس کو لے لو اور ہمارے ساتھ سودا کرو کہ اس کو غلامی اور اس کو لوٹدی گیری کے کتنے پیے ملتے رہیں گے۔ یہ ایک سوچ کی بات ہے اور ایک مختلف نوعیت کی سوچ کی بات ہے۔ آپ اس پر غور کیجیے اور مجھے بالکل منع کیجیے کہ خدا کے واسطے ایسی سوچ آئندہ میرے آپ کے ذہن میں نہ آیا کرے کیونکہ یہ کچھ خونگلوگوار سوچ نہیں ہے۔ کیا انسان اس کام کے لیے بنا ہے کہ وہ محنت و مشقت اور تردد کرے اور پھر خود کو ایک پیکٹ میں لپیٹ کے اس پر خوبصورت پیکنگ کر کے گوناگا کے پیش کرے کہ میں فروخت کے لیے تیار ہوں۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو نظر کے آگے سے گزرتی رہتی ہیں اور پھر یہ خیال کرنا اور یہ سوچنا کہ انسان بہت برتر ہو گیا ہے، برتر تو وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اردو گرد کے گرے پڑے لوگوں کو سہارا دے کر اپنے ساتھ بھانے کی کوشش کرتے ہیں اور وہی قومیں مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں جو ترقی مٹا دیتی ہیں۔ دولت، عزت، اولاد یہ سب خدا کی طرف سے عطا کردہ چیزیں ہوتی ہیں لیکن عزت نفس لوٹانے میں، لوگوں کو برا بیری عطا کرنے میں یہ تو وہ عمل ہے جو ہمارے کرنے کا ہے اور اس سے ہم پچھے ہٹتے جاتے ہیں اور اپنی ہی ذات کو معتبر کرتے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ ہمارے بابا جی کے ڈیرے پر ایک نوجوان سالاٹ کا آیا۔ وہ بچارہ نالگوں سے معذور تھا اور اس نے ہاتھ میں پکڑنے اور وزن ڈالنے کے لیے لکڑی کے دوچھے کھٹے سے بنوار کئے تھے۔ وہ بابا جی کو ملنے لئے اور سلام کرنے آیا کرتا

تھا۔ میں وہاں بیٹھا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور چونکہ بابا جی کے سامنے ہم آزادی سے ہر قسم کی بات کر لیا کرتے تھے۔ اس لیے میں نے کہا، بابا جی آپ کے خدا نے اس آدمی کے لیے کچھ نہ سوچا! یہ دیکھنے تو جو ان ہے، اچھا لیکن صحت مند ہے۔ بابا جی نے نہ کہا، سوچا کیوں نہیں۔ سوچا بلکہ بہت زیادہ سوچا اور اس آدمی ہی کے لیے تو سوچا۔ میں نے کہا، جی کیا سوچا اس آدمی کے لیے۔ کہنے لگے، اس کے لیے تم کو پیدا کیا، لتنی بڑی سوچ ہے اللہ کی۔ اب یہ ذمہ داری تمہاری ہے۔ میں نے کہا جی (مسکراتے ہوئے) آئندہ سے ذیرے پر نہیں آنا۔ یہ تو کندھوں پر ذمہ داریاں ڈال دیتے ہیں۔ دوسروں کے لیے سوچتا تو فلاج کی راہ ہے اور یہ ترقی جسے ہم ترقی سمجھتے ہیں یا وہ ترقی جو آپ کے، ہمارے ارجوں والیسی ناج کر رہی ہے یا وہ ترقی جو آپ کو خوفناک ہتھیاروں سے سچاری ہی ہے، اسے ترقی تو نہیں کہا جا سکتا۔ آج سے کچھ عرصہ قبل آپ جانتے ہیں کہ اس دنیا میں دُسپر پاؤ روز تھیں اور ان کا آپس میں بڑا مقابلہ رہتا تھا اور وہ کاغذی جنگ لڑتے ہوئے اور الائکشن دیک کی لڑائی لڑتے ہوئے آپس میں ہمیشہ ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے تھے اور ایک دوسری کو یہ طعنہ دیتی کہ میں تم سے بڑی پاؤ رہوں اور دوسری پہلی کو اور وہ اپنی پہر پاؤ اور ترقی کی پر کھا اور پیکانہ یہ بتاتی تھیں کہ جیسے ایک کہتی کہ تم دس سینٹ میں ایک میلن افراد کو ملیا میٹ کر سکتی ہو، ہم 5 سینٹ کے اندر ایک میلن انسان ہلاک کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم بڑی پہر پاؤ رہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے کبھی مقابلی مطالعہ میں یا معاملہ میں اور کسی بات پر فخر ہی نہیں کیا۔ تو کیا انسانیت اس راہ پر چلتی جائے گی اور جو علم ہمیں پیغامبروں نے عطا کیا ہے اور جو باتیں انہوں نے بتائی ہیں۔ وہ صرف اس وجہ سے پیچھے ہتھی جائیں گی کہ ہم نئی چیزیں اور نئے لوگ حاصل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بھر کیف یہ دکھ کی باتیں ہیں اور بہت سے لوگ میرے ساتھ اس دکھ میں شریک ہوں گے۔ اب آپ سے اجازت چاہوں گا۔ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

HOT LINE

ایک مرتبہ پروگرام "زاویہ" میں گفتگو کے دوران "دعا" کے بارے میں بات ہوئی تھی اور پھر بہت سے لوگ "دعا" کے حوالے سے بحث و تجھیٹ اور غور و خوض کرتے رہے اور اس بابت مجھ سے بھی بار بار پوچھا گیا، میں اس کا کوئی ایسا ماہر تو نہیں ہوں لیکن میں نے ایک تجویز پیش کی تھی جسے بہت سے لوگوں نے پسند کیا اور وہ یہ تھی کہ "دعا" کو بجائے کہنے یا بولنے کے ایک عرضی کی صورت میں لکھ لیا جائے۔ عرض کرنے اور میرے اس طرح سونپنے کی وجہ یہ تھی کہ پوری نماز میں یا عبادت میں جب ہم دعا کے مقام پر پہنچتے ہیں تو ہم بہت تیزی میں ہوتے ہیں اور بہت اتنا ولی (جلدی) کے ساتھ دعائیں لگتے ہیں۔ ایک پاؤں جوتے میں ہوتا ہے، دوسرا پہنچ کھلے ہوتے ہیں، اختحن اٹھتے، کھڑے کھڑے جلدی سے دعائیں لگتے چلے جاتے ہیں یعنی وہ رشتہ اور وہ تعلق جو انسان کا خدا کی ذات سے ہے، وہ اس طرح جلد بازی کی کیفیت میں پورا نہیں ہو پاتا۔ ہمارے ایک بابا نے یہ ترکیب سوچی تھی کہ دعائیں وقت انسان پورے خضوع کے ساتھ اور پوری توجہ کے ساتھ اور Full Attention رکھتے ہوئے دعا کی طرف توجہ دے اور جو اس کا نفس مضمون ہو، اس کو ذہن میں اتار کر، تکلم میں ڈھال کر اور پھر اس کو Communicate کرنے کے انداز میں آگے چلا جائے تاکہ اس ذات تک پہنچ جس کے سامنے دعا مانگی جا رہی ہے یا پیش کی جا رہی ہے۔ ہمارے ایک دوست تھے، انہوں نے مجھے بتایا کہ میں نے دعا کا نذر پر لکھنے کی بجائے ایک اور کام کیا ہے جو آپ کی سوچ سے آگے ہے۔ میرے دوست افضل صاحب نے کہا کہ میں نے ایک رجسٹر بنایا ہے اور میں اس پر اپنی دعا برداری توجہ کے ساتھ لکھتا ہوں اور اس پر باقاعدہ ڈیٹ بھی لکھتا ہوں اور اس کے بعد میں پہنچے پلٹ کر اس کیفیت کا بھی جائزہ لیتا ہوں جو دعائیں کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میرے دوست کے رجسٹر بنانے کا بڑا فائدہ ہے اور ان کا تعلق اپنی ذات، اپنے اللہ اور اس حقیقتی کے ساتھ جس کے آگے وہ سر جھکا کر دعا مانگتے ہیں، بہت قریب کا ہو جاتا ہے۔ اکثر ویژت اور میں بھی اس میں شامل ہوں، جو یہ شکایت کرتے

ہیں کہ ”بھی بڑی دعاء مانگی لیکن کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہم تو بڑی دعا مانگیں مانگتے ہیں، پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی اور ہماری دعا مانگیں قبول نہیں ہوتیں۔“

خواتین و حضرات! دعا کا سلسلہ ہی ایسا سلسلہ ہے جیسا نکا ”گیر“ کے پانی نکالنے کا ہوتا ہے۔ جس طرح ہند پپ سے پانی نکالتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو ہند پپ بار بار یا مسلسل چلتا رہے یا ”گڑتا“ رہے، اس میں سے بڑی جلدی پانی نکل آتا ہے اور جو ہند پپ سوکھا ہوا ہوا اور استعمال نہ کیا جاتا رہا ہو، اس پر ”گڑنے“ والی کیفیت کبھی نہ گزری ہو۔ اس پر آپ کتنا بھی زور لگاتے چلے جائیں، اس میں سے پانی نہیں نکلتا۔ اس لیے دعا کے سلسلے میں آپ کو ہر وقت اس کی حد کے اندر داخل رہنے کی ضرورت ہے کہ دعا مانگتے چلے جائیں اور مانگیں وجہ کے ساتھ چلتے ہوئے، کھڑے ہوئے، بے خیالی میں کہ یا اللہ ایسے کر دے۔ عام طور پر جب لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ”دعاؤں میں یاد رکھنا“ اور وہ بھی کہتے ہیں ہم آپ کو دعاوں میں یاد رکھیں گے اور بہت ممکن ہے کہ وہ دعاوں میں یاد رکھتے بھی ہوں لیکن آپ کو خود کو بھی اپنی دعاوں میں یاد رکھنے کی ضرورت ہے۔

خداء کے واسطے دعا کے وائرے سے ہرگز ہرگز نہیں نکلنے گا اور یہ مت کہیے گا کہ جناب دعاء مانگی تھی اور اس کا کوئی جواب نہیں آیا، دیکھنے دعا خط و کتابت نہیں، دعا Correspondent نہیں ہے کہ آپ نے چیھی لکھی اور اس خط کا جواب آئے۔ یہ تو ایک یکطریقہ عمل ہے کہ آپ نے عرضی ڈال دی اور اللہ کے حضور گزر اردوی اور پھر مطمئن ہو کر بیٹھنے لگئے کہ یہ عرضی جا چکی ہے اور اب اس کے اوپر عمل ہو گا۔ اس کی (اللہ) عرضی کے مطابق کیونکہ وہ بہتر سمجھتا ہے کہ کس دعا یا عرضی کو پورا کیا جانا ہے اور کس دعا نے آگے پہنچ کر اس کو وہ کچھ عطا کرنا ہے جو اس کے فائدے میں ہے۔ دعا مانگنے کے لیے صبر کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور اس میں خط کا جواب آنے کے انتظار کا چکر نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے شاید یہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ کچھ دعا میں تو مانگنے کے ساتھ ہی پوری ہو جاتی ہیں، کچھ دعاوں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور کچھ دعا مانگیں آپ کی عرضی کے مطابق پوری نہیں ہوتیں۔ مثال کے طور پر آپ اللہ سے ایک پھول مانگ رہے ہیں کہ ”اے اللہ مجھے زندگی میں ایک ایسا خوبصوردار پھول عطا فرم جو مجھے پہلے کبھی نہ ملا ہو۔ لیکن اللہ کی خواہش ہو کہ اسے ایک پھول کے بجائے زیادہ پھول، پورا گلdestہ یا پھولوں کا ایک توکرا دے دیا جائے لیکن آپ ایک پھول پر ہی Insist کرتے رہیں اور ایک پھول کی ہی بار بار دعا کرتے جائیں اور اپنی عقل اور دانش کے مطابق اپنی تجویز کوشامل کرتے ہیں کہ مجھے ایک ہی پھول چاہیے تو پھر اللہ کہتا ہے کہ اگر اس کی خواہش ایک پھول ہی ہے تو اسے پھولوں سے بھرا تو کرار بننے دیا جائے۔ آپ کی دانش اور عقل بالکل آپ کی دشگیری نہیں کر سکتی، مانگنے کا یہ طریقہ ہو کہ ”اے اللہ میرے لیے جو بہتر ہے، مجھے وہ عطا فرم۔

میں انسان ہوں اور میری آرزو میں اور خواہش بھی بہت زیادہ ہیں، میری کمزوریاں بھی میرے ساتھ ساتھ ہیں اور تو پروردگار مطلق ہے، میں بہت دست بستہ انداز میں عرض کرتا ہوں کہ مجھے کچھ ایسی چیز عطا فرمائے جو مجھے بھی پسند آئے اور میرے ارد گر درستے والوں کو، میرے عزیز دقاقوں کو پسند ہو اور اس میں تیری رحمت بھی شامل ہو۔ اگر کہیں کہ اللہ جو چاہے عطا کرے وہ تھیک ہے۔ اللہ آپ کو فتحی عطا کر دے جبکہ آپ کی خواہش میں ایسی افسر بننے یا ضلع ناظم بننے کی ہو۔ دعا ایسی مانگی چاہیے کہ اے اللہ مجھے ضلع ناظم بھی بنادے اور پھر ایسا نیک بھی رکھ کر رہتی دنیا تک لوگ اس طرح سے یاد کریں کہ باوصف اس کے کہ اس کو ایک بڑی مشکل در پیش تھی اور انسانوں کے ساتھ اس کے بہت کثرے روابط تھے لیکن پھر بھی وہ اس میں پورا اتر اور کامیاب ٹھہرا۔ دعا کے حوالے سے یہ باریک بات توجہ طلب اور نوٹ کرنے والی ہے۔ پھر بعض اوقات آپ دعاء مانگتے مانگتے بہت لمبی عمر کو پہنچ جاتے ہیں اور دعا پوری نہیں ہوتی۔ اللہ بعض اوقات آپ کی دعا کو Defer کر دیتا ہے کہ بھی پوری نہیں کرنی، آگے چل کر کرنی ہے۔ جیسے آپ ڈیپنس سیوگ بانڈز لیتے ہیں، وہ دس سال کے بعد پیغور ہوتے ہیں۔ جس طرح آپ کہتے ہیں کہ یہ بچوں کی ہو گیا ہے۔ اب اس کے نام کا ڈیپنس سیوگ مریقیکیٹ لے لیں، اسے آگے چل کر انعام مل جائے گا۔ اس طرح اللہ بھی کہتا ہے اور وہ بہتر جانتا ہے کہ اب اس شخص کے لیے یہ چیز عطا کرنا غیر مفید یا بے سود ثابت ہو گا، ہم اس کو آگے چل کر اس سے بھی بہت بڑا انعام دیں گے بشرطیکہ یہ صبر اختیار کرے اور ہماری مرضی کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ دعا کو خدا کے واسطے ایک معمولی چیز نہ سمجھا کریں۔ پہلی بات تو یہ ہے جو مشاہدے میں آئی ہے کہ دعا ایک اہم چیز ہے۔ جس کے بارے میں خداوند تعالیٰ خود فرماتے ہیں کہ ”جب تم نماز ادا کر چکو تو پھر پہلو کے بل لیٹ کر، یا بیٹھ کر میرا ذکر کرو، یعنی میرے ساتھ ایک رابطہ قائم کرو۔ جب تک یہ تعلق پیدا نہیں ہو گا، جب تک یہ Hot Line نہیں گئے گی۔ اس وقت تک تم بہت ساری چیزیں سمجھنے سکو گے۔ ہم نے بھی بابا جی کے کہنے پر جوبات دل میں ہوتی اس کو بڑے خوشخت انداز میں لے کا غذ پر لکھ کر، پلیٹ کر رکھتے تھے اور اس کے اوپر یوں حاوی ہوتے تھے کہ وہ تحریر اور وہ دعا ہمارے ذہن کے نہایا خانوں میں ہر وقت موجود رہتی تھی۔ ایک صاحب مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ جب وہ دعا پوری ہو جائے تو پھر کیا کریں؟ میں نے کہا کہ پھر اس کا غذ کو بچاڑ کر (ظاہر ہے اس میں آپ نے بہت پاکیزہ باتیں بھی لکھی ہوں گی کیونکہ آدمی کی آرزو خالص Materialistic یا مادہ پرستی کی دعاؤں کی ہی نہیں ہوتی کچھ اور دعا نہیں بھی انسان مانگتا ہے) پر زہ پر زہ کر کے کسی پھل دار درخت کی جڑ میں دبادیں، یہ احترام کے لیے کہا ہے۔ ویسے تو آپ خود بھی جانتے ہیں کہ ایسی تحریریوں والے مقدس کاغذوں کے ڈیپوزل کا کیا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ ہمارے دوست جو افضل صاحب ہیں، انہوں نے دعاؤں کا باقاعدہ ایک رجسٹر بنایا ہوا ہے جو قابل غور بات ہے اور اس

میں وہ دیکھتے ہیں کہ فلاں تاریخ کو فلاں سن میں نے یہ دعا مانگی تھی، کچھ دعا میں چھوٹی ہوتی ہیں، معمولی معمولی ہی۔ وہ ان کو بھی رجسٹر میں سے دیکھتے کہ یہ اس سن میں مانگی دعا اس وقت آ کر پوری ہوئی اور فلاں دعا کب اور جب جا کر پوری ہوئی۔ دعا پوری توجہ کا تقاضا کرتی ہے۔ چلتے چلتے جلدی جلدی میں دعا مانگنے کا کوئی ایسا فائدہ نہیں ہوتا۔ کچھ دعا میں ایسی ہوتی ہیں جو بہت "ٹھاہ" کر کے لگتی ہیں۔ بغداد میں ایک نابالی تھا، وہ بہت اچھے نان کلچے لگاتا تھا اور بڑی دودرور سے دنیا اس کے گرم گرم نان خریدنے کے لیے آتی تھی۔ کچھ لوگ بعض اوقات اسے معاوضے کے طور پر کھوئے سکدے کر چلے جاتے ہیں یہاں ہمارے ہاں بھی ہوتے ہیں۔ وہ نابالی کھوئے سکدے لینے کے بعد اسے جانچنے اور آنچنے کے بعد اسے اپنے "گلے" (پیپوں والی صندل قپی) میں ڈال لیتا تھا۔ بھی واپس نہیں کرتا تھا اور کسی کو آواز دے کر نہیں کہتا تھا کہ تم نے مجھے کھوئے سکدے دیا ہے۔ بے ایمان آدمی ہو وغیرہ بلکہ محبت سے وہ سکدے بھی رکھ لیتا۔ جب اس نابالی کا آخری وقت آیا تو اس نے پکار کر اللہ سے کہا (دیکھنے یہ بھی دعا کا ایک انداز ہے) "اے اللہ تو اچھی طرح سے جانتا ہے کہ میں تیرے بندوں سے کھوئے سکے لے کر انہیں اعلیٰ درجے کے خوبصوراً گرم گرم محبت مند نان دیتا رہا اور وہ لے کر جاتے رہے۔ آج میں تیرے پاس چھوٹی اور کھوٹی عبادت لے کر آ رہا ہوں، وہ اس طرح سے نہیں جیسا تو چاہتا ہے۔ میری تجھ سے یہ درخواست ہے کہ جس طرح سے میں نے تیری خلائق کو معاف کیا تو بھی مجھے معاف کرو۔ میرے پاس اصل عبادت نہیں ہے۔ بزرگ بیان کرتے ہیں کہ کسی نے اس کو خواب میں دیکھا تو وہ اونچے مقام پر فائز تھا اور اللہ نے ان کے ساتھ وہ سلوک کیا جس کا وہ متنی تھا۔ بھی بھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا مانگی گئی ہے لیکن قبولیت نہیں ہوئی اور جواب ملنا چاہیے لیکن جو محسوں کرنے والے دل ہوتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں جواب ملتا ہے۔ ایک چھوٹی سی بچی تھی۔ اس کی گڑیا کھیلتے ہوئے نوٹ گئی تو وہ بیچاری رو نے لگی اور جیسے بچوں کی عادت ہوتی ہے تو اس نے کہا کہ اللہ میاں جی میری گڑیا جوز دو، یٹوٹ گئی ہے۔ اس کا بھائی بہنے لگا کہ بھی یہ توٹ گئی ہے اور یہاب جر نہیں سکتی۔ اس نے کہا کہ مجھے اس گڑیا کے جڑنے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اللہ میاں جواب نہیں دیتا کرتے۔ اللہ میاں کو تو بڑے بڑے کام ہوتے ہیں۔ لڑکی نے کہا کہ میں اللہ میاں کو ضرور پکاروں گی اور وہ میری بات کا ضرور جواب دے گا۔ اس نے کہا، اچھا اور چلا گیا۔ جب تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا تو دیکھا کہ اس کی بہن ویسے ہی نوٹی گڑیا لیے بیٹھی ہوئی ہے اور بہن سے کہنے لگا، بتاؤ کہ اللہ میاں کا کوئی جواب آیا۔ وہ کہنے لگی، ہاں آیا ہے۔ اس لڑکے نے کہا تو پھر کیا کہا؟ اس کی بہن کہنے لگی، اللہ میاں نے کہا ہے یہ نہیں جو سکتی۔ یہ اس لڑکی کا ایک یقین اور القان تھا۔ بہت سی دعاؤں کے جواب میں ایسا بھی حکم آ جاتا ہے۔ اسی بھی Indication آ جاتی ہے کہ یہ کام نہیں ہوگا۔ اس کو دل کی نہایت خوشی کے

ساتھ برداشت کرنا چاہیے۔ ہم برداشت نہیں کرتے ہیں لیکن کوئی بات نہیں۔ پھر بھی ہمیں معافی ہے کہ ہم قاضیہ بشری کے تحت، انسان ہونے کے ناطے بہت ساری چیزوں کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہیں اور ہم پورے کے پورے اس پر حاوی نہیں ہوتے۔ کئی مرتبہ دعا مانگنے کے سلسلے میں کچھ لوگ بڑی ذہانت استعمال کرتے ہیں۔ آخر انسان ہیں نا! آدمی سوچتا بھی بڑے ٹیڑے ہے انداز میں ہے۔ ہمارے گاؤں میں ایک لڑکی تھی، جوان تھی لیکن شادی نہیں ہو رہی تھی۔ ہم اسے کہتے کہ تو بھی دعا مانگ اور ہم بھی مانگتے ہیں کہ اللہ تیرا کہیں رشتہ کرا دے۔ اس نے کہا، نہیں میں اپنی ذات کے لیے بھی دعا نہیں مانگوں گی۔ مجھے یہ اچھا نہیں لگتا۔ ہم نے کہا کہ بھی تو تو پھر بڑی ولی ہے جو صرف دوسروں کے لیے ہی دعا مانگتی ہے۔ اس نے کہا ولی نہیں ہوں لیکن دعا صرف مخلوق خدا کے لیے مانگتی ہوں۔ وہ اللہ زیادہ پوری کرتا ہے۔ ہم اس کی اس بات پر بڑے حیران ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ یہی دعا مانگا کر تھی کہ ”اے اللہ میں اپنے لیے کچھ نہیں مانگتی، میں اپنی ماں کے لیے دعا مانگتی ہوں کہ اے خدا میری ماں کو ایک اچھا، خوبصورت سادا ماد دے دے، تیری بڑی مہربانی ہوگی۔ اس سے میری ماں بڑی خوش ہوگی، میں اپنے لیے کچھ نہیں چاہتی۔ وہ ذہین بھی ہو، اس کی اچھی تنوہ بھی ہو۔ اس کی جائیداد بھی ہو۔ اس طرح کادما دمیری ماں کو دے دے۔“ انسان ایسی بھی دعا نہیں مانگتا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ اس قسم کی اور اس طرح سے دعا مانگنا بھی بڑی اچھی بات ہے۔ اس سے بھی اللہ سے ایک تعقیٰ ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ ہرزبان سمجھتا ہے۔ اپنی دعا کو نکھارنکھار کے نکھارنکھار کے چوکھتا لگا کے اللہ کی خدمت میں پیش کیا جائے کہ جی یہ چاہیے، ان چیزوں کی آرزو ہے۔ یہ بیماری ہے، یہ مشکل ہے، حل کر دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو دعا مانگنے والے کے لیے مشکل پیدا کر دیتی ہیں کہ وہ صبر کا دامن چھوڑ کر بہت زیادہ تجویز کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے اور سوچنے لگتا ہے کہ جتنی جلدی میں دکھاؤں گا، جتنی تیزی میں کروں گا۔ اتنی تیزی کے ساتھ میری دعا قبول ہوگی۔ وہ ہر جگہ، ہر مقام پر ہر ایک سے یہی کہتا پھرتا ہے۔ اگر کبھی وہ یہ تجربہ کرے کہ میں نے عرضی ڈال دی ہے اور لکھ کر ڈال دی ہے اور اب مجھے آرام کے ساتھ بیٹھ جانا چاہیے کیونکہ وہ عرضی ایک بڑے اعلیٰ دربار میں گئی ہے اور اس کا کچھ نہ کچھ فیصلہ ضرور ہوگا۔ کئی وعد دعا کے راستے میں یہ چیز حائل ہو جاتی ہے کہ اب جب آپ کوئی کوشش کر ہی رہے ہیں تو پھر انشاء اللہ تعالیٰ آپ کی کوشش کے صدقے کام ہو جائے گا۔ ہم یہ بھی سوچتے ہیں لیکن یہ بھی میرا ایک ذاتی خیال ہے کہ دعا کی طرف پہلے توجہ دینی چاہیے اور کوشش بعد میں ہونی چاہیے۔ دعا کی بڑی اہمیت ہے۔ دعا کے ساتھ گھری اور یقین کے ساتھ وابستگی ہونی چاہیے اور جب گھری وابستگی ہو تو پھر اس یقین کے ساتھ کوشش کر کے سوچنا چاہیے کہ اب عرضی چل گئی ہے، اب اس کا نتیجہ ضرور نکلے گا۔ دعا ہرزبان میں پوری ہوتی ہے جس زبان میں بھی کی جائے۔ 1857ء میں جب انگریزوں اور

مسلمانوں کے درمیان جنگ آزادی جاری تھی اور مولوی حضرات اس جنگ کی رہنمائی کر رہے تھے اور تو پیش بھر بھر کے چلا رہے تھے تو اس جنگ کے خاتمے پر ایک مولوی نے ایک انگریز سے کہا کہ جیران کی بات ہے کہ ہم جو بھی تدبیر یا تجویز کرتے ہیں وہ پوری نہیں ہوتی اور آپ جو بھی کام کرتے ہیں ہر جگہ پر آپ کو کامیابی ملتی رہی ہے، اس کی کیا وجہ ہے۔ انگریز نے نہ کہا ”ہم ہر کام کے لیے دعا مانگتے ہیں۔“ مولوی صاحب نے کہا، دعا تو ہم بھی مانگتے ہیں۔ انگریز نے کہا، ہم انگریزی میں دعا مانگتے ہیں۔ اب مولوی بیچارہ خاموش ہو گیا۔ اس وقت بھی انگریزی کا ایک خاص رعب اور بد بہ ہوتا تھا تو مولوی صاحب نے بھی کہا کہ شاید انگریزی میں مانگی ہوئی دعا کامیاب ہوتی ہوگی۔ دعا کے لیے کسی زبان کی قید نہیں ہے۔ بس دلی وال بنتگی اہم ہے۔ اب میں آپ سے اجازت چاہوں گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

تکبر اور جمہوریت کا بڑھاپا

ایک انگریز مصنف ہے جس کا میں نام بھولنے لگا ہوں۔ اس کی معانی چاہتا ہوں لیکن شاید گنتگو کے دوران نام یاد آجائے، وہ مصنف کہتا ہے کہ تکبر، رعونت اور گھمنڈ اور مطلق العناینیت جب قوموں اور حکومتوں میں پیدا ہوتی ہے تو یا ایک طرح کی ڈولپمنٹ بلکہ بڑی گھری ڈولپمنٹ ہوتی ہے اور اس کے بعد جب کوئی حکومت، کوئی مملکت یا کوئی بھی طرزِ معاشرت یا زندگی وہ Democratic یا شعور ای انداز سے گزر کر یہاں تک پہنچا ہو تو پھر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اب جمہوریت بوڑھی ہو گئی، کمزور، یمار ہو گئی ہے اور اس کے آخری ایام ہیں۔ کسی بھی قوم میں تکبر یا گھمنڈ آجائے تو وہ اس بات کی نشاندہی ہوتی ہے کہ وہ جمہوریت جس کو لے کر یہ کئی صدیوں سے چل رہے تھے، اب کمزور اور ماؤف ہو گئے ہیں۔ تکبر اور فرعونیت کے بڑے روپ ہیں، اونچے بھی اور نیچے بھی اور ان کو سنبھالا دینا اور ان کے ساتھ اس شرافت کے ساتھ چلانا جس کا معاملہ نہیں نے انسانوں کے ساتھ کیا ہے، بڑا ہی مشکل کام ہے۔ کسی قسم کی تعلیم، کسی قسم کی دنیاوی تربیت ہمارا ساتھ نہیں دیتی اور تکبر سے انسان بس اور پرے اور پرہی نکل جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی اس حوالے سے بہت کوششیں ہوتی ہیں۔ 220 قبل مسح میں جب ہمارے خطے میں گندھارا حکمرانی تھی، تب سو سو کے قریب بدھوؤں کی ایک بیتی تھی اور وہ بڑے بھلے لوگ تھے۔ جیسے بدھ لوگ ہوتے ہیں۔ ان پر ایک ہندو راج دھانی (حکومت) نے حملہ کر دیا۔ بدھوؤں نے فصیل کے دروازے بند کر دیے اور وہ یچوارے اندر چھپ کے پیش گئے۔ ہندو فوج نے اپنے تیر، ترکش اور اگن مم پھیلنے تو فصیل کے اندر بے چینی پیدا ہوئی۔ کچھ بوڑھے، بزرگ اور صلح پسند بدھ دروازہ کھول کے باہر لٹکا اور انہوں نے کہا کہ ”تم کیا چاہتے ہو؟“ انہوں نے جواب دیا کہ ہم تم سے لڑنا اور جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ بدھوؤں نے کہا کہ جتاب، حضور ہم تو لڑنا نہیں چاہتے۔ تب ہندو ہمارا جنے کہا کہ ہم تمہارا ”بیج ناس“، (نسل ختم) کرنا چاہتے ہیں اور تم کو زندہ نہیں چھوڑنا چاہتے اور اس چھوٹی سی ریاست پر جو تم نے سو سو کے کنارے بسائی ہے، اس پر اپنا تسلط قائم کرنا چاہتے

ہیں۔ بدھوؤں نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ آپ قبضہ کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے ہندو مہاراجہ سے ایک گھنٹے کی مہلت مانگی۔ وہ بدھہ بزرگ پڑے، انہوں نے اپنی بستی کے لوگوں سے کہا کہ اپنا سامان اٹھاؤ جو بھی چھوٹا موٹا اٹھا سکتے ہو اور ایک گھنٹے کے اندر اندر راستی کو خالی کر دو، پھر یوں ہوا کہ وہ جتنے بھی بدھہ لوگ تھے، وہ وہاں سے چل پڑے، باہر فوج کھڑی تھی اور بدھہ ان کو مسلمان کرتے ہوئے جا رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ جی، ہم سب کچھ چھوڑ چھڑا کے جا رہے ہیں، آپ قبضہ فرمائیجی۔ جب وہ بستی بالکل خالی ہونے لگی تو بدھہ فوج کے پس سالار بیا ”سینا بیتی“ نے انہیں روک کے کہا ”اوہ بدھوؤں یہ قسم کیا کر رہے ہو، تم بستی خالی کر کے جا رہے ہو۔ ہم اس خالی خوبی بستی پر قبضہ کر کے کیا کریں گے؟ انہوں نے کہا کہ یہ خالی نہیں، اس میں ہمارا سامان بھی رکھا ہوا ہے۔ پس سالار نے کہا، خالی سامان نہیں چاہیے۔ ہماری گھمنڈ کی جو آگ ہے، وہ خالی سامان سے نہیں بچے گی۔ یہ اس وقت بچے گی جب تک ہم تم کو زیر نیکیں نہیں کریں گے۔ جب تک تم کو زیر نیکیں کریں گے اور تم پر حکمرانی نہیں کریں گے یا تم کو اپنے ہاتھوں لڑ کے ختم نہیں کریں گے۔ بدھوؤں نے کہا کہ ہم تو خود تسلیم کرتے ہیں کہ ہم آپ کے زیر نیکیں ہیں اور ہم نے اب جنگل میں یعنی کا اہتمام بھی کر لیا ہے۔ اس کے باوجود بدھوؤں نے جاتے ہوئے گھمنڈ اور تکبر میں بدھہ بھکشوؤں پر حملہ کر دیا۔ کچھ کو مارا ڈالا، کچھ کو زنجیریں ڈال کے غلام بنا لیا اور اپنے گھمنڈ کی آگ کو اس طرح منتدا کیا۔ انسانی تاریخ میں ایسی بے شمار مشاہد چلتی آئی ہیں اور آرہی ہیں۔ یہ مت بچھے گا کہ تعلیم کی وجہ سے یا بہت اعلیٰ درجے کی تربیت کی وجہ سے یا قدم قدم یا قافلہ چلنے کے باعث انسان کے اندر روزگارت، تکبر اور گھمنڈ کا جذبہ کم ہو جائے گا۔ آپ جب بھی تاریخ کے درق پلیں گے، بڑے بڑے حکمرانوں، شہنشاہوں، بادشاہوں اور سلطنتوں نے اپنے گھمنڈ اور تکبر کی خاطر چھوٹی چھوٹی مملکتوں اور راج دھانیوں اور بستیوں پر اور اپنے برابروں پر بھی بڑھ چڑھ کے حملے کیے ہیں اور ان کو زیل و خوار کرنے کی نیت سے ایسا کیا ہے۔

خواتین و حضرات! ہماری زندگی میں اکثر اوقات یہ ہوتا ہے کہ معاشرتی زندگی میں آپ کی کسی ایسے مقام پر بے عزتی ہو جاتی ہے کہ آپ کھڑے کھڑے موم عقی کی طرح پکھل کے خود اپنے قدموں میں گر جاتے ہیں۔ مجھے اس وقت کا ایک واقعہ یاد ہے جب میں اٹلی کے دارالحکومت روم میں رہتا تھا اور تدبیت قدرت اللہ شہاب کو رس کرنے کے لیے ہالینڈ گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے مجھے وہاں سے خط لکھا کہ میں ایک بفتے کے لیے تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں اور میں روم کی سیر کروں گا اور وہاں پھر دوں گا، باوجود اس کے کہ سات دن بہت محدود اور کم عرصہ ہے لیکن کہتے ہیں کہ روم سات دنوں کے اندر کسی حد تک روم دیکھا جاسکتا ہے تو میں بھی کسی حد تک اسے دیکھنے کے لیے تمہارے پاس آ رہا ہوں۔ میں نے کہا ضرور آئیے۔ جب وہ آئے تو تین دن، ہم روم کے گلی کو چھوں اور بازاروں میں گھومنت رہے اور جتنے بھی وہاں عجائب گھر تھے، انہیں دیکھا لیکن لوگ کہتے ہیں کہ روم کے میوزیم تو

سال بلکہ سو سال میں بھی نہیں دیکھے جا سکتے۔ بہر حال ہم پھر تے اور گھوتے رہے۔ ایک شام بیٹھے بیٹھے قدرت اللہ شہاب کے دل نیں آیا اور کہنے لگے، میں ”پومپیانی“ (وہ شہر جو ایک بڑے پہاڑ کے لاوے کی وجہ سے تباہ ہو گیا تھا اور اب بھی وہ جلا ہوا اور بر باد شہر دیے کا دیسا پڑا ہے اور لاوے کے خوف سے ایک کتا لاوے کے آگے آگے چینا ہوا بھاگا تھا لیکن ایک مقام پر آ کر لاوے نے اسے بھی پکڑ لیا اور وہ جل بھن گیا۔ چنانچہ اس کا حنوٹ شدہ وجود اب بھی اسی طرح موجود ہے۔) جانا چاہتا ہوں۔ پومپیانی کے بارے میں میں آپ کو مزید بتاؤں کہ لاوے کے باعث وہاں جس طرح لوگ مرے تھے، گرے تھے، انہیں بھی دیے ہی چھوڑا ہوا ہے۔ حماموں اور غسلخانوں اور دوکانوں پر جس طرح سے لوگ تھے دیکھوں گا کیونکہ پھر مجھے ایسا موقع نہیں ملے گا۔ پومپیانی روم سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہاں جانے میں ترین پر غالباً دو پونے دو گھنٹے لگتے ہیں۔ جب ہم وہاں جانے لگے تو کہا کہ میں ایک ایسا جو تالیماً چاہتا ہوں جو برازیم و نازک اور Flexible ہو اور وہ پاؤں کو تکلیف نہ دے تاکہ میں آسانی سے چل پھر سکوں۔ میں نے کہا یہ تو جو توں کا گھر ہے، یہاں تو اعلیٰ درجے کے جوتے ملتے ہیں۔ چنانچہ ہم ایک اعلیٰ درجے کی جوتوں کی دکان پر گئے۔ میں نے دکان والے سے کہا کہ یہ ہمارے ملک کے بہت معزز رائٹر ہیں اور انہیں ایک اعلیٰ قسم کا جوتا خریدنا ہے۔ انہوں نے ہمیں ایک انتہائی خوبصورت، نرم اور پلکدار جوتا دکھایا جس کو ہاتھ میں پکڑنے پر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ ”چری“ (کھال) جوتا نہیں ہے بلکہ کپڑے کا ہے اور پچ اس میں ایسی کلیقین نہ آئے، یقین کریں آپ کا ہاتھ سخت ہو گا لیکن وہ جوتا انتہائی نرم تھا۔ قدرت اللہ نے اسے بہت پسند کیا اور خرید لیا۔ جب چل کے دیکھا تو انہوں نے خوشی سے سیئی بجائی کہ اس سے اچھا جوتا میں نے ساری زندگی میں نہیں پہنا، ہم وہاں سے پومپیانی کے لیے روانہ ہوئے۔ اب ظاہر ہے پومپیانی ایک پتھریلا علاقہ ہے، اس کی سڑکیں توئی ہوئیں، جلی ہوئیں کیونکہ جیسا کسی زمانے میں تھا ایسا ہی پڑا ہوا ہے۔ ہم چلتے رہے، کوئی پندرہ میں منٹ کے بعد ایک پاؤں کا جوتا ٹوٹ گیا اور اس کے نائکے اکھر گئے۔ وہ انہوں نے ہاتھ میں پکڑ لیا اور ایسے چلتے رہے جیسے بگلا چلتا ہے۔ اب ہاتھ میں جوتا پکڑے اونچی پیچی لگائیوں اور پہاڑیوں پر چل رہے تھے کہ تھوڑی دیر کے بعد دوسرے پاؤں کا جوتا بھی جواب دے گیا۔ چنانچہ دونوں کو تمہوں سے لٹکا کر انہوں نے پکڑ لیا اور سنگے پاؤں وہ پومپیانی کی زیارت کرتے رہے۔ جیسے یا تری مقدس مقامات کی کرتے ہیں اور شام کو ننگے پاؤں واپس آئے اور کہنے لگے، یا ریہ جوتے جو اتنے قیمتی تھے، انہوں نے یہ حال کیا۔ میں نے دیکھا کہ ان جوتوں کے تلے اور پتاوے تک الگ ہو چکے تھے تو مجھے بہت غصہ آیا اور اس میں میری بے عنانی بھی تھی کیونکہ میں توہر وقت روم کی تعریف کرتا رہتا تھا جس طرح اب بھی کرتا رہتا ہوں۔ اگلی صبح میں دوکان پر گیا، ساتھ

شہاب صاحب بھی تھے۔ میں نے کہا، دیکھئے آپ نے اتنے مبنگے جوتے ہمیں دیئے ہیں، یہ تو دیکھنے سے زیادہ بھی نہیں چلے اور آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا کہ ایک آدمی اتنی دور سے آیا ہے اور تمہارے نامی گرامی اور تاریخی شہر کی زیارت کر رہا ہے لیکن تم نے ایسے جوتے دے دیئے۔ جو دو کاندار تھا وہ بڑے نرم خواور محبت والے انداز میں کہنے لگا ”صاحب ہم شرفاء اور معزز لوگوں کے لیے جوتے ہناتے ہیں، پیدل چلنے والوں کے لیے نہیں ہناتے۔“ یہ ایک تکبر کی تواریخی جس نے ہم دونوں کو اس مقام پر بری طرح سے قتل کر دیا۔ انسان اکثر دوسروں کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے ایسے فقرے مجتمع کر کے رکھتا ہے کہ وہ اس فقرے کے ذریعے دار کرے اور اس پر حملہ آور ہو اور پھر اس کی زندگی اور اس کا جینا اس کے لیے محال کر دے۔ اس طرح جملے بڑی سطح پر بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے یوں پر بھی ہوتے ہیں لیکن ہمارے مذہب میں یہ روایت بہت کم تھی۔ اگر تھی تو ہمارے پیغمبر محمدؐ اپنی تعلیمات کے ذریعے لوگوں کو اس فروعیت سے نکالتے رہتے تھے جس کا گناہ شداد، غریون، نفر و اور بہمان نے کیا تھا۔ ان کا یہ اس ایک ہی گناہ تھا جو سب گناہوں سے بھاری تھا۔ ا Hazel سے لے کر آج تک انسان کے ساتھ گناہ اور بدیاں چشمی رہی، پچھلے کم ہوتی ہیں اور پچھلے زیادہ۔ کسی کے پاس ایک بدی بالکل نہیں ہوتی۔ کسی کے پاس کافی تعداد میں ہوتی ہیں لیکن کہتے ہیں کہ کائنات میں کوئی آدمی ایسا نہیں گزر جو تکبر کا مر تکب نہ رہا ہو۔ کسی نہ کسی روپ میں وہ ضرور اس گناہ کا شکار ہوا ہے یا اس میں بنتا رہا ہے۔ ہمارے صوفی لوگ اس تلاش میں مارے مارے پھرے ہیں کہ کوئی ایسی راہ تلاش کی جائے جس سے تکبر کی شدت میں کمی واقع ہو۔ ایک درویش جنگل میں جا رہے تھے۔ وہاں ایک بہت زہریا کو بر اس اپ پھن اٹھائے بیٹھا تھا۔ اب ان درویشوں، سانپوں، خوفناک جنگلی جانوروں اور جنگلیوں کا ا Hazel سے ساتھ رہا ہے۔ وہ درویش سانپ کے سامنے کھڑے ہو گئے اور وہ بیٹھا پھن کار رہا تھا۔ انہوں نے سانپ سے کہا کہ ناگ راجہ یا رائیک بات تو بتا کہ جب کوئی تیرے سوراخ کے آگے جہاں تور رہتا ہے، میں بجا تا ہے تو تو باہر کیوں آ جاتا ہے۔ اس طرح تو تجھے سپیرے پکڑ لیتے ہیں۔ سانپ نے کہا، صوفی صاحب بات یہ ہے کہ اگر کوئی تیرے دروازے پر آ کر تجھے یکارے تو یہ شرافت اور مرمت سے بعد ہے کہ تو باہر نہ نکلے اور اس کا حال نہ پوچھئے۔ میں اس لیے باہر آتا ہوں کہ وہ مجھے بلا تائے تو یہ شریف آدمیوں کا شیوا نہیں کہ وہ اندر ہی گھس کے بیٹھے رہیں۔ ایک طرف تو مشرق میں اس قسم کی تعلیم اور تہذیب کا مذکورہ رہا ہے اور دوسری طرف اسی مشرق کے لوگ اپنے قد کو اونچا کرنے کے لیے اور اپنی موچھوں کو اینٹھے کے رکھنے کے لیے مظلوموں اور حکوموں پر حملے کرتے رہے ہیں تاکہ ان کی رعویت اور تکبر کا نام بلند ہو۔ بعض اوقات بڑے اچھے اچھے افعال جو بظاہر بڑے معمول نظر آتے ہیں، وہ بھی تکبر کی ذلیل میں آ جاتے ہیں۔ میں نے آپ سے یہ بات شاید پہلے بھی کی ہو کہ جب میں اول اوقل میں پابا جی کے ذریعے پر گیا تو میں نے

لوجوں کو دیکھا کہ پچھے لوگ بابا جی سے اندر کوٹھڑی میں بیٹھے باتیں کر رہے ہوتے تھے تو پچھے لوگ ان کے پکھرے ہوئے "الم بلغم" اور "اگرم بگرم" پڑے ہوتے تھے۔ انہیں اٹھا کر ترتیب سے دروازے کے آگے ایک قطار میں رکھتے چلے جاتے تھے تاکہ جانے والے لوگ جب جانے لگیں تو انہیں رحمت نہ ہو اور وہ آسانی کے ساتھ پاؤں ڈال کے چلے جائیں۔ میں یہ سب چار، پانچ، چھر روز تک دیکھتا رہا اور مجھے لوگوں کی یہ عادت اور انداز بہت بھلا لگا۔ چنانچہ ایک روز میں نے بھی بہت کر کے (حالانکہ میرے لیے یہ برا مشکل کام تھا) میں نے بھی ان جوتوں کو سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن چونکہ اس زمانے میں میں سوت پہنچتا تھا اور مجھے یہ فکر رہتا تھا کہ میری تائی جیکٹ کے اندر ہی رہے لٹکنے نہ پائے۔ اس لیے جھکے ہوئے بار بار اپنے لباس کو اور اپنے وجوہ کو اور خاص طور پر اپنے بدن کے خم کاظر میں رکھتا تھا۔ ایک دفعہ دو ففعہ ایسا کیا۔ جب بابا جی کو پہنچا تو وہ بھاگے بھاگے باہر آئے، کہنے لگے "ندہ آپ نے ہرگز یہ کام نہیں کرنا، میرے ہاتھ میں جوتوں کا ایک جوڑا تھا۔ انہوں نے فوراً اپس رکھوادیا اور کہا یہ آپ کے کرنے کا کام نہیں ہے، چھوڑ دیں۔ یہیں چھوڑ دیں۔ میں بڑا نالاں ہو اور مجھے بڑی شرمندگی ہوئی کہ لوگوں کے سامنے مجھے اس طرح سے روکا گیا اور مجھے یہ ایک اور طرح کی ذلت برداشت کرنا پڑی۔

ایک روز جب تخلیہ تھا، میں نے بابا جی سے پوچھا کہ "سری" آپ نے اس روز میرے ساتھ کیا کیا، میں تو ایک اچھا اور نیکی کا کام کر رہا تھا۔ جو بات میں نے آپ ہی کے ہاں سے سمجھی تھی، اس کا اعادہ کر رہا تھا۔ انہوں نے نہ کس کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا کہ آپ پر یہ واجب نہیں تھا جو آپ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں، آپ تکبر کی طرف جا رہے تھے۔ اس لیے میں نے آپ کو روک دیا۔ میں نے کہا، جناب یہ آپ کیسی بات کرتے ہیں! کہنے لگے، اگر آپ وہاں جوڑے اسی طرح سے سیدھی قطاروں میں رکھتے رہتے، جس طرح سے اور لوگ رکھتے تھے تو آپ کے اندر تکبر کی ایک اور رنگ پیدا ہو جانی تھی کہ دیکھو" میں اتنے بڑے ادارے کا اتنا بڑا اڈا زیکر جز لہوں اور اتنے اعلیٰ سرکاری عہدے پر ہوں اور میں یہ جو تے سیدھے کر رہا ہوں، لوگوں نے بھی دیکھ کر کہنا تھا، سبحان اللہ یہ کیسا اچھا نیکی کا کام کر رہا ہے۔ اس سے آپ کے اندر عاجزی کی بجائے تکبر اور گھمنڈ کو اور ابھرنا تھا۔ اس لیے آپ مہربانی کر کے اپنے آپ کو کنشروں میں رکھیں اور یہ کام ہرگز نہ کریں، پھر مجھے رکنا پڑا اور ساری عمر ہی رکنا پڑا۔ اس لیے کہ دل کی سلیٹ پر اندر جو ایک لکیر تھی ہوئی ہے، انا کی اور تکبر کی وہ کسی صورت بھی ملتی نہیں ہے۔ چاہے جس قدر بھی کوشش کی جائے اور اس کے انداز بڑے زائلے ہوتے ہیں۔ ایک شام ہم اندر میں فیض صاحب کے گرد جمع تھے اور ان کی شاعری سن رہے تھے۔ انہوں نے ایک نیٰ نظم لکھی تھی اور اس کو ہم بار بار سن رہے تھے۔ وہاں ایک بہت خوبصورت، پیاری سی لڑکی تھی۔ اس شعروخن کے بعد اس کی باتیں ہونے لگیں یعنی "انا" کی بات چل لگی اور اس کے اوپر تمام موجود حاضرین نے

باز بار اقرار و اظہار اور تبادلہ خیال کیا۔ اس نوجوان لڑکی نے کہا فیض صاحب مجھ میں بھی برا تکبر ہے اور میں بھی بہت اننا کی ماری ہوئی ہوں، کیونکہ صحیح جب میں شیشہ دیکھتی ہوں تو میں سمجھتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ خوبصورت اس دنیا میں اور کوئی نہیں، اللہ نے فیض صاحب کو بڑی Sense of Humour تھی، کہنے لگے بی بی۔ یہ تکبر اور اننا ہرگز نہیں ہے، یہ غلط فہمی ہے (انہوں نے یہ بات بالکل اپنے مخصوص انداز میں لبھا اور لٹا کے کی) وہ بچاری قہقہہ رکا کے بلسی۔ زندگی کے اندر ایسی چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں لیکن قوموں کے لیے اور انسانی گروہوں کے لیے تکبر اور اننا رعنوت، گھمنڈ اور مطلقوں العناوینت بڑی خوفناک چیز ہے، اس اگر یہ مصنف جس کا نام اب میرے ذہن میں آ رہا ہے، وہ انگریز مصنف جی۔ کے جیسے کہتا ہے کہ جب تکبر انسان کے ذہن میں آ جائے اور وہ یہ سمجھے کہ میرے جیسا اور کوئی بھی نہیں اور میں جس کو چاہوں زیر کر سکتا ہوں اور جس کو چاہوں تباہ کر سکتا ہوں تو وہ حکومت، وہ دور، وہ جمہوریت یا وہ بادشاہت چاہے کتنی بھی کامیابی کے ساتھ جمہوری دور سے گزری ہو، اس بابت یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس جمہوریت کا جس کا نام لے کر وہ چلتے تھے، اس کا آخری پھر آن پہنچا ہے اور وہ جمہوریت ضعیف ہو گئی ہے اور اس میں ناتوانی کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور وہ وقت قریب ہے جب وہ جمہوریت فوت ہو جائے گی اور فوراً ہی گھمنڈ اور فرعونیت میں بدل جائے گی۔ مشرق میں اس پر بطور خاص توجہ دی جا رہی ہے اور بار بار مسلسل دہرا دہرا کر ایشیاء کے حصے بھی مذاہب ہیں ان میں بار بار اس بات پر زور دیا جاتا رہا کہ اپنے آپ کو گھمنڈ، فرعونیت اور شدایت سے بچایا جائے کیونکہ یہ انسان اور نوح انسانی کو بالکل کھا جاتی ہے کیونکہ اس کا مطلب خدا کے مقابلے میں خود کو لانا ہے۔ حافظ ضامن صاحب کے خلیفہ تھے۔ ان کا نام شمس اللہ خان یا اسد اللہ خان تھا۔ چلے اسد اللہ خان رکھ لیتے ہیں۔ وہ خلیفہ تھے لیکن طبیعت کے ذرا سخت تھے (پھنان تھے، طبیعت کے سخت تو ہوں گے ہی) ان کے ہاں ایک مرتبہ چوری ہو گئی۔ اب وہ گاؤں کے ”کھیا“ (چودھری) تھے۔ ان کے ہاں چوری ہو جانا بڑے دکھ کی بات تھی۔ انہوں نے لوگوں کو اکھا کیا اور اپنے طور پر تحقیق و تفتیش شروع کر دی۔ ایک بڑا نیک نمازی جو لاہا جو گفتگو میں بڑا کمزور تھا، وہ بھی پیش ہوا۔ اب لوگوں نے اس کے حوالے سے کہا کہ چونکہ یہ بولتا نہیں ہے اور ذرا ذرا ساستے اور اندازہ بیکی ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ چنانچہ اسد اللہ خان نے غصے سے پکار کر کہا کہ جو لا ہے حق بخدا ورنہ میں تیری جان لے لوں گا۔ وہ بچارہ سیدھا آدمی تھا، وہ سہم گیا اور ہکلا گیا اور اس کی زبان میں لکنت آگئی۔ خان صاحب نے اس کی گھبراہٹ اور لکھت سے یہ اندازہ لگایا کہ یقیناً چوری اسی نے کی ہے۔ انہوں نے اسے زور کا ایک تھپٹر مارا، وہ لڑکھڑا کے زمین پر گر گیا اور خوف سے کاپنے لگا اور سر اثبات میں ہلا کیا کہ جی ہاں، چوری میں نے ہی کی ہے۔ وہ جو لاہا سیدھا مولا نا گنگوہی کی خدمت میں حاضر ہوا اور سارا واقعہ انہیں سنایا اور کہا کہ میری زندگی عذاب میں ہے اور میں

یہ گاؤں چھوڑ رہا ہوں۔ مولانا گنگوہی نے خان صاحب کو ایک رقد کھا کہ تمہارے گاؤں میں یہ واقعہ گزرا ہے اور اس طرح تم نے اس جو لایے پر باتھا اٹھایا ہے تو آپ ایسے کریں کہ کیا آپ نے عذر شرعی کی وجہ سے اس پر باتھا اٹھایا ہے؟ آپ کو کیا حق پہنچتا تھا؟ اس بات کا جواب ابھی سے تیار کر کے رکھ دیجیے کیونکہ آگے چل کر آپ کی اللہ کے ہاں یہ پیشی ہو گئی اور پہلا سوال آپ سے یہی پوچھا جائے گا۔ جب یہ رقد اسد اللہ خان کے پاس پہنچا تو ان کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی اور پٹپٹائے، گھبرائے اور وہیں سے پیدل چل پڑے اور گلگوہا پہنچ۔ جب مولانا گنگوہی کے ہاں پہنچے تو وہ آرام فرم رہے تھے۔ ان کے خادم سے کہنے لگے، آپ مولانا سے کہہ دیجیے ایک ظالم اور خونخوار قسم کا آدمی آیا ہے۔ کہیں تو حاضر ہو جائے، نہیں تو وہ جا کر اپنے آپ کو ہلاک کر لے اور کتوں میں ڈوب کر مر جائے اور میں اس کا تہیہ کر کے آیا ہوں۔ مولانا نے انہیں اندر بلوالیا۔ آپ لیٹے ہوئے تھے اور فرمائے گئے، میاں کیوں شور مچایا ہوا ہے؟ اور کیا ایسا ہو گیا کہ تم وہاں سے پیدل چل کے آگئے۔ غلطی ہو گئی، گناہ ہو گئی۔ معافی مانگ لو اور کیا ہو سکتا ہے۔ جاؤ چھوڑو، اپنے ضمیر پر بوجھنہ ڈالو۔ چنانچہ خان صاحب واپس آگئے اور آکر گاؤں میں اعلان کیا کہ اس جو لایے کو پھر بلایا جائے۔ (ایسی میدان میں جہاں اسے سزا دی تھی) وہ جو لایا ہے چارہ پھر کا نپتا ڈرتا ہوا حاضر ہو گیا۔ کہنے لگا جتنا میں نے تجھے مارا تھا، اتنا تو مجھے مار، اب لوگ کھڑے دیکھ رہے ہیں۔ لوگوں نے کہا جاب! یہ بے چارہ کا نپا رہا ہے، یہ کیسے آپ پر باتھا اٹھا سکتا ہے۔ خان صاحب کہنے لگے، اس نے ہاتھنہ اٹھایا تو میں مارا جاؤں گا۔ جو لایے نے بھی کہا، جناب میری یہ بساط نہیں ہے اور میرا ایسا کرنے کو دل بھی نہیں چاہتا ہے۔ اگر کوتا ہی ہوئی ہے تو اللہ معاف کرنے والا ہے۔ اللہ ہم دونوں کو معاف کرے۔ چنانچہ وہ گھر واپس آگئے۔ اگلے دن جب وہ جو لایا کھڈی پر کپڑا بن رہا تھا تو خان صاحب اس کی بیوی کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے، گھر کے کام کا نکال کے لیے اب میں حاضر ہوں۔ جو چیز مودا سلف مغلوں ناہو مجھے حکم کیا تھی، بھائی صاحب کے ہاتھ نہ مغلوں یا تھیے (اب عورتوں کو اگر مفت کا نوکریں جائے تو کہاں چھوڑتی ہیں) پھر خان صاحب آخری دم تک ہر روز صبح اپنی بھی دور کھڑی کر کے اس جو لایے کی بیوی کے پاس جاتے اور جو بازار سے چیزیں لانا ہوتیں لا کر دیتے رہے اور وہ گھر کا سودا اپنے کندھوں پر اٹھا کے لا کے دیتے۔ بعض اوقات وہ وہ پہر کو بلوایا بھیجتی کہ فلاں کام رہ گیا ہے۔ انہوں نے اپنے ملازموں کو حکم دے رکھا تھا کہ اگر میں سویا بھی ہوں تو بھی مجھے بتایا جائے۔ جب تک وہ زندہ رہے، اس جو لایے کی بیوی کا ہر حکم بھالاتے رہے کہ شاید اس وجہ سے جان بخشی ہو جائے اور آگے چل کر وہ سوال نہ پوچھا جائے۔ کس شرعی ضرورت کے تحت آپ نے اس کو پھر مارا تھا؟ امید ہے ان سے یہ سوال نہیں پوچھا گیا ہو گا۔ اللہ آپ کو آسمانیاں عطا فرمائے اور آسمانیاں تقیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمين۔ اللہ حافظ

”شک“

میں ایک بہت ضروری اور اہم بات لے کر گھر سے چلا تھا لیکن سوڑہ یوتک پہنچنے سے پہلے ایک عجیب و غریب واقعہ رومنا ہوا جس سے میرا سارا ذہن اور آپ سے بات کرنے کا سوچا ہوا اندازہ ہی تبدیل ہو کر رہ گیا ہے اور جو بات میرے ذہن میں تھی، وہ بھی پھیل کر ایک اور جگہ پر مقید ہو گئی ہے۔ میں جب گھر گیا تو میں نے دیکھا کہ میری بیوی نے ہمارا ایک نیا ملازم جو گاؤں سے آیا ہوا ہے، اس کم سن کے باٹھ کے ساتھ ایک چھوٹی سی رسی باندھ کے اسے چار پائی کے پائی کے ساتھ باندھ کے بندر کی طرح بھایا ہوا ہے۔ میں نے کہا، یہ کیا معاملہ ہے؟ وہ کہنے لگی اس نے میرے پر س میں سے ایک پانچ سو کا، دوسو اور تین فوٹ دس دس روپے کے چالیے ہیں اور اس نے یہ سات سو تیس روپے کی چوری کی ہے۔ یہ بھی نیانا آیا ہے اور اس کی آنکھوں میں دیکھو صاف بے ایمانی جھلکتی ہے۔ میں نے کہا، مجھے تو کوئی اسی چیز نظر نہیں آتی۔ کہنے لگی، نہیں آپ کو اندازہ نہیں ہے، جب یہ آیا تھا اس کے کان ایسے نہیں تھے اور اب جب اس نے چوری کر لی ہے تو اس کے کانوں میں فرق پیدا ہو گیا ہے۔ میں نے کہا، دیکھئے یہ آپ شک و شبہ کی بات کرتی ہیں۔ اس حوالے سے آپ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتیں۔ انہوں نے کہا، نہیں میرا دل کہتا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ میں نے کہا، دیکھو اس پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ خدا کے واسطے اسے چھوڑ دو۔ تو کہنے لگی میں اسے کچھ کہوں گی تو نہیں اور نہ ہی اسے کوئی سزا دوں گی لیکن میں نے اسے باندھ کے اس لیے بھایا ہے کہ اسے اندازہ ہو کہ ایک اچھے گھرانے میں جہاں اس کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو رہا ہے، اس نے کس قسم کی غلط حرکت کی ہے۔ ابھی ہم اس گفتگو میں مشغول ہی تھے کہ میرا چھوٹا بیٹا گھر آیا اور اس نے آتے ہی پکار کر کہا کہ امی آپ نہیں نہیں اور مجھے باہر جانا تھا تو میں نے آپ کے پرس سے سات سو تیس روپے کے قریب رقم لی تھی۔ یہ آپ واپس لے لیں، اب اس کی ماں نے وہ پیسے تو پکڑ لیے اور لوٹ کے اس بندر (لاکے) کی طرف نہیں دیکھا جو باٹھ پر رہی بندھوا کر چار پائی کے پاس بیٹھا تھا اور میں بھی شرمندہ کھڑا تھا لیکن مجھ میں تھوڑی اسی ایسی تملکت

ضرور تھی کہ جیسے ایک چھوٹے لیول کے بادشاہوں میں ہوا کرتی ہے۔ میں نے کہا تا یے! وہ کہنے لگی، دیکھیں مجھے تو تقریباً اس لڑکے کی حرکت ہی لگی تھی۔ میں نے کہا کہ شک و شبہ اور ظن میں ایسے ہی ہوا کرتا ہے اور اس میں آدمی بغیر کسی منطق کے، بغیر کسی دلیل کے اور بغیر کسی الجھن کے الجھ جاتا ہے اور اکیلا فرد ہی نہیں، قومیں اور ملک بھی اس میں الجھ جاتے ہیں۔ فرض کریں کہ ایک ملک کو دوسرے ملک پر شک پڑ گیا کہ اس نے میرے خلاف کارروائی کی اور تاریخ کے واقعات اس کے شاہد ہیں کہ ایسا بھی ہوا کہ اس ملک نے دوسرے پر حملہ کر دیا اور بغیر سوچے سمجھے، ثبوت حاصل کیے ہزاروں لاکھوں جانیں ختم کر دیں۔ میں جب سوڑو یو آرہا تھا تو بات آپ سے سمجھو اور کہنی تھی لیکن مجھے اپنی آپا صالح یاد آگئیں۔ وہ ہم سے عمر میں ذرا سی بڑی تھیں اور ہم جب لی۔ اے اور ایم۔ اے میں تھے تو اس وقت ان کی شادی ہو چلی تھی اور وہ اپنے خاوند کے ساتھ ولایت چلی گئیں اور وہاں ایک عرصہ تک رہیں۔ جب دینی معرض وجود میں آیا تو پھر وہ لوگ دینی آگئے۔ یہاں انہوں نے اپنا وہی پرانا کام سنبھال لیا جو وہ اپنی کمپنی میں کر وہ پھر ولایت چلی گئیں اور وہاں جا کر انہوں نے اپنا وہی پرانا کام سنبھال لیا جو وہ اپنی کمپنی میں کرتے تھے۔ ایک روز کسی انگریز خاتون نے صالح آپا کو بتایا کہ اگر پلاٹنیم کے زیورات کو موٹے باجرے کے آٹے میں رکھا جائے تو ان کی دکھ (چمک) میں بڑا اضافہ ہوتا ہے اور یہ بہت صاف سترے ہو جاتے ہیں اور یہ ایسا علاج اور سمجھی ہے کہ اس سے بہتر طریقہ پلاٹنیم کے زیورات کے لیے ابھی تک نہیں آیا۔ اب ظاہر ہے کہ خواتین کی کامیابی اور زیورات سے گہری دلچسپی ہوتی ہے اور وہ ان کی بابت زیادہ گفتگو کرتی ہیں۔ آپا صالح کو بھی اس خاتون کی بات بڑی دل کو گئی۔ چنانچہ انہوں نے باجرے کا آٹا حاصل کیا اور اس میں اپنے کان کے دوبارے دوبارے دبادیے۔ صبح اجھ کر انہوں نے آٹے کی پڑیا کھولی اور وہ حیران رہ گئیں کہ آٹے میں صرف ایک ہی بالا تھا اور دوسرا بالا موجود نہیں تھا۔ اب وہ پریشان ہو گئیں کیونکہ پلاٹنیم کا بالا کچھ کم قیمت کا تو ہوتا نہیں۔ اس کرنے میں سوائے ان کے اور ارشد بھائی (ان کے خاوند) کے کوئی تھا بھی نہیں۔ اب جب ارشد بھائی عسل خانے سے شیو بنانے کے بعد باہر نکلے تو آپا صالح کہتی ہیں کہ مجھے پہلی مرتبہ باو جو وہ اس کے کہ وہ میرے خاوند ہیں اور ہماری شادی کو 21 برس ہو گئے ہیں لیکن وہ مجھے چہرے سے ایک چور سے نظر آئے اور ایسے محسوس ہوا کہ انہوں نے راتوں رات وہ بالا چرالیا ہے اور وہاں پہنچانے کی کوشش کی ہے جہاں میری ملکنی سے پہلے ان کی کسی دوسری رشتہ دار لڑکی کے ساتھ ملکنی طے ہو رہی تھی اور وہ لڑکی (ظاہر ہے اب تو وہ محورت ہو چکی ہو گی) لندن آئی ہوئی تھی اور اس کا شیلی فون ارشد صاحب کو آیا تھا۔ جس میں اس نے ارشد کو بتایا تھا کہ میں اور میرا خاوند لندن آئے ہوئے ہیں اور ہم ملنے اچاہتے ہیں۔ بتائیے ہم کب آسکتے ہیں۔ اب آپا صالح کو پکا یقین ہو گیا کہ یہ بالا سوائے ارشد کے اور کسی نے نہیں چرمایا، کیونکہ کرنے میں اور کوئی تھا ہی نہیں۔

چنانچہ تین چار روز انہوں نے بڑے کرب کی کیفیت میں گزارے اور جب وہ خاتون جن سے شاید ارشد بھائی کی شادی ہو جاتی کیونکہ دونوں گھرانوں کے درمیان ہاں بھی ہو گئی تھی لیکن کسی وجہ سے وہ ہاں ناں میں تبدیل ہو گئی۔ وہ اپنے خاوند کے ساتھ ارشد بھائی سے آ کر ملی تو آپا سارا وقت گلکی باندھ کر ارشد بھائی کے چہرے کی طرف دیکھتی رہیں اور انہیں ارشد صاحب کے چہرے پر سے بھی ایسے آثار واضح نظر آ رہے تھے کہ انہوں نے بالا چرا یا ہے اور اس خاتون کو دے دیا ہے یا اس کو بعد میں پہنچا دیں گے۔ اب ارشد بھائی اور صالح آپا کے درمیان ایک بہت بڑی طبع حائل ہو گئی اور وہ شک و شبیہ میں زندگی بسرا کرنے لگے۔ باوجود اس کے کہ ارشد بھائی بار بار پوچھتے تھے کہ تمہاری طبیعت پر مجھے کچھ بوجھ سالگتا ہے لیکن صالح آپا نبھی میں سر ہلا دیتی تھیں اور کہتیں خیر جو ہونا تھا، ہو چکا لیکن انہیں اپنے قیمتی بالے کے گم ہونے کا افسوس ہے۔ ارشد بھائی کو بھی اس بات کا بہت افسوس تھا کہ وہ بالا اگر گم ہو گیا ہے تو اسے تلاش کیا جانا چاہیے لیکن چونکہ آپا کی نظر میں چور وہ خود تھے، اس لیے تلاش کرنے میں ارشد بھائی کی کوئی مدد نہیں کرتی تھیں۔ پانچویں روز اس کمرے سے تھوڑی سی بدبو کے آثار پیدا ہوئے۔ شام تک وہ بدبو کافی بڑھ گئی۔ پھر یہ ڈھونڈ دیا پڑی کہ وہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے۔ چنانچہ سارے کوئے کھدرے تلاش کیے گئے اور ایک بڑا ساقی لیں جو کہ اخباروں کے اوپر پڑا ہوا تھا اور پرانے اخباروں کی نوکری اس پر اونڈھی لیٹی ہوئی تھی جب وہ انہا کردیکھا گیا تو اس کے نیچے ایک چوبامرا ہوا پڑا تھا اور اس چوبے کے گلے میں وہ پلاٹینم کا بالا پھنسا ہوا تھا۔ رات کو وہ باجرے کا آتا تھا نے آیا اور شوق میں اپنا منہ دھنستا ہوا آتی دور لے گیا کہ بالا اس کے طبق کا پھندا بن گیا اور پھر وہ اسے پتوں کی کوشش کے باوجود نکال یا اتارنے سکا اور اس کا دم گھٹ گیا، بڑی مشکل کے ساتھ اس سڑی ہوئی لاش سے وہ بالا چھڑا یا گیا اور صالح آپا کو اطمینان نصیب ہوا جو اللہ کے فعل سے اب تک ہے۔ شک و شبیہ کی دنیا بڑی عجیب و غریب ہوتی ہے اور اس پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ جب یہ ایک بارہ ہن میں جاگ جاتی ہے تو اس کا ذہن سے نکالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ نفیات دان یہ کہتے ہیں کہ شک کے نکلنے کے لیے ہمارے پاس کوئی فارمولہ نہیں ہے جو Apply کر کے انسان کو اس شک و شبیہ کی اذت سے نجات دلادے۔ البتہ اللہ ضرور اس بات کا حکم دیتا ہے کہ تم لوگوں کی تلوہ میں نہ رہا کرو۔ یہ مت دیکھو کہ اس کے گھر میں کیا آیا ہے، اس کو کون ملنے آیا۔ اس کو چھوڑو، وہ اللہ کا بندہ ہے اور اسے اللہ تھی پوچھنے کا اور تم زیادہ تجسس میں نہ پڑا کرو، یہ اللہ کا حکم ہے۔ اسی طرح سے جب آپ شک میں پڑتے ہیں تو آپ اس حکم کو یقیناً چھوڑ دیتے ہیں جو بڑے واضح انداز میں Categorically (جا سوی) لینے کے لیے اور ایسی سی آئی ڈی کرنے کے لیے مت جایا کرو۔ اپنی زندگی کے اندر کوئی سی آئی اے (CIA)، کوئی کے جی بی (KGB) نہ بنائیں، کوئی موساد، کوئی راءہ نہ بنائیں اور نہ آپ کی زندگی

عذاب میں پڑ جائے گی۔ جن ملکوں نے ایسے ادارے بنائے ہیں بظاہر تو وہ بہت خوش ہیں اور ان پر خفر کرتے ہیں لیکن آہستہ آہستہ اس قسم کے ادارے ان کو ایسی الجھنوں میں بنتا کر دیتے ہیں کہ وہ پھر اس سے نکل نہیں سکتے۔ شک کے حوالے سے مجھے بڑی لگزی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ جوانی میں مجھے درختوں اور پودوں کے ساتھ بڑا شغف تھا۔ اس وقت میرے پاس ایک چھوٹی آرمی ہوا کرتی تھی جس سے میں درختوں کی شاخیں کا بتاتھا اور ان کی اپنی مرضی کے مطابق تراش خراش کیا کرتا تھا اور ہمارے ہمسایوں کا ایک بچہ جو پانچوں ہیں، چھٹی میں پڑھتا ہو گا۔ وہ اس ولایتی آرمی میں بہت وچپی لیتا تھا۔ ایک دو مرتبہ مجھ سے دیکھے بھی چکا تھا اور اسے ہاتھ سے چھو کر بھی دیکھے چکا تھا۔ ایک روز میں نے اپنی وہ آرمی بہت تلاش کی لیکن مجھے نہ ملی۔ میں نے اپنے کمرے اور ہر جگہ اسے تلاش کیا لیکن بے سود۔ اب جب میں گھر سے باہر نکلا تو میں نے پڑوں کے اس لڑکے کو دیکھا۔ اس کے پھرے سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میری آرمی اس نے ہی چڑائی ہے۔ اس کی شکل، صورت، چلنے بات کرنے کا انداز، سب بدل گیا تھا۔ جیسے جو ملک دوسرے پر حملہ کرنا چاہتے ہیں اور مجھتے ہیں کہ یہ Culprit ہے یا اس نے کوئی ایسی کوتاہی کی ہے جو ہماری مرضی کے مطابق نہیں ہوئی اور ان کو یہ لگنے لگتا ہے کہ اس میں یہ، یہ خرابی ہے اور مجھے بھی پڑوں کے اس لڑکے پر سارے شک وارد ہونے لگے۔ اب مجھے ایسے لگتا کہ جس طرح وہ پہلے مسکراتا تھا، اب دیسے نہیں مسکراتا۔ مجھے ایسے لگتا جیسے وہ مجھے اپنے دانتوں کے ساتھ چڑا رہا ہو۔ اس کے کان جو پہلے چھپتے تھے، وہ اب مجھے کھڑے دکھائی دیتے اور اس کی آنکھوں میں ایسی چیز مجھے دکھائی دیتی ہو ایک آرمی چور کی آنکھوں میں انظر آ سکتی ہے لیکن مجھے اس بات سے بڑی تکلیف ہوئی جیسے صاحب آپ کو بھی ہوتی تھی۔ جب میں نے اس آرمی کو گھر میں موجود پایا کیونکہ میں خود ہی اس آرمی کو اٹھا کر گھر کے اندر سے آیا تھا اور ایک دن ایسے ہی اخباروں کی اللٹ پلٹ میں مجھے وہ آرمی مل گئی، جب مجھے وہ آرمی مل گئی اور میں شرمندگی کے عالم میں باہر نکلا تو یقین سمجھیجی وہی لڑکا اپنی ساری خوبصورتوں اور بھولے پین کے ساتھ اور ویسی ہی مخصوصیت کے ساتھ مجھے انظر آ رہا تھا۔ میں کہاں تک آپ کو یہ باتیں بتاتا چلا جاؤں، آپ خود بحمدہ رہیں اور جانتے ہیں شک کی کیفیت میں پوری بات ہاتھ میں نہیں آتی۔ اس موقع پر مجھے علامہ اقبال کا ایک شعر یاد آ رہا ہے

مِشَامٌ تِيقَنْ سے صُحْرَا مِيلَ مَلَّا هِي سِراغُ اسِ الْ
ظُلُمِ وَالْجُنُونِ سَهْلَهْ آتَاهُنْ آهُونَ تَاتَارِي

جو قوں میں شک و شب سے یہ اندازہ لگائی ہیں کہ میری نگاہوں میں جو Culprit ہے، اس وہی مجرم ہے، غلط اور شک پر بھی اندازوں سے اصل بات یا آہوئے تاتاری گرفت میں نہیں آتا ہے۔ آپ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے مجھے اپنے ایک دوست سعید اللہ صاحب یاد آ گئے، وہ سائیکالوجی کے

پروفیسر تھے اور وہ لندن پی ایچ ڈی کرنے گئے تھے۔ جب وہ پی ایچ ڈی کر رہے تھے اور وہاں انہیں تین چار سال ہو گئے تھے (اس زمانے کی پی ایچ ڈی ذرا مشکل کام تھا) تو ان کی بیوی کے ساتھ ایک عجیب و غریب حادثہ گزرا۔ وہ جب تہہ خانے میں نہانے کے لے جاتی اور پانی گرم کرنے والا الیکٹریک راڑا پانی میں ڈال کر کپڑے اتار کر نہانے لگتی تو عین اس وقت ان کے ٹیلی فون کی گھنٹی بجھنٹتھی اور وہ دوبارہ سے کپڑے پہن کر شیرھیاں چڑھ کے ٹیلی فون کا رسیور اٹھا کر جب ہیلو کہتی تھی تو انہیں کوئی جواب نہیں ملتا تھا اور ان کے ساتھ یہ واقعہ تقریباً ہر روز پیش آتا۔ اس پر پروفیسر سعد اللہ صاحب نے وہاں کی پولیس کو اس بات کی اطلاع کر دی اور پولیس نے تحقیق اور تحقیق شروع کی۔ جب ہماری آپا (پروفیسر دوست کی الہیہ) نہانے کے لیے خیچ گئیں اور انہوں نے کپڑے اتارے تو گھنٹی بجی۔ پولیس والوں نے فون انھیاں لیکن کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ پولیس اس حوالے سے تحقیق جاری رکھنے کا کہہ کر چل گئی۔ اب پروفیسر کو اندازہ ہوا کہ ہمارے سامنے جو مکار اور موٹا سا آدمی جس کی نائگ کئی ہوئی تھی، رہتا ہے، یہی فون کرتا ہوگا اور وہ تھا بھی کچھ بد تیز قسم کا۔ چنانچہ پولیس نے بھی اس کے نمبر پر پہرہ بٹھا دیا۔ حالانکہ وہ شخص فون نہیں کرتا تھا۔ پولیس نے ایکچھ سے بھی پتہ کیا لیکن وہاں سے پروفیسر صاحب کے نمبر پر کوئی فون کاں آنے کی بابت تصدیق نہ ہوئی۔ لندن کا یہ واقعہ اتنا مشہور ہوا اور یہ ذرا لئے ابلاغ کی خبروں کی زینت بن گیا۔ ہر چھوٹے بڑے اخبار، صحیح، دوپہر کے اخبارات میں اس بات کا ذکر ضرور آتا تھا۔ ابھی تک وہ ملزم گرفتار نہیں ہوا اور اس چور کا پتہ نہیں چل سکا۔ چنانچہ سب تھک ہار کے بیٹھ گئے۔ پروفیسر سعد اللہ صاحب کی بیوی نے کہا کہ میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، وہ ختم کر لیں تو چلتے ہیں۔ ان کی بیوی نے کہا کہ دفع کرو، کیا پی ایچ ڈی کے بغیر زندگی بسر نہیں ہوتی؟ جب پروفیسر صاحب پر اہمیت کا شدید باؤ پڑا تو انہیں پی ایچ ڈی بالکل غرق ہوتی نظر آئی تو انہوں نے کہا کہ میں اس کی تحقیق کرتا ہوں۔ پروفیسر صاحب بتاتے ہیں کہ وہ کسی زمانے میں ریڈ یو کے ٹرانسٹر بنا�ا کرتے تھے۔ ان ٹرانسٹرز کو کرشل بیٹ کہا جاتا تھا جس میں ایک لمبے سے ایریل کو خیچے گملے وغیرہ میں ارتھ دے کر گھما یا جاتا تھا اور کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی اشیش پکڑا ہی جاتا تھا۔ یہ سنیتیں اڑتیں کی بات ہے۔ انہوں نے کہا کہ میں اپنا ایکٹر نکس کا علم جتنا بھی ہے، اسے استعمال کروں گا۔ چنانچہ انہوں نے اس فون کے بجھنے کی آواز پر اپنے کان رکھے اور جو بھی خیچے ان کی بیوی نہانے کے لیے گئیں، انہوں نے آواز دے کر کہا، بیگم راڑا کیا، جب آواز آئی ہاں تو پروفیسر صاحب نے کہا، دیکھو بھی گھنٹی بجی! اور عین اس وقت گھنٹی بجھنٹتھی اور انہیں اس پر پروفیسر صاحب نے تحقیق شروع کر دی اور 6 دون کے اندر اندر انہوں نے چور پکڑ لیا، جو ساری لندن

پولیس اور ساری کامپلیکس سے پکڑا نہ جا سکتا تھا۔ وہ چور پروفیسر نے پکڑ لیا۔ چور یہ تھا کہ جب وہ بھلی کا راڑ آن ہوتا تھا اور پانی بائبلے کے لیے اس میں ڈالا جاتا تھا تو اس بھلی کی تار کے قریب سے فون کی تار نیچے زمین میں سے گزرتی تھی۔ جو نبی وہ بھلی کی تار Energise کرنے کے لئے بھانی شروع کر دیتی تھی اور اس میں کوئی Heat Up آدمی ملوث نہیں تھا۔ پروفیسر صاحب کہتے ہیں کہ جس کرب کی حالت میں انہوں نے وہ پورا سال گز ادا تھا، وہ یا میں جانتا ہوں یا میری بیوی جانتی ہے۔ اس طرح کے واقعات حیات انسانی میں گزرتے رہتے ہیں اور اب بھی گزر رہے ہیں تو اس عذاب سے نکلنے کے لیے روحانی طور پر اللہ سے مدد مانگی جاسکتی ہے کیونکہ اس نے شک سے منع فرمایا ہے۔ ہم خدا سے مدد مانگ کر اس تم کے کر بنا ک مرد سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اگر کبھی آپ کو ایسی مشکل درپیش ہو کہ ہم شک و شبہ یا ظن میں بیٹلا ہو جائیں تو پھر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تحام کر اور اپنا آپ سارے کا سارا ڈھیلا چھوڑ کر خود کو اس کے خواہ کر کے اس کا حل تلاش کریں تو اس کا حل تلاش کرنا ممکن ہے۔ میں آپ کو آخر میں یہ تسلی کر دوں کہ اس بچے کو جس کو میری بیوی نے شک میں باندھ دیا تھا، اس سے ہم دونوں میاں بیوی نے معافی مانگ لی ہے اور میرا بیٹا اس کو اپنے ساتھ لے جا کے کچھ مٹھائی شٹھائی بھی کھلا چکا ہے۔ ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں لیکن ان کو بڑی بصیرت، خوش دلی، سمجھا اور برداشت کے ساتھ نہ مانانا چاہیے۔ اگر جلد پاڑی اور خوش دلی سے کام نہ لیا گیا تو وہی صورت حال ہو گی جو میری آری چور کے بارے میں ہو گئی تھی یاد گیر واقعات کی مانند۔ اب اجازت چاہوں گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ فی امان اللہ

رشوت

آج سے کوئی دس بارہ برس پیشتر کچھ Socialogist جمن میں دو تین امریکی اور چار پانچ Scandinavian تھے، وہ یہاں تشریف لائے۔ وہ اس بارے تحقیق کر رہے تھے کہ پاکستان اور دوسرے ملکوں میں رشوت کی رسم کیوں عام ہے اور سرکاری و غیر سرکاری افرنجب بھی موقع ملے رشوت کیوں لیتے ہیں؟ اور اپنے ہی ہم ملکوں کو اس طرح سے کیوں پریشان کرتے ہیں؟ تقریباً ایک برس یا اس سے پچھے زیادہ عرصہ میں بھی ان کے ساتھ اتفاق کے طور پر رہا کہ دیکھتے ہیں ان کی تحقیق کا آخر کیا نتیجہ لکھتا ہے۔ آخر کار یہ بات پایہ رشوت کو پہنچی کہ کوئی شخص اس وقت تک رشوت نہیں لے سکتا جب تک کہ وہ اپنے آپ کو خوار، فلیل، کمینہ، چھوٹا اور گھٹیا سمجھتا ہے۔ اس کے بعد وہ رشوت کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ اگر کوئی شخص عزت و وقار اور اطمینان اور Dignity کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے تو وہ کسی حال میں رشوت کی طرف رجوع نہیں کرتا۔ ہمارے دین میں بھی اس بات پر بڑا اور دیا گیا ہے کہ آپ وقار، عظمت اور تکلفت کا دامن کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور اپنے آپ کو ایک اعلیٰ و ارفع مخلوق جانیں کیونکہ آپ کو اشرف الخلقات کا درجہ عطا کر دیا گیا ہے۔ اس لیے آپ ہر وقت اشرف الخلقات کے فریم و رک کے اندر اپنی زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ اکثر ہم سوچتے ہیں اور کتابوں میں بھی پڑھتے ہیں کہ کتنے کو ہمارے ہاں بخس جانور سمجھا گیا ہے اور اسے پالنے کی ترغیب نہیں دی گئی۔ مساواۓ اس کے یہ روڑ کی رکھوائی کرے اور محض اس کام کے لیے اسے رکھنے کی اجازت ہے۔ گھروں میں اسے پالنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے منطقی دلائل بھی دیے جاتے ہیں اور اس میں دینی دلائل بھی شامل ہو جاتے ہیں اور اس صورت حال میں ہمارے نئی نسل کے بچے بہت ناراض ہوتے ہیں (بچے ہیرے پوتے پوتیاں کہتے ہیں دادا آپ اس کی کیوں اجازت نہیں دیتے کہ کتنے کو گھر میں رکھا جائے) ہم طوعاً و کرہاً بچوں کی بات مانتے ہوئے اجازت تو

دے دیتے ہیں لیکن اس پر غور ضرور کیا جاتا رہا ہے اور اب بھی کیا جاتا ہے کہ ایسا حکم آخوند کیوں ہے؟ اگر یہ ناپاک ہے یا گند ڈالتا ہے تو بہت سے جانور ایسے ہیں جو ناپاک ہوتے ہیں اور گند ڈالتے ہیں لیکن بطور خاص اس کے اوپر کیوں قدغنا ہے؟ پتہ یہ چلا کہ کتابوں کے تمام جانوروں میں سے اور خاص طور پر پالتو جانوروں میں سے Psychophysicist (خوشامد پسند) جانور ہے اور ہر وقت ماںک کے سامنے جاوے جادوں ہلاتا رہتا ہے۔ اس لیے ہمارے دین نے یہ نہیں چاہا کہ ایک ایسا ذہنی روح آپ کے قریب رہے جو ہر وقت آپ کی خوشامد میں بتلار ہے اور یہ خیال کیا گیا کہ یہ انسانی زندگی پر ایک منفی طور پر اثر انداز ہو گا اور یہ خوشامد پسند ہر وقت دم ہلا ہلا کے اور پاؤں میں لوٹ کے اور طور و بے طور آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہے۔ اس لیے حکم ہوا کہ ایسا جانور مت رکھیں، یہ خصوصیات آپ میں بھی پیدا ہو جائیں گی اور جب آپ کے اندر Psychophyency اور خوشامد پسندی اور بلا وجہ لوگوں کو خوش کرنے کا جذبہ پیدا ہونے لگے گا تو آپ کی شخصیت، انفرادیت اور وجاہت پر اس کا منفی اور بر اثر پڑے گا۔ اس لیے اس جانور کو نہ رکھیں۔ آپ بھی کو رکھ کے دیکھیں، کبھی آپ کی خوشامد نہیں کرتی بلکہ جب موذ بنے، پیچہ مارتی ہے، گھوڑا کتنا بیمار جانور ہے اور انسان کا پرانا جانور ہے۔ انسان پر اپنی جان فدا کرتا ہے لیکن جب آپ اس کو بربی نظر سے دیکھیں گے یا زیادتی کریں گے تو ”الف“، ہوجائے گا اور دونوں نانکیں اور پاٹھا کر سیدھا کھڑا ہو جائے گا اور بھی خوشامد نہیں کرے گا اور آپ کے ساتھ برابری کی سطح پر چلے گا اور سارے جانور ہیں، عقاب ہے، باز ہے۔ آپ نے اکثر باز کو دیکھا ہو گا۔ جیسے ہمارے ہاں عرب شہزادے آتے ہیں اور انہوں نے اس کو ہاتھوں پر بھایا ہوتا ہے اور اس کی آنکھوں کو بند کر کے رکھا جاتا ہے۔ اس لے اس کے سر پر ٹوپی دی ہوتی ہے۔ اگر اس کی آنکھوں کو بند کر کے نہ رکھا جائے تو وہ ماںک جس نے اسے اپنی کلائی کے اوپر بھایا ہوتا ہے، اس پر بھی بچپت سکتا ہے کہ مجھے پاؤں میں دھاگے اور زخمیں ڈال کر کیوں قیدی بنایا گیا ہے۔ اسی چیزوں کو رکھنے کی اجازت ہے لیکن جو آپ کی عملت اور وقار میں کمی کا باعث بنتیں اور آپ کو خوشامد سکھائیں تو ایسے جانوروں کو رکھنے کی اجازت نہیں ہے اور ہمیں اس بات کا حکم ہے کہ ہم اپنی وجاہت کو ہر حال میں قائم رکھیں اور اس کے ساتھ ساتھ فرعونیت، تکبر اور گھمنڈ سے پرہیز کرتے رہیں اور تکبر کے درمیان ایک لائن ہر وقت کھیج کر رکھیں۔ انسان کی بھی بڑی مجبور زندگی ہے کہ جگہ جگہ پر اسے لائیں کھیجنی پڑتی ہیں حتیٰ کہ اسے اپنی لیعنی اپنی جبلی خواہشات کے آگے بھی لائیں کھیجنے کا حکم ہے۔ یہ میری جبلی Biological Needs خواہش ہے کہ میں کھانا کھاؤں، اچھا کھانا کھاؤں۔ بہتر، مزید اور لذیذ کھانا کھاؤں لیکن مجھے حکم ہے کہ بس آج لائن کھیج دوں۔ آج آپ صبح سے لے کر شام تک کچھ بھی نہیں کھا سکتے۔ نہایت لذیذ کھانے آپ کے سامنے آتے رہیں گے، اشتہا انگیز چیزوں آپ کو اکساتی رہیں گی لیکن کھانہ نہیں سکتے۔ حکم یہ

ہے کہ آپ کے لیے روک دیا گیا ہے کیونکہ آپ انسان ہیں اور آپ بلند تر چیز ہیں۔ انسان کو اس لیے اشرف الخلوقات کہا گیا ہے کہ جب وہ پورے کا پورا آزاد ہو جاتا ہے اور جب وہ کرنے اور نہ کرنے کی کیساں صلاحیت رکھتا ہو اور یہاں وہ انسان آزاد ہوتا ہے لیکن وہ اس لمحے وہ کرتا ہے جس میں وہ اپنی ذات کو گام ڈال کے بے جا اور ناجائز خواہیں اور عمل سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس سے وہ اشرف الخلوقات بنتا ہے۔ آزادی یہ نہیں کہ کسی کے خلاف مضمون لکھ دیا، تقریر کروی بلکہ اپنی ذات کو گام ڈال کے اور با گیس کھینچ کر کھنے کو آزادی انسان کا نام دیا جاتا ہے۔ نہیں برسم کے کھیت میں چلی جا رہی ہے تو وہ ادھر ادھر منہمارے گی، کتنا بخس بھی کھاتا چلا جائے اور پاک چیزیں بھی لیکن انسان وہ ہے کہ جو کھا بھی سکتا ہے اور پھر بھی نہیں کھاتا اور خود کو پابند بھی رکھتا ہے اور اس پابندی کے دوران سو مہمان بھی اس کے پاس آئیں تو وہ ان کی خدمت کرتا ہے، کھلاتا پلاتا ہے، مہمان نوازی کرتا ہے لیکن خود نہیں کھائے گا۔ انسان کی جبی خواہشات پر پابندی لگانے کا مقصد انسانوں کو بھوکار کھانا نہیں بلکہ انسان کی عظمت اور وقار کو برقرار رکھنا مقصود ہے تاکہ وہ بوقت ضرورت خود پر کنٹرول رکھے۔ ہمارے یہاں لا ہو رہا ڈال ناؤں میں ایک بری گینڈ یہر صاحب ہیں، انہیں کہتے رکھنے کا بہت شوق ہے۔ ان کا ایک اچھا ایسیں کھاتا ہے۔ وہ شاید بری گینڈ یہر صاحب کی نظر وہ میں گر گیا تھا اور وہ کھلا بھی چھوڑ دیا کرتے تھے اور وہ کتاب اپنی مرضی سے ادھر ادھر گھومتا رہتا تھا۔ وہ کتاب و ران آوارگی قصاب کی دوکانوں پر چھپھڑے اور کچھ گوشت کھاتا، سنتے ہیں کہ کچھ گوشت کتے کے لیے بہت مہلک ہوتا ہے۔ جب وہ دوکانوں سے گھوم پھر کر کچھ گوشت کھا کے آ جاتا اور اس کے ”لچمن“ بھی کچھ اپنے نہیں تھے۔ اس وجہ سے بری گینڈ یہر صاحب نے اس کے گلے میں دھاگہ ڈال کر ایک کارڈ ڈال دیا جس پر لکھا تھا ”مہربانی فرمائیں کارڈ“ اس کے کو گوشت نہ ڈالا جائے اور اگر یہ قصاب کی دوکان پر آئے تو قصاب حضرات اس کو دھکا کر کر پرے بیج دیں۔ ”اب بچارے تمام قصاب ڈر گئے اور وہ بری گینڈ یہر صاحب کے کتے کو کچھ نہیں دیتے تھے اور ایک دوسرے کو بھی انتباہ کرتے کہ خیردار اسے کچھ نہ دینا اور نہ مارے جاؤ گے۔ اسے یونہی بھوکار کیا ساہی رہنے دو اور وہ بچارہ ایسے ہی واپس لوٹ جاتا۔ کتاب جیسا کہ میں کہہ رہا تھا کہ ایک خوشامد پسند جانور ہے، اس نے بھی سوچا کہ اس طرح تو میری جان آفت میں بچنے گئی ہے، میں کیا کروں۔ ایسیں کہتے ہوئے کارڈ کی ہے تو اس نے ذہین ہوتے ہیں، چنانچہ اسے پتہ چلا کہ سب خرابی میرے گلے میں لٹکتے ہوئے کارڈ کی ہے تو اس نے بخوبی کے زور سے اور دانتوں سے وہ گتہ یا کارڈ کاٹ کر گلے سے اتار پھینکا۔ جب وہ اگلے دن باہر گیا تو ظاہر ہے کہ اس کے گلے میں اب کوئی ایسا ویسا نوٹ نہیں تھا اور وہ مزے سے کھا پی کے واپس آئیں آئی تو ایسی زندگی بس کرنے سے بہتر ہے کہ انسان ایک غار میں چلا جائے اور بے غیرتی اور کم مائیگی کی زندگی بس رہ کرے اور ایسی زندگی بس رہ کرے جس طرح کی عام طور پر حضرات الارض کرتے ہیں۔

ایک بار ایک عالمی سطح کے ہیئت دانوں کی کانفرنس ہو رہی تھی۔ اس میں آئن شائن بھی شریک تھے۔ ایک ہیئت دان نے دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد آئن شائن سے کہا کہ جناب دیکھئے! اگر ہم کا ناتاؤں کو ذہن میں رکھیں اور جتنے بھی عالم اللہ تعالیٰ نے بنائے ہیں، ان کو بھی اپنی نظر سے جانچنے کی کوشش کریں تو انسان کا مقام Mathematically ایک ذرے سے بھی بے حد کم تر رہ جاتا ہے یعنی وہ کچھ بھی نہیں ہے اور انسان تو اتنی بڑی کائنات کے اندر ایک بے معانی سے چیز ہے۔ یہ سن کر آئن شائن نے کہا، ہاں واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں اور جیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ ایک بے معانی، بے مایہ اور کم تر، کم حقیقت انسان جس کی حیثیت ایک ذرے سے بھی کم ہے، وہ ہی دورین لگا کر ان کا ناتاؤں کا مطالعہ کر رہا ہے اور وہی ان کا ناتاؤں کے بھید کھول رہا ہے اور لوگوں کو ان کا ناتاؤں کی تفصیل سے آگاہ کر رہا ہے اور لوگوں کو کائنات کی جزویات بابت بتاتے ہیں۔ اپنے آپ کو اتنا بھی حقیر نہیں سمجھا جانا چاہیے کہ وہ رشوت کی لپیٹ میں آجائے۔ کوئی بھی آدمی جو بظاہر آپ کو نہستا ہوا دکھائی دے اور بظاہر یہ کہے کہ جی ساری دنیا ہی رشوت لیتی ہے۔ بظاہر وہ آپ سے کہے کہ جی Values Change ہو گئی ہیں اور قدریں وہ نہیں رہیں۔ ان سے وہ اپنے آپ کو ضرور گھٹھیا، لکھنے اور ذلیل انسان ہی سمجھتا رہتا ہے اور اس کے اندر Guilt کا جذبہ ہر وقت اپنا کام دکھاتا چلا جاتا ہے۔ اللہ میاں نے ہم کو عجیب و غریب طرح سے باندھا ہوا ہے۔ آپ نے بھی غور کیا ہے کہ اس بھری دنیا میں جتنی بھی قویں، جتنی بھی نسلیں اور گروہ انسانی آباد ہیں، ان سب کا دن طلوع آفتاب سے شروع ہوتا ہے، سورج نمودار ہوا اور دن چڑھ گیا اور کہا کیا گیا کہ آج یہ کم دسمبر یا جنوری کی پہلی تاریخ ہے، صرف ایک آمد ایسی ہے پوری کائنات میں جس کا دن شام کے وقت شروع ہوتا ہے۔ جب شام پڑتی ہے تو اس کا نیادن معرض وجود میں آتا ہے اور وہ آمد اسلام کا آمد ہے، آپ نے رمضان المبارک میں دیکھا ہو گا کہ شام کو نقارہ بتتا ہے، تو پ چلتی ہے، اعلان ہوا یا اسمائرن بتتا ہے اور مغرب کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ اب ہم رمضان کے مینے میں داخل ہو گئے ہیں، ہم رمضان میں صبح کے وقت داخل نہیں ہوتے بلکہ رات کے وقت ہوتے ہیں۔ یہ عجیب دین ہے کہ شام سے یارات سے منسوب کر کے اس کے دن کا اور ہمینہ کا آغاز کیا جاتا ہے، دنیا کے کسی اور مذہب میں ایسا نہیں ہے اور کسی امت پر ایسا بوجھ نہیں۔ اس کی وجہ جو میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ اس امت کو یہ بارگراں عطا کیا گیا ہے کہ باوصاف اس کے کہ تمہارا تیا دین چڑھ گیا ہے، تم نئے ماہ میں داخل ہو گئے ہو اور اس کے بعد پوری تاریک رات کا سامنا ہے لیکن تم ایک عظیم Dignified آمد ہو۔ تمام ایک پر وقار امت سے تعلق رکھتے ہو۔ تم اس سے تاریکی سے گھبراانا ہرگز ہرگز نہیں بلکہ اس تاریکی میں سے گزر کر اپنے وجود پر اعتماد کر کے جھیں اس صبح تک پہنچنا ہے جس سے ساری جگہ روشنی پھیلے گی، گویا اس تاریکی کے اندر ہی آپ کو اپنی ذات، وجود اور شخصیت سے روشنی

کرنی ہے۔ ہم، تم، آپ سب کے سب اپنا ہمیت، اپنا دن مغرب کے بعد رات سے شروع کرتے ہیں اور ہمیں بحیثیت مسلمان یقین ہوتا ہے، یہ تاریکی ہمیں کسی قسم کی گزندیا تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ ہم ہیں اور یہ تاریکی ہے اور ہمارے وجود سے ہی اس تاریکی میں روشنی ہے۔ ہم روشن دن کی آرزو میں یا روشن صحیح کو پکڑنے کے لیے ہرگز ہرگز اتنے بے چین نہیں ہیں جس قدر دنیا کی دوسری قومیں مختصر ہیں، ہم اپنی سانسوں سے تاریک راتوں میں اجالا کرتے ہیں اور اپنی سانسوں سے شمعیں روشن کرتے ہیں۔ یہ وقار اور عظمت جو ہے یہ ہمارا طرہ امتیاز ہے لیکن کہیں کہیں ہم کمزور ہو جاتے ہیں اور وقار سے چیخھے رہ جاتے ہیں۔ پھر ہمارے اندر Guilt کا احساس ضرور پیدا ہوتا ہے۔ نہیں ہو سکتا کہ آپ اپنے آپ پر کچھ ایسی خود تقدیری سے کہیں کہیں اب زمانہ بدل گیا ہے، اب ساری دنیا ایسی ہو گئی ہے تو ہم بھی دیسے ہو جائیں۔ یہ بڑے شوق سے کہہ لیں یا بڑے شوق سے لکھ لیں، بڑے شوق سے اپنے Guilt کو کر لیں، جان نہیں چھوٹی کیونکہ جو حکم آپ کے اور پباری کر دیا گیا ہے، اور جس فرمیم درک میں آپ کو رکھا یا گیا ہے ہونا وہی ہے۔ مجھے حضرت نظام الدین اولیا کے خلیف خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کی وہ بات یاد آتی ہے جب ایک بار قحط پڑ گیا اور ولی میں بہت "سوکھا" ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ یا حضرت (وہ چبورتے پر تشریف فرماتھ) آپ تو چراغ دلی ہیں، آپ جا کے نماز استقاء پڑھائیے اور باراں رحمت کے لیے دعا کیجیے تو وہ کہنے لگی کہ میں کچھ متزدہ ہوا، پر یہاں ہوا کہ میں کیسے دعا کروں۔ یہ تو خدا کی مرخصی ہے کہ وہ باراں رحمت کرے یا نہ کرے۔ خیروہ طے شدہ مقام پر نماز استقاء پڑھانے چلے گئے۔ وہاں جا کر نماز پڑھائی اور دعا کی اور دعا کے بعد دیکھا کہ آسمان پر کچھ بھی نہیں، نہ کوئی ابر کے آثار ہیں نہ بارش کے۔ وہ لوٹ آئے اور کچھ شرمندہ تھے۔ وہاں ایک بزرگ یوسف سرہندی تھے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب پہلے بھی ایک ایسا واقعہ چیز آچکا ہے۔ ہم نے بھی ایک بار بارش کے لیے دعا کی تھی لیکن بدترین قحط اور Drought کے کچھ حاصل نہیں ہو سکا تھا اور اب کی بار بھی ایسا ہی ہوا ہے۔ کہنے لگے کہ ہمارے زمانے میں جب ہماری دعا قبول نہیں ہوئی تھی تو ایک صاحب میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ اگر تم باراں کے لیے دعا کروانا چاہتے ہو تو کسی باوقار آدمی سے کرو اور اللہ باوقار اور غیرت مند انسان پر بڑا اعتماد کرتا ہے اور اس کی بات سنتا ہے۔ تو میں نے کہا، تھیک ہے۔ ہمیں اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے تو بتاؤ کس سے دعا کرو ایں تو اس شخص نے بتایا کہ سیری دروازے کے پاس ایک بزرگ رہتے ہیں، وہاں چلتے ہیں۔ یوسف سرہندی نے مزید کہا کہ وہ شخص مجھے ان کے اس لے گیا اور میں دیکھ کر بہت حیران اور شرمندہ بھی ہوا کہ بزرگ جو تھے وہ خواجہ سرا تھے یعنی یہ جو (محنت تھے اور ان کا نام خواجہ راحت تھا)۔ اب وہ شخص جو مجھے وہاں لے کر گیا تھا، اس نے خواجہ راحت محنت سے کہا کہ یہ (یوسف سرہندی) آپ کی خدمت میں اس لے

حاضر ہوئے ہیں کہ آپ میرہ یا باران یا Rain Fall کے لیے دعا فرمائیں تو انہوں نے کہا، کیوں کیا ہوگا؟ اس شخص نے کہایا حضرت (اس بیجڑے سے کہا، مجھے انہیں بیجڑہ کہتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے اور یہ لفظ استعمال کرتے ہوئے اسی بزرگ شخصیت کے لیے لیکن چونکہ وہ مخت تھے اور اپنے آپ کو خود بھی کہتے تھے، دیکھئے باوقار لوگ بھی کیا ہوتے ہیں۔ ان کا کسی ذات، عورت، مرد یا مخت سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ وقار ایک الگ سی چیز ہے جو انسان کے اندر روح کے راستے داخل ہوتا ہے) دلی سوکھا ہے، بارش نہیں ہو رہی۔ ان حضرت نے اپنی خادم سے کہا کہ پانی گرم کرو، وضو کیا اور دعاء مانگی اور اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ پھر کہنے لگے کہ اے یوسف سرہندی آپ جائیں اور اپنے معروف طریقے سے بارش کے لیے نماز ادا کرو اور خدا سے دعاء مانگیں کہ وہ اپنی مخلوق کو بارش عنایت فرمائے لیکن اگر پھر بھی بارش نہ ہوتا (انہوں نے اپنی قباء سے ایک دھاگا یا بڑھا ہوا ڈورا کھینچ کر دیا) اس ڈورے کو اپنے دامیں ہاتھ پر رکھ کر اللہ سے درخواست کرنا کہ یہ خواجہ راحت مخت جس نے تیری رضا کا چولا پہن لیا ہے اور اب لوگوں سے نہیں ملتا اور ایک مقام پر ایک وقار کے ساتھ زندگی بسر کرتا ہے اور اس طرح مخلوق میں بھی شامل نہیں ہوتا کہ وہ دعائیں مٹکواتا پھرے۔ اس نے بارش کے لیے عرض کیا ہے۔ یوسف سرہندی صاحب کہنے لگے کہ ہم نے ایسا ہی کیا۔ وہاں بہت لوگ اکٹھے تھے۔ پورا دل امّت کے آیا ہوا تھا۔ وہاں نماز استقاء پڑھی اور دعاء مانگی لیکن بدقتی سے کچھ بھی نہ ہوا۔ پھر میں نے اپنی دستار سے خواجہ راحت مخت کی قباء کا وہ ڈورا نکالا اور اسے دامیں اٹھ کی ہتھیلی پر رکھ کر خدا سے دعا کی تو وہاں کھڑے بادل گھر کے آیا اور موسلا دھار بارش ہونے لگی اور اس قدر زور کی بارش شروع ہو گئی کہ لوگ تیزی سے بھاگنے کے باوجود اپنے گھروں تک نہ پہنچ سکے۔

خواتین و حضرات اب یہ فیصلہ ہمارا ہے کہ ہم کس وقار کے ساتھ اور اس امّت سے تعلق رکھتے ہوئے کیسی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ خدا ہم کو عزت و قار سے زندگی گزارنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسمانیاں عطا فرمائے اور آسمانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

بیشرا

میں ایک طویل مدت اور لمبے عرصے کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں اور آپ ملا جھنگ فرمائے ہوں گے کہ اب ”زوایہ“ کا رنگ کچھ مختلف ہے اور اس کی بیت میں پہلے کے مقابلے میں تبدیلی آئی ہے۔ اس طویل مدت اور اس قدر لمبی مدت کی غیر حاضری کی کیا وجہ ہے؟ اس کا میں ہی سراسر ذمہ دار ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوتاہی میری طرف سے ہوتی ہے۔ مجھے خیال آیا اور ایک مقام پر میں نے سوچا کہ شاید میں زاویے کے پروگرام سے بہتر طور پر آپ کی خدمت کر سکتا ہوں اور کسی ایسے مقام پر پہنچ کر آپ کی دلگیری کروں جہاں پر مجھے پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن یہ خیال باطل تھا اور یہ بات میرے نزدیک درست نہیں تھی لیکن اس کا احساس مجھے بہت دیر میں ہوا کہ جو شخص جس کام کے لیے پیدا ہوتا ہے، بس وہی کر سکتا ہے۔ اس سے بڑھ کے کرنے کی کوشش کرے تو وہ معدوم ہو جاتا ہے۔ میں آئندہ کے پروگراموں میں شاید اس بات کا ذکر ہوں کہ میں آپ کے بغیر اور آپ کی معیت کے بغیر اور آپ سے دور کس طرح سے معدوم ہوتا ہوں۔ ہمارے فیصل آباد گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس ایک جیبی گھڑی تھی۔ اس اعلیٰ درجے کی گھڑی کے ساتھ ایک سبھری زنجیر بندھی ہوتی تھی۔ یہ وہ گھڑی تھی جس کا ڈائل بڑا سفید اور اس کے ہند سے بڑے بڑے اور سیاہ رنگ کے تھے۔ اس گھڑی کے زور پر اور اس کی وجہ سے سارے سکول کا کام چلتا تھا اور اسی گھڑی کے حوالے سے اردو گرد کے لوگ اپنی گھڑیاں ٹھیک کرتے تھے لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ ہر روز گھنٹہ گھر کے قریب سے گزرتے ہوئے ہیڈ ماسٹر صاحب زنجیر کھینچ کر اپنی گھڑی کا وقت فیصل آباد کے گھنٹہ گھر سے ملاتے تھے اور دونوں میں مطابقت پیدا کرتے تھے۔ پھر ایک روز یہ ہوا کہ گھڑی کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ میں بھی گھنٹہ گھر کے مقام پر پہنچوں اور لوگوں کی خدمت کروں۔ ان کو وقت بتاؤں اور ان کے لیے وہی کچھ اور اتنی ہی خوبیاں لا کر ان کی جھوپی میں ڈالوں جو فیصل آباد کا گھنٹہ گھر ان کو عطا کرتا ہے۔ سنتے ہیں کہ کسی طسمی یا کسی روحانی زور سے وہ گھڑی کہ ان کی جیب سے اچھلی اور گھنٹہ گھر کے ماتھے پر جا کر

چپک گئی اور جو نبی وہ اس مقام پر پیچی وہ اپنی ہستی بالکل کھو گئی اور معدوم ہو گئی اور وہ لوگوں کو وقت بتا کر جو پہلے خدمت کرتی تھی اس سے بھی دور نکل گئی اور اتنی اوپنچائی پر پیچ گئی کہ اس اوپنچائی پر اسے پہنچنا نہیں چاہیے تھا۔ اسی انداز میں میرے ساتھ بھی کچھ دیباہی ہوا۔ میں سمجھا کہ میں آپ کی ایک اور طریقے سے اور ایک بلندی یا رفتہ پر پیچ کر خدمت کر سکوں گا لیکن وہ بات کچھ ٹھیک نہ نکلی اور میں لوت کر پھر آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا ہوں لیکن اس کا مطلب ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان فراق و جداگانہ رہی۔ اس میں ہم ایک دوسرے کو فراموش کرتے اور چلتے گئے ایسا نہیں ہے۔ ایک روز جب میں بابا جی کے پاس ڈیرے پر گیا تو میں اس بات پر شرمende تھا کہ میں بڑی دیرے کے بعد بابا جی کو کول رہا تھا۔ تقریباً چھ ماہ میں ان سے نہیں مل سکا تھا۔ میرا کچھ کام اس نوعیت کا تھا کہ مجھے ملک میں شہر نا فصیب نہ ہوا اور مجھے ایران اور ترکی میں کچھ کام کرنا ہوتے تھے۔ وہ آر۔سی۔ ڈی کا زمانہ تھا۔ جب میں بابا جی کے پاس گیا اور بیشتر اس کے کہ میں ان سے مخدودت کا کوئی جملہ بولتا، انہوں نے خود سے کہنا شروع کیا کہ ”میں ہوتے ہو، ہمارے درمیان ہی رہتے ہو۔ ہم سے ملتے جلتے ہو۔ باوصف اس کے کہ تم یہاں نہیں آئے لیکن نہ ہم نے تمہیں فراموش کیا، نہ ہم تمہاری یاد بھولے اور عاجز آئے۔“ میں اپنی جگہ پر شرمende و ششد درکھرا تھا، کہنے لگے، جس طرح گاڑی میں سفر کرتے ہوئے، ہوائی چہاز میں بیٹھے ہوئے زندگی کے مرحلے کر رہے ہوئے، سڑکوں پر چلتے ہوئے، محفل مشاعرہ یا گانے سنتے ہوئے آپ کبھی بھی اپنے دل سے، اپنے گردوں اور جگر کی کارکردگی سے واقف نہیں ہوتے لیکن وہ موجود ہوتے ہیں بالکل اسی طرح ہم بھی ایک دوسرے کی فراموشی میں زندہ تھے اور ایک دوسرے کے بہت قریب تھے۔ یہ مت سمجھا کیجیے کہ کسی وجہ سے، ہم ایک دوسرے سے دور رہے، یا ہم نے ایک دوسرے کو دور سمجھا ہے۔ مجھے اس سے ایک اور عجیب سی بانت جس کا باظہ ہر تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہے، یوں ذہن میں آئی کہ میری ایک نواسی ہے اور اس کا بیٹا کوئی اڑھائی تین برس کا ہو گا، اس سے ملنے سا ہیوال گیا۔ میری نواسی کا پچھہ باہر کوٹھی کے لان میں کھیل رہا تھا۔ مجھے اس کا علم نہیں تھا کہ وہ باہر کھیل رہا ہے۔ میں اپنی نواسی سے باقیں کرتا رہا، اچانک دروازہ کھلا اور وہ پچھے مٹی میں لمحڑے ہوئے ہاتھوں اور کپڑوں پر کچھڑا اور اس کے منہ پر ”چھپھیاں“ (خراب منہ اور بہت ناک) لگی ہوئی تھیں، وہ اندر آیا اور اس نے دونوں یا زوجہ سے اور اٹھا کر کہا، امی مجھے ایک ”چھپھی“ اور ڈالیں۔ پہلی ”چھپھی“، ختم ہو گئی ہے تو میری نواسی نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے اگالیا باوصف اس کے کہ وہ پچھہ باہر کھیلتا رہا ہو گا اور اس کے اندر وہ گرماہٹ اور حدت موجود رہی ہو گئی جو اسے ایک ”چھپھی“ نے عطا کی ہو گئی اور جب اس نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی بیٹری کو ری چارج کرنے کی ضرورت ہے تو وہ جھٹ سے اندر آگیا۔ میرے اور آپ کے درمیان بھی یہ بیٹری اپنا کام کرتی رہی، گونہ مجھے اس کا احساس رہا اور

شاید آپ کو اس قدر شدت سے رہا لیکن، ہم ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ اور ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلتے رہے۔ زندگی کے یہ معاملات بڑے عجائب ہوتے ہیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں بہت دیر تک اور جیسے ہمارے بزرگ کہا کرتے ہیں "بشرط زندگی" ایک دوسرے کے ہم ساتھ رہیں گے اور اس پروگرام کی نوعیت ویسی ہی رہے گی جیسے پہلے پروگراموں میں رہی اور جن میں آپ کی شمولیت میرے لیے غیر کا باعث تھی اور آپ نے مجھے بڑی محبت عطا کی۔ یہ بات آپ بالکل اپنے ذہن میں رکھیے گا کہ باوصاف اس کے کہ چیزیں نظر نہیں آتیں، دکھائی نہیں دیتی ہیں لیکن وہ موجود ہوتی ہیں۔ فرانس کا ایک بہت بڑا ائمہ جسے میں دل و جان سے پسند کرتا ہوں، وہ تقریباً تیس پینتیس برس تک فرانس سے غیر حاضر رہا اور جب وہ اس طویل غیر حاضری کے بعد لوٹ کر اپنے وطن آیا اور سیدھا اپنے اس محبوب گاؤں پہنچا جہاں اس کا بچپن گزر اتھا۔ رائٹر کھسو کہتا ہے کہ جب وہ اپنے گاؤں پہنچا تو اس پر ایک عجیب طرح کی کیفیت طاری ہو گئی اور مجھے وہ سب چیزیں یاد آئے لگیں جو بچپن میں میں نے یہاں دیکھی تھیں لیکن ان کا نقشہ اس قدر واضح نہیں تھا جیسا کہ ان کا نقشہ اُس وقت واضح تھا۔ جب وہ چیزیں میرے قریب سے گزرتی تھیں اور میرے پاس تھیں، کھسو کہتا ہے کہ ایک عجیب واقعہ سے یاد آیا کہ ایک ندی کی چھوٹی سی پلی پر سے جب وہ گزر اکرتا تھا تو اس کے دامنے ہاتھ پتھروں کی ایک دیوار تھی جس پر غیر ارادی طور پر میں اپنی انگلیاں اور ہاتھ لگاتا ہوتا چلتا جاتا تھا اور وہ آٹھ درج فٹ بھی دیوار میرے ہاتھوں کے لمس اور میں اس کے لمس کو محسوس کرتا رہا۔ وہ کہنے لگا کہ میرا بھی چاہا کہ میں اس پلی پر سے پھر سے گزوں اور اپنے بچپن کی یاد کو دیتے ہی تازہ کروں یعنی جب میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا تو میں نے اس لمس کو محسوس نہ کیا جو وہ پتھر کی دیوار مجھے میرے بچپن میں عطا کیا کرتی تھی۔ میں اس دیوار پر ہاتھ رکھتا ہو اپورے کا پورا راستہ عبور کر گیا لیکن وہ محبت اور چاہت پوچھر کی دیوار اور میرے زندہ جسم کے درمیان تھی، وہ مجھے میسر نہ آسکی۔ میں پھر پلنا لوٹ کے پھراہی طرح گزر ا۔ پھر میں اتنا جھکا جتنا اس زمانے میں میرا قد ہوتا تھا اور پھر میں نے اس پر ہاتھ رکھا اور میں اس قد کے ساتھ جب میں چھٹی ساتویں میں پڑھتا تھا، چلا تو میں نے محسوس کیا اور میرے ہاتھ نے محسوس کیا اور میرے ہاتھ نے میری روح اور جسم کو سکلن دیا جو سکلن میں آج تک اپنی تحویل میں کسی بھی چیز میں نہیں لاسکا۔ اس لمس کو مجھے اپنی روح پر طاری کرتے ہوئے یوں لگا جیسے میری ماں صحن خانہ میں کھڑی مجھے پکار رہی ہوا اور اس کے ہاتھ میں وہ Cookies ہوں جو ہو مجھے سکول سے واپسی پر دیا کرتی تھی (وہ ہاتھ کے لمس کا ذکر کر رہا ہے کہ اسے ماں کے بدن سے اور اس کے جسم سے لمبسن اور پیاز کی خوشبو آ رہی ہے۔ ساتھ میری بہن کھڑی ہے اور مجھے اپنی بہن کے سارے وجود کی خوشبو آ رہی ہے، جو وہ بچپن میں محسوس کیا کرتا تھا) میرے دیوار کے لمس کے ساتھ مجھے وہ سارا اپنا بچپن یاد آ گیا اور سارا منظر آنکھوں کے

سامنے فلم کی طرح چلنے لگا اور میں لوٹ کر اس زمانے میں چلا گیا جب میں چھوٹا سا تھا اور اس دیوار کے لمس کی یاد کے سہارے اور اس Imagination کے زور پر سارا کاسارا میں میرے وجود پر حقیقت کی طرح طاری ہو گیا اور میں وہاں سے گزر گیا۔ فرانسیسی رائٹر کی باتوں پر مجھے تھوڑی سی شرمندگی بھی ہوئی کیونکہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ درگا ہوں پہ آتے ہیں اور وہ اپنے بزرگ کی قبر کے ساتھ کھڑے ہو کر چوکھوں پر ہاتھ ملتے ہیں، قبر کے تابوت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور سنگ مرمر کا جو چوکھتا ہوتا ہے، اسے چھوٹے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کی وہ حرکت سخت ناپسند کرتے ہیں لیکن جان کفسو کی یہ بات پڑھنے کے بعد اب میں کچھ کچھ ان لوگوں کا ساتھی ہو گیا ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ انہیں مرقد کے چوکھے پر یا کھڑکی کی چوکھت پر ان دروازوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کچھ اپنا پن محسوس ہوتا ہو، کچھ روحاںی رابطہ، کچھ روحاںی نسبت، ان کے ساتھ قائم ہوتی ہو۔ میرا خیال ہے انہیں منع نہیں کرنا چاہیے بلکہ ان کے بارے میں یہ بھی نہیں سوچنا چاہیے کہ یہ کس قدر تجھ نظر، دیانتوں اور پرانی وضع کے لوگ ہیں۔ انہیں چھونے دیجیے۔ ان کو ہاتھ لگانے دیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں اس طرح سے ہاتھ لگانے میں، چھونے میں کچھ محسوس ہوتا ہو۔ جس طرح میری نواسی کے بیٹے نے کہا تھا کہ مجھے ایک ”چھی“ اور ڈالیں۔ میری ایسی کیونکہ پچھلی ”چھی“، ختم ہو گئی ہے۔ اسی طرح سے بہت سے لوگ ان یادوں کے سہارے کچھ محسوس کرتے ہوں جو دماغ کے نہایا خانے سے نہیں آتی ہیں بلکہ جسم کے ساتھ ان کا زیادہ اور گہرا تعلق ہوتا ہے اور وہ لمس کے ساتھ اور ہاتھ کی لکھروں کے ساتھ اور انگلیوں کے نشانوں کے ساتھ وجود پر وارد ہوتی ہیں۔ میں اس بھی بات کے ذریعے آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنا چاہتا تھا کہ جب کبھی آپ ملے، نظر آئے یا نظر آئے یا میں کبھی آپ کے شہر میں سے گزرا یا شہر کے اوپ سے گزر اتوہ ساری باتیں اور وہ ساری یادیں جو میرے اور آپ کے درمیان تھیں یا نہیں تھیں لیکن ہم ایک دوسرے کے ساتھ ”زاویہ“ کی نسبت سے وابستہ تھے، وہ یادیں لوٹ کر ڈہن میں آتی رہیں اور میں آپ سے مatarba جس طرح سے آپ اس پروگرام کے لیے مجھ سے ملتے رہے۔ ظاہری طور پر، باطنی طور پر یا معنوی طور پر، اس طرح میں بھی آپ کے ساتھ وابستہ رہا اور ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ کبھی نہ ٹوٹا اور میں آپ لوٹ کر پھر آپ کی خدمت میں آگیا ہوں۔ ہمارے ماشرال الداد کے بشیرے کی طرح میں بھی شاید آپ کی خدمت میں اسی طرح حاضر ہوتا رہوں گا۔ ہمارے ماشرال الداد تھے۔ وہ پڑھاتے تو فیروز پور میں تھے لیکن وہ قصور کے رہنے والے تھے۔ وہ پڑھانے کے بعد ہر روز گاڑی پکڑ کے شام کو گھر چلے جاتے تھے۔ ان کا ایک بڑا لالہ ڈالا بیٹا تھا اور بشیر اس کا نام تھا اور مجھے درمیان میں ہی ایک اور بات یاد آگئی۔ اگر کبھی آپ قصور گئے ہوں یا آپ کا وہاں جانے کا ارادہ ہوتا تو (میں نے یہ بات محسوس کی ہے، آپ بھی کر کے دیکھنے گا) آپ یہ جان کر جیران ہوں گے کہ قصور میں ہر تیسرے بچے کا نام بشیر ہوتا

ہے۔ اگر آپ راستہ بھول جائیں یا کچھ پوچھنا چاہیں اور قصور کے کسی بازار میں کھڑے ہو کر بشیر کہیں تو تین چار آدمی ضرور مر کر آپ کی طرف دیکھیں گے اور آپ ان سے رابطہ قائم کر کے اپنا منسلک ان کے سامنے پیش کر سکتے ہیں۔ ہمارے ماشر صاحب اپنے بیٹے سے بڑی محبت کرتے تھے۔ وہ بڑا غصے والا بھی تھا۔ ظاہر ہے لاذلا بچ تھا۔ وہ معمولی سی بات پر بھی ناراض ہو جاتا ہو گا اور وہ گھروالوں سے وقتی طور پرقطع تعاقب کر لیتا ہو گا۔ ماشر صاحب اس کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ ایک روز وہ ان سے ایسا ناراض ہوا کہ گھر سے بھاگ گیا اور پھر ملا ہی نہیں۔ ماشر صاحب کئی ماہ اس کی تلاش کرتے رہے۔ وہ بیچر آدمی تھے اور استادوں کا سوچنے کا انداز بڑا مختلف ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے پرانی وضع سے خوش خط اشتہار لکھ کر بابا بلجھے شاہ کے مزار کے باہر گست پر چپاں کر دیا جس پر مار کر سے لکھا ہوا تھا کہ ”پیارے بیٹے بشیر گھروالپس آ جاؤ۔ تمہاری جدائی میں میں یہ وقت آ سانی اور سکون کے ساتھ گزرانہیں سلتا۔“ وہ اشتہار چپاں کر کے ماشر صاحب گھر آ گئے۔ اگلے دن ماشر صاحب اس خیال کے پیش نظر کہ جہاں میں نے اشتہار لگایا ہے وہاں میرا بیٹا ضرور آتا ہو گا، درگاہ گئے۔ جب وہ وہاں پہنچنے تو ان کی حیرانی کی کوئی انہاد رہی کہ وہاں سات بشیرے بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کا بشیر اور وہاں نہیں تھا۔ ماشر صاحب پریشانی کے عالم میں اور اس خیال میں کہ شاید کسی روز ان کا بشیر ابھی وہاں آ جائے، بار بار وہاں کا چکر لگاتے رہے اور ماشر صاحب نے ایک دن لڑو بانے تو ہمیں پتہ چلا کہ ان کا بشیر اور اپس آ گیا ہے۔ میں بھی آپ سے یہ کہنے کے لیے حاضر ہوا ہوں کہ آپ کا بشیر اور اپس آ گیا ہے اور اب کبھی ناراض ہو کر، ناخوش ہو کر خوشی کی ترینگ میں آپ کو چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ میرا اور آپ کا بڑا اگھرا، بڑا پرانا، بڑی محبتیں کا رشتہ ہے اور یہ رشتہ آ سانی کے ساتھ توڑا نہیں جاسکتا۔ میں ایک مرتبہ پھر آپ سے معدودت چاہتا ہوں اور اپنی اس غلطی اور کوتاہی کی معافی مانگتا ہوں جو میرے اور آپ کے درمیان ایک وسیع طیح بن کر چند دن حائل رہی، آئندہ انشاء اللہ ایسا نہیں ہو گا اور مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنے بشیرے کی اس بات پر یقین آ گیا ہو گا۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

اسٹنڈ وس کے عرق سے شمیں گن تک

آج سے مھیک چالیس برس پہلے کی بات ہے، گرمیوں کا موسم اور اگست کا مہینہ تھا اور گرمی یہ نہیں بلکہ بلا کی گرمی تھی اور ہم جگہ کام کرتے تھے دہان کا جو Cooling System تھا وہ اچانک چلتے چلتے جواب دے گیا اور خراب ہو گیا۔ اس وقت ہم ایک پروگرام کی Editing کر رہے تھے اور سسٹم میں خرابی کے باعث ہمارا وہاں بیٹھنا مشکل ہو گیا اور ہم نے سوچا کہ جسمانی تکلیف ان ذہنی کالیف سے شدید تر نہیں ہے جو انسانی زندگی میں منفیانہ سوچ اور منفیانہ پیش قدمی اور ایسے منفی روایوں سے پیدا ہوتی ہے جیسے آپ Negative Thoughts کہتے ہیں۔ اس میں سب سے بڑی درجے یا طاقت کی نہیں ہے وہ غصہ ہوتا ہے۔ انسان میلاد آدم سے لے کر اب تک اس کوشش میں مصروف رہا ہے کہ وہ ان منفی خیالات اور منفی پیش قدمی سے نجات حاصل کرے۔ انسان نے اس سلسلے اور ٹھمن میں بڑے پاپڑ بیٹھے ہیں اور بڑی ساریں کھائی ہیں لیکن یہ عوارض اس کے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں اور اس نے انسانی زندگی کو بڑی بڑی طرح سے کھدیر کے رکھ دیا ہے۔ آپ کو یاد ہو گا پرانے زمانے میں لوگ کچھ دن دروز کچھ وظائف اور کچھ جہاڑ پھونک سے ڈریوں پر جا کے کچھ فقیروں اسادھوؤں اور سنتوں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان Negative Thoughts کو ملایا میٹ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن وہ اس میں کامیاب ہونہیں پاتے تھے۔ اس کے باوجود انسان کی کوششیں جاری رہیں اور شاید مستقبل میں بھی جاری رہیں گی۔ پھر مجھے یاد ہے کہ ڈریے پر جہاں ہم اپنے بابا جی کے پاس جایا کرتے تھے رات کے وقت جب بابا جی اپنا درس دیا کرتے تھے (جو تقریباً اڑھائی بجے شروع ہوتا تھا) تو اس وقت وہ ہم سب کو کاؤڑ زبان کا قہوہ پلایا کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کاؤڑ زبان کے قہوے میں یہ تاثر ہے کہ وہ انسان کے اندر سے منفی خیالات اور روایوں کو چوس لیتا ہے اور آدمی میں تقریباً ایسی ہی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ وہ اپنی پیدائش کے وقت تھا۔ ہم بابا جی سے قہوہ تو پیتے رہے لیکن اس کا

ہم پر ایسا اثر نہیں ہوا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔ آپ نے حکیموں سے یہ سن ہو گا کہ اگر دماغ کو بہت زیادہ گری ہو گئی ہے تو ”حجم بالنگ“ ہے آپ ”حجم ملنگاں“ کہتے ہیں اس کا استعمال کیا جائے۔ اس دور میں گری دانے کا بھی بہت استعمال ہوتا تھا۔ یہ ساری دو ایساں جسمانی عارضوں کے ساتھ نہیں لڑتی تھیں بلکہ یہ روحانی، ذہنی اور نفسیاتی بیماریوں کا مقابلہ کرتی تھیں۔ کہیں تو یہ خوش قسمتی سے کامیاب ہو جاتی تھیں اور کہیں نہیں ہوتی تھیں۔ ان ساری دو ایسوں میں بھی ایک ایسی دوایاد ہے جو واقعی بڑی مفید ہے اور اس کے نہایت اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور وہ ذہنی بالیدگی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسٹھنڈ وس ہے۔ ہمیں بھتے میں ایک روز ایک چیق بھرا سٹھنڈ وس اور اس میں سات سیاہ مرچیں ڈال کر اس کا ابلا ہوا پانی چھان کے دیا جاتا تھا اور حکماء اور صوفیاء کہتے ہیں کہ اس کے پینے سے دماغ پر اس کا بہت اچھا اثر پڑتا ہے..... اس کو ”جھاڑ و بد دماغ“ بھی کہتے ہیں کیونکہ کہا جاتا ہے کہ یہ دماغ کے سارے جالے جھاڑو کی طرح سمیٹ کر ذہن میں صفائی کر کے جلا جائتی ہے۔ Herbal Treatment کا زمانہ بھی گزرا۔ پھر نفسیاتی علاج دان آئے اور وہ بھی ذہن کے اندر پر انگدگی کو دور کرنے کے لیے اپنے اپنے درماں لوگوں کے سامنے پیش کرتے رہے۔ آپ کو تو مجھے سے بہتر علم ہو گا کہ فرائید اس ضمن میں Psycho Analysis لے کر آیا۔ ایڈلر کچھ اور کہہ کے لوگوں کے ذہن سے وہ منفیانہ پیش قدمی کو دور کرتا تھا جو انسانی زندگی پر اپنا بخوبی جا کر بیٹھی ہوتی ہوتی ہے اور کسی صورت بھی انسانی ذہن کو انسانی روح کو نہیں چھوڑتی تھی۔ پھر سائیکوڈرامہ آیا جس میں لوگ مل جل کے ایک ڈرامہ کرتے تھے جس میں وہ اپنے دکھ درد کا اظہار کرتے تھے اور انسان بے چارا اس تناظر میں اس ”ترنے“ ہی کرتا رہا۔ ترپاہی رہا۔ لیکن اس کے ذہن سے وہ باقی میں ہو سکیں جسے وہ دور کرنا چاہتا تھا۔ منفی خیالات بھی بڑھے عجیب و غریب ہوتے ہیں اور وہ بہت عجیب و غریب طریقے اور انداز سے حملہ آور ہوتے ہیں اور جو لوگ شدت سے اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں وہ بے چارے یہ بھی کہتے ہیں کہ بزرگ اور پاکیزہ ہستیوں کے بارے میں بہت بڑے بڑے خیالات ذہن میں آتے ہیں۔ باوصاف اس کے ہمارے روحانی پیشوں اور ہمارے ذہنی مبلغ اس امر کا یقین دلاتے ہیں کہ یہ خیالات اختیاری نہیں ہوتے ہے اختیاری طور پر آتے ہیں اس لیے اس حوالے سے زیادہ گھبرا نے کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ انسانی زندگی پر حملہ آور ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جب ہم Editing کا کام کر رہے تھے اور گرمی اپنے جو بن پر تھی تو وہ بڑے چھاڑی سائز کے امریکی کولنگ سٹم سے ٹھنڈا رہنے والا بڑا ہمال اور اس سے مسلک تیرہ کرے گرمی میں ڈوب گئے اور ہمیں کام جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہاں ہم ریکارڈنگ کرتے تھے اور ریکارڈنگ کو پھر آگے واپس آف امریکے واشنگٹن ڈی سی بھیجتے تھے جہاں امریکہ کی خوبیاں بیان کی جاتی تھیں کہ یہ بہت اچھا ملک ہے۔ یہ لوگوں کے ساتھ بہت محبت اور بھلائی کا سلوک کرتا ہے اور پسمندہ اور گرے پڑے لوگوں پر

خاص توجہ دیتا ہے اور ہم امریکہ کے اس سحر میں آئے ہوئے تھے اور اب بھی بہت حد تک آئے ہوئے ہیں لیکن اس گرمی میں کام کرنا ہمارے لیے مشکل تھا اور مشینیں بھی جواب دے رہی تھیں۔ مستری یعنی مقامی ماہرین کو بلا کر پوچھا گیا کہ اس سسٹم کو کیا مسئلہ ہو گیا ہے۔ وہ ماہرین اس کو تھیک کرنے کی کوشش کرتے تھے اور پورے سات دن تک عملی طور پر وہ وفت اور وہ کارخانہ بالکل ویسے ہی بند رہا جیسا کہ عام طور پر چیختی کے روز بند ہوتا تھا۔ ہم وہاں جاتے ضرور تھے لیکن کام کرنیں پاتے تھے۔ آخر تک آ کر گیا رہویں دن ہم نے اسلام آباد سے Experts ملنگوائے۔ ان میں ایک امریکی ماہر تھا اور اس کے ساتھ ایک لبنانی ایک پیرت تھا۔ ان دونوں نے شروع سے آخر تک اس پلانٹ کو چیک کرنا شروع کیا کہ آخر اس میں ایسی کون سی خرابی پیدا ہو گئی کہ یہ کوئی سے عاجز آ گیا ہے اور عاری ہو گیا ہے۔ وہ دونوں لگے رہے اور بڑی دیر تک سوچتے رہے لیکن تین دن کی مسلسل شب و روز مخت کے بعد ان کی سمجھ اور گرفت میں کچھ نہ آ سکا۔ آخر ایک روز اللہ نے ہم پر اور ہماری جانوں پر مہربانی کرنی تھی اور اس لبنانی نے خوشی سے ایک زور کا نعرہ بلند کیا اور اس نے چلا کر کہا کہ میں نے خرابی پکڑی ہے۔ اس پلانٹ میں ایک نہایت ہی پیچیدہ جگہ پر جہاں بڑا ہی حساس آلہ (قمر مولٹی) لگا ہوتا ہے جو سسٹم کے چلنے اور بند ہونے کو کنٹرول کرتا ہے اس کے اندر ایک حساس مقام پر چھپکلی کا ایک بچھپن کرکت چکا تھا اور اس کی نرم و نازک بہیاں وہ ساری اس مشین کے اندر پیوست ہو چکی تھیں اور اس چھپکلی کے بچے نے اس سارے پلانٹ کو روک رکھا تھا تو اب مجھے یاد آتا ہے کہ جب میں زندگی کے بڑے مراحل طے کرنے کے بعد آخری سفر کی طرف روانہ اور گامزن ہوں کہ جس طرح ایک معمولی چھپکی اتنے بڑے پلانٹ کو یوں روک لیتی ہے کہ انسان کا بس ہی نہیں چلتا اور اس طرح نفترت کدورت اور منفی سوچ کی چھپکلی انسانی زندگی میں پھنس کر کس طرح سے انسان کی ساری زندگی ویسے ہی روک لے گی جیسے کہ اس معمولی چھپکلی نے اس پلانٹ کو جام کر دیا تھا۔ آدمی کو شش کرتا رہتا ہے اور بڑا نیک نیت ہوتا ہے بڑا بھلا اور اچھا ہوتا ہے لیکن ایسے خیالات سے نہیں نکل سکتا۔ تشدید ایک نفترت ایک غصہ ایک خوف اگر انسان کی زندگی میں کسی طرح سے اس چھپکلی کی طرح پھنس جائے تو سزا اسی سال اور اس سے لمبی زندگی بھی اس کا ساتھ نہیں دے سکے گی اور ان عوارض میں مبتلا شخص اس مرض کا شکار اس دنیا سے چلا جائے گا۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا خیال رہا رہتا ہے اور اب بھی ہے اور بہت سے لوگ بہت سے بچے اب زیادہ ہی ہو گئے ہیں جو اس بیماری کوڈ پریشن کا نام دیتے ہیں جو کہ یہ انگریزی زبان کی Term میڈیکل کی دنیا سے ہمارے اور آئی ہے اور یہ لفظ یا بیماری جسے ڈپریشن کہتے ہیں اور اس کے بارے میں بہت کچھ کہا جاتا ہے اس کے وجود میں آنے اور پیدا ہونے کی ساری وجہ یہ ہے کہ انسان کی چلتی ہوئی زندگی میں ایک چھپکلی پھنس جاتی ہے اور یہ چھپتی بھی ایک ایسے انتہائی حساس مقام پر ہے جو

آپ کی روح کے تھر موسیٰ نت کو کنٹرول کرتا ہے اور وہ چھپکی وہی منفی پیش قدمی اور Negative Approach ہوتی ہے جس کو میں بار بار آپ کی خدمت میں یہ کہہ کر پیش کرتا ہوں کہ وہ یا تو تشدیدی صورت میں آتی ہے یا پھر غصہ، خوف یا نفرت کی شکل میں آتی ہے۔

آپ کبھی بھی اپنی زندگی کا جائزہ لے لیں یہ عارضہ جس شخص میں کم ہو گایا جس کسی نے اس کے اوپر کنٹرول کر رکھا ہے وہ خوش نصیب ہے اور وہ کم بیمار ہے۔ کچھ نہ کچھ خرابی تو آدمی میں رہتی ہی ہے لیکن اللہ جسمانی عارضے کے مقابلے میں روحانی اور نفسیاتی عارضے سے بچائے۔

ہم ایک بار تھر پار کر کے ریگستان میں تھے اور جیپ پر مسافر تھے۔ ریت میں جیپ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی تھی۔ ریت میں گاڑی کا چلتا خاصاً محال ہوتا ہے۔ اسے دہاں کے ماہر ڈرائیور ہی چلا سکتے ہیں۔ آدھا Desert عبور کر کے ہم اسلام کوٹ پہنچے۔ وہاں ہمارے میزبان مکھی نہال چند تھے جو ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ شام کے وقت جب میں اور متاز مفتی سیر کرنے کے لیے نکل تو ہمیں وہاں پر عجیب و غریب طرز کی دو چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو یہ کہ کھلے ریگستان میں جگہ جگہ شینٹ لگے ہوئے تھے اور ان میں بڑے ہی خوبصورت بیمارے پیارے بچوں والے خاندان آباد تھے اور ان میں نہایت کڑیں نوجوان مرد تھے اور عورت میں چونکہ لمبا گھونکھت نکال کے پردہ کرتی تھیں اس لیے ان کے بارے میں ہم دونوں سے نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس شکل و صورت کی تھیں۔ دوسرا ان بیٹوں کے آگے یا اس کار داں کے آگے جو خیسہ زن تھا ایک چھوٹا سا کچھ تھا جس کے باہر ایک پرانی بیٹی پڑی ہوئی تھی ایسی پیٹی بھی آموں والی ہوتی ہے اور اس پر پرانی مسوک سے لال رنگ میں جامعہ اشرفیہ لکھا ہوا تھا۔ میں نے متاز مفتی سے کہا کہ اس مقام پر اور اتنی دور جامعہ اشرفیہ کہاں سے آگیا۔ ہم نے اس کچے مکان کا دروازہ لکھا ٹایا تو اندر سے ایک صاحب نکلے۔ ان کی پینتائیں پچاس برس عمر ہو گی۔ ہم نے ان سے کہا صاحب آپ کے گھر کا نام جامعہ اشرفیہ کیوں ہے؟ انہوں نے کہا جی میں نے کچھ وقت مولانا اشرف علیؒ کی خدمت میں تھا نہ بھون میں گزارا تھا۔ میں ان سے متاثر ہوں اور انہی کی یاد میں میں نے اپنے گھر کو یہ نام دے دیا۔ ہماری ان کے ساتھ بڑی باتیں ہوتی رہیں اور آخر میں متاز مفتی نے پوچھا کہ دل میں طرح طرح کے خیالات آتے ہیں جن میں منفی قسم کے خیالات بہت زیادہ ہیں اور ان خیالات میں بری بری باتیں بھی ہیں۔ کچھ ایسی بری باتیں جو میرے دل کو بھی بری لگتی ہیں اور کچھ ایسی باتیں جو لوگوں کو ناگوار گز ریں تو مولوی صاحب آپ یہ بتا میں کہ کیا آپ نے بھی اس کے بارے میں کچھ سوچا۔ دو ایسا تو بنی ہیں حکیموں نے اس کے توڑے کے لیے جو شاندے بھی بنائے ہیں اور لوگ دم درود بھی کرتے ہیں لیکن یہ خیالات ذہن اور دل سے نکل نہیں پاتے تو مولوی صاحب نے کہا جی میں نے تو یہ سوچا ہے کہ اگر آپ تشدد پر مائل ہوں اگر آپ کی طبیعت میں غصہ ہو اور آپ خوفزدہ رہتے

ہوں اور آپ کو کسی شخص کے ساتھ نفرت ہو تو آپ ہمیشہ اپنی شین گن اپنے ساتھ رکھیں اور جو آپ کا مقابل ہے جس سے آپ کو نفرت ہے اس کو کمرے میں داخل ہوتے ہی یا ملتے ہی (انہوں نے باقاعدہ شین گن پکڑ کر پوزیشن بننا کر دکھائی) اس پر فائز کر دیں پھر آپ کی جان فتح گئی اور اس کے بارے میں پروانہ کریں۔ اب میں بھی اور مفتی صاحب بھی حیران کہ بھئی اچھا آدمی ہے یہ شین گن سے بندوں کو ہی تباہ کیے جاتا ہے۔ اس نے کہا جاتا جب تک آپ اپنی شین گن ہر وقت تیار نہیں رکھیں گے اس وقت تک اس عمل سے آپ گزرنہیں سکیں گے اور یاد رکھئے شین گن میں ہر طرح کی گولی پڑے گی چوکور بھی، چھوٹی اور بڑی اور وہ چلے گی۔ ہم نے کہا مولوی صاحب ہم نے تو ایسی کوئی شین گن نہیں دیکھی۔ جس میں گولیوں کی شکل و صورت اور جنم بھی مختلف ہو۔ کہنے لگے آپ کو بس یہ گن ہر وقت تیار رکھنی ہے اور اپنے بائیں کندھے کے ساتھ لٹا کے چلاتا ہے اور اس سے غافل نہیں ہوتا۔ مفتی برا مجس آدمی تھا۔ انہوں نے کہا کہ جی یہ گن کہاں سے ملتی ہے، تو مولوی صاحب نے جواب دیا کہ یہ آپ کو خود تیار کرتا پڑے گی۔ مفتی صاحب نے کہا باڑے سے ملے گی؟ انہوں نے کہا کہ نہیں۔ پوچھا سندھ سے تو بھی جواب نہیں ملا۔

ہم نے کہا کہ صاحب یہ تو ایک مشکل سا کام ہمیں بتا دیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ اس کے تیار کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ سارا دار و مدار ان گولیوں پر رکھیں جن کا میں نے ذکر کیا "یعنی چھوٹی مولیٰ، لمبی، ستری، چوکور چورس۔" جب وہ تیار ہوں گی تو پھر آپ جملہ آور ہوں گے۔ میں نے کہا جناب وہ کس قسم کی گولیاں ہیں؟ انہوں نے کہا وہ جو گولیاں ہیں وہ آیات کی گولیاں ہیں جتنی بھی آیات آپ کو یاد ہوں اور سورتوں کے تکڑے اور جتنی بھی دعا کیں ہیں یا آپ محفوظ رکھیں اور انہیں عربی میں یاد کر کے رکھیں اس کا آپ کو بڑا فائدہ ہو گا۔ یہ آئیں اور یہ دعا کیں اور یہ اور ادو و خالق کے جو طے شدہ الفاظ ہیں اور جو اللہ کے پاک نام میں استعمال ہوں ان کو گولیوں کے طور پر اپنے وجود کی شین گن میں ہر وقت فر رکھیں اور جو بونی آپ کو اپناء مقابل نظر آئے جس سے آپ کو نفرت ہے تو اسے دیکھتے ہی فائز کر دیں اور جو کچھ آپ کو اپنے مخالف کو زیر کرنے کے لیے یاد ہے پڑھنا شروع کر دیں اور ساتھ ساتھ یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ یہ شخص بہت بر الگتا ہے مجھے اس سے نفرت ہے، میں اس شخص (نفرت، غصہ اور دیگر منفی سوچیں) کو قتل کرنے پر مائل ہوں اور میں اس سے کسی صورتِ محبت نہیں کر سکتا۔ اب تو ہی اس کا بندوبست کر جب آپ یہ سوچتے جائیں گے اور اپنی قرآنی شین گن سے گولیوں (آیات) کی بوچھاڑ کرتے جائیں گے تو آپ کا منفی خیالات پر غلبہ ہوتا جائے گا۔ ہم مولوی صاحب کی اس بات پر اپنے اپنے دل میں غور کرتے رہے میں اور ممتاز مفتی اپنے اپنے بستر پر لیئے اس پر غور تو کرتے رہے لیکن ہم نے اس پر کوئی بات نہیں کی۔ اگلے دن صبح سیر کے وقت ممتاز مفتی نے کہا کہ بھئی اس کی بات تو ٹھیک ہے لیکن پتہ نہیں ہم اس میں کامیاب ہو بھی سکیں گے کہ

نہیں۔ میں نے کہا کہ ہاں یار ہے تو مشکل بات لیکن تجربہ کر کے دیکھا جاسکتا ہے۔ میری ریٹائرمنٹ سے کچھ عرصہ قبل ایک مرد یوں کی خوشنگوار پیشی دو پہر تھی۔ میں اپنے دفتر کے لان میں چھتری لگا کر مزے سے دھوپ میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں نے دفتر کے بڑے چھانک پر یعنی سڑک کے موڑ پر وہ کار دیکھی جس کے اندر میرا نہایت ہی منحوس اور نہایت قتنج دشمن بیٹھا ہوا تھا اور جو ”کتنی“ کاٹ کے میری طرف ہی آ رہا تھا۔ جو نبی میں نے اسے دیکھا وہ کار کھڑی کر کے اس میں سے باہر نکل آیا۔ جب وہ اپنی کار کا دروازہ کھول کر باہر نکل رہا تھا تو مجھے اسلام کوٹ کے (تھر پار کر) کے مولوی صاحب کی بات یاد آ گئی جس میں انہوں نے Defence کا طریقہ بتایا تھا چنانچہ میں اچھل کر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور میں نے پوزیشن لے لی تو میرا ہاتھ میں گن پکڑنے کے انداز میں ایک او تھا اور ایک نیچا ہو گیا اور میں نے فنا فٹ اور کھٹا کھٹ درو د اور آیات کا و در شروع کر دیا۔ چھوٹی کچھ بڑی جو یعنی منہ اور ذہن میں آیاں آیات کی گولیوں کی بچھاڑی میں نے جاری رکھی۔ جوں جوں وہ میرے قریب آ رہا ہے میں اور الٹ ہوتا جا رہا ہوں۔ وہ بڑا ہی نالائق بے وقوف، منحوس اور تکلیف دہ آدمی تھا۔ جب اس نے قریب پہنچ کر اسلام علیکم کہا تو میں نے اسے علیکم السلام کہا اور بیٹھنے کا کہا تو وہ حیرانی سے میری جانب دیکھ کر کہنے لگا! اشغال صاحب میں نے دور سے یہ سمجھا کہ آپ کوئی بلب لگا رہے ہیں لیکن یہاں آ کر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں نہ کوئی بلب ہے نہ کوئی تار ہے اور نہ ہی یہاں کوئی ایسا یہ پ ہے تو یہ آپ کیا کر رہے تھے۔ میں نے کہا شریف رکھیے۔ آدھا میرا غصہ تو دور ہو چکا ہے اور انشاء اللہ ابھی ہو جائے گا کیونکہ میری شین گن میں ابھی چند گولیاں باقی ہیں اور یہ آپ کے بیٹھنے بیٹھنے اس طرح سے چلتی چلی جائیں گی۔ وہ بیٹھ گیا اور با تین ہونے لگیں۔ (میں نے پھر حمرا میں رہنے والے مولوی صاحب کی بات یاد کی۔ خدا ان کی عمر دراز کرے شاید اس وقت بھی وہ حیات ہوں گے) میں نے آنے والے شخص سے کہا کہ دیکھنے مولوی صاحب نے کیسا اچھا سخن بتایا ہے کہ اتنی دیر کے بعد آنے والے صاحب جو مجھے ہمیشہ اذیت اور تکلیف دیا کرتے تھے اب میرے سامنے بیٹھے ہیں اور میری طبیعت پر اتنا بوجہ نہیں پڑ رہا جس قدر پہلے پڑا کہتا تھا چنانچہ اب زندگی میں جب بھی کبھی موقع ملتا ہے اور میں اس حوالے سے خوش قسمت ہوں اور مجھے ان بابوں نے بڑی آسانیاں عطا کی ہیں۔ یہ بابے ہی ہوتے ہیں جن نے انسان پوچھتا رہتا ہے۔ آپ بھی پوچھتے رہا کہ اس کے جناب مجھے یہ مسئلہ ہے یا تکلیف ہے۔ اس کا کیا سد باب کیا جائے۔

میں اٹھنے والی عرق سے لے کر اپنی شین گن چلانے تک جتنی بھی عمر گزری ہے اس میں کافی آسانیوں میں سے گزر گیا ہوں اور میری آرزو ہے اور آپ بھی میرے ساتھ اس دعائیں شریک ہوں کہ اللہ مجھے اور آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا مزید شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”پانی کی لڑائی اور سندھیلے کی طوائفیں“

ہم اہل ”زادیہ“ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچے۔ ابھی تھوڑی پہلے جب ہم میز کے گرد جمع ہو رہے تھے تو ہم دریاؤں پانیوں اور بادلوں کی باتیں کر رہے تھے اور ہمارے وجود کا سارا اندر وہی حصہ جو تھا وہ پانیوں میں بھیگا ہوا تھا اور ہم اپنے اپنے طور پر دریاؤں کے مبنی وہی طور پر تلاش کر رہے تھے کیونکہ زیادہ باہر نکلنا تو ہمیں نصیب نہیں ہوتا۔ جغرافیہ کی کتابوں یا رسالوں، جریدوں کے ذریعے ہم باہر کی دنیا بارے معلوم کرنا چاہتے ہیں اور معلوم کر بھی لیتے ہیں۔ دریاؤں کی باتیں جب ہو رہی تھیں تو میں سوچ رہا تھا کہ دریا بھی عجیب و غریب چیز ہیں اور ان کو کیسے پہنچ جانا ہے نہ ان کا کوئی نزوں ستم ہے نہ دماغ ہے پھر کس طرح سے دریا کو پہنچ جلانا ہے کہ سمندر کی طرف ہے اور اسے ایک دن جا کے ملنا ہے! بغیر کسی نقشے کے۔ دریا بغیر کسی سے پہنچنے سمندر کی طرف رو ایں دوں ہے اور کہیں اگر اس کے دو حصے ہو جاتے ہیں تو وہ دونوں چکر کاٹ کے مل کے پھر سمندر ہی کی طرف جو سفر رہتے ہیں اور اگر بدستی سے اگر دریا کی کوئی شاخ کسی ایسے مقام پر رک جاتی ہے جہاں بہت ہی سنگلاخ چٹان ہو اور وہ شاخ اس سے سرکراتی ہے اور وہاں سرچھوڑتی ہے کہ مجھے مت رو کو مجھے جانے دو اور سنگلاخ چٹان اسے کہتی ہے کہ میں تو سوا کروڑ سال سے یہاں کھڑی ہوں، میں کیسے ایک طرف کو ہٹ جاؤں۔ وہ بھی (دریا کی شاخ) ضدی ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر تو مجھے نہیں گزرنے دے گی تو میں بھی یہاں کھڑی ہوں، چنانچہ دریا کے اس پانی کے ساتھ جو اس سنگلاخ چٹان کے ساتھ نکلا کے رک جاتا ہے کپڑے پڑ جاتے ہیں، وہاں بھینیں آ جاتی ہیں، گوبر جمع ہونے لگتا ہے، بد بودار اور معفن پانی گزرتا ہے اور اس کا وہ حصہ جو سفر پر رواں دواں تھا اور ایسی سنگلاخ چٹان آنے پر راستہ چھوڑ کے دوسری طرف سے گزر جاتا ہے وہ دریا اپنی منزل تک پہنچ جاتا ہے بالکل اسی طرح سے انسانی زندگی ہے جہاں انسان خند میں آ کر رہتا ہے، لڑائی جھکڑا کرتا ہے تو پھر اس کے آگے بڑھنے اور منزل تک پہنچنے کے جو بھی مقامات ہیں وہ مسدود ہو جاتے ہیں۔ آج سے بہت عرصہ پہلے میرے خیال میں سوڈیڑھ سو

بس قبل کی بات ہے لکھنؤ (بھارتی شہر) کے قریب ایک قصبہ "سندھلے" ہے وہاں کے لہذا اور شاعر مشہور ہیں۔ وہ شاعر بڑے اعلیٰ پائے کے ہیں۔ لکھنؤ میں بھی بڑے شاعر تھے لیکن سندھلے کے شاعر اصلاح دیتے تھے اور اس کی اجرت وصول کرتے تھے۔ ایک دفعہ یہ ہوا کہ سندھلے میں بہت زبردست Drought یعنی خشک سالی ہو گئی اور وہاں کے نواب اور چھوٹی چھوٹی راج دھانیاں تمام کی تمام سو کھے (خشک سالی) کا شکار ہو گئیں۔ اس قدر صور تھا خراب ہوئی کہ زمین کا کایجہ خشکی سے پھٹے لگا۔ جگہ جگہ پر پھٹی ہوئی زمین کے آثار نظر آنے لگے۔ ڈھور ڈنگر (مویش) مرنے لگے اور ان کے بڑے بڑے پتھر اور سینگ جگہ جگہ پڑے نظر آتے۔ پرندوں نے وہ علاقہ چھوڑ دیا۔ ایک دفعہ گئے تو پھر لوٹ کے نہیں آئے لوگوں نے آ کر "کھیا" (سردار) کے پاس شکایت کی۔ وہ کھیا کھڑا نواب کے پاس گیا کہ حضور لوگ گاؤں چھوڑ کر جانا چاہ رہے ہیں لہذا نماز استقامت پڑھی جانی چاہیے کیونکہ اس طرح تو گاؤں ہی خالی ہو جائے گا۔ چنانچہ نماز استقامت ادا کی گئی لیکن اس کا کوئی اثر نہ ہوا جس سے لوگوں کی مایوسیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ہندوؤں نے کہا کہ ہم اپنا "ناکوس" بجا کر اور بھیجن کا کر بھگوان کو راضی کرتے ہیں شاید وہ بارش بھیج دے۔ انہوں نے اپنا پورا زور لگایا لیکن کچھ نہ ہوا۔ جب ڈھور ڈنگروں کے بعد انسان بھی مرنے لگے تو اس علاقے کی طوائفیں (وہ سارے اتر پردیش میں بہت مشہور تھیں) اپنا چھوٹا سا گروہ لے کر نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہو گئیں اور انہوں نے کہا کہ جتنا (عوام) پر بہت کڑا اور پر اوقت آیا ہے اور اس بڑے وقت سے ہم سب ماؤف ہو گئے ہیں۔ ہمارے ذہن میں ایک بات آتی ہے اگر ہمیں اس کی اجازت دی جائے تو ہم شاید اس علاقے اور آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔ نواب صاحب نے کہا کہ اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ طوائفوں نے کہا کہ ہم بھی ایک مخصوص مقام پر پہنچ کر کھلے میدان میں جا کر بیٹھیں گی اور ہم بھی کچھ گریہ وزاری کریں گی لیکن شرط یہ ہے کہ کوئی آدمی اس طرح نہ آنے پائے۔ ان کی وہ شرط منظور کر لی گئی۔ وہ اپنے قیمتی گھروں اور سونے چاندی کے زیورات اور جو بھی کچھ ان کے پاس تھا اپنے بالاخانوں پر چھوڑ کر بیٹھیاں اتریں۔ انہوں نے سفید رنگ کی نیلی "کنی" والی دھوتیاں باندھی ہوئی تھیں۔ جیسے کلتے والی خواتین پہنچتی ہیں۔ خاص طور پر جس طرح مدمر تریسا پہنچتی تھیں (ایک چڑواہے نے یہ آنکھوں دیکھا حال بتایا تھا حالانکہ کسی مرد کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی) وہ جب اس مخصوص جگہ پر آئیں تو انہوں نے گزر کر اللہ سے درخواست کی اے خدا تو جانتا ہے ہمارے افعال کیسے ہیں اور کردار کیسا ہے اور ہم کس نوعیت کی عورتیں ہیں۔ تو نہیں بڑا برداشت کیا ہے۔ ہم تیری شکر گزار ہیں لیکن یہ ساری مصیبت جو انسانیت پر پڑی ہے یہ ہماری ہی وجہ سے ہے۔ اس علاقے میں جو خشک سالی آئی ہے وہ ہماری موجودگی سے آئی ہے اور اس ساری خشک سالی کا "کارن" ہم ہیں۔ ہم تیرے آگے سجدہ ریز ہو کر دل سے دعا کرتی ہیں کہ بارش برسا اور

ان لوگوں اور جانوروں کو پانی عطا کرتا کہ اس بستی پر رحم ہوا اور بھرت کر کے جانے والے پرندوں کو واپس آنے کا پھر موقع ملے اور وہ یہاں خوشی کے لئے نہیں۔ چرا وہا کہتا ہے کہ جب انہوں نے سجدے سے سراخایا تو اتنی گھر کے سیاہ گٹھا آئی اور وہ چشم زدن میں بارشی میں تبدیل ہو گئی اور اسی زبردست موسلا دھار بارش ہوئی کہ سب جل تخلی ہو گیا اور وہ عورتیں اس بارش میں بھیگیں اور ان کی بغلوں میں چھوٹی چھوٹی پوٹلیاں تھیں جنہیں لے کر وہ ایک طرف کو نکل گئیں۔ پھر کسی نے نہ ان کا پوچھا اور نہ ہی ان کا کوئی پتہ چلا کہ وہ کہاں سے آئیں تھیں اور کہ در چلی گئیں۔ انہیں زمین چاث گئی یا آسمان کھا گیا لیکن ساری بستی پھر سے ہری بھری ہو گئی۔ ان طوالوں کے گھروں کے دروازے کھلتے تھے، لوگوں نے ایک دو ماہ تو خود پر جر کیا لیکن پھر آہستہ آہستہ ان کا قیمتی سامان چرانا شروع کر دیا اور تاریخ دان کہتے ہیں کہ ان کے گھروں سے بڑی دیر تک ایسی قیمتی چیزیں برآمد ہوتی رہیں اور انہی چور اور پکے چور کی سال تک وہاں سے چیزیں لاتے رہے۔ ان کی یہ قربانی اور لوگوں کے ساتھ محبت اور تال میں اور گھری دلستگی کو جب میں آج کے تنااظر میں دیکھتا ہوں اور آج میں اپنا اخبار پڑھتا ہوں تو مجھے بڑی حیرانی ہوتی ہے کہ ہم جو پڑھتے لئے لوگ ہیں جوان (طوالوں) سے بہت آگے نکل کر پانی پر جھکڑا کرتے ہیں کہ اس صوبے نے میرے اتنے قطرے پانی کے چھین لیے۔ وہ سرا کہتا ہے کہ میں نے تجھے اتنے قطرے زیادہ دے دیئے۔ ان یہیوں جیسی بلکہ بازاری یہیوں جیسی کام کی بات نہیں کرتا اور ایسی کوئی بات کسی کے دل میں نہیں آتی اور کوئی بھی اس بات کو مانے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ یہ پانی جو اللہ کی عطا ہے اور جو ہم کو جس قدر بھی مل رہا ہے اس کو بانٹ کے کس طرح استعمال کرنا ہے۔ جب بھی ایسی خبریں دیکھتا ہوں تو میرے ذہن میں اور دل میں ان طوالوں سے منسوب اس کہانی کا پس منظر آ جاتا ہے، تو میں اپنے اردو گرد کے لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا ہم جو بہت اچھے بھٹلے اور پاکیزہ لوگ ہیں ان طوالوں کی قربانی کے جذبے کے لئے قدم پر جل سکتے ہیں، تو مجھے ہر طرف سے چروں پر نفی کے آثار ملتے ہیں کہ نہیں..... اہم ایسا نہیں کر سکتے۔ میں حیران ہوتا ہوں کہ ہم کیسے اس Source کو ڈھونڈ سکیں اور پانی کے اس منبع تک پہنچ سکیں جو ہماری روحوں کی آبیاری کرے لیکن یہ ہونہیں پاتا۔ اس کی طرف ہم جانہیں سکتے۔

بہت ممکن ہے کہ میرے پیارے مہمانوں (حاضرین زاویہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میں سے کوئی مجھے تھوڑی سی Guidance اس حوالے سے عطا کرے کہ کس طرح سے ہم اس منزل تک پہنچ سکیں جس منزل پر وہ پا کیزہ یہیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں۔ (پروگرام میں سوال وجواب کا سیشن شروع ہوتا ہے)

اشفاق احمد صاحب سوال کرتے ہیں۔ شہزاد صاحب وہ یہیاں ایک ہی فیصلے پر پہنچ گئیں۔

اس حوالے سے آپ کا کیا خیال ہے؟

شہزاد صاحب: آپ نے یہ جو سوال انھیاں ہے یہ آپ کے لیے بھی بہت مشکل سوال ہے اور ہم سب کے لیے بھی مشکل ہے۔ اصل میں جو کہانی آپ نے بیان کی اس کے جو معانی میرے ذہن میں آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ہم سب اپنے اپنے گناہوں اور اعمال کی ذمہ داری قبول کریں اور پھر اس ذمہ داری کو قبول کرنے کے بعد تصرف یہ کہ اپنی ہی اصلاح کریں بلکہ کسی بہت بڑی قربانی کے لیے تیار ہو جائیں اور یہ مغلہ نہ کریں کہ کس کو کتنا پانی ملا اور کس کو کتنا پانی نہیں ملا۔ اس سے ایک ایسی بارش ہو سکتی ہے جو ہم سب کو سیراب کر دے۔

اشفاق احمد صاحب: ہماری اس محفل میں ڈاکٹر توفیق صاحب بھی موجود ہیں۔ ان کے پاس بھی بڑے مریض آتے ہیں اور یہ بڑے بینی کے کام کرتے ہیں۔ ان سے بھی پوچھا جائے کہ ہم میں کسی طرح سے وہ جذبہ پیدا ہو جو آپ میں ہے کیونکہ میں نے آپ کو لگن اور محبت سے کام کرتے ہوئے دیکھا ہے جبکہ اس کے برکت ہم رکتے اور رکھتے ہیں۔ ہم بھی پھیلنا چاہتے ہیں۔

ڈاکٹر توفیق: میرا خیال ہے کہ ہمیں چاہیے کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کی بھی کوشش کریں اور ایک دوسرے سے جو توقعات ہم رکھ رہے ہیں ان توقعات کا دائرہ بھی جانچیں اور ایک دوسرے کو چیزیں دینے کی بہت بھی رکھیں۔ صرف یہ پڑھی مصروف ہے ہیں۔ جب یہ سارے جذبے ہم میں آجائیں گے تو ہم بیٹھ کے پانی کے قطروں کو جو بھی ہمارے پاس ہیں ان کو خوش اسلوبی سے بانٹ لیں۔

اشفاق احمد: پروین اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟

پروین صاحبہ: میں سمجھتی ہوں کہ میرا جو اپنا زاویہ نظر ہے وہ یہ ہے کہ جیسے توفیق صاحب نے فرمایا کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھیں گے تو ہم قطرے بانٹیں گے مجھے یہیں لگتا کہ میں اور آپ اس میں قصور دار ہیں یا کہ ہم لوگ اپنی سطح پر غلطی پر ہیں۔ ہمیں ان عناصر کے مذموم مفادات کو پن پوچھ کرنا ہو گا جو اپنے ذاتی اغراض و مقاصد اور فوائد کے لیے اس طرح کی بانٹیا اس طرح کی بندرا بات ہم کو سکھاتے ہیں۔ اگر ہم میں حب الوطنی کا جذبہ بیدار ہو جائے اور ہم سمجھیں کہ الفاق اور محبت سے ہی مسائل حل کر سکتے ہیں۔ وہ بیان جن کی مثال دی گئی ہے وہ متحدد ہو کر جنگل میں گئی تھیں اور ان کے دل میں درود تھا اور انہوں نے اپنا ذاتی فائدہ چھوڑ دیا تھا تب وہ مسئلہ حل ہوا تھا۔ ہمارے اوپر جو بھی مسائل آرہے ہیں وہ پانی کے ہوں یا انج کے اس میں Vasted Interest کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔

اشفاق احمد: پونکہ پانی کی باتیں ہو رہی ہیں اور ہم نے یہ بھی کوشش کی ہے کہ گلیشیر پکھلا کر اپنے آئندہ مصارف کے لیے پانی حاصل کریں گے تو مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ ہم ناران جا رہے تھے اور ہمیں یہ کہہ کر روک دیا کہ گلیشیر کی کیفیت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو ایک دو دن یہاں بالا کوٹ میں قیام

کرنا پڑے گا۔ بالا کوٹ میں جب ایسا کوئی ہوٹل نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ممتازِ مفتی صاحب بھی تھے۔ وہ کہنے لگے یا رہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ مسافر مسجد میں وقت گزارتے تھے تو چلو کسی مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں۔ ہم پانچ آدمی تھے مولوی صاحب کے پاس گئے ان سے کہا کہ آپ کیا ہمیں مسجد میں رہنے کی اجازت دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہاں جی کیوں نہیں۔ ادھر برآمدہ ہے صرف ہے مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس ایسی کوئی دری نہیں جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا۔ ہم نے کہا کہ نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں ہمارے پاس Sleeping Bages ہیں۔ مولوی صاحب بھی وہ سلپینگ بیگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہ یہ بڑی مزیدار چیز ہے کہ اس کے اندر آدمی گھس جائے اور سکون سے سو جائے۔ ہم ایک دو دن وہاں دیے ہی سوتے رہے۔ ابھی ہمیں آگے جانے کی کلیرنس نہیں مل رہی تھی۔ وہ مولوی صاحب بھی عجیب و غریب آدمی تھے ان کے گھر کے دو جگرے تھے۔ ہم سے کہنے لگے (متازِ مفتی ان کے بڑے دوست ہو گئے) میرے ساتھ چاۓ پیسیں وہ ہمیں اپنے گھر لے گئے اور جس کمرے میں بٹھایا اس میں ایک صندوقچی تھی بیٹھ کر وہ جس پر لکھتے تھے اور باقی صفحچی ہوئی تھی۔ متازِ مفتی تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگے کہ مولوی صاحب! آپ کا سامان کہاں ہے تو وہ کہنے لگے آپ ہم کو متاد کہ آپ کا سامان کدھر ہے؟ متازِ مفتی کہنے لگے میں تو مسافر ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا میں بھی تو مسافر ہوں۔ کیا جواب تھا۔ اس طرح کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ مولوی صاحب کا ایک خادم تھا وہ اذان دیتا تھا۔ اس نے واںکٹ پہنی ہوئی تھی۔ وہ اندر آ کے کبھی ایک اور کبھی دوسری جیب میں ہاتھ ڈالتا تھا۔ میں سمجھا کہ اسے کوئی خارش کا مرض لاحق ہو گایا ایک ”جوہ لے“ کا مرض ہو جاتا ہے اسے اُوہ ہو گا۔ وہ بار بار جیب دیکھتا تھا۔ اس سے مجھے بڑا تجسس پیدا ہوا۔ میں نے کہا مولوی صاحب آپ کا یہ خادم کیا پیار ہے۔ کہنے لگے نہیں اللہ کے فضل سے بہت صحت مند بہت اچھا اور نیک آدمی ہے۔ میں نے کہا جی یہ ہر وقت جیب میں ہاتھ ڈال کے کچھ ٹوٹا رہتا ہے۔ کہنے لگے جی یہ اللہ والا آدمی ہے اور خدا کے اصل بندے جو ہیں وہ ہر وقت جیبوں کی تلاشی لیتے رہتے ہیں کہاں میں کوئی چیز تو نہیں پڑی جو اللہ کو ناپسند ہو۔ میں نے کہا کہ ہم تو بڑے بد نصیب ہیں اور اس شہر سے آتے ہیں جہاں ناپسند چیزیں ہم جیبوں میں ہی نہیں دل کے اندر تک بھرتے ہیں اور بہت خوش بھی ہوتے ہیں۔ اس طرح کے آدمی یا کردار جب پیدا ہونے لگیں گے تو پھر ظاہر ہے کہ کچھ مشکلات دور ہوں گی اور یہ کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے کے لیے اور ایک دوسرے کو جانے کے لیے ہمیں شاید وقت در کار ہو یا ہمیں اپنے ارگرد کے لوگ دیے نہ نظر آتے ہوں جیسے نظر آنے چاہیں یا وہ Level Create ہم نے کیا ہو جو بڑے مہذب ملکوں نے کیا ہوا ہے یا جو ہمارے سامنے اور دیکھتے دیکھتے چاہنا نے Create کر لیا ہے۔ ہمارے چودہ کروڑ عوام ایک طرف ہیں اور ہم جو مراجعات یافتہ لوگ ہیں ہم نے انہیں خود سے

الگ کیا ہوا ہے۔ ہمارے درمیان ایک بہت بڑی گھری کھائی ہے جو کبھی تو پانی سے بھر جاتی ہے اور بھی سوکھ جاتی ہے اور پانی سے خالی ہو جاتی ہے۔ اب اس مکالمے میں ہم عطاۓ الحق قاسی سے پوچھتے ہیں کہ ہم وہ کون سارا ست پکڑیں جس میں ہم لوگوں کو آسانیاں عطا فرمائیں اور یہ معاشرتی مسائل جو پیدا ہوتے ہیں یہ پیدا نہ ہوں۔

عطاء الحق قاسی:- اشراق صاحب! آپ نے جو حقائق بیان کیے ہیں اور جو حکایت بیان کی ہے وہ اس قدر لچک ہے اور اس میں اتنے معانی پوشیدہ ہیں اور بھی بات یہ ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی تجویز باقی نہیں رہتی۔ میں آپ ہی کی بات کو ہر اندا چاہتا ہوں کہ ہم 14 کروڑ ہجوم سب بہت اچھے ہیں۔ ہم میں سے کچھ کو چاہیے کہ اپنے آپ کو برا بھیجیں اور جا کر ان ہی بازاری عورتوں کی طرح اگر یہ زاری کریں تب شاید ہمارا مسئلہ حل ہو جائے۔

اشراق احمد:- عاصم قادری صاحب آپ بھی کچھ فرمائیں۔

عاصم قادری:- لوگ ایثار و قربانی کی شیرنگ اور مل بانٹنے کی بات کرتے ہیں۔ ہم لوگ ہر گھنٹہ ہر منٹ ایک ایسی بے تینی اور غربت کی طرف چلتے چلے جا رہے ہیں جہاں پر سوچ کی Maturity ہم سے بہت دور ہے اور ہم میں چھین کے کھالینے کی حس بیدار ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آپ اس مسئلے کو جو مسئلہ ہر دن ہمیں غربت اور بے تینی کی جانب گھستیا چلا جا رہا ہے اس کو تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔

اشراق احمد:- ہمارے درمیان نیلم احمد شریف رکھتی ہیں۔ وہ اس عہد کی بہت معترض نوجوان افسانہ نگار اور قلم کار ہیں اس سلسلے میں جس میں ہم پختے ہوئے ہیں اس کی بابت ان سے پوچھتے ہیں۔

نیلم احمد:- اشراق صاحب کی بیان کردہ حکایت سے دو باتیں میرے ذہن میں آئیں۔ ایک یہ کہ جن خواتین کا انہوں نے تذکرہ کیا انہیں معاشرتی طور پر اچھی زنگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا لیکن پھر بھی ان کے دل میں ایک مقصد تھا جس کی وجہ سے انہوں نے خدا سے دعا کی اور وہ ایک عظیم مقصد تھا۔ دوسری بات جو پانی کی ہے یہ مسئلہ روز اخباروں میں آتا ہے اور اس سے ہم کافی افراد بھی ہوتے ہیں۔ میں بھتی ہوں کہ ہم سب میں Tolerance کی کمی ہے۔ برداشت کا مادہ شاید کم ہو گیا ہے اور ایک دوسرے کے لیے کچھ کر گزرنے کا جذبہ بھی کافی کم ہے اس لیے اگر ہم میں سے کچھ قطرے کسی کو زیادہ مل جاتے ہیں یا کچھ کم تو ہم لوگ واپسیا چاہتے ہیں جبکہ یہ پوری قوم کا مسئلہ ہے اگر ایک صوبے کو پانی ملے گا اور دوسرے کو نہیں تو یہ بھی مُھک نہیں ہو گا۔ سارے ملک کو پانی ملے گا اور فصلیں پیدا ہوں گی تو سب ہی خوشحال ہوں گے۔

(عطاء الحق قاسی درمیان میں بولنے ہیں)

اشراق صاحب اس حوالے سے ایک بہت ضروری بات میں کہنا چاہ رہا ہوں اور وہ اخباروں

کے کردار کے حوالے سے ہے۔ اخبارات اس ایشیو جس طرح اخھاتے ہیں میں سمجھتا ہوں وہ بالکل قومی مفاد میں نہیں ہے۔ سیکرٹریوں کی جو مینگز ہوتی ہیں یہ بات وہیں تک رہنی چاہیے جبکہ اس کے برکس یوں لگتا ہے کہ جیسے دو صوبوں کی صفات آراء ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف طبلی جنگ بجا دیا گیا ہے۔ یہ صورت حال قطعاً قومی مفاد میں نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اخبارات کو اپنا کردار بہت اختیاط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

اشفاق احمد: آپ بالکل صحیح کہد رہے ہیں اور گھوم پھر کے بات پھر اسی مرکز پر آ جاتی ہے کہ جب تک ہم میں تعلیم کا فقدان رہے گا اور جب تک تعلیم یافتہ لوگوں کی تربیت درست انداز خطوط اور سطح پر نہیں ہوگی اس وقت تک ہم ایسی الجھنوں کا شکر ہوتے رہیں گے اور اس میں بنتا ہوتے رہیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ جو صاحبان اختیار و اقتدار ہیں اور جن کے ہاتھ اور قبیلے میں لوگوں کی زندگیوں کی قدرت ہے ان کو دوبارہ اپنے آپ کو بھی درست کرنا چاہیے اور اس تعلیم کی طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ اس حوالے سے تربیت کی واقعی ضرورت ہے۔ تربیت حاصل کرنے کے لیے کوئی اور راست اختیار کیا جانا چاہیے اور میں تو اکثر ایک ہی بات کہا کرتا ہوں کہ جب تک آپ اپنے ۱۴ کروڑ باقی بھائیوں کو ان کی عزت نفس نہیں لوٹا میں گے آپ پوری طرح سے بے رہیں گے اور کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ ان کو ان کی عزت لوتا دیجیے اور ان کو سلام کیجیے۔ آپ کے گھر زادنوں سے بھر جائیں گے اور آپ کی ”چاہیاں“، ”مکھن“ سے لبریز ہو جائیں گی۔ آپ سے اجازت لون گا۔ اللہ آپ کو آساتیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

بندے کا دار و بندہ

ہمارے ہاں آج کل لوگوں کی لوگوں پر توجہ بہت زیادہ ہے اور اس اعتبار سے یہاں اللہ کے فضل سے بہت سارے شفا خانے اور ہسپتال بن رہے ہیں اور جس مخیر آدمی کے ذہن میں لوگوں کی خدمت کرنے کا تصور اٹھتا ہے تو وہ ایک ہسپتال کی داغ بیل ضرور ڈالتا ہے اور پھر اس میں اللہ کی مدد شامل حال ہوتی ہے اور وہ ہسپتال پائی چکیل کو بھی پہنچ جاتا ہے لیکن سارے ہی لوگوں کو کسی نہ کسی جسمانی عارضے میں بنتا خیال کرنا کچھ اسی خوش آئند بات نہیں ہے۔ لوگ جسمانی عوارض کے علاوہ ذہنی، روحانی، نفسیاتی یا ماریوں میں بھی بنتا ہوتے ہیں یا یوں کہیے کہ لوگوں پر کبھی ایسا بوجھ بھی آنا پڑتا ہے کہ وہ بلباٹے ہوئے ساری دنیا کا چکر کاٹتے ہیں اور کوئی بھی ان کی دلگیری کرنے کے لیے نہیں ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں ایک یونیورسیٹی تھا۔ وہ بے چارہ بہت پریشان تھا اور وہ یہ سمجھتے ہوئے کہ کوئی ہسپتال ہی اس کے دکھوں کا مد او کرے گا وہ ایک بہت بڑے ہسپتال میں چلا گیا اور وہاں جا کر واویا کرنے لگا کہ مجھے یہاں داخل کرلو کیونکہ معاشرے کے تھانیدار نے مجھ پر بڑی زیادتی کی ہے اور میری بڑی بے عزمی کی ہے جس کے باعث میں یہاں ہو گیا ہوں۔ اب ہسپتال والے اسے کیے داخل کر لیں۔ انہوں نے اس سے کہا کہ ہمارے ہاں ایسا کوئی بند و بست نہیں ہے کہ تم آپ کے دکھوں کا مد او کر سکیں یا آپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ سکیں یا آپ کی تشغیل کر سکیں۔ اس کے لیے تو کوئی اور جگہ ہونی چاہیے اور تم اس بات سے بھی معدود ہیں کہ آپ کو کوئی ایسی جگہ بتا سکیں۔ یونیورسیٹی بے چارہ پریشان حال میں کوئی پرمارامارا پھر تارہ اور اب تک پھرتا ہے اور اس کی تشغیل دلگیری یا حوصلہ جوئی کرنے والا کوئی بھی شخص یا ادارہ نہیں ہے۔ پرانے زمانے میں بطور خاص بر صیغہ اور وسطیٰ ایشیا کے اسلامی ملکوں میں خانقاہیں ہوتی تھیں، ذیرے ہوتے تھے اور درگاہیں ہوتی تھیں جہاں سے کھانا بھی ملتا تھا اور رہنے اور وقت گزارنے کے لیے جگہ بھی ملتی تھی اور ایسی جگہوں پر ایسے لوگ بھی ملتے تھے جو دکھ بانٹتے تھے اور یونیورسیٹی کے دکھی لوگ ان کے پاس اپنے دکھ لے کر جاتے تھے اور وہ ان کے دکھوں کا علاج تو نہیں کر سکتے تھے لیکن جتنے بھی آدمی وہاں جمع ہوتے

تھے تو سارے لوگ اسکے ہو کر اس دلکھی شخص کی دل جوئی کرتے اور اللہ سے اس کے حق میں دعا کرتے کہ اے اللہ اس کا دلکھ دور فرمادے اور ایسے ذیروں درگاہوں اور خانقاہوں پر موجود سوغاتیں کھانے والے اور لانے والے سب لوگ اس شخص کے لیے ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے تھے۔ کئی یونسوں کے کندھوں سے کچھ بوجھا اتر جاتا تھا لیکن اب ایسی چیزیں مفقود ہو گئی ہیں کیونکہ نئی تعلیم اور ترقی کے دور نے یہ بات واضح کی ہے کہ اس قسم کے ذیرے اور درگاہیں اور اس قسم کے زاویے (زاویہ پروگرام کی مثال دیتے ہوئے جہاں کئی لوگ اسکے ہوتے ہیں) اور دائرے ہمیں نہیں چاہیں کیونکہ انسان صرف جسمانی طور پر ہی مربیض ہوتا ہے اور اس کی کیمسٹری میں ہی کوئی فرق پڑتا ہے۔ خواتین و حضرات لوگ ایک دوسرے کا سہارا مانگتے ہیں۔ ایک دوسرے کے قریب آنا چاہتے ہیں لیکن ترقی کے اس دور میں ایک دوسرے کے قریب آنے کی ساری راہیں مسدود و مفقود ہو گئی ہیں لیکن پھر بھی انسان اپنے ساتھ والوں کو اپنے پرکھوں اور آبا اجداد کو ساتھ ساتھ اٹھائے پھرتا ہے۔ اگر کسی روشن دن میں آپ اپنا ہاتھ کھوں کر دیکھیں تو آپ کو ہاتھ کی ان لکیروں میں ان چوکھوں، چوکڑیوں اور مساموں کے اندر بہت سے ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کے جیز م موجود ہوں گے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو آپ کے آبا اجداد یا پرکھ تھے۔ ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور آپ کا ہنسنا، بولنا، غصہ اور آپ کی شوخی و ضد آپ کے اندر ان ہی لوگوں کی طرف سے منتقل ہوتی ہے۔ اگر کسی نہ کسی طرح سے آپ ان کے قریب رہیں یا وہ آپ کے قریب رہیں یا آپ کے ارد گرد موجود لوگ آپ کو ہاتھ لگا کر محبوس کرتے رہیں یا آپ ان کو Touch کر کے ایک دوسرے کے ہونے کا ثبوت بھی پہنچاتے رہیں تو پھر ایسے ذہنی اور نفیاً عارضے لا حق نہیں ہوں گے۔ انسان انسان کی قربت چاہتا ہے اس سے علاج نہیں کروانا چاہتا اور مختلف کروں میں منتقل ہو کر یہ تقاضا نہیں کرتا کہ میرا کمرہ نمبر 144 یا 213 ہے آپ مجھے دہاں ملنے آ جاؤ۔ لیکن آج کی ترقی ہمیں کروں میں بند کر کے علاج کروانے کی ترغیب دیتی ہے کہ وقت پر ڈاکٹر آتا ہے اور وقت پر زرس چیک کرتی رہے پھر مشینوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے کہ آپ ہی نئی سکین کے عمل سے گزریں اور دیگر مشینوں سے علاج کروائیں لیکن اس طرح سے علاج ہونیں پاتا کیونکہ انسان بکھرا ہوا ہے۔ مجھے اپنے بچپن کے قبے کا واقعہ یاد ہے۔ قبصور میں عجیب و غریب قسم کی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دفعہ منہ کھر کی بیماری لا حق ہو گئی (اب بھی یہ بیماری آئی ہو گئی ہے جس میں بے شمار جانور مر جاتے ہیں) تو ہمارے قبے میں کچھ لوگ آئے جنہیں جھوک قسم کے لوگ کہا جاتا تھا انہیں نے کھدر کے کئی تھان ملکوائے اور شام کو گذروں (چھکڑوں) پر ان تھانوں کو پھیلایا کر (ہم چھوٹے بچے انہیں دیکھتے تھے کہ یہ کیا کر رہے ہیں) بڑے بڑے ہاتھیوں کی شکل بنایا (آپ ہاتھیوں سے تو واقف ہوں گے یہ بڑا مویشی ہوتا ہے اور اس سے بڑا کام لیا جاتا ہے سری لنکا میں لوگ اس سے ہل بھی چلاتے ہیں) کر ان گذروں کو دریا

کنارے لے گئے اور وہ لوگ ان پر اپنے کچھ مخصوص سے متر پڑھتے تھے اور دعا کرتے تھے کہ یا اللہ اس قبیلے سے جانوروں کی یہ بیماری چلی جائے۔ میں اب ٹھیک سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسی چیزوں سے علاج ہوتا تھا یا نہیں لیکن لوگوں کا یہ اجتماع انہیں ایسی طاقت عطا کرتا تھا کہ وہ بیماری پر بڑی شدت اور زور کا جملہ کرتے تھے اسی لیے ہمارے بزرگان دین اس بات پر زور دیتے ہیں کہ خلوق خدا کا ساتھ دو اور خلوق خدا کی خدمت کرو اس میں آپ کا بھی فائدہ ہے کیونکہ خلوق خدا کی Magnetic Force است کر آپ کے اندر کی جو خرابیاں ہیں وہ بھی ٹھیک کر دے گی اور ان کا بھی علاج کر دے گی۔ میں تقسیم بر صیغہ کے اتر پر دلیش کے جس قبیلے کا ذکر کر رہا ہوں وہاں مویشیوں کا اس طرح سے علاج کیا جاتا تھا وہاں ایک مرتبہ بارش نہ ہوئی۔ وہاں اکثر ایسا ہو جاتا تھا اور اب اس طرح ہمارے ہاں بھی مسلسل ہے۔ میرے قبیلے والے سخت خشک سالی کے خاتمے کی دعا کروانے کے لیے ایک صاحب دعا کو لے آئے اور اس سے درخواست کی کہ آپ ہمارے قبیلے میں دعا کریں کہ اب رحمت بر سے کیونکہ بڑی تنگی ہے۔ اس صاحب دعا نے کہا کہ میں قبیلے کے کنارے ایک جھونپڑی میں رہوں گا اور کوئی آدمی مجھے Disturb نہ کرے اور پھر میں دعا کروں گا آپ لوگوں کو سات دن تک انتظار کرنا ہو گا چنانچہ ان کے لیے ایک جھونپڑی کا انتظام کر دیا گیا۔ ساتویں دن سے پہلے ہی یعنی پانچویں دن ہی اللہ کا فضل ہو گیا اور بارش ہونے لگی اور ہر طرف جل تھل ہو گیا۔ لوگ بڑی مٹھائی سوئا تھیں اور پھلوں کے ہار لے کر اس صاحبِ دعا کی جھونپڑی میں آئے تو انہوں نے ہنس کے کہا کہ بھی میں نے تو کوئی خاص دعا نہیں کی۔ میں نے تو کچھ خاص نہیں کیا، جب آپ لوگ مجھے قبیلے میں لائے تھے تو میں نے دیکھا کہ آپ سارے لوگ بکھرے ہوئے اور Order کی کیفیت میں پھر رہے ہیں، بے ہنگام سے ہیں اور کسی کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے کے پاس سے گزرتا ہے تو وہ دوسرے کو حاصل کر کے نہ سلام کہتا ہے نہ دعا دیتا ہے بس گزر جاتا ہے۔ میں دیکھ کر بڑا حیران ہوا کہ ان کے اندر Unity کا جو کرنٹ ہے وہ نہیں چل رہا ہے۔ ہر آدمی الگ الگ زندگی بس کر رہا ہے اور مجھے جانوروں کو دیکھ کر آپ کے رویے سے تکلیف ہوئی کہ یہاں تو چیزوں میں بہت اچھی ہیں جو جب قطار میں چل رہی ہوتی ہیں اور انہیں جب راستے میں دوسری چیزوں میں تھی تو وہ رک کر دوسری چیزوں سے اس کا حال ضرور پوچھتی ہے (اگر آپ نے بھی کبھی غور سے دیکھا ہو تو آپ نے بھی یہ مشاہدہ ضرور کیا ہو گا) اور میں یہ دیکھ کر ایک الگ جھونپڑی میں چلا آیا اور میں نے اپنے آپ کو ہی مجمع کیا کیونکہ آپ لوگوں کے ساتھ رہنے سے میری ذات بھی بٹ گئی تھی اور الگ الگ حصوں بخود میں تقسیم ہو گئی تھی۔ میں اس لیے الگ تھلک بیٹھا رہا اور پھر میں نے اللہ کے فضل سے محسوس کیا کہ آپ لوگوں کے اندر بھی تعاون اور تیکھی اور یا گفت پیدا ہونے لگی ہے۔ کیونکہ میری خدا سے یہی دعا تھی۔ جب آپ لوگوں میں یا گفت پیدا ہونے

لگی تو آپ کے اردو گرد کے موسم اور ان بخارات میں بھی تیکھی پیدا ہونے لگی اور مل کر بادل بنتے ہیں چنانچہ بادل بننے اور برکھا ہوئی۔ میں نے تو کوئی کام یا کمال نہیں کیا اور نہ ہی میں نے بارش کے لیے دعا مانگی ہے بلکہ میں تو اس جھونپڑی میں بیٹھ کر اس بات پر زور دیتا رہا ہوں کہ آپ میں اتحاد ہوا اور آپ کی سوچ میں اتحاد ہو۔ میں نے اس دوران آپ کو پیچانا ہے اور محبوس کیا ہے کہ آپ کیا خطاب ہے۔ ہمارے بیبا جی تھے وہ رات کو کبھی ڈیڑھ کبھی دو بجے تہجد کے بعد میں درس دیا کرتے تھے۔ وہ وقت بڑا خاموش لمحہ ہوتا ہے اور وہاں چند ایک آدمی ہوتے تھے۔ درس کے بعد پھر فجر کی نماز آ جاتی تھی اور سلام پھیرنے کے بعد روشنی آ نگتی تھی۔ ایک روز فجر کی نماز سے قبل بیبا جی نے پوچھ کہ بتاؤ ”اندھیرا روشنی میں کب تبدیل ہوتا ہے اور جالا کب ہوتا ہے۔“

وہاں ہمارے دوست ڈاکٹر صاحب تھے وہ ہم سے بڑے تھے اور بڑے ذہن آدمی تھے۔ انہوں نے کہا کہ سرکار جب آدمی کو دور سے یہ نظر آنے لگے کہ یہ کون سا جانور ہے تو بت اجالا ہورا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر یہ کہ جب کتے اور بکری کی پیچان واضح طور پر ہونے لگے تو روشنی ہورا ہوتی ہے۔ وہاں آفتاب صاحب جنمیں ہم سکرٹری صاحب کہتے تھے انہوں نے کہا کہ جب درخت اچھی طرح سے نظر آ نگیں اور آدمی کی نگاہیں یہ بھانپ جائیں کہ یہ درخت نیم یا شہتوت کا ہے تو روشنی قریب تر آ جاتی ہے۔

بیبا جی نے کہا کہ نہیں یہ بات نہیں ہے۔ روشنی تب ہوتی ہے جب آپ ایک شخص کو دیکھ کر یقین کے ساتھ یہ کہنے لگیں کہ یہ میری ہمیشہ ہے۔ یہ میرا بھائی ہے۔ جب انسانوں کے چہرے آپ پیچانے لگیں اور آپ کو ان کی پوری شاخت ہو جائے تو اس کے بعد اجالا ہوتا ہے۔ جانور یا نباتات کو جاننے سے اجالا نہیں ہوتا ان کا مطلب یہ تھا ”آدمی آدمی کا دارو ہے۔“

آدمی جب آدمی کے قریب آئے گا تو پھر ہی کچھ حاصل ہو گا جب یہ دور جائے گا تو پھر کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ آج کل آپ افغانستان کی جنگ کے حوالے سے ڈیزی کٹر بم کی بڑی بات کرتے ہیں کہ اس نے ایسا کام کیا کہ چھروں کو ہوتی میں تبدیل کر دیا اور ہزاروں انسانوں کو چشم زدن میں دفعہ کر دیا۔ ڈیزی کٹر کا ذکر کرتے ہوئے میں کئی لوگوں کے چھروں پر عجیب طرح کی فتح مندی کے آثار دیکھتا ہوں۔ یہ چشم زدن میں انسانی و نباتاتی تباہی کرنے والے آلات یا بم ترقی یاروش مستقبل کی دلیل ہرگز ہرگز نہیں ہے کیونکہ جب تک انسان انسان کے قریب نہیں آئے گا اور اس کے دھنوں کا ”دارو“ نہیں کر کے گا بات نہیں بنے گی۔

ایک بڑے اچھے جلد ساز تھے اور ہم سب علم دوست ان سے مخصوص کاغذوں کی جلدیں کروا کرتے تھے۔ یہ ہماری جوانی کے دنوں کی بات ہے اور اس جلد ساز کا نام نواز محمد تھا۔ جب ہم

ایم۔ اے میں پڑھتے تھے تو ہمارا ایک دوست نئے کا عادی ہو گیا۔ ہم چونکہ سمجھدار پڑھ لکھے اور سیانے دوست تھے، ہم اسے مجبور کرنے لگے کہ تمہیں یہ بری عادت چھوڑ دینی چاہیے ورنہ ہم تمہارا ساتھ نہیں دے سکیں گے اور ہم تمہارے ساتھ نہیں چل سکیں گے۔ وہ بے چارہ ایک تو نئے کی لعنت میں گرفتار تھا دوسراؤہ روز ہماری چھڑکیاں سہتا تھا جس کے باعث وہ ہم سے کنارہ کشی کرنے لگا۔ محمد نواز جلد ساز بڑے خوبصورت دل کا آدمی تھا۔ ہر وقت مکراتا رہتا تھا۔ گودہ اقتصادی طور پر ہمارے دائرے کے اندر نہیں تھا لیکن وہ خوشنوار طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے ایک دن اس آدمی (ہمارے دوست) کا ہاتھ تھام کر کہا کہ بھلے تم نشہ کرو اور جتنا مرضی کرو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے اور تو چاہے نشہ کرے یا نہ کرے میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں، تو ہمارا یار ہے اور یار ہی رہے گا۔ اس نے کہا کہ پنجابی کا ایک محاورا ہے کہ یار کی یاری دیکھنی چاہیے یار کے عیوبوں کی طرف نہیں جانا چاہیے۔ خواتین و حضرات آپ یقین بیکھیے کہ بغیر کسی طبی علاج اور ماہر نفیسات کی مدد کے جب ہمارے نئے دوست کو محمد نواز جلد ساز کا شہار اماما تو وہ نئے کی بری اور گندی عادت سے باہر نکل آیا اور صحت مند ہو نا شروع ہو گیا۔ انسان کو انسان ہی شہارا دے سکتا ہے۔ اب ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ کیا انفرادی طور پر ہی کسی کا ساتھ دیا جاسکتا ہے یا پھر انسان مدد کے لیے ادارے ہی بنا تا تارے۔ پرانے زمانے میں اس بات کی بڑی تلقین کی جاتی تھی کہ ”ملوک خدا کا ساتھ دیں“، کیونکہ جب تک ان کا ساتھ نہیں دیں گے ان کی طرف سے آنے والی طاقت آپ تک نہیں پہنچ پائے گی۔ مجھے وہ بات یاد آ رہی ہے جو میں نے شایدیٰ وی پر ہی سنی ہے کہ ایک اخبار کے مالک نے اپنے اخبار کی اس کاپی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جس میں دنیا کا نگین اقتشہ تھا اور اس نقشے کو 32 ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا اور اپنے پانچ چھ سال کے کمسن بیٹے کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا کہ لو بھی یہ دنیا کا نقشہ ہے جو ٹکڑوں میں ہے تم اسے جوڑ کر دکھاؤ۔ اب وہ بے چارہ تمام ٹکڑے لے کر پریشان ہو کے بیٹھ گیا کیونکہ اب سارے ٹکلوں کے بارے میں کہ کون کہاں پر ہے کوئی میرے جیسا بڑی عمر کا آدمی بھی نہیں جانتا ہے۔ وہ کافی دیر تک پریشان بیٹھا رہا لیکن پچھے دیر کے بعد اس نے تمام کا تمام نقش درست انداز میں جوڑ کر اپنے باپ کو دے دیا۔ اس کا باپ بڑا حیران ہوا اور کہا کہ بیٹے مجھے اس کا راز بتا کیونکہ اگر مجھے یہ نقشہ جوڑتا پڑتا تو میں اسے نہیں جوڑ سکتا تھا۔

اس پر اس لڑکے نے کہا کہ بابا جان میں نے دنیا کا نقشہ نہیں جوڑا بلکہ نقشے کے دوسری طرف ایک سیفی بلیڈ کا شہما رتھا اور اس میں ایک شخص کا بڑا سا پیڑہ تھا جو شیو کرتا دکھایا گیا تھا۔ میں نے سارے ٹکڑوں کو لٹا کیا اور اس آدمی کو جوڑتا شروع کر دیا اور چار منٹ کی مدت میں میں نے پورا آدمی جوڑ دیا۔ اس لڑکے نے کہا کہ بابا اگر آدمی بڑا جائے تو ساری دنیا بڑا جائے گی۔ خواتین و حضرات میں یہی درخواست اپنی ذات سے بھی کرتا ہوں کہ کاش جانے سے پہلے ایک ایسی صورت پیدا ہو کہ ار دگر د

بنے والے لوگ اور انسان اور اپنے عزیز واقارب اور ان کے علاوہ لوگوں میں محبت، الفت اور یگانگت پیدا ہو جائے اور وہ اچھے لگنے لگیں اور اتنے اچھے لگنے لگیں جتنی اپنی ذات اچھی لگتی ہے، لیکن ایسے ہوتا نہیں ہے۔ ہم تو رفاقتی ادارے بنانے پر لگے ہوئے ہیں۔ ماشاء اللہ یہ کام قابل داد ہے۔ ضرور بنا کیں لیکن انفرادی طور پر انسانوں کا خیال رکھیں۔ لوگ عام طور پر ستم کی بات کرتے ہیں۔ انسان کی بات نہیں کرتے۔ گورنمنٹ کا لج (جس کا نام اب گورنمنٹ کا لج یونیورسٹی ہے) کے پیچے ایک محلہ ہے جہاں سے میشنری کی چیزیں ملتی ہیں۔ میں وہاں سے بھی کاپیاں، کاغذ، لفافے وغیرہ خریدنے چلا جاتا ہوں۔ کچھ عرصہ قبل میں وہاں گیا تو ایک دکان پر اتنی پچاسی سال کا بوڑھا آدمی بیٹھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ اسی عمر کی اس کی بیوی بیٹھی تھی۔ آخر بوڑھا آدمی سخت مزاج تو ہوئی جاتا ہے اس طرح وہ بوڑھا شخص اپنی بیوی کی جان عذاب میں ڈال رہا تھا اور اپنی بیوی سے کہہ رہا تھا ”مر جا مر جا“ آخر تو نے مرت جانا ہی ہے اور مجھے اس بات کا پتہ ہے لیکن تیرے مرنے کی مجھے کوئی پرواہ نہیں ہے تو مر جادفع ہو جا۔“ وہ کہنے لگی ”میں بخی مردی جدوں اللہ دا حکم ہووئے دا او دوں مرالاں گی۔“ میں نے اس سے کہا بایا کیا بات ہے اس سے کیوں لڑتا ہے۔ کہنے لگا میں اس کے لیے دو بیان لایا ہوں لیکن یہ کھاتی نہیں ہے اور جب یہ انہیں کھائے گی انہیں زندہ نہیں رہے گی اور جب یہ زندہ نہیں بچے گی تو میں بھی زندہ نہیں بچوں کا اور اس کا دوائی کھانا میری خود غرضی کا معاملہ ہے۔ یہ تو ایک تعلق کی بات ہوتی ہے اور بایا اسی بات پر ناراض ہو رہا تھا۔ اس کا اس بڑھیا سے گہر تعلق تھا اور وہ اس تعلق کا خاتمہ نہیں چاہتا تھا۔ کوئی لڑائی جھگڑا ہوئا محبت ہو یا کوئی گیت گارہا ہو تو یہ باتیں انسان اور انسان کے درمیان ہوتی ہیں اور یہ انسان کو ایک دوسرے کے قریب لارہی ہوتی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ جب تک انسان انسان کے قریب نہیں آئے گا تب تک وہ سب کچھ ہونے کے باوصف کچھ نہیں ہو سکے گا جس کی ہمیں آرزو ہے اور جس خواہش اور آرزو کے لیے ہم اپنادا من پھیلائے رکھتے ہیں اور اس آس میں زندہ رہتے ہیں کہ وہ جنت ارضی کہاں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

”عالم اصغر سے عالم اکبر تک“

ہم سب کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں سلام پہنچتے۔ ہمارے ہاں بڑی دیرے سے عالم اکبر کا تصور چلا آ رہا ہے اور اس پر بڑا کام بھی ہوا ہے اور اس کے بارے میں صاحبِ حال لوگ جانتے ہیں اور جو اس میں سے گزرے ہیں ان کی کیفیت ہم لوگوں سے ذرا مختلف رہی ہے۔

(عالم اکبر) کے ساتھ ساتھ Macrocosm (عالم اصغر) کا بھی سلسلہ چلا،
کہ جو کچھ ہے وہ اس کی (خدا) طرف سے ہے۔ مغرب کے لوگ خاص طور پر امریکہ اور روس نے اس موضوع پر بڑا کام کیا ہے۔ ہمارے ہاں مشرق میں مولانا روم نے اور ان کے بعد مولانا روم کے شاگرد حضرت علام محمد اقبال نے بھی اس پر بہت کچھ کہا، لکھا اور بتایا ہے لیکن اس کے اسرار آہستہ آہستہ اس وقت کھلنے لگے جب مغرب میں Parapsychology کا علم بطور خاص پڑھایا جانے لگا اور اس کی تفاسیر باہر نکلنے لگیں۔ امریکہ کی ائمہ کے قریب یونیورسٹیوں جن میں نارتھ کیرولینا کی یونیورسٹی بہت معروف ہے وہ اس سلسلے میں بہت آگے ہے۔ بھارت کی گیارہ کے قریب یونیورسٹیاں بھی اس پر کام کر رہی ہیں۔ ہم اس پر کام نہیں کرتے کیونکہ اس کو وقت کا ضایع خیال کرتے ہیں یا سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل دنیوی تصور ہے لیکن West نے جو تصور قائم کیا ہے وہ Microcosm اور Macrocosm کا تصور تھا جسے عالم اکبر اور عالم اصغر کہتے ہیں۔ مغرب والے کہتے ہیں کہ عالم اکبر تو وہ کائنات ہے جو آپ کے ارد گرد پھیلی ہوئی ہے اور عالم اصغر ”میں“ ہوں یعنی چھوٹا سا ایک وجود میرے سے لے کر مینڈ کا وجود۔ اب اس بات پر غور ہو رہا ہے اور بڑی اچھی لائنوں اور خطوط پر سوچا جا رہا ہے کہ کیا عالم اکبر کا عالم اصغر کے اوپر کوئی اثر پڑتا ہے یا عالم اصغر کا کوئی کیا ہوا کام عالم اکبر پر پہنچتا ہے؟ کیا یہ بات حق ہے کہ

لہو خورشید کا بیکے اگر ذرے کا دل چریں

وہ اس نتیجہ پر پہنچے (خاص طور پر دینا یونیورسٹی کے پروفیسر) ہیں کہ اس کا بڑا اشیدید اثر پڑتا

ہے اور وہ بات جس پر ہم ہنسا کرتے تھے کہ جی ستاروں کا آدمی کے ساتھ اور اس کی قسم کے ساتھ کیا تعلق؟ ستارہ ستارہ ہے اور اس کی اپنی گردش اور اپنی چال ہے اور آدمی یہاں بیٹھا ہے آخوندگی کیسے ہو سکتا ہے۔ لیکن علم بتاتا ہے کہ نہیں آدمی یہاں ایسے ہی بیٹھا نہیں ہے اس کے ”پرکھوں“ اور Arche Types کے ذریعے ایک پورا عمل جاری ہے۔

میں معافی چاہتا ہوں کہ میں ایسے ہی Technically Detail میں چلا گیا۔ میں یہ بات آپ سے اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ 1953ء میں میں پہلی مرتبہ انگلستان گیا۔ میرے لندن میں بڑے پیارے دوست تھے جن سے ملے ہوئے مجھے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ جن میں جاوید اعجاز، الیاس گرخجش اور جگیت سنگھ وغیرہ شامل تھے۔ یہ سارے لوگ بی بی میں بھی کام کرتے تھے اور انہوں نے اپنی پڑھائی بھی جاری رکھی ہوئی تھی۔ اس وقت بی بی میں کافی ہاؤس ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہم سارے اکٹھے ہوتے تھے اور پہلی بانکتے تھے۔ وہاں پر ہمارا جو دوست الیاس تھا وہ یہاں خاموش طبع آدمی تھا۔ وہ سعد حنا نیو سے پاکستان اور پھر یہاں سے انگلستان چلا گیا تھا۔ اسے بائیں کان سے سنائی نہیں دیتا تھا۔ لاہور میں اس نے آپریشن بھی کروایا مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ اس نے لندن سے بھی آپریشن کروایا لیکن ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اس کا یہ مسئلہ لا اعلان ہے۔ پہلے اس نے چارڑا کاؤنٹنگ کا کام شروع کیا لیکن وہ اس میں ناکام ہو گیا پھر اس نے پیر شری والا پڑھائی کا سلسلہ شروع کیا جو اس کے دوسرے دوست کر رہے تھے۔ اس میں بھی اس کا دل نہ لگا۔ یہ بس عجیب آدمی تھا۔ ایک دن ہم شام کو بیٹھے ہوئے تھے تو جگیت کہنے لگا ”اوئے تم تو ہم سکھوں سے بھی مجھے گزرے ہوئے تمہاری اردو زبان بھی کیا زبان ہے اس میں تم لکھتے ”خواب“ ہوا اور سے پڑھتے ”خاب“ ہو۔ لکھتے ”خوش“ ہوا اور پڑھتے ”خوش“ ہو۔ یہ تو کوئی زبان نہ ہوئی۔ اعجاز یہ سن کر کہنے لگا۔ دیکھو بھئی گرامر کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ کافی دیر تک یہ بحث ہوتی رہی اور ہم بڑے غور سے اسے سنتے رہے۔ میں نے بھی اپنے علم کے مطابق اس موضوع پر بات کی۔ الیاس ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ جگیت سنگھ ”ایہہ جیہو ہی خواب دے وچ“ ”اوے نا“ ایہہ کہنے دی اسے میں نہیں بول دی بس اینا ای رازاے ”وہ اس مزانج کا آدمی تھا اور وہ کہتا تھا کہ ”بس میں نہیں بول دی“ وہ ذرا دھیما اور ڈھیلا سا آدمی تھا۔ مجھے اعجاز کہنے لگا کہ تو الیاس سے پوچھ کہ اس کے ساتھ یہاں کیا واقعہ گزرا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیوں بھئی تیرے ساتھ کیا ہوا؟ کہنے لگا یہ میں نے ایک پڑھائی شروع کی، پھر وہ چھوڑ دی۔ پھر دوسرا کی اس میں بھی دل نہ لگا۔ میں آجھوڑ اس اپریشن تھا اور ایک دن شام کے وقت آ رہا تھا اور مجھے بیٹھ جو نزو و ڈھیریٹ سے ہو کے البرٹ روڈ پر جانا تھا۔ البرٹ روڈ کراس کر کے پھر میں ریمنز پارک جانا تھا۔ میں جب پہنچا تو ایک لبے کھاتا جا رہا تھا اور سڑک سمنان تھی۔ ایک اور سمنان گلی کے درمیان میں میں جب پہنچا تو ایک لبے

ترے ہے امریکن سیاح نے مجھ سے کہا کہ Do you know the hide park?

اور میں نے اس سے پتہ نہیں کیوں کہہ دیا کہ Yes i know but i do not tell you.

کیونکہ اس طرح کا جواب دینے کا کوئی "تک" نہیں تھا۔ وہ امریکی سیاح "دھکھپو" تھا اور اس نے "کہے" (بائیں) ہاتھ کا ایک گھونسا میری کپٹی پر مارا اور میں گھنٹوں کے بل زمین پر گر گیا۔ جب میں گھنٹوں کے بل گر گیا تو میں نے سراخنا کر اس سے کہا Thank you very much.

اور اس امریکی نے بردست کہا You are well come.

الیاس نے کہا کہ میں اس کے یہ الفاظ تو سن سکا لیکن پھر بے ہوش ہو گیا اور وہیں پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد مجھے ہوش آیا تو مجھے شرمندگی اس بات پر تھی کہ میں نے اسے "تحینک یو" کیوں کہا۔ مجھے چاہیے تھا کہ اسے جو اب امارتا یا پھر نہ مارتا۔ الیاس اب دوستوں کے تھنگ کرنے پر جواز یہ پیش کر رہا تھا کہ غالباً اس کا جرگ گھونسا تھا وہ میری کپٹی کے ایسے مقام پر لگا تھا جہاں سے شریان میں دماغ کے اس حصے میں جاتی ہیں جو بڑا ہی شکر گزار ہوتا ہے اور وہ تحینک یو تحینک یو کہتا ہے اور میں نے اسے مجبور ہو کر Thanak you کہہ دیا۔

الیاس نے مزید بتایا کہ اگلے دن جب وہ صحیح سوریے اٹھا (میرے پاس ایک الارم تھا جو جب چلتا تھا تو اس کے ساتھ بی بی ہی ریڈ یو کی نشريات چلتا شروع ہو جاتی تھیں) اور جب آلام کے ساتھ ریڈ یو چلا تو میں جیران رہ گیا کہ اس کی آواز کچھ عجیب سی تھی چنانچہ جب میں نے اپنے دائیں کان میں انگلی ڈال کے بند کیا تو میرا بابیاں کان ڈن ڈناؤں کام کر رہا تھا۔ میں پھر حینچ مار کے باہر نکلا اور اپنی لینڈ لیڈی سے لپٹ گیا اور خوشی سے کہا کہ I can Listen and Hear from Both Ears.

وہ بھی بڑی خوش ہوئی اور کہا کہ! Realy Ilyas

میں نے کہا بالکل تم کچھ لفظ بولو اور اس طرح وہ میرا ایک کان بند کر کے ٹھیک لیتی رہی۔ الیاس کہنے لگا کہ میں اب سوچتا ہوں کہ کیا یہ حادثاتی واقعہ تھا؟ ایسے ہی ہو گیا یا ایک آدمی کو کیلی فورنیا سے نیویارک نیویارک سے لندن بھیجا گیا اور وہ چلتا ہوا اور سارا سفر طے کر کے یہاں پہنچا اور میں اس وقت اس گلی میں پہنچا جب کہ مجھے بھی وہاں سے گزرنا تھا اور ایک شریف آدمی کی طرح میں نے اسے راستے بتانا تھا جو دراصل میری طرف سے حماقت کے مترادف تھا اور میں نے اس کے بر عکس اسے کیوں کہا کہ ہاں راستہ تو جانتا ہوں بتاؤں گا نہیں۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟ اور اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اور کیا ہم بڑی کائنات میں جو عالم اکبر ہے اس کے ساتھ وابستہ ہیں اور جو جو کچھ وہاں سے طے ہوتا ہے یا لکھا گیا ہے اور کیا اس لکھے کے مطابق سارے کام ہو رہے ہیں یا یہ کہ ہمارے سارے افعال انفرادی طور پر طے پاتے ہیں۔ یہ بات ان

دنوں بی بی سی کی کینٹھیں میں زیر بحث تھیں لیکن کوئی کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا تھا اور سارے الیاس کو اس کی خام خیالی اور نالائقی کی بات ہی قرار دیتے تھے۔ اس وقت شاید عالم اصغر اور عالم اکبر کا علم اس قدر آگئے نہیں بڑھا تھا۔ ہم جب بھی اس حوالے سے بحث کرتے ہیں تو اکثر بہت میں یہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ پر پورا ایمان ہو اور اگر انسان کو اپنی ذات پر اعتماد ہو یا اگر انسان کی خودی بلند ہو تو وہ کچھ کر سکتا ہے۔ پھر خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ سب تو کتابی باتیں ہیں اور شیکست کی باتیں ہیں جو ہم نے پڑھی ہوئی ہیں۔ ہم تو یہ پوچھتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم اللہ پر ویسا اعتماد کیسے لائیں جیسا کہ ہونا چاہیے اور جس طرح کے اعتماد کو ہم ذکر کرتے ہیں میرے ابا بیجی نے بتایا تھا کہ اللہ میاں ہوتے ہیں اور میں اس بات کو لے کر چلا آ رہا ہوں۔ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، فوت ہو جاؤں گا اور اس کا محض یہی صورت میرے ساتھ رہے گا۔ زندگی کے اور بھی تو بہت سارے معاملات ہیں۔ ان میں ہمارا کتابی اور شیکست بک کا علم وہ ہمیں ایک بات فیڈ کر دیتا ہے لیکن وہ ہمارا سہارا نہیں بتتا۔ آگے نہیں لے جاتا لیکن جو مرشدوں اور گروؤں کا علم ہوتا ہے وہ انفارمیشن کے علم سے مختلف ہوتا ہے۔ یہ انفارمیشن کا علم وہ ہے جو ہم اور آپ نے حاصل کیا ہے۔ یہ علم ہمیں اطلاعات کے طور پر ملتا ہے اور استاد اور طالب علم کے درمیان ہمیشہ ایک فاصلہ ہوتا ہے اور علم دور کھڑے ہو کر یا بلیک بورڈ کے پاس کھڑے ہو کر یا چاک سے لکھ کر دور بیٹھے سٹوڈنٹس کو فراہم کیا جاتا ہے اور یہ فلاںگ علم Flying Kiss کی طرح سے پہنچتا ہے اور ایسے ہی اثر انداز ہوتا ہے جیسے Flying Kiss اثر انداز ہوتی ہے (اس مثال پر معافی چاہتا ہوں) لیکن گروکا جو علم وہ اس سے مختلف ہے۔ یہ اس لیے مختلف ہے کہ گرو اور چیلے کے درمیان یا مرشد اور مرید کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا اور فاصلہ رکھا نہیں جاتا۔ قربت ہوتی ہے۔ مرشد چنانی پر بیٹھ کر مرید کو تعلیم دیتا ہے اور مرشد تعلیم حاصل کرتا ہے۔ اکثر ویشرت اس کے ہاتھ گرو کے پاؤں پر ہوتے ہیں یا زانوؤں پر ہوتے ہیں۔ اتنی قربت کے باعث وہ اپنے استاد یا مرشد کے اتنا قریب آ جاتا ہے کہ وہ اس کو بہت اچھا لگتے لگتا ہے اور اسے اپنے گرو یا مرشد سے پیار ہو جاتا ہے اور ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ وہ شاگرد شوق میں آ کے اور فرط محبت سے اپنے گرو کی "چھنگی" کھا جاتا ہے۔ گرو اس کو منع کرتا ہے اور نہ اس کو انکار کرتا ہے اور اسے کھانے دیتا ہے۔ دوسرے دن شاگرد اس کی دوسری "چھنگی" بھی کھا جاتا ہے اور آہستہ آہستہ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ سارے مرشد کو کھا جاتا ہے۔ اب مرشد اس کے پیٹ کے اندر ہے اور معدے میں اتر کر اس کی رگ رگ میں سرائیت کر گیا ہے اور مرشد کا سارا علم سارے کا سارا مرید کے بدن کے اندر خون کی صورت دوڑنے لگتا ہے۔ اس لیے آپ نے دیکھا ہو گا کہ آستانوں پر جب میلا دیا درود شریف کی محفل ہوتی ہے تو (خاص طور پر سلسہ نقشبندیہ میں کیونکہ میں نے ولایت میں اکثر ایسے ہی دیکھا ہے۔ لندن اور نیویارک میں بھی وہاں انگریز ترک بھی خوب درود شریف پڑھتے ہیں) تو وہاں کھڑے ہو کر ایک

شجرہ پڑھا جاتا ہے جس میں شاعری نہیں ہوتی۔ وہ ایسے ہی ہوتا ہے کہ
”میرے چیر اولیا کے واسطے“
حضرت نظام الدین کے واسطے

وہ اس طرح سے پڑھتے چلے جاتے ہیں اور ایک کے بعد ایک گروہ کا نام آتا چلا جاتا ہے۔ وہ اس بات کا اشارہ ہوتا ہے۔ دوسرے نے پہلے سے علم حاصل کیا اور اس طرح یہ پئی آگے چلتی جاتی ہے۔ اس طرح سے علم آگے سے آگے عطا ہوتا ہے۔ ولایت کی طرح ڈگریاں عطا نہیں ہوتیں۔ گروہ کے علم میں یہ آسانی ہوتی ہے کہ آپ کو کتابی علم کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آپ ایسی جو بھی بات جس میں مرشد یا گروہ بولتا ہے وہ کرتے ہیں تو وہی ہو گئی جو مرشد کرتا رہا ہے۔ آپ منہ میں روٹی کا ایک لقمه رکھ کے تین دن گھومتے رہیں وہ آپ کی نشوونما کا باعث نہیں بن سکے گا۔ جب تک کہ وہ آپ کے معدے میں نہ اتر جائے اور معدے میں اتر کر آپ کے خون کا حصہ نہ بن جائے اور پھر آپ کو تقویت عطا ہوتی ہے۔ میں آپ اور ہم سب مند کے اندر رہے علم کو ایک دوسرے کے اوپر اگلتے رہتے ہیں اور بھینٹتے رہتے ہیں اور پھر اس بات کی توقع کرتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ ہم کو اس سے خیر کیوں حاصل نہیں ہوتی۔ حالانکہ میں نے یہ بات بڑی اچھی کی تھی اور بڑی سوچ سمجھ کے کی تھی اور وہ بات جو گروہ آپ کو عالم اکبر سے عالم کبیر کے ساتھ داہستہ کر کے دیتا ہے اور اس کے اسرار و رموز بیان کرتا ہے جبکہ کتابی صورت میں صرف اپنا آپ پیش کر کے یا اپنے آپ کو فولڈر بنا کے پیش کیا جاتا ہے۔ میرا یہ ذاتی خیال ہے کہ واقعی جو عالم صغير ہے جو میں ہوں جو آپ ہیں یہ سارے کے سارے بنی آدم اداۓ یک جگہ کی طرح سے ہیں اور جب اقبال کا مطالعہ کریں تو پہنچتا ہے کہ انسان تو بڑی حد میں عبور کر کے کئی بار تو عالم کبیر سے بھی آگے نکل جاتا ہے۔

بات الیاس میاں سے کہاں سے کہاں چلی گئی لیکن اگر وہ واقعی عالم اصغر اور عالم اکبر میں کسی دا بستگی کو جانتے کے خواہاں ہیں تو اس کے لیے ہمارے بزرگوں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے کہ اگر آپ اپنے نفس کو جان جائیں تو پھر آپ خدا کو جان لیتے ہیں پاکتے ہیں اور جب خدا کو جان جائیں گے تو پھر آپ عالم اکبر سے بھی آگے لگز رجائیں گے۔ اپنے نفس کو جانتے کے لیے بڑی اہم بات اور فارمول یہ ہے کہ شام کے وقت آپ مغرب کی نماز کے بعد دیوار کے ساتھ ”ڈھو“ لگا کر اپنے آپ کو اور اپنے اس چھوٹے سے چوزے کو تلاش کریں جو بہت بڑے بڑے تختوں کے نیچے چھپا ہوا ہے۔ وہ چوزا ہمارا نفس ہے۔ اس کے اوپر ہم نے بڑے بڑے تختے لگائے ہوئے ہیں۔ ایک تختہ ہوتا ہے داشورا ایک ہوتا ہے پہلوان۔ ایک لیدر کے نام کا ہوتا ہے۔ ایک امیر آدمی کے نام سے ہوتا ہے تو دوسرا کسی اور نام کا۔ اس طرح ہم بچپن نے لے کر اوپر تک بہت سارے ”پھٹے“ لگاتے چلے جاتے ہیں تو جب

ہمارا چوڑا باہر بازار میں نکلتا ہے تو یہ تختے کھڑ کرنے لگتے ہیں اور سارے لوگ دیکھتے ہیں کہ جناب وہ ہیرہ جار ہا ہے۔ جناب وہ رائٹر جار ہا ہے۔ یہ اشراق صاحب ہیں جی اور دانشور ہیں۔ اگر کوئی باہم آدمی جس طرح کچھ لوگ کرتے بھی ہیں وہ ہمت سے زور لگا کر کندھا دے کر ان پھٹوں یا تختوں کے نیچے سے اپنے نفس کو نکال کر اس کی اصل شکل و صورت سے آشناً حاصل کر کے عالمِ اکبر سے وابستہ ہو کر بہت آگے نکل جاتے ہیں اور وہ جو کہا گیا ہے کہ ”جس نے اپنے نفس کو پیچان لیا اس نے اپنے رب کو پیچان لیا۔“ اور رب کو پیچان لینے کے بعد کوئی مشکل رہ ہی نہیں رہ جاتی ہے۔ دنیاوی زندگی میں سب سے مشکل کام اس تختے کو ہٹانا ہے جو ہم نے بڑی محنت سے بڑے بڑے وزنی صندوقوں میں اپنے اوپر بھمار کئے ہیں۔ اب یہ سب آپ کے سامنے ہے۔ میں تو ساری زندگی ان تختوں کو لیٹا نہیں سکا۔ میں تو ان پھٹوں تختوں سمیت ہی لحد میں جاؤں گا اور فرشتے وہ تختے دیکھ کر جیران ہوں گے کہ یہ کن چیزوں کو اپنے ساتھ لگائے پھرتا ہے جس طرح لوگ اپنی ڈگریوں کو فریم کر کے لگاتے ہیں، ہمارے بزرگ اپنے نفس کی تلاش کے کام کو تلاوت الوجود کہتے ہیں کہ اپنے وجود کی تلاوت کرو۔ الیاس میاں ابھی تک لندن میں ہی ہے لیکن ابھی تک وہاں اس کا دل نہیں لگا اور وہ ابھی تک بھی سمجھتا ہے کہ ”خواب“ کی ”؟“ ہم سب سے ناراض ہے اور وہ کہتی ہے کہ جا میں نہیں بولتی۔ بڑی مہربانی، آپ کا بہت بہت شکر یہ۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

انسانوں کا قرض

میری زندگی میں محبوب و غریب واقعات رومنا ہوتے رہتے ہیں اور ان میں سے کچھ کچھ میں آپ کی خدمت میں بھی پیش کرتا رہتا ہوں۔ اکثر لوگ مجھے راستہ روک کر پوچھتے ہیں کہ ہمارے ساتھ ایسے واقعات کیوں پیش ہیں آتے جس طرح کے آپ کے ساتھ پیش آتے ہیں تو میں ان سے عرض کرتا ہوں کہ میں تھوڑا اصول کنندہ یا (Receptive) ہوں اور جو Vibration آپ اپنے بدن یا وجود میں رکھتے ہیں وہ باہر کی واہر بیشن (ارتعاش) سے مل جاتا ہے اور پھر وہی کچھ ہونے لگتا ہے جس کی آپ کے اندر کو توقع تھی یا جس کا انتظار تھا۔ میں ہر روز صبح سوریے اپنے بستر سے ہمیشہ ایک دستک پر بیدار ہوتا ہوں اور جب میں دروازہ کھولتا ہوں اور جب میں دروازہ کھولتا ہوں تو میرے گھر کے دروازے پر ایک سر پر ٹوپ لگائے ہوئے چیک کا سوت پہنے ہوئے اور ہاتھ میں روپر پکڑے ہوئے ایک شخص کھڑا ہوتا تھا۔ وہ میرے گھر کے دروازے کو زور سے بجا تا ہے اور جب میں باہر نکل کر اس سے ملتا ہوں تو وہ مجھے ہمیشہ ایک ہی بات کہتا ہے کہ ”آپ کے ذمہ میرا قرض واجب ہے وہ قرض لوٹائیے۔“

اور میں بہت حیران ہو کر اس کی مکمل دیکھتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں کہ میں نے تو آپ سے کبھی کوئی قرض نہیں لیا لیکن وہ بہت سے کاغذات کے پلنڈے نکال کر میری طرف بڑھا رہا تا ہے اور کہتا ہے کہ ”آپ نے مجھ سے 35 بلین ڈالر قرض لیا ہے اور یہ دستخط ہیں آپ کے بڑوں کے آپ کے آبادو اجداد کے جنمبوں نے یہ قرض لے کر کہیں استعمال کیا ہے۔“

اور میں اس کی بات سن کر شرمندہ اور نہایت ”کپا“ پڑ کے اس سے کہتا ہوں کہ اس قرض بابت مجھے تو علم نہیں کہ یہ کب لیا گیا تھا؟ کیوں لیا گیا؟ اور کس جگہ پر استعمال ہوا؟ لیکن وہ کہتا ہے کہ اس قرض کی ادائیگی کا جلد بند و بست کریں ورنہ یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ خواتین و حضرات میرے ہر دن کی ابتداء کچھ اسی طرح سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد میں پھر گلیوں

بازاروں پارکوں میں گھومتا رہتا ہوں اور اس بوجھ کو اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا ہوں۔ بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کی طبیعتوں اور کندھوں پر یہ بوجھ نہیں ہو گا لیکن پتہ نہیں کیوں مجھے اس شخص کی شکل سے بھی خوف آتا ہے اور مجھے اس بات کا خوف بھی رہتا ہے کہ کل صحیح پھر وہ میرے دروازے پر آ کر اسی زور سے ڈنڈا بجائے گا اور مجھے اپنے قرض کا تقاضا کرے گا۔ میں پارکوں میں گھومتا رہتا ہوں اور وقت گزار تارہتا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں ہے کہ وہ قرض جو میرے ساتھیوں بڑوں یا پرکھوں نے لیا تھا وہ کہاں ختم ہوا؟ کیسے خرچ ہوا؟ کس مقام یا جگہ پر اس کا استعمال ہوا؟ یا اس قرض کی رقم سے کیا فائدہ اٹھایا گیا؟ اور اس دولت کا ذاتی، اجتماعی یا قومی طور پر کیا فائدہ حاصل ہوا؟ ایسی باتوں کا میری طبیعت پر بوجھ پڑتا رہتا ہے اس لیے آپ سے عموماً کہتا رہتا ہوں اور اس بوجھ کی موجودگی میں میں شرمندگی کے عالم میں کچھ اپنے آپ سے شرمساز کچھ اپنے عزیز واقارب اور کچھ اپنی آنے والی نسل اور خاص طور پر پوتوں سے شرمندہ شرمندہ سا وقت گزارتا ہوں۔ اللہ نہ کرے کہ آپ پر ایسا وقت آئے۔ مجھ پر ایک طرح سے تھوڑی سے تشفی اس طرح سے ہو جاتی ہے اور ذرا سا Respite یوں کم ہو جاتا ہے کہ جو قرض خواہ ہے اس کو بھی بڑی الجھن کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قرض خواہ بھی آسانی میں نہیں ہوتا۔ مقرض کو خیر بالکل ہی دبا ہوا ہوتا ہے لیکن قرض دینے والا بھی ایک عجیب طرح کے شکنے میں پھنسا ہوا ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے کی جان کے دشمن بننے ہوتے ہیں اور ان کے درمیان انسانی رشتہ وہ سارے کے سارے منقطع ہو جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے مجپن میں ہمارے قبیلے میں ایک شوکت صاحب تھے وہ ابتدائی قسم کا ڈائنسٹری کا امتحان پاس کر کے آئے تھے اور انہوں نے گاؤں میں کلینک کھولا تھا۔ وہ مصنوعی دانت تیار کرتے تھے اور ڈاکٹر شوکت نے گاؤں میں پہلی بار مصنوعی دانت متعارف کر دئے۔ وہاں گاؤں میں ایک سردار تھے (سردار کئی قسم کے ہوتے ہیں آپ کے ذہنوں میں تو فلمیں یاٹی وی ڈرائے دیکھ کر سرداروں کا کچھ اور ہی اٹھج بنا ہوا ہو گا۔ وہ سارے ہی ویے نہیں ہوتے۔ سارے ہی ٹی وی والے بابا سائیں نہیں ہوتے، کچھ چاچا سائیں بھی ہوتے ہیں اور خالی سائیں بھی ہوتے ہیں)۔ انہوں نے ڈاکٹر شوکت سے مصنوعی دانت لگوائے اور تمام کے تمام دات نے الگوائے اور وہ یہ مہنگا لیکن آرام دہ سودا کر کے مزے سے گھومتے پھرتے رہے لیکن رقم اداونی کی۔

ایک دن ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ سردار صاحب میرے پیے ادا کریں لیکن اس دور میں ڈیڑھ دو سو کی رقم ادا کرنا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اب ڈاکٹر صاحب قرض خواہ تھے اور گاؤں کے سردار یا بابا سائیں مقرض تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے روز صحیح سوریے رقم کا تقاضا کرتے تھے اور وہ آج کل کے وعدے پر رخالتے رہتے تھے لیکن رقم دے نہیں پاتے تھے۔ ایک روز دو پھر کے وقت ڈاکٹر شوکت صاحب غصے کے عالم میں سردار جی کے پاس آئے اور وہاں تو تو میں میں شروع ہو گئی اور وہ کہنے

لگے کہ آپ میرے پیسے ادا کریں ورنہ میں نے آپ کو یہ جو "بیڑھ" (تینی) لگایا ہے وہ واپس کر دیں۔ وہ سردار صاحب بھی علاقے کے آخر مالک تھے۔ غصہ کھانے چنانچہ تو تو میں میں کے بعد ان دونوں میں باقاعدہ ہاتھا پائی کی نوبت بھی آئی پہنچ اور اس کے بعد ڈاکٹر شوکت بڑی مایوسی کے عالم میں واپس اپنے کلینک پر پہنچ گئے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے کلینک میں مشینیں، آلات اور یہ دیکھنے کے مصنوعی دانت کیسے بنتے ہیں بڑے شوق سے چلا جاتا تھا۔ اس وقت میں فرشت ایسر میں پڑھتا تھا۔ میں وہاں بیٹھا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنا بازو میرے آگے کر کے کہا "یہ دیکھ رہے ہو بابا سائیں کے کرفوت میں اس سے اپنا قرض مانگنے گیا اور اس ظالم نے مجھے "دندی" کاٹ لی جیسے کہا کاتا تھا ہے۔"

اس نے کہا کہ دکھ کی بات یہ ہے کہ اس نے "دندی" بھی ان دانتوں سے کامی جو میں نے اسے بنایا کر دیتے تھے۔ اس طرح خواتین و حضرات قرض خواہ کا ایک اپنا دکھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کہنے لگ کر اگر میں نے اس کو دانت نہ بنا کر دیتے ہو تو وہ مجھے کات نہیں سکتا تھا۔ جب میں اپنے آپ کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ واقعہ یاد آ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں کہ میں بھی کہیں نہ کہیں کافی ضرور ہوں کیونکہ میں مقروض ہوں اور میرے سر پر 35 بلین ڈالر کا قرض ہے۔ میری طبیعت تمیک نہیں رہتی۔ یہ بوجھا اس قدر زیادہ ہے کہ میں اس کا کوئی مداوایہ نہیں کر سکتا۔ ہر وقت مجھے کسی نہ کسی ایسے الجھاؤ میں اس لیے ابھنا پڑتا ہے کہ میں اس قرض کو بھولارہوں لیکن ہمارا اپنے قرض خواہ کے ساتھ رشتہ استوار نہیں ہوتا اور قرض خواہ بھی بہانے نکال نکال کے اور ہماری غلطیاں پکڑ لپکڑ کر ہمارے کندھوں پر بوجھ اور بڑھاتا رہتا ہے تاکہ ہمیں واجب الادا قرض کا احساس رہے۔

اوکاڑہ میں ایک میلہ لگتا ہے (اب پڑھیں لگتا ہے یا نہیں کیونکہ میری جوانی کے زمانے میں لگا کرتا تھا) اور مجھے ان میلیوں ٹھیلوں سے بہت دلچسپی ہے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں پر ایک پنگھوڑا الگا ہے اور اس کا مالک آنھا آنھا نے لے کر گول گھونٹے والے پنگھوڑے سے جھولے دے رہا ہے۔ وہ پنگھوڑا آج کل کے پنگھوڑوں کی طرح بجلی یا مشین سے چلنے والا نہیں تھا بلکہ پنگھوڑے والا سے ہاتھ کے زور سے گھما تھا۔ میں وہاں بغیر کسی مقصد کے کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا تو ایک گاؤں کا آدمی وہاں آیا۔ اس کی گپڑی کھل کر گلے میں پڑی ہوئی تھی اور اس نے کھدر کی تہبند باندھی ہوئی تھی۔ وہ بھی اس پنگھوڑے کے لکڑی کے گھوڑے پر سوار "جمٹے" (جمولے) لے رہا تھا۔ جب ایک "پور" (چکر) ختم ہوا اور سارے اتر گئے تو سب بھی وہ شخص دیہیں بیٹھا رہا اور وہ اکڑوں حالت میں بڑی تکلیف اور پریشانی میں ویسے ہی گھومتا رہا جب وہ تیرے چکر کے اختتام پر بھی نہ اتر ا تو میرا اس میں بختیس بہت بڑھ گیا اور میں نے آگے بڑھ کر اسے کہا کہ آپ نے "جمٹے" لے لیے ہیں اور آپ اترتے کیوں نہیں ہیں۔ اگر آپ کو یہ چکر پسند ہیں تو پھر آپ کے چہرے پر خوشی، مزے اور بنشاشت کے اشارہ ہونے

چاہئیں جو بالکل نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ جناب بات یہ ہے کہ یہ جو پنگھوڑے والا ہے اس سے میں نے تیس روپے لینے ہیں اور میں ہفتہ بھر سے اس کے پیچھے گھوم رہا ہوں اور یہ میرا قرض نہیں دے رہا ہے اور اب میں نے اس کا بھی حل سوچا ہے کہ میں اپنے قرضے کے بدے اس کے پنگھوڑے پر ”جھوٹے“ لوں۔ اب یہ میرا 29 والی پھیر اجارہ ہا ہے اور ہر مرتبہ میں آٹھ آنے کم کرتا جاتا ہوں اور اس طرح سے میں اپنا قرضہ واپس لے رہا ہوں۔ حاضرین محترم میرے دل میں بھی ایسا خیال آتا ہے کہ کاش میرا بھی کوئی اس طرح سے سودا طے ہو جائے اور میں نے اپنے قرض خواہ کے جو 35 بلین ڈال دینے ہیں تو میں اس کو بھی کسی گھوڑے پر بٹھا کرایے چکر دوں جو ذہنی جسمانی نفیاتی انداز کے چکر ہوں اور وہ 20 ویں پھیرے پر ہی کہہ دے کہ میں تمہیں قرض معاف کرتا ہوں اور تم میری جان چھوڑو لیکن میرا قرض خواہ اس دیہاتی جیسا نہیں ہے۔ وہ دیہاتی تو بڑا سیدھا، بھلا سا اور نیک آدمی تھا اس کا غصہ ایک چھوٹی سی پڑی پر چل رہا تھا جبکہ میرے قرض خواہ کا غصہ میری ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس نے میری زندگانی کو اپنے شکنخ میں لے رکھا ہے اور وہ مجھے چھوڑتا نہیں ہے۔ آغا حشر کا جب طوٹی بولتا تھا تو فلم والے ان کے پیچھے پیچھے بھاگے پھرتے تھے کہ آپ فلم کے لیے کچھ لکھیں لیکن وہ اپنی تھیسٹر کی زندگی اور اس تصور میں اتنے مگن تھے کہ وہ فلم والوں کو گھاس نہیں ڈالتے تھے۔ مختار بیگم بتاتی ہیں کہ انہیں کپڑے سلوانے اور پہننے کا بڑا شوق تھا۔ ممیں کا ایک بڑا معروف درزی تھا۔ آغا حشر نے اپنا سوت سننے کے لیے اسے دیا اور اسے کہا کہ آپ مجھے ایک تاریخ بتا دیں تاکہ میں اپنا سوت آ کر لے جاؤں کیونکہ وقت کی کمی کے باعث میں بار بار نہیں آپاؤں گا۔ انہیں تاریخ بتا دی گئی اور جب مقررہ تاریخ پر وہ اپنا سوت لینے آئے تو درزی نے کہا کہ جی میں بھی تک سوت کی کنگن نہیں کر سکا۔ اس پر آغا صاحب بہت ناراض ہوئے اور واپس آگئے۔ اس درزی نے انہیں عرض کی میں آئندہ ہفتہ کو آپ کا سوت تیار کر کے رکھوں گا۔ آغا صاحب ہفتے کو گئے تو بھی سوت تیار نہ تھا۔ درزی نے کہا کہ میر آپ تو اور کوآ جائیے گا میں پھٹک جائیں گے دن بھی آپ کی خاطر دکان کھول لوں گا۔ جب وہ سندے کو گئے تو تب بھی سوت تیار نہیں تھا۔ اس طرح وہ آتے اور جاتے رہے۔ جب آغا حشر نے ٹیکر ماسٹر کی دکان پر جانا چھوڑ دیا تو وہ درزی سوت کی کراور اسے پیک کر کے خدمت میں حاضر ہو گیا۔ آغا صاحب نے کہا کہ تمہارے پیسے تمہیں پیٹھ جائیں گے اور اس طرح سے مقرض اور قرض خواہ کا رشتہ شروع ہو گیا۔ ایک ہفتے کے بعد درزی بل مانگنے آیا تو انہوں نے کہا کہ آپ فکر نہ کریں آپ کا بل آپ کوبل جائے گا۔ اب آغا صاحب کو درزی پر فتحی وقت ضائع کرنے کا غصہ تھا اور وہ بدلمہ لے رہے تھے۔ درزی نے کوئی چار پانچ چکر لگائے۔ مختار بیگم بتاتی ہیں کہ وہ درزی بے چارہ ایک دن رونے والا ہو گیا اور کہنے لگا کہ آغا صاحب آپ ایسا کریں کہ مجھے ایک آخری وقت یا تاریخ بتا دیں میں آپ کو درمیان میں شنگ نہیں کروں گا۔ آغا صاحب نے کہا کہ

آپ ایسا کریں کہ ہر جمارات صبح 10 بجے آ جائیں۔ وہ بے چارہ روتا پیٹتا چلا گیا۔ یہ واقعہ بتانے کا میرا مقصد یہ ہے کہ خالی متروض پر ہی بو جھنپس ہوتا قرض خواہ بھی جال میں پھنسا ہوتا ہے۔

ایک بڑا پریشان آدمی تھا وہ راتوں کو جا گتا تھا اور چینیں مار مار کر روتا تھا۔ وہ ایک ڈاکٹر کے پاس آیا تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ آپ اپنے ڈپریشن کی اصل وجہ بیان کریں؟ آپ کیوں اس قدر پریشان ہیں۔ اس نے بتایا کہ میرے ذمہ ایک لاکھ روپے قرض واجب الادا ہے جو مجھے ادا کرنا ہے لیکن میں اس کی ادائیگی کرنیں سکتا۔ راتوں کو میں اس فکر سے جا گتا ہوں اور دن کو اس قرض کو چکانے کی تدبیریں کرتا رہتا ہوں۔ ڈاکٹر نے کہا کہ وہ کیجئے آپ کے ذمے قرض ایک کاغذ کے ٹکڑے پر ہی لکھا ہوا ہے نا! اس کو اہمیت نہ دیں، دفع کریں جائیں اس کاغذ کے ٹکڑے کو بچاڑ دیں۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بڑی مہربانی اور وہ چلا گیا۔ وہاں ایک اور شخص بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب یہ جو شخص پریشان آیا تھا اور خوش خوش گیا ہے آپ نے اسے کیا کہا ہے تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ میں نے اسے قرض کے معاملہ سے والا کاغذ چھاڑنے کا مشورہ دیا ہے۔ یہ سن کر وہ شخص رونے دھونے لگا اور کہنے لگا ڈاکٹر صاحب اس شخص نے مجھ سے ہی ایک لاکھ روپے قرض لے رکھا ہے۔ عید کے روز بھی میں یہیں کہیں ایک غیر معروف کو نے میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بابا آ گیا، وہ پرانی وضع کا نیم فقیر یا نیم صوفی قسم کا تھا۔ وہ میرے پاس مخصوص قسم کے شعری جملے جو ہم بچپن میں سنا کرتے تھے۔

میرے پاس ایک پانچ روپے کا نوٹ تھا وہ میں نے اس کو دیا کیونکہ میرے بچے مجھے کہا کرتے ہیں کہا بواب آپ کی فقیر کو پانچ روپے سے کم نہ دیجیے گا کیونکہ وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔ اس شخص نے خوش ہو کے وہ نوٹ لے لیا اور کہنے لگا تو بڑا پریشان سا ہے اور یہاں اکیلا بیٹھا ہوا ہے کیا بات ہے؟

میں نے کہا کہ مجھ پر بڑا قرض ہے اور میں کوشش کرتا ہوں کہ اس سے کسی طرح باہر نکل جاؤں۔ بھی میری پریشانی کا باعث ہے۔ اس نے ہلکا سا تقدیر کیا اور کہا، "شکر کر اللہ کا اور خوش ہو کہ تیرے اوپر کاغذوں روپوں اور ڈالروں کا قرض ہے اللہ کے سامنے بجدہ رہیز ہو اور ہر وقت جھک کر دہما کر کہ تیرے اوپر انسانوں کا قرض نہیں ہے، تم نے کسی کو انسان نہیں لوٹا نے۔"

میں نے کہا بابا میں تیری بات نہیں سمجھا۔ کہنے لگا شکر کرتے تو تو اسے کیسے لوٹاتا اور تیرے ملک والے بھی اللہ کا شکر ادا کریں کہ ان کے اوپر جانوں کا بوجھ ہوتا تو تو اسے کیسے لوٹاتا اور تیرے ملک والے ایک شخص کو نا حق قتل کیا تو گویا تم نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ الحمد للہ میرے اوپر ایسا بوجھ نہیں ہے۔ اس نے کہا کہ تم اپنے پڑوسیوں کو دیکھو 73 ہزار بے گناہ کشیریوں کے قتل کا بوجھ

(اب یہ تعداد 75 ہزار سے بھی زائد ہو چکی ہے) ان کی گردن پر ہے کہ وہ کیسے لوٹا سکیں گے۔ لتنی بھی کوشش کر لیں؛ جدھر بھی مرضی بھاگ لیں وہ 73 ہزار آدمی جن کے وہ مقرر ہیں وہ کیسے آدمی لوٹا سکیں گے۔ تمہارا تو روپوں کا قرض ہے کسی نہ کسی صورت لوٹایا جائے گا۔ پھر ان کو دیکھو انہوں نے ایک لاکھ پندرہ ہزار سکھوں کو Blue Star Process میں قتل کیا۔ وہ ان کی ماڈل کو اور بہنوں کو ان کے بیٹے اور بھائی کیسے لوٹا سکیں گے؟ ان سے اگر وہ مانگنے والا (خدا تعالیٰ) آ گیا کہ میرے انسان واپس کرو تو کہاں سے دیں گے۔ وہ کہنے لگا تمہیں پتہ ہے میں تو جانتا نہیں کہ ”اسکھوں دور سند راں وجہ کوئی پنڈ اسے۔“ کہنے لگا وہاں پر دیکھوں پر ہم پھینک کر لاکھوں انسانوں کو ہلاک کر دیا۔ میں نے کہا کہ بابا ان شہروں کو ”ہیر و شیما“ اور ”نا گا ساکی“ کہتے ہیں۔ اب وہ کس طرح لاکھوں بندے لوٹا سکیں گے۔ وہ بابا ”پھوسی“ مار کے چلتا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ”میں نے سنا ہے کہ جب امریکہ آباد ہوا تو وہاں پر ایک قوم آباد تھی جسے Red Indian کہتے تھے۔ وہ قوم اب ساری کی ساری ختم ہو گئی ہے اور اب اگر کوئی کھاتے والا اپنار جستر لے کر آ گیا اور اس نے موجودہ قوم جو بڑی طاقت اور سیافی اور ماہر قوم ہے اس سے کہا کہ مجھے وہ آدمی واپس کرو تم نے انہیں ناخن مارا ہے اور کیوں مارا ہے؟ جواب دو اور بندے واپس کرو تو وہ کیا کریں گے؟ مجھے کہنے کا تم کونے میں لگ کے پریشان ہیٹھے ہو جالا نکلے تمہیں خوش ہونا چاہیے اور تمہاری قوم کے لوگوں کو خوش ہونا چاہیے کہ چلو تم قتل کر دیے گئے لیکن قاتلوں میں سے نہیں ہو۔ اس نے کہا کہ میں تو خوشی سے ناچتا ہوں کہ الحمد للہ مسلمان امہ پر یہ بوجہ نہیں ہے۔ مسلمان یہوقوف اور مقتول ہیں، قاتل نہیں ہیں۔ یہ پھر لے کر مد مقابل کو مارتے ہیں اور پھر وہوں سے ان کے (اسرائیل) میتوں کو نشانہ بناتے ہیں اور ان کے نیچے کلے جاتے ہیں۔ جان سے جاتے ہیں لیکن ان ظالموں میں سے نہیں ہیں جو انسانوں کا ناخن خون کرتے ہیں اور پوری کائنات اور معاشرے کو قتل کر دیتے ہیں۔ اس کی بات سن کر میں خوشی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس روز سے اب تک میں کافی خوش ہوں کہ الحمد للہ میری ذات کے اوپر اور میری قوم پر خون یا آدمی لوٹانے کا بوجہ نہیں ہے اور انشاء اللہ وہ وقت بھی بہت قریب ہے کہ ہم ڈھیر سارا قرضہ لوٹا سکیں گے اور شکر ہے ہمیں زندہ جیتے جاگتے انسان واپس نہیں کرنے ہیں۔ انسانوں کو لوٹانے کے قرض دار ایسے بھی ہیں جو بھی اڑا نہیں بھر بھر کر سکا۔ لیتڈ پر جو نہ پیسے والا ہے اور نہ سی ان کا کوئی قصور تھا ان پر بمباری کرتے رہے۔ ان سے تو ہمارا قرض اچھا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔

بabe کی تلاش

بڑے برسوں کے بعد کچھ روز پہلے کی بات ہے کہ میں سینما دیکھنے گیا۔ کانچ کے زمانے میں ہم ”منڈوا“ (سینما) دیکھنے جایا کرتے تھے۔ تب بھی اس وقت ہی جاتے تھے جب Matinee Show ہوتا تھا اور اتنے سال کے بعد جب دوبارہ سینما جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بھی یہ مٹھی شو ہی تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی کہ پروگراموں میں ذکر کر چکا ہوں کہ لوگ مجھ سے اس پروگرام کی مناسبت ہی تھا۔ کسی بابے کا پتہ پوچھتے ہیں یا کہتے ہیں کہ ہم روحاں کی منازل تلاش کر سکیں یا ہمیں کوئی ایسا طریقہ بتائیں کہ ہم باطن کا پتہ کر سکیں اور اس منزل پر پہنچیں جہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں کہا گیا ہے اور میں ان سے اکثر یہی عرض کیا کرتا ہوں کہ بابوں کی دنیا وہ ایسے نہیں ہے کہ جس طرح وہ کسی ماہر ڈاکٹر کا پتہ ہو اور آپ آرام سے کسی ماہر طبیب یا سپیشلٹس کا پتہ اور فون نمبر حاصل کر لیں یا آپ کا نامی گرامی وکیل جو کبھی ہارتا ہی نہ ہو اس کے جیسا کہ پتہ فون یا فیکس نمبر لے لیں بلکہ یہ بابے تو آپ کے اندر سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جب آپ تہیہ کر لیتے ہیں اور فیصلہ کرتے ہیں بالکل ایسا ہی فیصلہ جس طرح آپ اور آپ کے گھروالے کرتے ہیں کہ آپ نے بی۔ اے کرنا ہے۔ جس طرح بی۔ اے کرنے کے لیے چودہ برس کا عرصہ درکار ہوتا ہے اسی طرح باطن کے سفر کے لیے بھی آپ کو اپنی ذات کے لیے ویسا ہی فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ دیکھئے....!

انسان جو ہے وہ دوسرے جانداروں کے مقابلے میں ایک مختلف جاندار ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر جانداروں میں بھی جان ہوتی ہے اور انسان میں بھی جان ہے اور انسان بھی دوسرے جانداروں کی طرح حرکت کرتا ہے، بولتا اور چلتا پھرتا ہے لیکن ان دونوں میں ایک بڑا واضح فرق ہے کہ انسان میں روح ہوتی ہے اور جانور میں روح نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر چار بکرے کھڑے ہیں ان میں سے ایک کو ذبح کر دیں۔ اس کی کھال اتاریں اور باقی تین کو چارہ ڈال دیں تو وہ بڑے شوق سے چارہ کھانے لگ جائیں گے اور ان کی توجہ نہیں ہوگی کہ ان کا ساتھی تنہ دار پر چڑھ چکا ہے۔ انہیں کوئی

ملال یاد کرنے میں ہوگا۔ دوسری طرف ایک انسان کو آپ قتل کر کے پھینک دیں یا وہ خدا نخواستہ قتل کیے جانے کے بعد کہیں پڑا ہو اور آپ وہاں لوگوں سے کہیں کہ آپ سکون سے بینچ کر سکون سے کھانا کھائیں یا خوش رہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ میں جہاں تک جان سکا ہوں وہ یہ ہے کہ روح اور جان میں ایک تبی فرق ہے کہ جان ہر جاندار کا ایک چھوٹے یوں پر ساتھ دیتی ہے لیکن جور و جعل عطا کی گئی ہے وہ صرف انسان کو دی گئی ہے۔ ہر انسان کے اندر ایک ایسی چپ لگادی گئی ہے اور پہلے سے پروگرامنگ کردی گئی ہے جس طرح آپ نے اپنے جسم اور اپنی جان کو پروش کی آنکھ سے دیکھتا ہے بالکل اسی طرح آپ نے اپنی روح کو بھی ان بلند یوں پر لے جاتا ہے جن بلند یوں سے یہ اتر کر آپ کے وجود کے ساتھ پوست ہو جائے اگر آپ یہ پوچھتے رہیں گے کہ جناب مجھے بتائیے کہ ہم یہ کیسے کریں؟ تو آپ کی یہ بات محض کتابی اور اکتسابی سی بات ہی ہوگی۔ آپ ایک تجسس کے طور پر ہی پوچھیں گے کہ کیا ایسے بھی ہوتا ہے؟ اور فرض کریں کہ اگر آپ کو بتا بھی دیا جائے کہ فلاں صاحب بڑی روشنی منازل طے کرچکے ہیں اور ان کے پاس سمجھانے اور بتانے کے لیے کچھ ہے اور اس کے بعد آپ ارادہ اور تہبیہ بھی کریں کہ ان سے کچھ حاصل کریں تو آپ یوں ان سے کچھ حاصل نہ کر سکیں گے کہ آپ کی ایک آنکھ اور سارا وجود اور اس کے ساتھ آپ کا نصف دماغ اس بات پر متین ہو جائے گا کہ میں اس صاحب کی کوئی ایسی چوری پکڑوں جس پر میں تقدیم کر سکوں اور لوگوں کو بتا سکوں کہ یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ عام طور پر جتنے بھی لوگ آتے ہیں وہ خاص طور پر ایسی ہی نگاہ رکھتے ہیں اور عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ ہم اس بات پر زیادہ نظر رکھتے ہیں کہ ایک آدمی سے بابے نے ہاتھ ملایا اور اس آدمی نے ہاتھ ملاتے ہوئے بابے کو پاخ روپے کا ایک نوٹ دیا اور انہوں نے اسے لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا۔ یہاں آ کر آپ کی سوچتے، مجھے اور اختیار کرنے کی ساری صلاحیتیں مسدود ہو جاتی ہیں کیونکہ اب آپ نے اس شخص کی چوری پکڑ لی اور اس آدمی کو اپنے سے بدر تر خیال کیا۔ میں آج سارے پروگرام میں اسی موضوع پر ہی فوکس رکھوں گا کیونکہ مجھے سے عام طور پر یہ پوچھا جاتا ہے کہ آپ ”بابو“ کی باتیں کیوں کرتے ہیں۔ باتیں اس لیے کرتا ہوں کہ یہ ہماری روح کو بلندی عطا کرنے کے لیے ہماری مدد کرتے ہیں اور ہماری روح کو ارتقع اور بلندی اسی صورت میں عطا ہوتی ہے کہ ہم دوسرے جانداروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو یہ ثابت کریں کہ ہم حرکت، سوچ اور کھانے پینے میں Movement اور Reproduction میں تو ان کے ساتھی ہیں لیکن ہم ان سے آزاد ہیں اور ان معنوں میں آزاد ہیں کہ ”اگر ہم چاہیں تو کریں اور چاہیں تو نہ کریں۔“ مجھیں جب کھیت میں سے گزرتی ہے تو وہ آزاد نہیں ہوتی وہ ہر حالت میں چارہ کھانے یا ادھر ادھر منہ مارنے پر مجبور ہوتی ہے۔ جانور کی نسبت ایک آدمی چاہیں افراد کو یا پاخ سو آدمیوں کو کھانے کی دعوت پر بلا سکتا ہے کھانا کھلا سکتا ہے اور خود الگ سے کھرا

ہو سکتا ہے کہ میرا روزہ ہے میں نہیں کھاؤں گا۔ اگر وہ روزے سے نہ بھی ہو تو بھی تو وہ اگر ضروری خیال کرے تو کھاپی لے اگر نہ چاہے تو کھائے۔ اس کی Animal Drive جو ہے وہ اس کی Instinctive Drive ہے اور وہ اس پر کنٹرول کرتا ہے اور یہ اس کی روح ہے جو اسے کنٹرول کی طاقت اور بلندی عطا کرتی ہے۔ اس کے لیے اگر آپ مجھ سے بار بار یہ اصرار کریں کہ آپ کو وہ راست بتایا جائے جس کی معرفت ایسے آدمی سے آپ ملاقات کر سکیں جو آپ کی روح کی سر بلندی میں آپ کی مدد کرے تو اس حوالے سے میں یہ عرض کروں گا کہ اس کے لیے آپ کو آنکھ کھول کر رکھنی ہوگی اور منہ بند کر کے رکھنا ہو گا۔ ایک مرتبہ سمندر کے اندر ایک چھوٹی مچھلی نے بڑی مچھلی کو روک کر کہا کہ ”آپ مجھے بتاؤ کہ سمندر کہاں ہے میں بڑی پریشان پھرتی ہوں، مجھے سمندر نہیں ملتا“ میں نے سمندر کا لفظ سن رکھا ہے۔“

اس پر بڑی مچھلی نے اس سے مخاطب ہو کر کہا کہ جہاں ہم دونوں کھڑی ہیں یہ ہی سمندر ہے۔ چھوٹی مچھلی بولی واہ آپ آپ نے بھی وہی بات کی جو سارے لوگ کرتے ہیں۔ یہ تو پرانی ہے سمندر نہیں ہے اور وہ یہ کہہ کر دہاں سے چل پڑی اسے بڑی مچھلی آوازیں دیتی رہی کہ رک جاؤ۔ میری پوری بات سن کے جاؤ اور یہ بات سننی تھمارے لیے بہت ضروری ہے کہ اگر تم سمندر کی کھونج میں نکلو گی تو تمہیں سمندر نہیں ملے گا لیکن اگر آنکھیں اور اتنے کان کھول کر مشاہدہ کرو گی تو پھر تمہیں وہ سمندر ضرور نظر آئے گا جس کی تمہیں تلاش ہے، لیکن بڑی مچھلی کی بات ختم ہونے سے قبل چھوٹی مچھلی بڑی دور جا چکی تھی اور اس نے میری طرح سے اپنی بڑی آپا کی بات نہیں سنی۔

32 سال کے بعد بلکہ اس سے بھی زیادہ سالوں کے بعد میں ایک بار پھر چند روز قبل سینما دیکھنے گیا۔ کڑی وھوپ تھی لیکن جب میں سینما کے اندر داخل ہوا تو مجھے اندر اندر ہمراں نظر آیا جیسا کہ باہر سے اچانک اندر جائیں تو آنکھیں چند صیائی ہوئی ہوتی ہیں۔ ہال میں میری سیٹ قریب ہی تھی اور میں بیٹھ گیا۔ اس کے بعد سکرین چلنے بے قبل ایک اور صاحب ڈاکس پر آئے جنہوں نے روشنی کے ایک ہالے کے اندر اس فلم کا تعارف کرایا کہ اس فلم کو بنانے کا مقصد کیا تھا اور اس کس لیے چلایا گیا؟ اور کس لیے ہم نے یہاں بطور خاص پڑھے لکھے لوگوں کو دعوت دی ہے۔ ان صاحب کو روشنی کے ہالے میں دیکھ کر مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ اگر کوئی شخص کسی طرح کسی روشنی کے ہالے میں آجائے تو وہ خود بخود جا گر ہونے لگتا ہے اس کو یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ دیکھو اس وقت میں اپنا آپ ظاہر کر رہا ہوں۔ فلم شروع ہوئی اور ہال میں بالکل اندر ہمراں اچھا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہال کا دروازہ کھلا اور ایک اور تماشاٹی اندر داخل ہوا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ مجھے نظر تو نہیں آیا کیونکہ دروازہ بند ہو گیا تھا۔ جب دروازہ کھلا تھا تو اندر آنے والے شخص کا وجود مجھے نظر آیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ آدمی تو کسی صورت میں بھی اپنی سیٹ تک نہیں پہنچ سکتا لیکن تھوڑی ہی دیر میں ایک ثارچ چلی اور اس ثارچ

زاویہ را نے اس شخص کے پاؤں کے اوپر ایک چھوٹا سا ہالہ بنایا اور اس ہالے کی مدد سے وہ شخص چلتا گیا، تاریخ والا اس کے پیچھے پیچھے آتا گیا اور جہاں اس شخص کی سیٹ تھی اس کو بھاولیا گیا۔ اس کے بعد میں نے پھر فلم تو کم دیکھی۔ یہی سوچتارہا کہ اگر کسی شخص کی زندگی میں ایسا ہالہ آئے اور کوئی گائیڈ کرنے والا اسے میرا ہو تو پھر وہ شخص یقیناً اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے لیے تکث خریدنا پڑتا ہے، سینما کارخ کرنا پڑتا ہے اور فلم کے لگنے کے اوقات کا علم ہوتا چاہیے۔ دروازہ کھلانا چاہیے پھر تاریخ والا خود بخود آ کر مدد کرتا ہے اور آپ کو مدد کے لیے کسی کو پکارنے یا آواز دینے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی ہے۔ آپ جب آوازیں دیتے ہیں، جیج و پکار کرتے ہیں اور دنیاداری کے معاملات کے اندر رہتے ہوئے آہ و بکار تے ہیں تو پھر وہ تاریخ والا نہیں آتا۔ اس طرح آپ بُس پتے اکٹھے کرتے رہتے ہیں اور ٹیلفون نمبر جمع کرتے رہتے ہیں لیکن وہ بات جو بڑی مچھلی نے چھوٹی مچھلی سے کہی تھی کہ آئا چیس کھول کر رکھو اور مشاہد بن کر رہوتا کہ تم پر سارے بھید آشکار ہوں اور روشن ہوں۔ اس مادی زندگی میں جس میں بار بار آپ کے دوست و احباب عزیز واقارب مادہ پرستی کی بات کرتے ہیں کہ جی پاکستان میں لوگ بہت مادہ پرست ہو گئے ہیں، لوگوں میں پہلی سی محبت پیار اور یگانگت نہیں رہی۔ مادہ پرستی کا کھیل صرف پاکستان میں ہی نہیں چلا ہے بلکہ ساری کی ساری دنیا اس وقت مادہ پرستی کے چکر میں ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ بڑی بات نہیں ہے، میں ایک ایسے علاقے میں رہا ہوں اور اسی جگہ جنمبا پلا ہوں جہاں سانپ بہت ہوتے تھے اور ملک کے سانپ بکثرت پائے جاتے تھے۔ ہم پہنچنے میں جنگل میں جا کر یا ویران اور گرے پڑے گھروں میں سانپوں کی کیپیخیاں اکٹھی کرتے تھے۔ کیا آپ کو سانپوں کی کیپیخیوں کا پہنچا ہے؟ سانپ ایک خاص وقت پر سو جاتا ہے اور اس کے جسم کے اوپر ایک پلاسٹک کے شاپر بیگ کی طرح کی باریک کھال یا کپیخی چڑھاتی ہے اور اس کپیخی پر اس سانپ کے سے نقش و نگار منتقل ہو جاتے ہیں اور سانپ ایک خاص عرصے کے لیے اس کپیخی کے اندر رہ کر Hibernate کرتا ہے تب نہ وہ سانس لیتا ہے نہ کھانا کھتا ہے بلکہ مردہ یا سدھ بدھ ہو کے پڑا رہتا ہے۔ میں اس Economic World میں جب بھی اس کو (کپیخی) دیکھتا ہوں تو میں غور کرتا ہوں کہ ہم سانپ میں جو Economics یا پیسے کی دوڑ کے اندر اپنے بدن پر کپیخی چڑھا کے خاموش پڑے ہوئے ہیں۔ ہم بے جس و حرکت ہیں اور ہمارا کوئی بس نہیں چلا۔ ہمیں Consumer Goods بنانے والی کمپنیاں جس طرح چاہتی ہیں استعمال کرتی ہیں اور کرتی جلی آرہی ہیں۔ خواتین و حضرات جس بات سے آپ خوفزدہ ہیں زیادہ دیر تک چل نہیں سکے گی کیونکہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب سانپ کو اپنی Growth کے لیے اس کپیخی کے اندر سے نکلا پڑتا ہے اور وہ کمال سے اور بڑی عجیب و غریب حرکات و مکنات کر کے اپنے بدن کو پرانی ثوٹی دیواروں سے رگڑ رگڑ اور گھا گھس کے کنج (کپیخی) سے باہر نکلتا ہے اور اپنی وہ کپیخی پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔ جب وہ باہر نکلتا

ہے تو وہ زندگی میں اور زندگی کے دوسرے جانوروں کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ سانپ جس طرح اپنی نشوونما کے لیے ایک خاص وقت پر اس خول میں سے نکلتا ہے اور باہر آ کر زندگی میں شامل ہوتا ہے اور نئے اندازو ڈھنگ اور نئے سرے سے سانس لیتا ہے اسی طرح ہی انسانوں کی یہ ساری بستیاں جو مجموعی طور پر اس وقت اپنی Economics کی کیفیتی کے اندر لپی پڑی ہیں۔ ان کو اپنی گروچھ کے لیے باہر نکلنا ہی پڑے گا اور یہ نکل کے ہی رہیں گی کیونکہ یہ معاشرہ یہ دنیا اور یہ خدا کی اور جتنا اس کام کے لیے نہیں بنی جس میں اس کو داخل کر دیا گیا ہے یا ایک مخصوص کیفیتی چڑھادی گئی ہے۔ یہ بستیاں اپنی روحاں نی نشوونما کے لیے بنی ہیں اور ان بستیوں کے باسیوں کو اپنی روحاں نیت کا مظاہرہ کرتا ہے اور اپنے باطن کے سفر میں آگے نکلتا ہے۔ باطن کے اس سفر میں آپ شور و غونما کر کے کسی کوششیوں کر کے کسی کو Message بھیج کر یا کسی کو اپنے کمپیوٹر کے ذریعے ہوشیار کرنے کو کوئی پیغام دے سکتے ہیں اور نہیں لے سکتے ہیں۔ یہ خاموشی کی ایک دنیا ہے اس میں اگر آپ کبھی داخل ہو سکتے ہیں تو پھر ہی آپ اس کا مزہ لے سکتے ہیں۔ مت پوچھیں کہ ہمیں کسی بابا کا پتہ بتائیں آپ خود بابا ہیں۔ جب آپ کو دیوار سے ڈھون (لیک) لگا کر آرام سے بیٹھتا آگیا اور دنیا کی سب سے بڑی عبادت یعنی آپ خاموشی میں داخل ہو گئے تو آپ کے اوپر انوار و برکات کی بارش بھی ہونے لگئی اور انواع و اقسام کا رزق آپ کا مقدر بتا چلا جائے گا۔

میں جب اٹلی سے لوٹا تو میں بھری جہاز "موتو ناوے و کتو ری" کے ذریعے وطن آیا۔ یہ میرا آبی جہاز پر سفر کرنے کا پہلا تجربہ تھا۔ جب نیپال کی بندگاہ پر جہاز مغرب کے وقت آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا اور شہر کی روشنیاں دور ہونے لگیں تو وہ نہایت سُست رفتاری کے ساتھ گھرے پانیوں کی طرف چل رہا تھا اور عشاء کے وقت تک شہر ہماری نظروں سے بالکل اوچھل ہو گیا اور ہم آ کر کھانے کی میز پر بیٹھ گئے اور اس کے بعد ہم اپنے اپنے کیمبوں میں آ کر لیٹ گئے۔ صبح اٹھنے تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ جہاز کس رخ جا رہا ہے اسے کون چلا رہا ہے اور یہ کیسے چل رہا ہے۔ ہم جب ناشت کر ہی رہے تھے تو پیکر پر ایک آواز گونجی وہ نہایت میٹھی سی Italian انداز میں انگریزی بولنے کی آواز تھی جو کہہ رہی تھی کہ "میں کپتان بول رہا ہوں۔"

ہم سب نے یہ سن کر اپنا کھانا دیں چھوڑ دیا اور کپتان کی آواز آتی رہی اور وہ ہمیں بتاتا رہا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور کس طرح سے یہ گیارہ دن کا سفر اس کے ساتھ گزارنا ہے۔ نہ ہمیں کپتان کبھی نظر آیا نہ اس سے تعارف ہوا نہ ملاقات ہوئی اور نہ ہی اس سے ملنے کے موقع میسر آئے۔ ایک صرف اس کی آواز ہی تھی جو آتی تھی اور ہمیں زندگی کے ایک نئے مرحلے میں داخل کر جاتی تھی۔ میں نے اس وقت جب بہت طوفانی سمندر سے جہاز گزر رہا تھا تو میں نے سوچا کہ ایک اور بھی کشتی ہے جس

کو ہم دنیا کہہ سکتے ہیں اور اس کشٹی کا ایک نگہبان اور کپتان بھی ہے جس کی آواز ہم تک پہنچتی رہتی ہے جو ہمیں ہدایات دیتا رہتا ہے اور احکام صادر کرتا رہتا ہے وہ ہمیں دکھانی نہیں دیتا، ہمیں ملتا نہیں ہے اور نہ ہی ملنے کی امید ہوتی ہے اور ہم اس کے مطابق چلتے رہتے ہیں اور جو اس کے احکام مانے والے ہوتے ہیں انہیں کسی بابے یا کسی Instructions کے سفر کو اختیار کرتا ہے اس کو بنداندھیرے کر کے میں خاموشی اور تہائی کا سفر ہے جو بھی اس Silence کے سفر کو اختیار کرتا ہے اس کو بنداندھیرے کر کے میں ایک دروازہ ضرور نظر آتا ہے جس میں وہ روحانی طور پر داخل ہو سکتا ہے۔ آپ کے پاس اور ہمارے پاس روح کا وہ جلوہ موجود ہے اور وہ Chip جس کا میں نے پہلے ذکر کیا ہے وہ کسی اور کے Egnite کرنے سے نہیں چلے گا۔ وہ آپ ہی کی کوشش اور جدوجہد سے چلے گا لیکن یہ کوشش اور Struggle اس سے مختلف ہے جو آپ اکنامک ورلڈ میں کرتے ہیں یا جو آپ Competition میں کرتے ہیں اور جس طرح سے ہمیں حکم ہے جس طرح اسلام نے رخ مقرر کیا ہے کہ آپ نے اس رخ کھڑے ہونا ہے اور خدا نے تو فرمایا ہے کہ میں ہر جگہ موجود ہوں لیکن ہمیں حکم دیا کہ تم خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے ساری کوشش شروع کرو۔ ہم نے سب سے پہلے رخ کو متعین کرنا ہے۔ اگر آپ روحانیت کی دنیا میں داخل ہونے کے آزو مند ہیں تو سب سے پہلے آپ کو اپنی ذات کو یہ سمجھانا پڑے گا کہ ہم ایک رخ لے کر اس طرف بڑھیں۔ پہلے دونوں ایک جغرافیہ کے دو سالے میں میں نے ایک مضمون دیکھا جس میں لکھا تھا کہ بہت دیر پہلے لوگوں نے ایک چھوٹے سے جزیرے پر ایک خوبصورت عبادت گاہ بنائی اور اس میں دنیا کی ہر قسم کی دھات کی گھنٹیاں لگائیں اور وہ گھنٹیاں ہوا کے چلنے سے بجتی تھیں۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ وہ جزیرہ آہستہ آہستہ زیر آب آگیا اور وہ مندر یا عبادت گاہ پانی کی آغوش میں آ کر ختم ہو گئی۔ کچھ پرانے لوگ بتاتے ہیں کہ بھی بھی وہاں پانی کے اندر سے گھنٹیوں کی آوازیں آتی ہیں اور جو سننے والے کان رکھتے ہیں انہیں وہ آواز بھی صبح شام آتی ہے لیکن ان سننے والوں کا کہنا ہے کہ آپ کو گھنٹیوں کی آواز سننے کے لیے مندر کی آواز سے ہم آہنگ ہونا پڑے گا۔ اس طرح خدا سے بات کرنے اور اس کو سننے کے لیے اس کی مخلوق کے درشن کرنا ہوں گے جو لوگ مخلوق خدا کے متعلق غور کرتے ہیں اور اس کے ہو جاتے ہیں اور مخلوق خدا کی خدمت کا راستہ اختیار کر لیتے ہیں یا وہ لوگوں سے کیڑے نکالنے بند کر دیتے ہیں ان کو کسی بابے، کسی رہنمایا ہادی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ڈاٹریکٹ اس آواز میں پہنچ جاتے ہیں جو مندر کے نیچے چھپے ہوئے عبادت کدے کو ہر وقت نہ مودار ہوتا دیکھتے رہتے ہیں۔ خدا آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”محاورے“

ایسے مقام پر بھیج کر اور ایک ایسی پر فضا جگہ پر آجائے کے بعد مجھے اپنے لڑکپن کا زمانہ یاد آتا ہے جب ہم مکول میں پڑھتے تھے۔ اس وقت ہمارے ماسٹر صدیق صاحب ہمیں اکثر اپنے ساتھ کلاس سے اٹھا کر ایسے باغوں اور گلستانوں میں لے جاتے تھے جہاں قدرت کے نظارے کتابی و نصابی علوم سے بڑھ کر ہوتے تھے اور جو ہماری زندگیوں کے قریب تر ہوا کرتے تھے اور ماسٹر صدیق صاحب بات کو سمجھانے اور بتانے کا بہترین جانتے تھے اور اس قدرت پر ملکہ رکھتے تھے۔ وہ ایک ایک پتے سے لے کر ایک تنا آور درخت تک اور ایک اڑتی ہوئی چڑیا سے لے کر ایک پتھی ہوئی گدھ تک ہر ایک بات اور مفہوم پر سیر حاصل کرتے تھے۔ ہمیں ان کی کچھ باتیں سمجھ میں آتی تھیں اور کچھ نہیں آتی تھیں لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کی باتیں آہستہ آہستہ ہمارے اوپر کھلتی گئیں پھر ایک وقت ایسا بھی آگیا جب ہم ساتویں جماعت پاس کر کے آٹھویں میں داخل ہو گئے تو انہوں نے خصوصی طور پر ہمیں اس بات کا حکم دیا کہ انگریزی کے محاوروں کو اچھی طرح سے زبانی یاد کرو اور ان کو اپنے ذہن میں بخدا کیونکہ آگے چل کر جب آپ کو انگریزی لکھنے کا موقع ملے گا تو یہ یاد کیے ہوئے محاورے آپ کی مدد کرتے رہیں گے چنانچہ وہ بے شمار محاورے جن کو انہوں نے ترتیب دے رکھا ہوا تھا ان کا بوجھ ہمارے اوپر لا دیا۔

A bird in hand is worth two in the Bush.

(نو نقذ نہ تیرہ ادھار)

Never put off till tomorrow, what you can do to day.

(آج کا کام کل پر مت چھوڑو)

Might is right.

(جس کی لائھی اس کی بھیں)

اس طرح کے کئی اور محاورے انہوں نے ہمیں یاد کروائے اور ان محاوروں اور Idioms کے

سہارے اور اس گراري پر چلتے ہوئے آگے زندگی کے سفر میں چلتے ہی چلے گئے لیکن جب ہم فرست ایئر میں داخل ہوئے تو انہی انگریزی محاوروں میں سے جو ہماری زندگی کے اندر رچ بس چکے تھے اور جو ہمارے اندر اپنی کمی مزدیں طے کر چکے تھے، ہم نے یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ کچھ محاورے ایسے ہیں جن کا مفہوم تو کچھ میں آتا ہے لیکن وہ ہماری زندگی پر کچھ اور ہی طرح سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ شاید اس سے پہلے آپ نے اس کا جائزہ نہیں لیا ہوگا لیکن آج میں آپ کی خدمت میں اپنی مشکلات کا ذکر کرتا ہوں۔

جب میں نے پہلی مرتبہ انگریزی کے دو الفاظ "Take Care" جو عام طور پر بہت استعمال ہوتے ہیں۔ تodel میں خیال آیا کہ ہم ان کا کیا کریں یعنی اگر میں گاڑی پر جا رہا ہوں اور میری خالہ جو نندن سے تشریف لائی تھیں انہیوں نے کہا۔

اب میں حیران ہوں کہ میں ہی اپنی ذات کا Care Taker ہوں کیونکہ ہمارے ہاں تو "اللہ حافظ" (اللہ تم کو اپنی حفظ و امان میں رکھے) کہنے کا رواج ہے لیکن انگریزی بولنے والے کہتے ہیں کہ اللہ حافظ نہیں، ہم اللہ کے اوپر یہ ذمہ داری نہیں تھوپتے اور نہ ہم اپنے اوپر ذمہ داری لیتے ہیں بلکہ یہ تمہاری اپنی ذمہ داری ہے کہ تم خود ہی اپنی Take Care کرو اور تم احتیاط کے ساتھ زندگی بسر کرو۔

بڑے زمانے کی بات ہے ہم ایک روز گاڑی پر جا رہے تھے اور آگے سڑک کھدی ہوئی تھی اور وہاں ایک بہت بڑا سائین بورڈ لگا ہوا تھا جس میں انتباہ کی گئی تھی کہ۔

Travel at your own risk.

میں نے بورڈ پر ٹھک کے ڈرائیور سے کہا کہ بھائی ذرا آہستہ اور احتیاط کے ساتھ چلو۔ ساتھ میری خالہ بیٹھی ہوئی تھیں انہیوں نے کہا کہ احتیاط سے کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ تو میں نے کہا کہ یہاں اتنا بڑا بورڈ لگا ہوا ہے کہ آپ اپنی ذمہ داری پر سفر کریں سڑک ٹوٹی ہوئی ہے اور زیر قیصر ہے۔ اس پر میری خالہ بُنی اور کہنے لگی پچھلا سفر ہم کس کی ذمہ داری پر طے کر کے آئے ہیں اور اگلا کس کی ذمہ داری پر طے کریں گے۔ یہ بورڈ یہاں کیوں لگایا ہوا ہے۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ Take Care کا بھی بڑا عجیب و غریب معاملہ ہے کہ مجھے ہی سے کہا جا رہا ہے کہ میں اپنا خیال رکھوں۔ میرا ہی پروفیسر مجھے گاڑی پر چھوڑتے وقت مجھے کہتا ہے کہ۔

Ashfaq you are going abroad' take care.

اس حوالے سے میری خالہ کی بات تو ٹھیک تھی کہ ہم زندگی کا جو بھی سفر طے کرتے ہیں اپنی ہی ذمہ داری پر یا اللہ کے حوالے سے یا اس کی مہربانی سے سے طے کرتے ہیں۔ یہ لکھنا یا یہ کہنا کہ دیکھو یہاں سڑک ٹوٹی ہوئی ہے اور تم اپنی ذمہ داری سے سفر کرو آگے گورنمنٹ تمہاری ذمہ دار ہے یا معاشرہ اس ذمہ داری کو پورے کا پورا ادا کرے گا ایسا ہوتا نہیں ہے۔ اس طرح جب ان معمول یا روزمرہ کے فقرات یا محاوروں پر نظر پڑنے لگی تو اس حوالے سے مشاہدہ بھی تیز ہونے لگا۔ جب ہم نے جیو گر افک

میگرین پڑھنا شروع کیا اور دنیا کے ان منظقوں کے مطالعہ میں بہت گہرے اترے جہاں جانور کشیر تعداد میں لستے ہیں جسے افریقہ کہا جاتا ہے تو ہمیں پتہ چلا کہ جانوروں کا ایک با قاعدہ قانون ہوتا ہے اور کوئی جانور اس قانون سے تجاوز نہیں کرتا۔ یہ صرف انسان ہی ہے جو اپنے قانون اور طے شدہ بالوں میں آہستہ آہستہ تنفس کرتا رہتا ہے اور اس میں تبدیلیاں پیدا کرتا رہتا ہے۔ شیر جب بھوکا ہوتا ہے تب شکار کرتا ہے اور جب وہ شکار کو مار چکتا ہے تو تین روز تک مزید کسی جانور کا شکار نہیں کرتا۔ شکار ہونے والے جانور بھی اچھی طرح سے سمجھتے ہیں کہ اب ہمیں اپنے آپ کو قربانی کے لیے تیار کرنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ شیر اعلیٰ درجے کے ہوائی چہاز میں بم پھر کراوچے آسمانوں میں اڑنا شروع کرے اور اوپر سے بم پھینک کر بغیر سوچے سمجھے انسانوں جانوروں یا دوسرے بشروں کو قتل کرنا شروع کرے۔ یہ انسان کا ہی ایک ایسا خوفناک قانون ہے جو ایک ظالم کا قانون ہے۔ آپ تم ظریقی ملاحظہ فرمائیں کہ انسان نے بچارے مخصوص شریف جانوروں کے حوالے سے ”جنگل کا قانون“ کا لفظ بنا کر خود کو بری الذمہ کر لیا ہے۔ آپ زندگی میں چھوٹے چھوٹے معاملات سے لے کر یہ مسائل معاشرت تک نظر دوڑا کر دیکھیں تو آپ کو سب اندازہ ہو جائے گا۔ بڑے ملک غریب، کمزور اور چھوٹے ملکوں پر حملہ آور ہوتے ہیں اور آپ دم نہیں مار سکتے اور یہ انسانی قانون ہی ہے جو اس قدر تکلیف دہ اور انسان کو آزار پہنچانے والا ہے۔ خواتین و حضرات ایک اور بھی محاورا ہے جس نے ہمیں ہلاک رکھ دیا ہے۔ جب ہم بی۔ اے میں پہنچ تو ایک نیا محاورا سامنے آیا جس کا سامنا کرنے کے لیے ہم کسی بھی صورت تیار نہیں تھے۔ وہ یہ تھا۔ "یعنی یہ بات اتنی چیزیں اچھی اور پاکیزہ ہے کہ یہ بھی ہوئی نہیں سکتی۔ اب آپ یہ بتائیے ہم کیا کریں یعنی اس محاورے کو ساتھ لے کر کہاں تک اور کہ ہر تک جائیں اور یہ ہماری زندگیوں پر ایسے انداز ہو کہ ہم نے لا شعوری طور پر یہ سوچنا شروع کر دیا کہ جو بات اچھی ہوتی ہے وہ بات پاکیزہ صباح اور نیکی پر ہوتی ہوتی ہے وہ چیزیں ہوتی اس لیے چیزیں بات پر دار و مدار کرنے کے لیے اس کے پس منظر کی بات کو گھٹھیا، ظالم بے انصاف اور ستکدل ہونا چاہیے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ میری خالہ زاد بہن جن کے خاوند ایک ملٹی میشنل کمپنی میں کام کرتے ہیں۔ ان کی زندگی زیادہ ہنگامہ خیز بھی نہیں رہی۔ کام پر جاتے ہیں اور واپس سیدھے گھر آ جاتے ہیں لیکن ہیں بڑے اچھے۔ وہ ایک دن اچانک دفتر سے اٹھ کر گھر آگئے اور آ کر میری بہن سے کہنے لگے کہ لو بھی غدر میں نے تو آج چھلی پکڑ کے لانے کا پروگرام بنایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے زندگی میں پہلے کبھی چھلی پکڑی تو ہے نہیں وہ ان سے پھر گویا ہوئیں کہ آپ نے چھلی پکڑنے والی کنڈی دیکھی ہے؟ کہنے لگے نہیں دیکھی۔ پوچھا کبھی وہ پانی دیکھا ہے جس میں مچھلیاں ہوتی ہیں انہوں نے کہا اتنی مقدار میں تو نہیں دیکھا۔ گھر سے یا گلاس کا پانی ہی دیکھا ہے۔ وہ کہنے لگیں آپ کا پھر بھی چھلی پکڑنے کا ارادہ

ہے تو وہ کہنے لگے: میں میرا بھی چاہا۔ دفتر میں ایک فائل بڑی پیچیدہ قسم کی تھی۔ میں نے سوچا اس کو کل نہ لیں گے اور مجھے انگریزوں نے کہا (دفتر میں کام کرنے والے ساتھی انگریز) تم آج پچھلی پکڑنے جاؤ اور اب میں نے پچھلی پکڑنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اگر تمہاری بھی خواہش ہے تو میرے ساتھ چلو! بلوک کے مقام پر دریا بڑی شاخیں مارتا ہوا گزرتا ہے اور سنائے ہے وہاں پچھلی بہت ہوتی ہے۔ میں ڈوری کا نشا اور پچھلی پکڑنے کے دیگر لوازمات ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اس نے (عذر) کہا میں تو ساتھ جانیں سکتی کیونکہ آپ نے اچانک پروگرام بنالیا ہے، تو وہ کہنے لگے کوئی بات نہیں میں اکیلا چلا جاؤں گا۔ تب میری خالہزاد بہن پر بیٹا ہو میں اور کہا ہائے ہائے آپ نے زندگی میں پہلی مرتبہ از حد خود پہنچ کا ایسا پروگرام بنایا ہے اور میں پھر گھر میں کیوں بیٹھی رہوں۔ یہ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا لیکن وہ بڑی بے چین کبھی گھر کے اندر جائے اور کبھی باہر آئے۔

اس پر ان کے میاں کہنے لگے کہ تم اس قدر پر بیٹا کیوں ہو؟

وہ کہنے لگی کہ میں نے آج تین مرتبان اچارڈا لئے کافی لے کیا تھا اور آپا صغری سے درخواست کی تھی کہ وہ آکے مجھے اچارڈاں دیں۔ خواتین و حضرات ہمارے اکثر گھروں میں کئی آپا صغری آئیں ہوتی ہیں جو گو Poor Relations ہوتی ہیں اور ہم ان کے ساتھ کچھ زیادہ محبت نہیں رکھتے لیکن مشکل اوقات میں وہ ہمارا بڑا ساتھ دیتی ہیں مثلاً شادیاں ہوں، مہنگی کی رات ہو تو آپا صغری آجائی ہیں۔ وہ ساری بیٹھنی بچیوں کے پس سنبھال کے گود میں رکھے بیٹھی رہتی ہیں اور پھر جانے کے وقت انہیں دے دیتی ہیں اچارڈاں ہو چینیاں بنانی ہوں، رضاۓ سینی ہو تو وہ بڑے کام آتی ہیں۔ عذر رکھنے لگی کہ میں نے اتنے سارے آم لے کے رکھے ہوئے ہیں اور آپا صغری نے بھی آنا ہے۔ سارے مصالحے بھی تیار ہیں لہذا میں جاسکتی۔ پھر جب وہ چلنے لگے تو کہنے لگی نہیں نہیں میں آپ کے ساتھ چلتی ہوں اور تیار ہو گئیں اور اس نے آپا صغری کے نام کی ایک پرچی لکھ کر لیز بکس میں ڈال دی (عذر اور آپا صغری کے درمیان یہ بات طبقی کہ اگر بھی وہ گھر پر نہ ہوں تو گھر کی چابی اور ہدایات لیز بکس میں پڑی ہوں گی) چنانچہ وہ دونوں میاں بیوی چلے گئے۔ جب وہاں پہنچ گئے تو ان سے پچھلی پکڑی تو کیا پکڑی جانی تھی لیکن انہوں نے بہت زیادہ Enjoy کیا، دن بھر وہ دونوں وہاں رہے۔ جب وہ لوٹ کر نشام کو گھر آئے (تو میری ہمیشہ (عذر) کہتی ہیں تو میرا اور پرکادم اور پر نیچے کا دم نیچے رہ گیا اور میری تھی نکل گئی کیونکہ جس گھر میں ہم داخل ہو رہے تھے وہ کچھ اور ہی عجیب و غریب نقش پیش کر رہا تھا اور جب میں اندر گئی تو حیران ہوئی کہ تین مرتبانوں میں اچارڈاں کے رکھا ہوا تھا اور ان کے اوپر ڈھکنا پڑا ہوا تھا لیکن میری تھی اس وجہ سے نکلی کہ میرے گھر کی جو عیشیاں تھیں جو عرصہ دس سال سے خراب تھیں وہ تمام کی تمام چکلدار اور بہت اعلیٰ درجے کی پاش کی ہوئی لگتی تھیں۔ میز کے اوپر ایک کاغذ پر اتحاد اور اس

پر لکھا تھا کہ محترمی آپا جی السلام و علیکم میر انام کرم داد ہے۔ میں بیہان سے گزر آپ کے گھر کی گھنٹی بجائی تو آپ نے دروازہ نہیں کھولا۔ پھر میں ہمت کر کے چھانک کھول کے اندر داخل ہوا تو آپ کا دروازہ بند تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کوئی بھی گھر پر نہیں ہے، اور ادھر دیکھا تو مجھے لیٹر بکس نظر آیا۔ اس میں سے مجھے گھر کی چابی نظر آئی اور اس کے ساتھ ہی ایک خط پر اتحا جاؤ آپ نے آپا صغری کے نام لکھا تھا۔ وہ میں نے پڑھا اور سوچا آپا صغری تو آئی نہیں میں ہی یہ کام کروں۔ میں نے آپ کا اچارڈال دیا ہے۔ میری ماں اچار میں کلوچی زیادہ ڈالا کرتی تھی میں نے بھی اسی لحاظ سے ڈالی ہے اور نہ مرچیں میں نے کم رکھی ہیں۔ اگر آپ اسے بڑھانا چاہیں تو بڑھا دیں۔ باقی آپا آپ کا اتنا خوبصورت گھر ہے اور اس کی روینگ کا سیستان اس ہوا پر اتحا اس پر کسی نے توجہ ہی نہیں دی میں نے کوشش کر کے میں پڑے برش پالش سے سب ٹھیک کر دیا ہے۔ اس کے رقدمیں مزید لکھا تھا کہ ساتھ والوں کا ملازم گھر مانگنے آیا تھا تو میں نے آپا انکا دردیا کیونکہ معاف کرنا آپا یہ لوگ چیزیں مانگ کر لے جاتے ہیں اور واپس نہیں کرتے یا خراب کر دیتے ہیں لہذا میں نے اس سے کہا کہ ہمارے گلکار بڑھا بے تو وہ چلا گیا۔ باقی کمروں میں گھوما اور میں یہ کیک کر جیران رہ گیا اور آپ پر مجھے بہت نیک خاتون علوم ہوتی ہیں آپ کی ہیرے کی دو انگوٹھیاں تجھے کے نیچے پڑی ہوئی تھیں وہ کافی خراب ہو چکی تھیں اس لیے میں نے انہیں کھانگا کر صاف کر دیا ہے اور میں نے انہیں دھو کر نشوپیر میں پیٹ کے مجبوراً دیے ہی تجھے کے نیچے ہی رکھ دیا ہے۔ خدا کے واسطے خیال کریں تیس تیس پینتیس پینتیس ہزار کی ایک ایک انگوٹھی کو آپ نے اتنی لاپرواہی سے رکھا ہوا ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ میں نے غسل خانے میں دیکھا کہ صاحب کی شیوگنگ کٹ میں تمام کے تمام بلیڈ پرانے ہیں اور وہ صاحب ان سے گھسا گھسا کے شیو کر لیتے ہوں گے۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ آپ مہربانی فرمایا کہ آج ہی انہیں نئے بلیڈوں کا ایک پیکٹ لے کر دیں اور جو چیزیں آپ نے پکنک پر لے جانے کے لیے تیار کی تھیں وہ چیزیں میں نے اٹھا لی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میرا حق ہے۔ میں حیدر آباد فون کری کی غرض سے جا رہا ہوں۔ وہاں مرے اور چنیاں بنانے والی قیکشی میں میرا ایک ”گرا میں“ (علاقے کا آدمی) ہے اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے وہاں نوکری دلوادے گا کیونکہ میں سال ڈیڑھ سال سے ہی وزگار ہوں۔ آپ میرے حق میں دعا کرنا اور میں آپ کا آپا صغری کے لیے کھانے کا رکھا ہوا سامان ساتھ لے جا رہا ہوں تاکہ راستے میں کھا سکوں۔ میں آپ کو اس کھانے کے لیے دعا دوں گا۔ اس رفتے کے نیچے اس نے درج کیا کیا تھا۔

”کرم دار“

ریٹارڈ بیٹ میں بریگیڈ یونیفار لاس قلاں۔

جب میری بہن نے مجھے یہ خط دکھایا تو میں یہ خط لے کر میں اخبار کے ایک بڑے دفتر میں

گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ تم خوفزدہ کرنے والی خبریں تو چھاپتے ہو۔ ایک یہ خبر بھی چھاپو کر ایسا ایک واقعہ ہوا ہے۔ تو وہ صاحب کہنے لگے Sir It is too good to be true ایسے تو ہو ہی نہیں ملتا کہ ایک انجان آدمی بھرے پڑے گھر میں داخل ہوا اور صفائی وغیرہ اور کام کر کے چلا جائے اور باقی سب کچھ چھوڑ جائے اور نہیں تو خبریں ہی ایسی چھاپنی پڑتی ہیں جو خوفزدہ کرنے والی ہوں؛ جب تک ایسی خبریں نہیں چھاپی جائیں گی تو لوگ اخبار ہی نہیں خریدیں گے۔ اس نے مجھے کہا کہ دیکھیں جب کوئی بینک لوٹنے آتا ہے تو وہ خوفزدہ کر کے اور پستول دکھا کے پیشہ چھینتے ہیں اور ہمارے پاس بھی اسی طرح کے خوفناک خبروں کے پستول ہوتے ہیں اور ہم ان سے اپنی سیل میں اضافہ کرتے ہیں اور یہ کہہ کر اس خبر چھاپنے کا رادہ انہوں نے ترک کر دیا۔

اس کے بعد ایسا ہی ایک واقعہ میرے ساتھ بھی پیش آیا۔ میں نے یہ بات شاید آپ کو پہلے بھی سنائی ہو گی کہ ایک بڑی خوبصورت دھان پان کی پتلوی ہی لڑکی ایک ٹوٹے سے موڑ سا ٹکل پر بیٹھ کر انارکلی بازار میں آئی۔ وہاں میں اپنے دوست ریاض صاحب کی کپڑے کی دکان میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے آکر کہا کہ کیا آپ کے پاس کوئی اعلیٰ درجہ کا عروضی جوڑا ہو گا تو میر دوست نے کہا جی بالکل ہے۔ یہ دس ہزار کا ہے یہ پندرہ ہزار کا ہے، یہ بیس ہزار کا ہے، پسند کر لیجیے۔ بہت اچھے ہیں۔ یہ چیزیں ہزار کا بھی ہے۔ وہ کہنے لگی بس بس یہاں تک کاہی ٹھیک ہے۔ کیا مجھے اسے پہن کر دیکھنے کی اجازت ہے۔

میرے دوست کہنے لگے ہاں ہاں ضرور۔ یہ ساتھ ہمارا ٹرانس روم ہے آپ ٹرانس کریں۔ وہ لڑکی اندر گئی۔ اس کے ساتھ ایک سہا اور ڈراہونو جوان بھی تھا (جیسے آج کل کے سارے خوفزدہ سے نوجوان ہیں کہ زندگی کیسے کامیں گے اور مستقل کافل انہیں لاحق ہوتا ہے) وہ عروضی جوڑا پہن کر باہر نکلی اور دکاندار نے اسے دیکھ کر کہا "سبحان اللہ بی بی یہ تو آپ پر بہت ہی بجتا ہے ایسی دہن تو ہمارے پورے لاہور میں کبھی ہوئی نہ ہو گی" (جس طرح سے دکاندار کہتے ہیں)۔ کہنے لگی جی بڑی مہربانی ٹھیک ہے اسے دوبارہ پیک کر لیں۔ وہ مزید کہنے لگی کہ میں تو صرف ٹرانس کرنے کے لیے آئی تھی میں اپنے اس خاوند کو جو میرے ساتھ آیا ہے یہ بتانے کے لیے لائی تھی کہ اگر ہم امیر ہوتے اور ہمارے پاس عروضی جوڑا ہوتا اور اگر میں اسے پہن سکتی تو میں ایسی دکھائی دیتی۔ آج ہماری شادی کو سات دن گزر چکے ہیں۔ ہم اللہ کے فضل سے بہت خوش ہیں لیکن میں اپنے خاوند کو جوڑا ہی Depressed رہتا ہے اسے خوش کرنے آئی تھی۔ میرے دوست نے کہا کہ کیا آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس نے کہا کہ نہیں ہمارے پاس پیسے تو تھے لیکن میری ایک چھوٹی بہن جو ایم بی بی ایس کر رہی ہے اس کو پیسوں کی ضرورت تھی اور میرے والدین نے کہا کہ اگر میں یہ قربانی دوں تو اس کی ضرورت پوری ہو جائے۔ تب میں نے کہا کہ بسم اللہ یہ زیادہ ضروری ہے چنانچہ میں نے سادہ کپڑوں میں ہی شادی کر لی۔ جب میں یہ

بات اپنے دوستوں کے پاس لے کر گیا تو انہوں نے بھی کہا کہ۔ It is too good to be true. خواتین و حضرات اب وقت کم ہے لیکن میں آخری اور خوفناک و خطرناک محاوراً بھی آپ کی خدمت میں پیش کریں گے دوں وہ ہے۔ Live and Let to Live:

پاکستان کا ہر شخص آج کل اس وقت بڑی شدت کے ساتھ اس محاورے پر عمل کر رہا ہے۔ جب میں اپنے بہت امیر دوستوں سے ملتا ہوں تو وہ کہتے ہیں اشراق صاحب ہم تو Live and Let to Live پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم جس طرح سے زندگی بسر کر رہے ہیں اس پر خوش ہیں اور ہم لوگوں کی زندگیوں میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارے اروگر جھگی والے رہتے ہیں دوسرا لوگ رہتے ہیں ہم نے کبھی جاگران سے نہیں پوچھا کہ تم کیسے ہو۔ ہمارا اصول Live and Let to Live ہے۔ ہمارے اب یہ اصول ہی چل رہا ہے کہ کوئی زندہ رہے مرنے کچھی جیسے ہم اس میں دخل نہیں دیں گے۔ پچھلے سے پچھلے سال مجھے امریکہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں ریاست کیلی فوریا میں ایک صاحب نے ہماری دعوت کی۔ میرے ساتھ بانو قدر سی بھی تھیں۔ وہ دعوت بڑی ہی پر ٹکلف تھی۔ وہ ہمارے دوست ایز فورس کے بھاگے ہوئے افسر تھے۔ وہ انشاء اللہ پاکستان سے بڑی دولت لوٹ کر ساتھ لے گئے تھے۔ وہ آج کل امریکہ میں انگور سکھا کر دنیا بھر میں سپاٹی کرنے کا روبرابر کرتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ تو یہاں ہمارا سارا اپیسہ لے کر آگئے ہیں۔ وہ کہنے لگے ”اشراق صاحب ہم تو Live and Let to Live پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ ہم یہاں Live کر رہے ہیں اور آپ کو ہم نے Let Live کے لیے چھوڑ دیا ہے کہ جیسے مرضی زندگی بسر کرو۔ میں نے کہا کہ میں ایک دن صحیح جاگا تو جیسے سودخور پٹھان ڈنڈا پکڑ کر دروازے پر آیا کرتا ہے اس طرح آئی ایم ایف اور ولڈ بینک کا ایک بندہ ہم سے وصولی کے لیے آ جاتا ہے اور پٹھان کی طرح کہتا ہے کہ ”دیکھو ہمارا اپیسہ نکالو۔“ اور میں اس سے کہتا ہوں کہ میں نے تو تم سے ساری زندگی کوئی پیسہ نہیں لیا تو وہ کہتا ہے کہ تم نے لیا ہے اور تمہیں 32 بلین ڈالر دینا پڑیں گے۔

میں نے کہا کہ کب لیا؟ کس نے لیا؟ تو اس نے کہا کہ تمہارے بڑوں نے قرض لیا۔ اس پر میرے دوست نے کہا کہ ہم نے پیسہ لیا اور اسے اچھی طرح سے خوشی کے ساتھ استعمال کیا اور اگر اب بھی ہمیں موقع ملا تو ہم انشاء اللہ ای طرح سے استعمال کریں گے۔ خواتین و حضرات دنیا کا یہ معروف ترین محاوراً پاکستان میں بڑے اطمینان، اعتماد اور یقین کے ساتھ بولا جاتا ہے لیکن کسی نے کبھی موڑ کا شیشہ نیچا کر کے نہیں دیکھا کہ پیچھے آنے والا زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقدیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

ڈپریشن کا نشہ

ہم بڑی دیر سے ایک عجیب طرح کے عذاب میں بٹلا ہیں۔ ہمیں بار بار اس بات کا سند یہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے ملک میں نشہ کی عادت بہت بڑھ گئی ہے اور ڈاکٹر والدین دونوں ہی بڑے فکر مند ہیں اور والدین دانشور لوگوں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ اس کے قلع قع کے لیے کچھ کام کیا جائے۔ میں نے بھی ایک سوسائٹی کے ساتھ مل کر اس مسئلے کا مطالعہ کیا۔ میں نے اس سوسائٹی سے کہا کہ نشہ بری چیز ہے لیکن اتنا ساتو قوموں کی زندگی میں آتی جاتا ہے اور یہ بہودہ چیز ہے جو کب سے چلی آ رہی ہے اور معلوم نہیں کب تک چلتی رہے گی۔ اس تحقیق کے دوران جو میں نے ایک عجیب چیز نوٹ کی وہ یہ کہ ایک اور قسم کا نشہ بھی ہے اور آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں کہ میں اسے نشہ کہوں کیونکہ وہ ہماری زندگیوں پر بہت شدت کے ساتھ اثر انداز ہے۔ وہ نشہ Stress، فشار پر بیٹھانی اور دکھ کو قبول کرنے کا ہے۔ اس نشے کو ہم نے وظیفہ بتالیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم Stress Ful نہیں ہوں گے اس وقت تک ہم نارمل زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس نشے کو ترک کرنے کی اس نشے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ میں ایک بار کچھری گیا، ایک چھوٹا سا کام تھا اور مجھے باقاعدگی سے دو تین وہاں جانا پڑا۔ کئی سیڑھیاں چڑھا اور اتر کر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ بہت سے میری عمر سے بھی زیادہ عمر کے بابے کچھری میں بچوں کے اوپر بیٹھے ہوئے ہیں اور مقدمے لڑ رہے ہیں۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق ان سے پوچھا کہ آپ کیسے آئے ہیں۔ کہنے لگے جی ہمارا مقدمہ چل رہا ہے۔

میں نے کہا کہ سے چل رہا ہے۔ ایک بابے نے کہا کہ پاکستان بننے سے دو سال پہلے سے چل رہا ہے اور ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ وہ سُٹم کے اوپر لعن طعن بھی کر رہا تھا۔ میں نے کہا کہ مقدمہ کس چیز کا ہے۔ اس نے بتایا کہ ہماری نوکنال زمین تھی اس پر کسی نے قبضہ کر لیا ہے۔ میں نے کہا کہ کے 53 سال میں 2 سال ملا کر 55 سال بننے ہیں۔ آپ دفع کریں، چھوڑیں اس قصے کو۔ وہ کہنے لگا کہ

جی اللہ کے فضل سے بچوں کا کام بڑا چھا ہے اور میں اس کو دفع بھی کر دوں لیکن اگر مقدمہ شتم ہو جائے تو میں پھر کیا کر دوں گا۔ مجھے بھی تو ایک نشہ چاہیے۔ صبح اٹھتا ہوں کاغذ لے کر وکیل صاحب کے پاس آتا ہوں اور پھر بات آگئے چلتی رہتی ہے اور شام کو میں گھر چلا جاتا ہوں۔ اس بابے کی بات سے میں نے اندازہ لگایا کہ ہمارے ہاں تو اس نشے نے خوفناک صورت حال اختیار کر لی ہوئی ہے۔ سکولوں میں ماسٹروں، گھروں میں عورتوں اور دفتروں میں صاحبوں کو یہ نشہ لگا ہوا ہے۔ جسے دیکھیں وہ پریشانی کے عالم میں ہے اور کسی نے اس نشے کو چھوڑنے کی کوشش کرنے کی بھی کبھی رحمت گوارہ نہیں کی۔ اگر کسی پیشیش بل کے آخری تاریخ 17 ہے تو اسے چند لوگوں کو چھوڑ کر باقی دونوں پہلے بھی ادا کر سکتے ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو صرف فشار کے حوالے کر رکھا ہے۔ اس دکھ سے ہمیں نکلنا پڑے گا۔ تیرسری دنیا اور بطور خاص ہم پاکستانی اس قدر دکھ کی طرف تیزی سے بڑھتے ہیں کہ جیسے ہمیں اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی نہیں رہا۔ ایک زمانے میں سمن آباد میں رہتا تھا۔ ان دنوں ہمارے پاس پیسے بھی کم ہوتے تھے لیکن جو بوجھ ہم نے اب اپنے اوپر طاری کر لیا ہے ایسا نہیں تھا لیکن اب ہم اس بوجھ اور دکھ کے نشے سے باہر نکلنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ میرے ایک دوست ہیں انہیں آدھر سر کے درد کی شکایت ہے اور وہ ایسا طے شدہ درد ہے کہ ہفتے میں ایک مرتبہ بدھ کے دن شام کو تین بجے کے بعد ضرور ہوتا ہے اور اس درد کا حملہ بڑا شدید ہوتا ہے لہذا وہ صاحب دو بجے ایک چھوٹے سے س Howell پر اپنی دوائیاں اور ایک بڑے س Howell پر اپنے رسالے اور کتابیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں اور کتابوں کو پڑھتے ہوئے اس درد کے حملے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ اس وقت اس کی بیوی آرام کرتی ہے اور اسے پتہ ہوتا ہے کہ اب اسے ایک ہو گا اور یہ جانیں اور اس کا کام۔ لیکن وہ صاحب اس ”بھاؤ“ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں کہ وہ کب آتا ہے۔ جس طرح پہلے زمانے کی ہم کہانیاں سناتے تھے کہ ایک سنتی کے اندر بلا پڑتی تھی تو وہ ایک بندہ یا لڑکی دیتے تھے کہ اس کو قتل کر کے کھا جا اور چل جا۔ اب وہ ”بھاؤ“ سب کو پڑنے لگ گیا ہے اور ہر بندہ اس کے انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے کہ یا اللہ میرا ”بھاؤ“ کب آئے گا تاکہ میں اس کو اپنے اوپر وارد کروں حالانکہ انسان اس نشے سے نکل بھی سکتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے فضل سے بڑا طاقتور ہے۔ اللہ نے اس کو بڑی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ وہ صاحب بیٹھے ہوئے ہیں اور سائز ہے تین بجے ٹھاکر کے انہیں اٹیک ہوتا ہے۔ جب وہ اٹیک ہوتا تو وہ سخت تکلیف میں کا نہتے ہیں۔ پھر وہ ایک دوائی کھاتے پھر دوسری اور شام کے چھ بجے تک نہ حال ہو کے بستر پر لیٹ جاتے اور پھر صبح جا کے وہ بالکل ٹھیک ہوتے۔ ایک روز جب میں اور ممتاز مفتی ان سے ملنے گئے تو وہ اپنی دوائیاں رکھ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا ہی کیا ہے۔ کہنے لگے یہ میری دوائیاں ہیں اور اب میرے اوپر اٹیک ہونے والا ہے اور میں ان دوائیوں سے اس کا سد باب کر دوں گا۔

ان دنوں مفتی صاحب کو ہومیوپٹیکی کا شوق تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے ہومیوپٹیک طریقہ علاج میں ایک ایسی دوائی ہوتی ہے جو اس مرض کے لیے ہوتی ہے۔ ان صاحب نے کہا کہ نہیں میرے پاس یہ دوائیاں پڑی ہیں لیکن مفتی صاحب اپنے سکوٹر پر گئے اور جا کے دوائی لے آئے۔ اور انہوں نے گول گول میٹھی سی گولیاں ان کے منہ میں ڈال دیں۔

اب اللہ کی مہربانی اوراتفاق دیکھنے کے پہلے سائز ہے تین بجے، پھر چار نج گئے اور پانچ بجے ان صاحب نے زور سے چیخ ماری اور پریشان ہو کر کہنے لگے کہ میری بیماری کہاں گئی۔ (اب وہ صاحب تو اس بیماری کے عادی ہو چکے تھے۔)

وہ کہنے لگے کہ میرے ساتھ یہ دھوکا ہوا ہے۔ یہ کیوں ایسا ہوا ہے۔ اس کی بیوی کہنے لگی کہ یہ تو اچھی بات ہے لیکن ان صاحب نے رات بڑی بے چینی میں گزاری۔ اگلے دن وہی ایم ایچ گئے اور اس دوائی کو دکھایا۔ ہپتال والوں نے اس دوائی کا نیٹ کیا اور کہا کہ یہ کوئی دوائی نہیں ہے یہ تو میٹھا ہے۔ انہوں نے آئے مفتی صاحب سے پوچھا کہ آپ بتائیں کہ وہ کیا تھا۔

مفتی صاحب نے کہا کہ یہ ہماری ایک مشہور دوائی ہے اور خاص طور پر آدھے سر کے درد کی شکایت کے لیے ہے۔ انہوں نے کہا کہ مجھے یہ دوائی بالکل نہیں چاہیے۔

خواتین و حضرات! وہ بیماری ہی ان کی محبوب ہو گئی تھی۔ اتنی بیماری کے نہ انہیں بیوی اچھی لگتی تھی نہ انہیں بچے اچھے لگتے تھے۔ لیس انہیں بدھو والے دن آنے والی اس بیماری سے عشق تھا۔

آپ اگر اپنے گھروں میں غور کریں تو آپ کو احساس ہو گا کہ ہر بندہ اپنی اپنی بیماری سے چمٹا ہوا ہے اور ثابت زندگی گزارنے کی طرف کسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں یہ بات بھی جانتا ہوں اور محضوں بھی کرتا ہوں کہ ہمارے سب کے مالی حالات اتنے اچھے نہیں ہیں جتنے ہونے چاہیں لیکن اس کے باوصف گزارہ چلتا تو ہے نا!

میں عمر کے بالکل آخری حصے میں ہوں لیکن میں آپ کو بتاؤں کہ 1964ء میں ہماری اُن وی اشیش چلا تھا اس وقت میں جو کہتا تھا یا جو میری تجوہ تھی اور اب جو کچھ میں کہتا ہوں اس میں یہ افرق ہے۔ اس وقت میری کمائی کا ستر فیصد حصہ ان چیزوں پر لگ رہا ہے جو 1964ء میں موجود ہی تھیں تھیں اور میں حل斐 کہتا ہوں کہ میں سن چونسھے میں بھی زندہ تھا۔ اس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کی مشین نہیں تھی۔ شیپو نہیں ہوتے تھے جبکہ آج اُن وی کے اشتہاروں سے پتہ چلتا ہے کہ پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ شیپو کا ہے کہ کون سا شیپو استعمال کیا جائے اور ہمارے بچے شیپو کے انتساب کے عذاب میں بنتا ہیں۔ اگر سب عذاب اکٹھے کیے جائیں تو زیادہ عذاب ایسے ہیں جو 1964ء میں موجود نہیں تھے لیکن ہم ہر بڑے مرے کی زندگی گزارتے تھے۔

کیا ہم اس عذاب سے باہر نہیں نکل سکتے؟ کیا ہم اپنی بیماری کو اس طرح لکھے سے لگا کر بیٹھ رہیں گے؟

کیا ہماری زندگیوں میں خوشی کا کوئی دن بھی نہیں آئے گا؟

یہ خوشی اسی چیز ہے جو صرف اندر سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ یہ باہر سے نہیں لی جاسکتی۔ آج کل کے بچے کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس چیزیں زیادہ اکٹھی ہوں گی تو ہمارے پاس زیادہ خوشیاں ہوں گی۔ میری بہو کہتی ہے کہ اگر اس کے پاس پنے (زمروں) کا ہار ہوتا وہ بڑی خوش ہو۔ وہ مجھے کہتی ہے کہ ماں میں اگر دوبار بن جائیں تو پھر زبردی بات ہے۔ میں نے کہا اچھا میں تمہیں لاد دیتا ہوں۔ وہ کہنے لگی 35 ہزار کا ہے۔ میں نے کہا کوئی بات نہیں لیکن یہ بتاؤ کہ وہ لے کر تم کتنے دن خوش رہو گی۔ کہنے لگی میں کافی دن خوش رہوں گی۔

میں نے کہا کہ تم اپنی سہمیلوں کے سامنے شنی گھمار لو گی کہ میرے پاس یہ سیٹ بھی آگیا ہے۔ پھر کیا کرو گی۔

وہ مجھے کہنے لگی کہ Posession کا ایک اپنا نشہ ہوتا ہے اور یہ خمار ہوتا ہے کہ فلاں چیز میرے قبضے میں ہے۔

میں نے کہا پیارے بچے!

میں تم سے یہ پوچھتا ہوں کہ اتنی ساری قیمتی چیزیں اکٹھی کر کے جب تم سوتی ہو تو یا سونے لگتی ہو تو ان ساری چیزوں سے تمہارا تصرف توٹ جاتا ہے اور میں تمہیں جب کبھی صبح جگاتا ہوں تو تم کہتی ہو ماں میں بس دو منٹ اور سو لینے دیں۔ یعنی جو خوشی آپ کے اندر سے پیدا ہو رہی ہے وہ زیادہ عزیز ہے اور وہ جو Posession آپ نے اکٹھے کیے ہوئے ہیں وہ اس وقت آپ بھلانے ہوئے ہوئے ہوئی ہیں لیکن اس بات پر تم نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔

میری بہو جس کی سمجھ میں میری باقی تھوڑی تھوڑی آنے لگی ہیں وہ کہتی ہے کہ ماں میں ان باتوں پر عمل کر کے کہیں مارے ہی نہ جائیں۔

میں کہتا ہوں کہ مارے جانے والی کوئی بات نہیں ہے۔ بلکہ آپ خوش ہوں گے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ میں جب تمہاری عمر کا تھا اور اٹلی میں تھا تو بہاں مجھے جب گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے گے تو میری لینڈ لیڈی جس کے گھر میں پھر اہوا تھا یا رہتا تھا اس کا نام کا تانی تھا وہ کہنے لگی کہ پروفیسر تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ میں نے اس سے کہا کہ میں پریشان ہو گیا ہوں۔ مجھ پر بڑا باؤ ہے۔ وہ کہنے لگی کہ تم ایک دن چھٹی کرلو۔ میں نے کہا کہ میں چھٹی کر کے کیا کروں۔ میں پر دلیں میں ہوں اور دفتر میں جا کے ہی میرا دل لگتا ہے۔

اس نے کہا کہ روم اتا بڑا شہر ہے تم گھومنے جاؤ اور بے مقصد جاؤ۔ میں نے کہا کہ بے مقصد کیسے گھوما جا سکتا ہے؟ کہنے لگی گھوما جا سکتا ہے۔

میں نے مسلسل 23 دن کام کیا تھا اور کوئی چھٹی نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے دفتر والوں سے کہا کہ میں آج نہیں آؤں گا تو انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ خواتین و حضرات اس دن میں نے جو پہلا کام کیا وہ یہ تھا کہ نئے کپڑے پہن کر میں دفتر پہنچا لیکن کام کرنے کے مقصد سے نہیں بلکہ یہ دیکھنے کے لیے کوئیگی کیا کر رہے ہیں۔ میں نے سوتور بینا کو دیکھا۔ وہ پیشی ٹاپ کر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگی ”مزے کر رہے ہو نا آج چھٹی جو ہے۔“ میں نے کہا ہاں اور میں اپنے کام کرنے والی کرسی پر بغیر کوئی کام کیے بیٹھا رہا۔

پھر دوسرے دفتری دوستوں سے گپ شپ کرتا رہا۔ دفتر میں وقت گزارنے کے بعد میں سیر ہیاں اتر اتوہاں قریب ہی ”سانتا ماریا“ میں ایک گرجے کے نیچے اندر گراونڈ بازار ہے اس میں چلا گیا۔ وہاں عورتیں ٹیچ رہی تھیں اور وہاں آوازیں دے دے کر چیزیں بیچتے کارروائج ہے۔ ایک خاتون نے مجھے بُلا کر کہا کہ تم یہ جالی کے دستانے لو۔ وہ بڑے اچھے بنے ہوئے دستانے تھے۔ وہ کہنے لگی کہ یہ تمہاری محبوبہ کے لیے ہیں یا ملکیت کے لیے ہیں۔

میں نے کہا کہ میری تو کوئی ملکیت نہیں ہے۔ کہنے لگی بے وقوف کبھی تو ہوگی۔ میں نے کہا نہیں مجھے ان کی ضرورت نہیں لیکن وہ اصرار کرنے لگی کہ میں تمہیں زبردستی دوں گی اور اس نے وہ لفافے میں ڈال کے دیئے۔ اب مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے یہ کس کو دینے ہیں۔ اس وقت نہ کوئی میری ملکیت تھی اور بانو قدیس کا بھی تب کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ بہر حال میں نے وہ دستانے لے لیے۔

میں وہ دستانے لے کر بازار سے باہر آگیا تو دیکھا کہ ریلوے اسٹیشن کے پاس ایک سیاہ فام خاتون ایک چھابے میں زرد گلاب کا ایک پھول رکھ کر اپنا بیرون کھجوار ہی تھی اور اسے جماں یاں سی آر ہی تھیں۔ اس نے مجھے کہا کہ یہ پھول بڑا اچھا ہے اور اس نے بھی کہا کہ یہ پھول تیری یہوی کے لیے بڑا اچھا ہے گا۔ میں نے وہ بھی ”بڑا خوبصورت“ ہے۔ کہہ کر خرید لیا۔ پھر میں نے اسٹیشن پر ٹرام پکڑنے سے پہلے اپنا ایک شام کا محبوب پرچہ (اخبار) خریدا اور میں 77 نمبر کی بس میں آ کر بیٹھ گیا۔ اس میں ایک بوڑھا سا آدمی جو بظاہر پروفیسر لگتا تھا مگلے میں عینک لٹکائے بیٹھا اونگرہ رہا تھا۔ میں دھرم سے سیٹ پر بیٹھا تو اس نے آنکھیں کھولیں۔ میں نے کہا کہ آپ کیسے ہیں؟ اس نے کہا کہ ٹھیک ہوں۔ میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ وہ اچانک میرے ہاتھ سے گرفتی ہے اور میں نے اسے اٹھانے کی رحمت گوارہ نہیں کی اور سوچا کہ کوئی بندہ آئے گا تو مجھے اٹھا دے گا۔ میں نے وہ کتاب اٹھا کر اسے دے دی۔

وہ ایک رینارڈ سکول تھی تھا۔ ہم باتیں کرنے لگے۔ اس نے کہا کہ آج موسم کتنا اچھا ہے۔ میں نے کہا ہاں جی موسم واقعی بہت اچھا ہے۔

جب میں گھر کے پاس پہنچا تو شام ہو چلی تھی۔ میں نے آسان پر ایک ستارہ دیکھا جو میں نے دوسال سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ ستارہ ایک گائیڈ کی طرح سے نشاندہی کر رہا تھا کہ میرا گھر اس طرف ہے۔ مجھے وہ بڑا چھانگا اور میں کافی درستک اس کو دیکھا رہا۔ میں نے گھر آ کر اخبار سفید دستانے اور لمبی ڈنڈی والا پچھوں جب میز پر رکھا تو آپ یقین کریں، میں آپ کوچھ جمع عرض کرتا ہوں کہ مجھے ویسی خوشی عطا کرنے والا دن پھر کبھی نصیب نہیں ہوا حالانکہ میرے پاس کوئی Possession نہیں تھا۔ آپ بھی میں کسی دن نکل کر دیے ہی چور بھی کی طرف جاؤں گا اور جب چلتے چلتے شام ہو جائے گی تو میں کہوں گا کہ میں یہ نشہ کرنا نہیں چاہتا جو شہ ہمارے اوپر عائد کر دیا گیا ہے۔ میری آپ سے بھی پر زور درخواست کہ ہم دوسرے نشوں کی طرف توجہ دینے کی بجائے Stress کے نشے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ میں پھر کہوں گا کہ بڑی تکالیف اور تنگیاں ہیں لیکن جس طرح سے بارش کے دنوں میں جب آپ کچی کچی میں سے گزرتے ہیں اور وہاں رکھی کپی ابتوں پر آپ پاؤں رکھتے ہوئے اپنی منزل پر پہنچ جاتے ہیں ویسے ہی ان مشکلات کو جانچتے ہوئے پاؤں رکھتے ہوئے اگر خوشی کی طرف نکل جائیں۔ یہ میرے اس دوست کی طرح ہمیں یہ خوف لگا ہوا ہے کہ ہم اپنی بیماری کو چھوڑنا بھی ایک بیماری ہی تصور کرتے ہیں اور اپنے اوپر مسلط کردہ بیماریوں سے جان چھڑانا نہیں چاہتے۔ میں پھر یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمیں بڑی پریشانیاں ہیں اور بچھوں کے حوالے سے بڑی مشکلات ہیں۔ ہمیں انہیں اس طرح سے زندگی کے سفر میں کامیاب طریقے سے گامزن کرنے کے لیے کوئی راست نہیں مل رہا جیسے انہیں ہونا چاہیے۔ لیکن میری اس آرزو میں آپ بھی شریک ہوں گے کہ ہم ڈپریشن کی ایسی بیماری کی طرف بڑھ رہے ہیں جو بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے اور ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ پانچ سے سات سال کی مدت میں یہ بیماری لوگوں میں ایسے پھیل جائے گی جیسے کینسیا الیزکی بیماری ہے۔

اس ذاتی بیماری کا سد باب کرنے کے لیے میں اور لوگوں کے لیے بھی دعا گو ہوں لیکن اپنے ملک اور اس کے باشندوں کے لیے یہ ضرور تمنا کرتا ہوں کہ اللہ نہ کرے ہم ڈپریشن کی بیماری میں شدت سے بہلا ہو جائیں۔ جس کی نشاندہی دنیا بھر کے ڈاکٹر چیخ و پکار کر کے کر رہے ہیں۔ ہمیں ایک ہی ذات اور نبی اکرمؐ کی رہنمائی کا سہارا ہے جو ہر وقت ہمارے ساتھ ہے اور یہ سہارا ہمارے پاس ہے۔ اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک ہم اللہ پر اتنا بھروسہ نہیں کرنے لگیں گے جتنا کفر مانے والوں نے فرمایا ہے کہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔

میرے بڑے بڑی ہی آسان زندگی گزار گئے۔ وہ کہتے تھے کہ یہ جو سب کچھ ہو رہا ہے یہ

خاص سیم کے تحت ہو رہا ہے جبکہ میں بدنصیب کہتا ہوں گہوتا ہے تو ہوتا ہے لیکن میں اس میں اپنی عقل اور دانش ضرور استعمال کروں گا اور اس عذاب میں ضرور بہتلا ہوں گا جس کا وسط تو پورے طور پر ہو چکا ہے اور تم اس کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔ ہمیں روحانیت کی ریقاام کرمادیت کی زمین کے اوپر چلنے کی بڑی اشد ضرورت ہے لیکن ری وہی تھامنی پڑے گی اسی میں نجات ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”زندگی سے پیار کی اجازت درکار ہے“

چھلے دنوں کچھ ایسے بوجھ طبیعت پر ہے ان کچھ اور چند دنوں کو میں اگر پھیلاوں تو وہ بہت سارے سالوں پر محیط ہو جاتے ہیں لیکن اللہ کا اصل ہے کہ ہماری اجتماعی زندگی میں دو ماہ ایسے آئے کہ بوجھ میں کچھ کمی کا احساس پیدا ہوا اور یوں بھی چاہا کہ ہم بھی زندوں میں شامل ہو جائیں اور جس مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ زندگی پر کر رہے ہیں اس سنجیدگی میں کچھ کمی پیدا کریں۔ ہم سے بڑوں نے بھی خود کو خوش کرنے کے لیے خوش بخختی کا سامان بھم کیا تھا لیکن بدستقی سے وہ سارے یہی سمجھتے رہے کہ اگر ہمارے پاس ڈھیر ساری دولت ہوگی تو ہم خوش ہوں گے۔ ان بڑوں نے یہی درشتاپنے پھوپھوں میں منتقل کیا۔ ہمارے طالب علموں کو بھی یہی بتایا گیا کہ بہت سارے پیسے اور اقتصادی طور پر مضبوط مستقبل ہی خوشی ہے۔ ان مادی خوشیوں کو سمجھتے سیئتے اب حالت یہاں تک آن پیشی ہے کہ صورت حال نہایت تکلیف دہ ہو گئی ہے۔ آپ آئے روز اخباروں میں نیب کے بنائج پڑھتے ہوں گے کہ فلاں شخص سے 5 یا 8 کروڑ واپس لے لیا گیا۔ یہ ہمارے وہ پیسے تھے جو لوگ لے کر بھاگ گئے تھے۔ یہ بڑی دردناک کہانی ہے۔ میری تھنا اور آرزو ہے کہ ہم کاش ایسا بھی سوچنے لگیں کہ بہت زیادہ سنجیدگی کی دنیا سے نکل کر تھوڑی سی آسانش کی طرف بھی توجہ فرمائیں خواتین و حضرات آسانش خالی پیسے کے جمع کرنے یا اپنی ذات کو مضبوط کرنے سے میرنہیں آتی۔ تھنڈی تھنڈی ہوا کو محسوس کرنے میں، گلتانوں کی سیر کرنے اور چیلوں کو دیکھنے میں بھی اتنی خوشی ملتی ہے جس کا اندازہ کرنا ہم شاید بھول گئے ہیں۔ میں ایک مرتبہ لاہور سے قصور جارہا تھا تو ایک پلی پر لڑکا بیٹھا ہوا تھا اور اس پلی کوڈا نڈے سے بجارتھا اور آسان کو دیکھنے میں مخوچتا۔ مجھے بحثیت ایک استاد کے اس پر بڑا غصہ آیا کہ دیکھو وقت ضائع کر رہا ہے اس کو تو پڑھنا چاہیے۔ خیر میں وہاں سے گزر گیا۔ تھوڑی دور آگے جانے کے بعد مجھے یاد آیا کہ جو قاتلیں اور کاغذات میرے ہمراہ ہونے چاہئیں تھے وہ نہیں تھے لہذا مجھے لوٹ کر دفتر جانا پڑا۔ میں واپس لوٹا تو وہ لڑکا کام پھر ڈنڈا بجارتھا۔ مجھے اس پر اور غصہ آیا۔ جب میں وہ کاغذات لے کر واپس آ رہا تھا تو تباہی اس

لڑکے کی کیفیت دیکھی ہی تھی۔ میں نے دہاں گاڑی روک دی اور کہا ”یار دیکھو تم یہاں بیٹھے وقت ضائع کر رہے ہو تمہاری عمر کتنی ہے۔“

اس نے بتایا کہ تیرہ یا چودہ سال ہے۔ میں نے کہا کہ تمہیں پڑھنا چاہیے۔ وہ کہنے لگا جی میں پڑھنا نہیں جانتا۔

تب میں نے کہا کہ تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو۔ میرے خیال میں فضول میں اپنا اور قوم کا وقت ضائع کر رہے ہو، تمہیں شرم آئی چاہیے۔

وہ کہنے لگا جی میں تو یہاں بیٹھا بڑا کام کر رہا ہوں۔ میں نے کہا آپ کیا کام کر رہے ہیں۔ کہنے لگا جی میں چڑی کو دیکھ رہا ہوں۔ یہ وہی چڑی ہے جو پچھلے سے پچھلے سال ادھر آئی تھی اور اس نے بیہیں گھونسلا ڈالا تھا۔ جب اس کے ساتھ کوئی اور چڑا تھا اب کی بار یہ شاید اور کسی سے شادی کر کے آئی ہے۔

میں نے کہا کہ تم کیسے پچھانتے ہو کہ یہ وہی چڑیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں اس کو پچھانتا ہوں۔ یہ مجھے پچھانتی ہے۔ مجھے اس کی بات سن کر پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ میرے ملک میں ایک اور نئی تھا لو جست بھی ہے۔

(The person who knows the details of the Birds.)

اس کا گوکوئی گائیڈ نہیں ہے۔ یہ کسی یونیورسٹی سے یہ مضمون نہیں پڑھا ہوا کیونکہ ہماری کسی یونیورسٹی میں یہ Subject نہیں پڑھایا جاتا ہے۔ میں چونکہ شرمندہ ہو چکا تھا اور میں اس سے کہہ دکا تھا کہ تم بڑا وقت ضائع کر رہے ہو اور فضول کام میں لگے ہو اور اب میں نے اپنے موقف سے نہ بیٹھے ہوئے اور شرمندگی نالتے ہوئے کہا کہ یا تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔ میری طرف دیکھو میں کیسی اچھی گاڑی میں ہوں اور میں اپنی ایک مینگ میں جا رہا ہوں۔ لوگ مجھے اجلاؤں میں بلاتے ہیں اور میں تم سے بڑے درجے میں ہوں اور یہ اس وجہ سے ہے کہ میں تعلیم یافتہ ہوں اور تم نے گویا تعلیم حاصل نہیں کی ہے اور تم فضول لڑکے ہو۔

وہ میری بات سن کر نہیں کہنے لگا ”صاحب جی بات یہ ہے کہ ہم تم دونوں ہی برابر ہیں۔ میں اس پلی پر بیٹھا بھاگتی ہوئی موڑیں دیکھ رہا ہوں۔ آپ موڑ میں بیٹھے ہوئے پلیاں بھاگتی ہوئی دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے بھی کچھ زیادہ اکٹھا نہیں کیا۔

خواتین و حضرات! کبھی کبھی اس لڑکے کی بات مجھے یاد آ جاتی ہے۔ میں نے اب حال ہی میں پچھلے سے پچھلے بختے یہ فیصلہ کیا کہ اتنی زیادہ Rigid خشک اور اتنی زیادہ سنجیدہ زندگی بسر کرنے کی نتوانگی اور اس طور پر ضرورت ہے اور نہ ہی اجتماعی طور پر ضرورت ہے بلکہ ہمیں ڈھیلے ذھالے اور پیارے

پیارے آدمی ہو کر Relax رہنے کا فن سیکھنا چاہیے۔ خواتین و حضرات اگر آپ مجھ سے میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی پوچھیں تو میں آپ کو بتاؤں گا کہ جب میں سیکنڈ ایز میں تھا تو لا ہور میں (جو لوگ لا ہور کو جانتے ہیں انہیں پتہ ہے کہ نسبت روڈ اور میکلوڈ روڈ کا ایک چھوٹی سی سڑک ملاتی ہے اور وہ سڑک بالکل دیال سنگھ کالج کے سامنے ہے) دیال سنگھ کالج کے پاس ایک طوائی کی دکان ہوتی تھی جو سموے بیچتا تھا۔ تب اس کے سموے پورے لا ہور کے ہنگلے ترین ہوتے تھے اور وہ تین آنے کا ایک سموہ بیچتا تھا۔ اس کے سموسوں کی خوبی یہ تھی کہ ان میں آلوکی بجائے مژر کے سربزدا نہ ہوتے تھے۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد کسی نے اس طرح کے مژر کے سموے بنائے ہی نہیں ہیں شاید۔ ہم سب دوستوں کی بڑی آرزو ہوتی تھی کہ ایک عدو سوسا ایک دن میں ضرور کھایا جانا چاہیے اور ہماری بد قسمی یہ ہوتی تھی کہ میری ماں مجھے کالج جانے کے لیے دو آنے دیتی تھی۔ اب دو آنے میں ایک آنڈھلا ناخاص مشکل کا مام تھا۔ ہم تین آنے اکٹھے کرنے کے چکر میں پڑے رہتے تھے اور وہ ایک سموہ کھاتے بھی دوستوں سے نظر بچا کے تھے کیونکہ جود دست دیکھ لیتا ہو تو پھر حصے دار بن جاتا تھا۔ ہم اس تین آنے میں میسر آنے والی عیاشی سے بڑے لطف اندوں ہوتے تھے اور آج سماں برس سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی ہم یاد کرتے ہیں کہ عیاشی کے جو لمحے تھے اور میری افسانہ زگاری ناموری اور ڈرامہ زگاری کے لحاظ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ اگر کالج کی زندگی سے بھی ذرا پیچھے جاؤں تو اور خوشی کے لحاظ آتے ہیں۔ ابھی کل ہی میری پوتیاں پوتے مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ دادا نانا آپ کی زندگی کا سب سے خوبصورت دن کونسا ہے۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ میں دوسری جماعت میں پڑھتا تھا اور میں تب خوش خط تختی لکھا کرتا تھا اور مجھے بھی کبھی اس خوش خط پر ایک یادو پیسہ انعام بھی ملتا تھا اور تب بھی اتوار کی چھٹی ہوتی تھی۔ ایک دن میری ماں نے مجھے بتایا اور ان کی یہ بات سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے چتری مرغی کے نیچے اندھے رکھے ہیں اور وہ انہیں سی رہی ہے۔ اکیس دن کے بعد ان اندھوں سے چوزے نکلیں گے اور وہ تمہارے کھینے کا سامان ہو گا۔ تم ان چوزوں سے کھیلا کرنا۔ میں نے ماں سے کہا کہ مجھے اندریشہ ہے کہ یہ کسی ایسے دن نکلیں گے جب میں سکول میں ہوں گا۔ میری ماں نے کہا کہ تم گھبراو میں نے مرغی کے نیچے اندھے اس حساب سے رکھے ہیں کہ اتوار کی صبح کو ہی چوزے نکلیں گے اور وہ تمہارا چھٹی کا دن ہو گا۔ تم ان سے خوب کھیلنا۔

خواتین و حضرات! جب وہ نیچے نکل وہ ہفتے کا دن تھا۔ میں خوش خط لکھی تختی لے کر جب سکول جانے لگا تو میری ماں نے مجھے خوشخبری دی کہ ”اشفاق چوزے نکل آئے اور چھا بھی نکلے ہیں باقی نکل رہے ہیں۔“

پیارے بچوآپ اندازہ نہیں لگا سکتے اس وقت میرے دکھ اور میری ما یوس کا۔ کیونکہ چوزے

نکل آئے تھے اور میں سکول جا رہا تھا اور میں نہ انہیں انڈوں سے لکھتے ہوئے ویکھ سکتا تھا اور نہ ان کے پاس سارا دن بیٹھ سکتا تھا۔ میں نے رنجیدہ ہو کر کہا ”ماں تو نے تو کہا تھا کہ اتوار کو نکلیں گے آج تک ہفتہ ہے۔“

میری ماں نے مجھ سے کہا کہ میئے جب چوزے نکل آتے ہیں تو ہفتہ بھی اتوار ہو جاتا ہے۔ تیرے لیے بھی آج اتوار ہی ہے۔ تختی بستہ رکھ دے سکول نہیں جانا۔ وہ دن آج تک میری زندگی کا خوبصورت دن ہے اور مجھے یاد ہے کہ وہ ہفتہ کیسے اتوار بن گیا اور وہ سارا دن میں نے کتنی خوشی کی لہر میں گزارا۔ میں اسے باوصف اس لینے نہیں بھول سکتا کہ مجھے زندگی میں بڑی کامیابیاں ملیں۔ میرے لیے بڑے بائے بچے بڑے کمرے سجائے گئے لیکن اس خوشی کا میں آپ کو ترجمہ کرنے کے نہیں تسلکتا، اس کی ترجمانی نہیں کر سکتا۔

ہمیں ایسی خوشیوں کی طرف رجوع کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اب میں نے پچھلے دو ہفتوں سے یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ فیصلہ اپنے مشاہدے کی بنا پر کیا ہے کہ زندگی پر تھوڑا اختیار تو ہونا چاہیے یا اس پر کثری و حاصل کرنا چاہیے۔ یہ تو اپنی مرضی سے چلی آ رہی ہے۔

Life is Bigger than Life

میرا یہ مشاہدہ یہ دیکھ کر ہوا کہ یوٹیوٹی بلز جن کے بارے میں آپ بروتے پھرتے ہیں۔ یہ آپ تک 24 گھنٹے کے اندر اندر پہنچ جاتے ہیں لیکن وہ چیک جو آپ کی تخلوہ یا محنت کا پیسہ ہوتا ہے وہ ایک ماہ سے پہلے آپ تک نہیں پہنچتا۔ بعض اوقات تو ایک مہینے سے بھی زیادہ عرصہ لگ جاتا ہے۔ سخیز بک والوں کا کہنا ہے کہ دنیا کے تین بڑے جھوٹوں میں سے ایک جھوٹ یہ بھی ہے کہ ”جی ہم نے آپ کا چیک روانہ کر دیا ہے۔ وہ بس آپ تک پہنچنے ہی والا ہو گا۔“ حالانکہ چیک نہیں پہنچتا۔ میرے پوتے پوتیاں اور ان کے سکول کے باقی دوست ایک ہی موڑ پر آتے ہیں اور راستے میں وہ اپنے دوستوں کو ان کے گھروں میں چھوڑتے آتے ہیں لیکن میرے پوتیاں پوتے گھر آ کر اپنے انہی دوستوں سے فون کر کے بات کرتے ہیں اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیتے ہیں حالانکہ ابھی چند منٹ پہلے وہ انہیں چھوڑ کر آئے ہوتے ہیں۔ جب میں پورا منہ کھولے بڑی تکلیف میں اپنے ڈسٹرکٹ کے آگے بیٹھا ہوتا ہوں تو وہ بار بار مجھ سے پوچھتا ہے کہ ”اشفاق صاحب تکلیف تو نہیں ہو رہی۔“ اور وہ ایک ایسے وقت پر پوچھتا ہے جب نہ میں بول سکتا ہوں تھے میں سر ہلا سکتا ہوں۔ بس زندگی بھی کچھ اسی ڈسٹرکٹ اور مریض کی طرح ہے۔ اب میں نے جو دو ہفتوں سے سوچ رہا ہوں تو بڑے اعتدال پسندی کے موڑ میں ہوں۔ آپ پر بڑی نیچھوٹوں اور بابوں کی بات کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ میری سوچ کی طرح آپ بھی سیر کریں۔ پرندوں بارے غور کریں۔ اچھا سوچیں کیونکہ جب تک آپ کے اندر کی

Dور نہیں ہوگی باہر کی تو بالکل ختم نہیں ہوگی۔ پہلے اندر کی صفائی ہونی چاہیے۔ اب میں نے Pollution فیصلہ کیا ہے کہ میں اب زندگی میں Relaxed Dieting کرنے کی کوشش کرتا رہا اور میرے ساتھ اور بھی عورتیں، لاکیاں لڑکے زور لگاتے رہے گیں وہ ڈائیننگ نہیں کر سکے کیونکہ یہ دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ پتہ نہیں یہ کیوں نہیں ہوتا۔ میری آپا ریس ایک دن اپنے خادم سے کہنے لگیں کہ ”ارشد آپ کو ڈائیننگ کرنی چاہیے دیکھیں نا۔ آپ چلتے ہوئے ایسے لگتے ہیں جیسے دو آدمی چل رہے ہوں۔“ لہذا ارشد بھائی نے ڈائیننگ شروع کر دی۔ پھر دو ماہ کے بعد کہنے لگیں کہ آپ تو آم کی گھٹلی کی طرح سے چوستے ہوئے لگتے ہیں۔ آپ اپنا چہرہ آئینے میں دیکھیں تو سہی آپ نے اتنی لمبی اور خوفناک ڈائیننگ کیوں کر لی۔

ارشد بھائی کہنے لگے رضیم تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم کو میری کون سی ساییدہ سے محبت ہے۔ کبھی تم موٹاپے پر تفہید کرتی ہو تو کبھی دبلے پن پر۔

خواتین و حضرات ڈائیننگ مشکل کام ہے اور اگر اب میرے پوتے پوتیاں مجھے کہیں گے کہ نانا آپ چوڑائی کے رخ پھیلتے جا رہے ہیں تو میں کہوں گا کہ اب تو میں چوڑائی کے رخ ہی پھیلوں گا۔

"Let Me Relax"

میں نے دوسرا فیصلہ یہ کیا ہے کہ میری میز پر جو گند پڑا ہوتا ہے جو بٹوٹی سرخیں جن سے میں پین میں سیاہی ڈالتا ہوں، پرانے پین، پھٹی پرانی کتابیں اور سوکھی دواتیں پڑی ہوئی ہیں۔ یہ میں اب دیسے ہی پڑی رہنے والے دوں گا۔ میں صفائی نہیں کروں گا۔ میری بے ترتیبی اور صفائی نہ کرنے پر میری بیوی مجھے کہا کرتی ہے کہ کیا یہ پڑھے لکھے لوگوں والا کام آپ کرتے ہیں کہ کسی چیز کی آپ کو خبر ہی نہیں ہے اور میں اس کی باتیں سن کر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں شرمندہ بھی نہیں ہوں گا۔ میں آپ سے بھی بھی درخواست کروں گا کہ آپ بھی اپنی شرمندگیوں کو اپنے دکھوں اور دباو کو کم کرنا شروع کریں اور ایک آزاد اور ہلکی چھکلی زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں۔ خواتین و حضرات میرے سر پر کچھ کتابوں کا بوجھ تھا کہ یہ ضرور پڑھنی ہیں اور ختم کرنی ہیں۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ میں History Of God کے ساتھ ساتھ مولا ناروم کی مشنوی بھی شروع کر دوں گا لیکن اگر اب یہ ختم نہیں ہوتی ہیں نہ تو نہ ہوں۔ میں اس بات پر ملاں نہیں کروں گا اور کسی پریشانی کا اعلہا نہیں کروں گا کیونکہ بلا وجہ کا اتنا سارا بوجھ لے کر میں کیا کروں گا۔

(پروگرام میں شریک ایک خاتون سوال کرتی ہیں)

سوال:- اگر ہم اپنی ذات کو عذاب میں بچانا نہیں کریں گے اس وقت تک ہم کامیاب زندگی

کیسے بسر کریں گے؟

اشفاق احمد: میرے ارد گرد کامیاب زندگی بسر کرنے والے بہت سے لوگ ہیں جنہوں نے زندگی سے پیار نہیں کیا بلکہ کامیابی سے پیار کیا ہے۔ جب آپ زندگی کو کامیابی سے علیحدہ کر دیتے ہیں اور زندگی کو مقفل کر دیتے ہیں اور صرف کامیابی کو پکڑ لیتے ہیں تو پھر آپ کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ابھی ماضی قریب میں ہم نے دیکھا کہ ہم لوگوں نے بہت پیسے اکٹھے کر کے اپنی زندگیاں بنا کیں پھر ان پر بد عنوانی کے مقدمات چلے اور پھر ان کی گردنیں ناپی گئیں۔ کامیاب ہونا اور چیز ہے زندگی کے ساتھ وابستہ رہنا الگ چیز ہے۔ بے شک بچوں کو ہم سب استاد یہی کہتے ہیں کہ عذاب میں بٹلا ہوئے بغیر کامیاب نہیں لیکن آج میں آپ لوگوں کے سامنے اپنادل کھول کے لایا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں کامیاب بھی ہوں اور میری زندگی بھی خوبصور اور ضمیر بھی مطمئن ہو۔ صرف کامیاب یہی کامیاب نہ ہو۔ ترقی اور فلاخ میں بھی زمین آسان کا فرق ہے۔ ترقی فلاخ نہیں ہے فلاخ کے اندر ترقی موجود ہے۔ خالی ترقی آپ کا ساتھ نہیں دے گی۔ اب میں نے یہ جو فیصلے کیے ہیں یہ آپ کی مرضی کے بغیر کیے ہیں لیکن آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں اور کہیں کہ ”ٹھیک ہے بابا آپ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزاریں لیکن اس میں فلاخ کا رخ ہو اور میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ انشاء اللہ تعالیٰ اب میری زندگی میں فلاخ کا رخ ضرور ہوگا۔ میں صرف ترقی کی طرف جانے والا نہیں ہوں گا۔ اگر میں خالی ترقی کی طرف جاؤں گا تو پھر میں ذیزی کمز (وہ تباہ کن جو امر یکہ نے افغانستان میں استعمال کیے) بناوں گا۔ پھر میں تو رابورا کوفا کر کے ریت میں تبدیل کر دوں گا۔ مجھے ایسی ترقی نہیں چاہیے۔ مجھے زندگی سے پیار کرنے کی اجازت دیں اور میں بھی آپ کو یہ اجازت دیتا ہوں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ خدا حافظ۔

”نظر بدر“

ہم اہل زاویہ کی طرف سے آپ سب کی خدمت میں مجت بھر اسلام پہنچے۔

میں ایک تھوڑے سے دکھی دل کے ساتھ طبیعت پر بوجھ لے کر آپ سے بات کر رہا ہوں اور امید ہے کہ آپ بھی میرے اس دکھ میں شرکت فرمائیں گے۔ ایک زمانے میں جب میں بہت چھوٹا تھا تو میری بڑی آپا جو نظر بدر پر بڑا اعتقاد رکھتی تھیں میں اس وقت باوصف کہ بہت چھوٹا تھا اور میں بھی نظر و ظر کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا تھا لیکن چونکہ میرے بڑے بھائی مجھے سیر کے لیے اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور میں نیلی نیکر پہن کر اپنے سنہرے بالوں کے ساتھ ”بادا“ سا بنا ہوا ساتھ چلتا تھا تو میری بڑی آپا کہتی تھیں کہ بھروسے اس کے ماتھے پر تھوڑی کالک لگا دوں کہ کہیں نظر نہ لگ جائے لیکن میں ان کے اس عمل سے بڑا گھبرا تا تھا کیونکہ گھرانوں میں نظر بدر کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ میں کالک لگانے سے گھبرا تا کہ میرے ماتھے پر کالک کیوں لگائی جاتی ہے؟ میری چھوٹی آپا اس پر کوئی یقین نہیں رکھتی تھیں اور جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا تو مجھے پتہ چلا کہ یہ ماتھے پر کالک نہیں لگاتے بلکہ اس طریقے سے نظر اتاری جاتی ہے۔ میری ماں سرخ مرچیں لے کر انہیں جلتے ہوئے کوئی لوں پر رکھ کر کہا کرتیں کہ اگر ان کے جلنے سے بدبو آتی ہے تو نظر ہے اگر نہیں آتی تو پھر نظر نہیں ہوئی ہے۔ میرے والد صاحب اور میرے بھائی ان کے اس اعتقاد پر بہت ہنسا کرتے تھے کہ یہ کیا فضولی بات ہے۔ نظر نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ میری تانی کہتی تھیں کہ تمہارے ماموں اعجائز اور تمہاری مہماں رضیہ جو منگورہ (سوات) میں اس وقت موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے جب ایک درخت ان کی کار پر آن گرا، انہیں نظر نہ لگ گئی تھی۔ اس بارے میری ماں بتاتی تھیں کہ ہم نے ماں کو ایسے ہی بتایا ہے۔ ان کی کار پر کوئی درخت و رخت نہیں گرا تھا بلکہ سڑک کنارے ایک بلدوزر کھڑا ہوا تھا۔ جب ان کی کار گزری تو اس بلدوزر کا مٹی اٹھاٹے والا بھاری بھر کم ”چچی“ عین اس وقت ان کی گاڑی پر گر گیا جب موڑ اس کے نیچے سے گزر رہی تھی۔ ایسی بہت سی کہانیاں زندگی میں چلتی رہتی ہے۔ آپ نے بھی سنی ہوں گی لیکن ہم تعلیم کی وجہ سے ایسی کہانیوں پر کچھ زیادہ اعتماد نہیں

کرتے۔ ایک وقت ایسی صورت حال میری زندگی میں بھی پیدا ہوئی جب میں بڑی برقی طرح سے نظریا گیا۔ میں بڑا ہو چکا تھا اور پڑھ لکھ چکا تھا۔ یونیورسٹی سے فارغ التحصیل ہو چکا تھا۔ اس واقعہ میں مجھ پر اس قدر بوجھ پڑا کہ میں نے گھبرا کر اور سر جھکا کے اس بات کا اعلان کیا کہ واقعی نظر بد کوئی چیز ہے اور نظر لگانے والا بڑے اہتمام کے ساتھ Plan کرنے نظر لگاتا ہے۔ یہ نہیں کہ نظر اتفاق سے لگ گئی۔ نظر لگانے والا اندر سے بڑا کینہ پرور ہوتا ہے اور بے ایمان ہوتا ہے۔ ہم 1950ء کے قریب پہلی مرتبہ مشرقی پاکستان گئے۔ ہم نے چار پانچ دن وہاں گزارے اور پہلی مرتبہ ہم نے جی بھر کے کیلے کھائے۔ جب ہمارا وہاں سے لوٹنے کا پروگرام ختم ہوا تو ہمارا وہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایسی محبت والے لوگ تھے جو خود بھی نہیں چاہتے تھے کہ ہم واپس جائیں لیکن ہمیں مجبوراً واپس آنا پڑا۔ اللہ نے ہماری خواہش ایک بار پھر پوری کی کہ ہمیں تقریباً آٹھ ماہ کے بعد دوبارہ وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہم بہت سارے شاعر، ادیب اور رائٹر تھے جو وہاں ایک اجلاس میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ ہمیں وہاں حد سے زیادہ محبت ملی اور ہمارے وہ بھائی ہمیں ایسی چیزیں کھانے کو دیتے جو ہم نے پہلے کبھی دیکھی بھی نہیں تھیں۔ بنگال اکیڈمی والوں نے مجھے کہا کہ اشفاق صاحب ہم نے آپ کے لیے یہ ایک بہت بڑا پھل رکھا ہے جو تاریخ سے بھی بڑا تھا۔ انہوں نے مجھے کہا کہ آپ اس کو کام لیکن اسے آپ احتیاط سے کامیں کیونکہ یہ چیजھی پڑ جاتا ہے۔ اسے ”کٹھل“ کہتے تھے۔ جب میں نے اسے چھری سے کامنا شروع کیا۔ میں نے ایک آدھ بار تو چھری چلانی لیکن اس نے واقعی میرے دونوں ہاتھوں کو دیہیں سے پکڑ لیا جہاں پر تھے۔

دنیا کی اگر کوئی پاؤ فل گوند یا گلکو اگر کہیں سے ملتی ہے تو وہ ”کٹھل“ سے نکلتی ہے۔ وہ سب ہمیں کہتے تھے کہ کوئی داڑھی والا آدمی اسے نہ کامل کیونکہ اگر اس کا کام نہ ہوئے ہاتھ داڑھی کو لگ گیا تو وہ ساری نوج کے نکالنی پڑے گی۔ اس کے سوا اور کوئی چارہ ہی نہیں ہوگا۔ وہاں ہم نے خوب کٹھل کھایا۔ میں نے اپنے استاد غلام مصطفیٰ تبّم سے کہا کہ جی میں ہوٹ سے میچ گیا تھا اور آپ کے لیے یہ انسان لایا ہوں۔ میں نے دو انساس کو دھاگے کے ساتھ باندھ کے لٹکا رکھا تھا۔ وہ کہنے لگے تو ان کو کیوں لے آیا۔ میں نے کہا سریہاں آئے ہیں تو انساس تو کھائیں گے۔
وہ پوچھنے لگا کہ کتنے کے آئے؟

میں نے جواب دیا جی۔ ایک روپیہ دس آنے کے یہ دو انساس آئے ہیں۔
وہ غصے میں آ کر کہنے لگے اسے کاٹے گا تیرا باپ۔ ہم کو تو پتہ ہی نہیں کہ انہیں کیسے کاٹا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ جی میں وہ بھی ”سامی“ (ٹے کر کے) گا کے آیا ہوں ابھی ہوٹ میں کام کرنے والا لڑکا اور آئے گا اور وہ دو مزید انساس بھی لا رہا ہے۔

وہ کہنے لگے ارے برباد ہو جائیں گے۔ میں نے کہا جتاب انہیں فریج میں رکھیں گے اور شوق سے کھائیں گے ایسا موقع بار بار کہاں ملتا ہے۔ چنانچہ وہ لڑکا آیا اس نے کاٹ کے طشیری میں رکھ دیئے۔ ہمارے وہاں قیام کے وقت ہمارے لیے اور ہمارے پیارے میزبانوں کے لیے یہ ایک عید کا سامان تھا۔ وہاں محبت کی اتنی بڑی دنیا آباد ہو گئی تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں اس سے پہلے محبت کا ایسا مظہر نہیں دیکھا تھا۔

وہاں پر ایک بی بی جس کا ادمنام تھا اس نے ہمیں علامہ اقبالؒ کی ایک نظم:

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن

مجھ کو پھر افسانوں پر اکسانے لگا مرغِ چن

نالی۔ ایسی خوبصورت آواز اور اچھی انداز میں میں نے یہ نظم نہیں سنی۔ اس موقع پر مجھے انشاء جی کہنے لگے کہ ہمیں شرم آئی چاہیے اور ہمیں بھی کچھ آنا چاہیے۔ یہ اقبالؒ کی نظم کتنے اچھے انداز میں گاری ہے۔ ہم نے اپنے پیرے سے کہا کہ یا رہمیں بھی کچھ گانا سکھا دو چنانچہ ہم نے پہلا گانا مشرقی پاکستان میں اپنے پاکستانی بھائیوں سے سیکھا وہ یہ تھا:

اللہ میک دے پانی دے چھایا دے تو ای

حو اللہ میک دے پانی دے چھایا دے تو ای

(گانے کے انداز میں)

ہم یہ شعر تو گا کر کہہ لیتے تھے لیکن ”اللہ“ کہنے کا خوبصورت انداز صرف انہی کو آتا تھا۔ خواتین و حضرات کیا آپ نے کبھی کسی سندھی کو ”اللہ“ کہتے ہوئے سنائے۔ جب کوئی سندھی اپنی کسی نظم میں یا کلام میں ”اللہ“ کہتا ہے تو میں اس پر قربان ہو جاتا ہوں یعنی میرے میں طاقت ہی نہیں رہتی۔ میں نے ”اللہ“ کا اُچارن ”اللہ“ کا تلفظ اور اس لفظ کی قرأت ان سے زیادہ خوبصورت انداز میں سوائے سندھیوں کے کسی کے مند سے نہیں سنی۔ ایسے ہی ہمارے مشرقی پاکستان کے بھائی وہ ادا کرتے تھے۔ ہم نے وہاں سائیکلیں لے لیں۔ وہ اپنا گھر تھا اور میزبان اپنے بھائی تھے۔ ہم صح سویرے سائیکلیں لے کر نکلتے اور سائیکلیں چلاتے ہوئے گانا گاتے پھرتے تھے۔ جس کا ترجمہ کچھ اس طرح سے تھا:

”اے اللہ، ہم تو تیرے بندے ہیں اور تیر انام بار بار لیتے ہیں۔“

ہم سب اپنی اپنی اوپنجی، پنجی اور پیٹھی آوازوں میں گانے گاتے پھرتے تھے۔ ہمارے ساتھ گانے والے احمد راہی کی آواز تو بالکل ہی پیٹھی ہوئی تھی۔ ہم جب وہاں شہر میں گاتے پھرتے تھے اور شہر کا چکر لگاتے تو پتہ چلتا کہ جیسے جسم میں تو انہی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے اور میں نے اس وقت یہ بھی

محسوس کیا کہ ایک تیسری آنکھ جو نظر بدوالی آنکھ کہلاتی ہے وہ ہم لوگوں کو دیکھ رہی ہے۔ میں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ وہ آنکھ ہم پر اثر انداز ہو رہی ہے اور اس آنکھ نے باقاعدہ Plans کر کے منصوبہ بندی کر کے ہمار درمیان تفریقہ ڈالا اور یہ آپ سب کو معلوم ہے مشرقی پاکستان کی سرحد سے تقریباً پچھاس ساٹھ میل کے فاصلے پر ایک شہر ہے۔ خواتین و حضرات براعظہ ایشیاء کے اندر اگر کوئی دہشت گردی کا مرکز پہلی مرتبہ قائم ہو تو وہ اس "اگر تلہ" شہر میں ہوا۔ وہاں تیسری آنکھ نے بڑی ہمت سے بڑی محنت کر کے ہمارے درمیان نفرتیں بھی پچھلائیں۔ غلط فہمیاں بھی پچھلائیں اور اس سے وہ تانا بانا بنا کر وہ دہشت گردی نہ صرف اس علاقے میں رہی بلکہ وہاں سے پھیلتی پھیلتی دوسرے علاقوں میں بھی چلی گئی۔ وہاں سے نکل کر سری لنکا میں بھی چلی گئی وہاں کے نرینڈ کیے ہوئے دہشت گرد باہر نکل کر دوسرے علاقوں پر حملہ آور ہوتے اور پر سکون زندگی گزارنے والوں کو ذلیل و خوار کرتے پھر انہوں نے میرے ہی ان بھائیوں کو جن کے ساتھ مل کر ہم گانے گاتے تھے جن میں ہم نے قدرت اللہ شہاب کو بھی ملا لیا تھا اور ہم وہاں سے میٹھا دہی کھایا کرتے تھے اور اس دہی کے بڑے بڑے بھرے ہوئے "کونڈے" جہاز میں رکھ کر لا ہو رہی لے آئے تھے۔ (وہ اس دہی میں بھوکار کا شیرہ ڈالتے ہیں اور اس سے اچھی سویٹ ڈش میں نے پہلے یقیناً نہیں کھائی تھی اور نہ آپ نے کھائی ہو گی)۔ ان کے اور ہمارے والوں میں غلط فہمیاں ڈال دیں اور اس تیسری نظر بدوالی آنکھ نے وہیں سے ہمارے اپنوں دوستوں جانے اور چاہنے والوں اور ہماری جان و جگہ کو لیا اور ان کو مکنی باہمی کا نام دے کر ان کی ٹریننگ شروع کی جس میں انہیں فور سز کے آدمی بھی تھے اور انہوں نے بھی مکنی باہمی کی وردياں پہن رکھی تھیں۔ اس تیسری آنکھ کو یہ خوف تھا کہ اگر ان دونوں (مشرقی و مغربی پاکستان) کے درمیان محنت اور یگانگت بڑھتی رہی اور یہ ایک دوسرے کے اس شدت کے ساتھ قریب آتے رہے اور دین کے رشتے کے بعد یہ شفافی رشتہوں میں بھی مزید بند ہتے چلے گئے تو پھر ہمیں انہیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرننا یا "لکھریتا" یہ مشکل ہو جائے گا چنانچہ انہوں نے منصوبہ بندی کر کے اور دنیا کے دوسرے ملکوں کو ساتھ ملا کے یہ پروگرام بنایا کہ کسی طرح سے اس رشتے کو توڑ دیا جائے۔

انہوں نے جو سب سے بڑا کام کیا وہ یہ تھا کہ اس تیسری نظر بدوالی آنکھ نے ہمیں اپنی ہی نگاہوں میں پامال بھی کر دیا۔ شرمندہ کر دیا۔ سارا بوجھہ اور الزام اٹھا کر ہمارے اوپر رکھ دیا اور ہم وہ سارا بوجھا بھی تک اٹھائے پھرتے ہیں۔ یہ ان کا بہت بڑا کمال ہے۔ اس شرمندگی نے کس طرح سے آپ پر اور آپ کی نفیات پر اثر ڈالا ہے یہ وہ لوگ بڑی اچھی طرح سے جانتے ہیں لیکن ایشیاء کے اور پاکستان کے لوگ نہیں جانتے صرف ہندوستان کے لوگ ہی جانتے ہیں کہ دہشت گردی کا جو پہلا اڈا اور مرکز قائم ہوا وہ کہاں قائم ہوا تھا۔ جہاں سے دہشت گردی کی شاخیں پھوٹی تھیں۔ جب آپ

دہشت گردی کا نام لیتے ہیں اور دہشت گردی کی بات کرتے ہیں تو ان کا پسلام مقام ”اگر تله“ ہی تھا اور وہ دہشت گردی کا پودا اب تک پھیلتا چلا جا رہا ہے۔ جیرانی کی بات یہ ہے کہ ہم جو مظلوم و معہور ہیں جن پر ظلم کیا گیا ہے اور پوری دنیا یا گلوب میں پاکستان واحد ملک ہے جو دہشت گردی کا شکار ہوا اور اس کا ایک حصہ دہشت گردی کے زور پر جدا کیا گیا۔ یہ نظر بند یونہی نہیں لگ جاتی اس کے لیے خاص منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔ ہم جو بھائی آپس میں ملتے تھے ”محبیاں“ ڈالتے تھے مل کر کبھی نہیں اور کبھی بُرے ہو کر گاتے تھے وہ سارے کے سارے ملیا میت ہو گئے۔ (اس موقع پر اشراق احمد بن گلزار بان میں کوئی محبت اور دوستی کا گیت گاتے ہیں۔) اب لوگ چلتے تو پھرتے ہیں اور ابلاغ کا ایسا زور ہے کہ بہت سے لوگ حق مجید یہ مانے لگے ہیں کہ شاید پاکستانی بھی دہشت گرد ہیں۔ ہمیں ہر روز دہشت گرد باور کرایا جاتا ہے اور ہم ہر روز شرمندگی کی آنکھوں پر اپنی حاجت کا ہاتھ رکھ کر گھروں میں داخل ہوتے ہیں اور باہر نکلتے ہیں۔ یہ آخر کیسے اور کس طرح سے ہو گیا۔ اب پھر کون سماں ایسا گناہ اور ترا ناگایا جائے کہ ہمیں اس بات کا احساس نہ ہے ہم ایک بڑی پوری اور زندہ قوم ہیں اور ہم شوکیس پا اور ہیں۔ کسی سے کم تر نہیں ہیں۔ میں اب کس بابے کو جا کر ملوں کو وہ میرے ملک کے بندوں کے دل سے شکوک و شبہات

نکال دے۔

مجھے ہالینڈ میں ایک بھارتی دوست ملے۔ میں نے کہا کہ وہ ایک ظلم تو تم نے کیا اور کمال اور بڑی چالاکی کے ساتھ کیا لیکن یہ فن تم نے کس طرح سے ہماری اجتماعی زندگیوں پر اپلاٹی کیا کہ ہم خود کو ذمہ دار سمجھنے لگے۔

وہ کہنے لگے کہ اگر ہم یکمال آپ کو بات دیں تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جائے گا۔ ہم اب بھی کوشش کریں گے اور کرتے رہیں گے اور آپ کو جیسے نہیں بیٹھنے دیں گے۔ یہ ہمارا منہماں مقصود ہے اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ اگر پاکستان جغرافیائی طور پر ہندوستان سے دور ہو یا مثال کے طور اندرونیشا کے قریب ہو تو پھر ساری دنیا اس ملک کو ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے دیکھے۔ اب یہ ایسی جگہ پر پھنس گیا ہے ایک ایسے ظالم پڑوی کے چکل میں آ گیا ہے کہ یہ جسمانی طور پر تو شاید طاقتور رہے گا اور ہے بھی لیکن نفیاتی طور پر اس شرمندگی سے نہیں نکل سکتا۔ جس میں اسے بھلا کر دیا گیا ہے۔ نظر اور نظر بند کے کئی ایک پہلو ہوتے ہیں۔ میں اس کو تعلیم نہیں کرتا تھا اور ماتھے پر کا لک لگانے کے فلسفے کو نہیں مانتا تھا۔ اب مان گیا ہوں۔

چٹا گانگ میں دریائے ہنگی کے کنارے ایک بزرگ معزال الدین شازی تھے۔ وہاں انہوں نے کٹیا ڈالی ہوئی تھی۔ ہم سب ان کو سلام کرنے لگے۔ اس زمانے میں میں نظر بند کے معاملے کو نہیں مانتا تھا۔ وہ ہم سے بڑی محبت سے ملے۔ سو کھے اور دبلے سے تھے۔ ان میں روحانی طاقت ظاہری طور

پر نظر آتی تھی اور بڑی شاکستہ گفتگو کرتے تھے۔ ہم سے دین ایمان اور تجھتی کی باتیں کرتے رہے۔ ہم جب اجازت لے کر جانے لگے تو انہوں نے اپنی انگلی سے ہمارے ماتحت کے اوپر ایسے کچھ لکھا۔ ہم اس کو ماننے نہیں تھے لیکن جب ایک بزرگ محبت سے ایسا کہرا تھا تو ہم کیسے انکار کر سکتے تھے۔ این انشاء نے کہا کہ میں نہیں لکھواتا اور وہ ایک طرف ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجیل الدین عالیٰ نے کہا کہ میں نے لکھوا تو لیا ہے لیکن میں اسے مانتا نہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں جی میں لکھوا بھی لیتا ہوں اور مان بھی لیتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ اس کی بڑی برکت تھی۔ میں بعد میں بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

ایک بار چٹا گانگ میں میں فیض احمد فیض سے ملا تو انہوں نے کہا کہ اشفاق میں تجھے ایک دنیا کی مزیدار ترین آنس کریم کھلاتا ہوں اور انہوں نے ایسی آنس کریم لا کر دی جو ہم نے واقعی ہی پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔ میری بیوی نے کھاتے ہی کہا کہ اشفاق صاحب دودھ دی تو ہمارے ملک میں بھی ہوتا ہے یہ اتنی مزیدار آنس کریم یہاں کیسے بنتی ہے۔ اس پر فیض احمد فیض کہنے لگے کہ سارا دودھ دی تو تم کھا جاتے ہو آنس کریم کیسے بنے۔ میں نے آنس کریم کھلانے پر ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آنس میں اب آپ کو ایک بابے سے طوا ہوں۔ وہ بھی بڑی محبت کے ساتھ چل پڑے۔

اب میں عمر کے اس حصے میں جب ان باتوں کو اپنے اس ملک اور بھائیوں کو سوچتا ہوں تو میرے دل میں یہ بات آتی ہے کہ جتنا بڑا ظلم ہماری ذات پر بھائیوں سے جدائی کی صورت میں ہوا ہے اس سے بڑا ظلم کرہ ارض پر کسی قوم پر نہیں ہوا اور پھر صورت حال ایسی ہے کہ چور ”چھر“ بھی بن گیا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ہم سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے“

خطوط کی دنیا بھی ایک زریں دنیا ہے اس کا انسانی زندگی پر اور انسانی تاریخ پر بڑا گہر اثر ہے۔ خط کب سے لکھے جانے شروع ہوئے اور کب آ کر ختم ہوئے۔ میں اس کے بارے میں یہ تو عرض کر سکتا ہوں کہ کب آ کر ختم ہوئے لیکن ان کے لکھے جانے کی تاریخ اس کے بارے میں یقین اور وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لکھے جانے تو اب ختم ہوئے ہیں جب کوئی ای۔ میں کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب Chating کا نیا لفظ ایجاد ہوا۔ جب کمپیوٹر کے ذریعے طرح طرح کے طریقے انسان کے درمیان رابطے کا ذریعہ بنے ہیں لیکن خطوں کا جو حسن تھا اور خطوں میں جوبات ہوتی تھی اور ان کے اندر جس طرح سے اپنا آپ، اپنی روح، زندگی اور نعمیات نکال کر پیش کر دی جاتی تھی وہ اب نہیں رہی۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید تم اس یونیورسٹی کے آخری طالب علم تھے جو چوری چوری خط لکھا کرتے تھے اور بڑے اچھے خط لکھا کرتے تھے۔ اب میں اپنے سٹوڈنٹس، بیویوں، پوتوں اور نواسیوں کو دیکھتا ہوں تو وہ کہتے ہیں Stop it Dada because this way of Communication is very silly and we can not write.

ہمیں تو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ خط لکھتے پھریں۔ خواتین و حضرات وقت خدا جانے کدھر چلا گیا ہے کہ آدمی آدمی سے خط و کتابت کے ذریعے رابطہ قائم نہیں کر سکتا۔ آپ یہ تو ضرور جانتے ہوں گے کہ خط کس طرح کے لکھے گئے، کسی کیسی خطوط پر متنی کتابیں چھپیں۔ آپ دیکھیں تو پڑھتا ہے کہ رومن فلاسفہ جو فورم میں کھڑے ہو کے باتیں کرتے تھے اور ان کی باتیں آگے پہنچائی جاتی تھیں۔ سقطاط آیا اس کے بعد افلاطون اور ارسطو آیا۔ ارسطو کے فلاٹے کو آگے پہنچانے کے لیے لوگوں نے چھوٹے چھوٹے رقوع میں اس کے فالٹے کو بیان کیا اور اسے آگے اپنے دوستوں تک ارسال کیا اس طرح ہمارے صوفیائے کرام نے خطوں کے ذریعے دور بنتے والے اپنے مریدین کے لیے اپنے پیغامات پہنچائے۔ بادشاہوں نے بھی خطوط کا بھی سہارا لیا۔ مجھے اور نگزیب عالمگیر کی مشہور تصنیف رقعات

عالیگیری یاد آ رہی ہے جو خطوط پر مبنی ہے۔ اس میں وہ خط ہیں جو وہ اپنے بیٹوں کو لکھتا رہا تھا جس میں وہ شہزادوں کو مخاطب کرتا ہے۔ ایک خط فارسی میں لکھا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ”شکار بے کاروں کا کام ہے۔“ (شہزادہ شکار پر گیا ہو گا تو بادشاہ نے اسے یہ خط لکھا ہو گا۔ محبت کے خزانے بھی خطوط کے ذریعے ہی بھرے گے۔)

ادب نواز سلسلی کے خطوط کو جانتے ہیں اس کے بعد مجتوں کی ڈائری چینی شروع ہوئی پھر سجادہ زبیر اور رضیہ کے خطوط چھپے۔ اس طرح خط زندگی پر چھائے رہے اور بہت قریب اور غالب آ کر چھائے رہے۔ مرزا غالب کے خط تو آپ سب نے ضرور پڑھے ہوں گے۔ غالب بڑی محبت اور روانی و شخصی سے بات کرتا تھا اور اس کی باتیں ایسی ہوتی تھیں جیسے کوئی ڈائیلاگ رائٹر لکھ سکتا ہے۔ جتنے بھی بچے جو ذرا مدد نگار میرے پاس کچھ پوچھنے یا سیکھنے کے لیے آتے میں انہیں یہی مشورہ دیتا کہ آپ غالب کے خط جب تک نہیں پڑھیں گے آپ کے اندر رُد رامے اور مکالمے کی سیس پیدا نہیں ہو گی کیونکہ غالب کے بات کرنے کا ڈھنگ ہی نہ ہے۔ آٹھویں یا نویں جماعت کی اردو کی کتاب میں سے مجھے غالب کے خط کے چند فقرے یاد آ رہے ہیں:

”میر مہدی مجروح تم مشقِ خن کر رہے ہو میں مشقِ فنا میں مستغرق ہوں۔ ارے میاں ارے میاں اس دنیا میں اگر کوئی پہلوان ہوا تو کیا؟ کوئی نامی گرامی جیا تو کیا؟ کوئی گنام مردا تو کیا؟ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تھوڑی سی پوچھی ہے، تھوڑی سی صحت جسمانی باقی سب وہم ہے پیارے جانی۔“

جب کبھی غالب تھک جاتا ہے تو کہتا ہے

”میں کیا کروں، اگر چہ اس وقت اللہ کے ساتھ ٹکوہ نہیں کیا جاسکتا لیکن آرزو کرنا آئیں عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری آرزو ہے کہ اب میں زندہ نہ رہوں اور اگر رہوں تو کم از کم اس ملک میں نہ رہوں کہیں اور خراسان ایران نکل جاؤں۔ یہاں کے لوگ بڑے ظالم ہیں۔“

ایک اور جگہ کہتا ہے:

”رکاب پر پاؤں ہے اور اس پر ہاتھ ہے۔ دور راز کا سفر در پیش ہے۔ ستر مکر ہے اور حادیہ زاویہ ہے اور کیا کسی کا ایک اچھا شعر ہے (ذوق کا ہے)“

اب تو گھبرا کے کہتے ہیں کہ ہر جائیں گے

مر کے بھی چین نہ پایا تو کہر جائیں گے“

ایک زمانے میں محبوب کبوتر کے گلے میں پر پی ڈال کر بیج دیا کرتے تھے کیونکہ ایک دوسرے سے ملتا جانا مشکل ہوتا تھا۔ ان کبوتروں کی خدمات سے بعد میں جنگوں میں بھی فائدہ اٹھایا گیا

اور دوسری جنگ عظیم میں باقاعدہ کبوتر کوڑینگ وی گئی اور ان کے بچوں کے ساتھ ایلو موونہم کی ایک باریک سی پنسل جیسی تکلی میں خط لپیٹ کر کر کھا جاتا تھا اور کبوتروں نے جاسوسی کا کام خوب کیا اور خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ میں یہ ساری باتیں اس لیے کہ رہا ہوں کہ میرے پاس بھی ایک خط ہے اور میں اسے لیے پھرتا ہوں۔ میں اسے ضرور شاؤں گا۔ یہ خط سنانے سے پہلے مجھے خطوں کی اور باتیں بھی یاد آ رہی ہیں۔

اکبرالہ آبادی کے بیٹے جولندن میں تھے وہ خط نہیں لکھتے تھے جس پر اکبرالہ آبادی ان سے بہت شاکی رہتے تھے۔ اس زمانے میں خط سمندر سے یا بحیری چہازوں کے ذریعے آتے آتے۔ ایک بار انہوں نے اپنے بیٹے کو خط میں لکھا تو ان کے بیٹے نے جواب میں لکھا کہ ابا جان جب واقعات گزرتے ہیں تو میں مصروف ہوتا ہوں جس کے باعث خط نہیں لکھ سکتا اور جب واقعات نہیں ہوتے تو کوئی چیز لکھنے والی نہیں ہوتی اور میں اس وجہ سے خط نہیں لکھتا۔

(محفل میں سے ایک صاحب اس خط کی بابت ایک شعر بھی یاد کرواتے ہیں جس کا ایک مصروف اس طرح سے ہے۔ کھا کے لندن کی ہوا مہدو فا بھول گیا۔)

جب بچے بڑی یونیورسٹیوں میں پڑھنے کے لیے چلے جاتے ہیں تو میری طرح کے تھوڑے پڑھنے لکھے والدین خوفزدہ ہو جاتے ہیں۔ ایک بار دو بابے بیٹھے ہوئے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ ایک نے کہا کہ یا مری ابھی جو خط لکھتا ہے تو مجھے بڑی پریشانی ہوتی ہے اور مجھے اس کے خط کو لے کر لاہبریری جانا پڑتا ہے اور مجھے وہاں جا کر موٹی ڈکشنری کھوں کے مشکل الفاظ کے معانی دیکھنے پڑتے ہیں کیونکہ میں زیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوں۔

دوسری کہنے لگا یار کیا کمال کی بات ہے میرے بیٹے کا جب بھی خط آتا ہے تو مجھے بینک جانا پڑتا ہے کیونکہ اس نے خط میں پیے مانگے ہوئے ہوتے ہیں۔

خطوں سے وابستہ بڑی لمبی داستانیں ہیں۔ اگر ہم اس کی طرف چل نکلے تو بروادقت لگ جائے گا اور میرا پہ خط رہ جائے گا جو آپ کو سنا ناپڑا ضروری ہے۔ ہم نے پہلے دوسری جنگ عظیم کا ذکر کیا تو آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ اس جنگ میں ہمارے علاقوں کا سب سے بڑا اور طاقتور مجاز برما تھا اور ہمارے بہت سارے فوجی وہاں پر تھے۔ وہ فوجی جو مجاہد جنگ پر ہوتے ہیں ان کی سب سے بڑی آرزو اور تنگ گھر سے آنے والے خط کی ہوتی ہے چنانچہ ان پر پریشانیوں کی جو پر چھایاں پڑتی ہیں وہ خطوں کے ریفارنس سے ہی ہوتی ہیں۔ فوجی دوران جنگ جنگل میں تھے اور ڈاک جب تقسیم ہوئی تو کسی فوجی کے گھر سے کوئی خط نہ آیا اور چار پانچ چھوٹے دن ایسے ہی گزر گئے۔ ایک دن ایک خوش نصیب کا خط آ گیا اور دوسرے جو تین چار پانچ فوجی بیٹھے تھے کیونکہ ان کا کوئی خط نہیں آیا تھا اور جس کا خط آیا تھا اس نے

خوشی سے لفاف نہ لہرایا اور کہا کہ دیکھو ایسے خط ہوتے ہیں جو گھر سے آتے ہیں۔ اس نے لفاف نہ چاک کیا اور اس سے کاغذ نکالا۔ اس کاغذ کے دونوں طرف کچھ بھی لکھا ہوا نہیں تھا وہ بالکل کورا کاغذ تھا۔

دوسرے فوجی اس کامنے اڑانے لگے لیکن اس نے کہا کہ نہیں یہ کورا کاغذ نہیں بلکہ باقاعدہ ایک خط ہے۔ یہ میری بیوی کا خط ہے۔ آج کل ہماری بول چال بند ہے اس لیے یہ خالی کاغذ ہے لیکن مجھے یہ پتہ ہے کہ خط میری بیوی کا ہے۔ خواتین و حضرات! میرے ہاتھ میں جو خط ہے وہ کچھ اس طرح سے ہے:

”جناب نامعلوم مگر موجود ہیں کہیں السلام و علیکم!

مجھے یقین ہے کہ آپ کو 8 جون کی تاریخ اسی طرح سے یاد ہو گی جیسی کہ مجھ کو ہے۔ اس روز میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں آپ کو عمر بھرنیں بھلا کوں گا۔ اس تاریخ سے پہلے میں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ پارک میں جاتا تھا۔ ہم نجپر بیٹھتے تھے اور ہمارا بچہ ہمارے سامنے چھولوں کی کیا ریوں کے درمیان بھاگا کرتا تھا۔ اس تاریخ سے پہلے میں نے اپنے پورے خاندان کا بوجھ اٹھایا ہوا تھا اور میں کبھی کبھی دوچار آنے فقیروں کو بھی خیرات کر دیا کرتا تھا۔ اب عرصہ دس سال سے میں بیکار پڑا ہوں۔ ٹھیک 8 جون سے ٹھیک اس رات سے جب تم نے میری کمر میں اپنے پستول کی گولی اتنا ری تھی اور وہ ریڑھ کی ہڈی میں پھنس گئی تھی۔ مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ اس رات تم بہت ہی تروں تھے اور پستول تمہارے ہاتھ میں کانپ رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ تم پہلی بار کسی پڑوں پہپ کو لوٹنے آئے ہو۔ میں نے دن بھر کی کمائی ساری کی ساری تم کو دے دی تھی۔ پھر پتہ نہیں تم کو کیا ہوا اور تم نے کیوں میرا دیاں بازوں مژو و کر میری کمر سے لگا دیا اور مجھے دھکیتے ہوئے اندر کمرے میں لے گئے۔ وہاں تم نے میرے سر میں پستول کا بٹ مار کر مجھے اونٹھے منہ فرش پر گرا دیا۔ پھر پتہ نہیں میرے اونٹھے منہ گر جانے کے بعد تم نے پستول کیوں چلا یا؟ ایک زور کا دھماکہ ہوا اور اندر ہیرے کمرے میں ایک شعلہ ساپ کا۔

پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا اور جب میں جا گا تو گردن کے نیچے میرا سارا جسم شل ہو چکا تھا اور میں فرش پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ پھر تین لڑکے اپنی موڑ سائکلوں میں پڑوں بھروانے آئے اور انہوں نے مجھ سے میرا حال دریافت کیا۔ میرا خیال تھا کہ میں زور زور سے پکار کر چیخیں مار کر لوگوں کو اپنی طرف بularتا تھا مگر ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ تمہارے منہ سے صرف سرگوشی جیسی آواز نکل رہی تھی جو بہت بلکی تھی۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ کس طرح مجھ کو لوگوں نے حیدر آباد کے ہفتال میں پہنچایا جہاں مجھے داخل کر دیا گیا۔ میری 19 سالہ روئی ہوئی بیوی کوڈاکڑوں نے بتایا کہ ہم مجرور ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ ہڈی میں پھنسی

ہوئی گولی کو نکالنا خطرناک ہے۔ میری بیوی مجھے اٹھا کر گوٹھ لے آئی اور ہم سب میرے
مرنے کا انتظار کرنے لگے۔ میں دن رات ایک پھٹے (تخت) پر لیٹا ایک کوٹھڑی میں پڑا
رہتا اور میری بیوی مجھے دوا کی گولیاں کھلاتی رہتی۔ ایک روز میں نے دیکھا کہ ایک نہایت
تیز دھار قلنچی میرے تختے کے پاس کھلی پڑی تھی۔ اس کا ایک پھل بہت آسانی سے میرا
کام تمام کر سکتا تھا۔ مجھے اسے اس قدر قریب دیکھ کر خوشی ہوئی لیکن میرا بے حس باتھا سے
اٹھانے سے معذور تھا۔ میری موت بھی میرے اختیار میں نہیں تھی۔ میں اس کو دیکھ رہا تھا
اور وہ میرے قریب نہیں آ رہی تھی۔ میں تمہیں صاف صاف بتا دوں کہ تمہارے پستول کی
گولی پورے چھ ماہ تک میری ریڑھ کے مہرے میں موجود رہی اور میں اسے دل سے لگا
کے بے حس و حرکت جیتا رہا۔ پھر مجھے کراچی کے آغا خان ہسپتال لے جایا گیا جہاں
ڈاکٹروں نے مل کر بڑی احتیاط سے پھنسی ہوئی گولی میرے وجود سے نکال دی لیکن مجھے
ہتایا گیا کہ میں زیادہ سے زیادہ وہ آب انٹھ کر کرانی چارپائی کے کنارے پر بیٹھ سکوں گا۔
بشر طیکہ میرے ارد گرد اور میری کمر کے چیچے لکڑی کا ایک مخصوص ڈبہ بنایا کر رکھا جائے۔
ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ میں تھوڑا سا بیٹھ کر کھانا کھا سکتا اور گلاں اٹھا کر پانی
میری بیوی اور میرا بیوڑھا بابا پ مجھے اٹھا کر لکڑی کے سہارے بٹھا دیتے تھے اور پھر مجھے اس
لکڑی کے تختے کے ساتھ باندھ دیتے تھے۔ میں کچھ لئے خود کھا سکتا اور گلاں اٹھا کر پانی
بھی پینے لگا تھا۔ گھروالے شام کو مجھے اٹھا کر صحن میں بھی صفائی دیتے اور میں اس پر
کھکھتا کھکھتا اس صفائی کے دوسرا کے کنارے پر پہنچ جاتا ہوں پھر ادھر سے اسی طرح سے
واپس آ جاتا۔ میں خوش ہوں کہ کسی کی مدد کے بغیر بدن کو خود حرکت دے سکتا ہوں۔ پھر
مجھ پر درد کے خزانے نچاہوں ہو گئے۔ پہلے میرے بازووں میں درد اٹھا اور میں پندرہ دن
تک ترپتارہا۔ پھر درد ناٹانگ میں منتقل ہو گیا اور مجھے یوں لگتا گویا میری ناٹانگ آری سے
کافی جارہی ہے اور الگ ہونے کو نہیں آتی پھر یہی درد پیٹ میں چلا گیا اور میں تھے
کر کر کے عاجز آ گیا۔ اس کے بعد میرے اوپر کے دھڑ میں تھوڑی سی طاقت آنے لگی اور
میں بیساکھیوں کے سہارے کھڑا بھی ہونے لگ گیا لیکن چونکہ ناٹانگوں میں کوئی حس موجود
نہیں اس لیے میں چل نہیں سکتا۔ اب میرے ہاتھوں اور بازووں میں ایک سمناہٹ ہے
لیکن ناٹانگیں بالکل ساکت ہیں۔ بیساکھیوں کے سہارے کھڑے کھڑے کئی مرتبہ مجھے
یوں محسوں ہوتا ہے جیسے کسی نے کھولتے ہوئے پانی کے جام میں اتار دیا ہو۔ میرا سارا
بدن جل جاتا ہے سوائے میری ناٹانگوں کے۔ میں نے خدا سے دعا کی تھی کہ یا اللہ اگر تو نے

مجھے کچھ اور نہیں دینا تو مجھے مسلسل درد عنایت فرمادے کیونکہ مکمل بے حسی کے مقابلے میں درد ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ انسان کو پتہ چلتا رہتا ہے کہ وہ موجود ہے اور وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ موجود ہے۔ درد کے زور پر کمی مرتبہ میرے دونوں ہاتھ ایک ساتھ اٹھ جاتے ہیں اور میں آدھے منٹ تک انہیں وہاں فضاء میں رکھ سکتا ہوں۔ پھر میرے ہاتھ یخچے گر جاتے ہیں اور میں درد کی دوسرا لہر کا انتظار کرنے لگتا ہوں۔ جس رات تو نے مجھے گولی ماری تھی اس سے کچھ ماہ بعد جب میر اسارا وجہ سا کت اور صرف گردن کے اوپر کا حصہ زندہ تھا میں نے خدا سے ایک اور آرزو کی تھی کہ میرے دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر دو منٹ تک کے لیے اٹھے رہنے کی سکت عنایت فرمادے تاکہ میں کوئی چھوٹی سی دعا مانگ کر سکوں۔ میری آرزو پوری ہو گئی اور میں چار پائی پر لیٹ کر اس عید کے موقع پر جواب گھر گز ری ہے گاؤں کی عیدگاہ میں پہنچ گیا۔ میرے والد اور عاموں نے مجھے بیساکھیاں دے کر ایک درخت کے سہارے کھڑا کر کے مجھے وہاں باندھ دیا تاکہ گرنہ جاؤں اور میں نمازوں کو وہاں جمع ہوتے ہوئے دیکھنے لگا۔ مولوی صاحب نے خطبے میں فتح کہ کے تعلق سے ایک شخص کی معافی کا واقعہ سنایا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے حضور نبی اکرم کے محبوب چچا حضرت حمزہ کو نیزہ مار کر شہید کیا تھا اور حضورؐ کو اپنے دوستوں جیسے پیارے چچا کی رحلت کا بڑا ہی غم تھا لیکن اس گھرے غم کے باوجود آپ نے اس شخص "وحشی" کو معاف کر دیا۔ میں نے عین اسی وقت جب میں یہ واقعہ سن رہا تھا دونوں ہاتھ اٹھا کر دعا کی کہ "اے میرے اللہ اس نوجوان کو جس نے 8 جوں کو مجھے گولی ماری تھی وہ جہاں کہیں بھی ہے معاف کر دینا۔ اس بے چارے کو پتہ نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ میرے گناہ دوست مجھے آپ کا نام معلوم نہیں ہے اور نہ ہی آپ مجھے سے کبھی مل سکیں گے اس لیے میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں۔ میرے پاس آپ تک پہنچنے کا اس سے بہتر اور کوئی ذریعہ نہیں تھا جو میں نے اختیار کر لیا ہے۔ اس دن سے لے کر آج تک کوئی دن ایسا نہیں گزرا جب میں نے صحیح سوریے سب سے پہلے تمہاری صحبت وسلامتی کی دعا نہ کی ہو اور اوپنجی آواز میں پیٹی وی کی مشہور عالم صد اندھی ہو کہ اللہ تم کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تفہیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔"

خداحافظ۔

چیلیسی کے باعزت مانچھے گائے

میں ایک بات پر بہت زور دیتا رہا ہوں اور اب بھی مجھے اسی بات پر زور دینے کی تمنا ہے لیکن الحمد للہ کچھ اصلاح بھی ہوتی رہتی ہے پھر میں محسوس کرتا ہوں کہ میں جس شدت سے اس صیغہ پر قائم تھا وہ اتنا اہم نہیں تھا۔ میرا اس پر کامل یقین ہے کہ ہمارے ملک کے لوگوں کو ایک سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ (روٹی، کپڑا اور مکان کی کہانی تو عام چلتی رہی ہے اور اس بارے میں اپر چار ہوتا رہا ہے) لوگوں کو ان کی عزت نفس سے محروم رکھا گیا ہے۔ ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اپنی تو قیزادات کے لیے آپ سے اپنے ملک سے تقاضا کرے میری عزت نفس اور Self Respect مجھے دی جائے۔ دولت، شہرت، روپیہ پیسہ اور علم کی ہر شخص ڈیماں نہیں کرتا بلکہ عزت کا تقاضا سب سے پہلے کرتا ہے۔ دنیا کے جتنے بھی مہذب ملک میں انہوں نے اپنے لوگوں کو جو ایک بڑا انعام عطا کیا ہے وہ سارے کے سارے لوگ عزت نفس میں ایک سطح پر ہیں۔ یہ ان ملکوں کی جمہوریت کا خاصا کہہ لیں یا ان کی سوچ و فکر کی خوبی کہہ لیں یا پھر کوئی اور نام دے دیں۔ میں غیر ملکوں کی مثال دیا تو نہیں کرتا لیکن مجبوری کے تحت دے رہا ہوں کہ آپ ولایت چلے جائیں یا پھر لندن چلے جائیں وہاں آکسفورڈ، سریت یا بون سریت میں دیکھیں تو وہاں کے فریلے رہائشوں نے اس جدید دور میں دو گھوڑوں والی بھیان رکھی ہوئی ہیں اور وہ لارڈ زاس طرح وقار سے رہتے ہیں آپ وہاں ایک جگہ چیلیسی کے لوگوں کو دیکھ لیں وہ ہمارے جیسے گامے مانچھے کی طرح سے ہیں۔ ایک پاؤں میں جوتا ہے ایک میں نہیں ہے۔ پہلے چیلیسی کے سارے لوگ ”پی“ ہوتے تھے۔ ان کی مالی حیثیت نہایت قابلِ رحم ہے لیکن ان کے مقابلے میں لارڈ زاعلی حیثیت میں ہیں لیکن اگرڈا کھانے پر (یہ واقعہ چونکہ میرے سامنے پیش آیا اس لیے عرض کر رہا ہوں) قطار میں کھڑے ہو کر آپ ٹکٹ لینا چاہ رہے ہیں تو پھر وہ شخص جو قطار میں آگے کھڑا ہے اسے اپنچھے کر کے لارڈ آگے نہیں آ سکتا اور کسی بھی صورت میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ لارڈ جانتا ہے کہ یہ آگے کھڑے شخص کی عزت نفس کا معاملہ ہے اور یہ اس کا استحقاق ہے۔ جب گندی مندی حالت کا آدمی تھا نے میں بھی جائے اور اس

کی شکل و صورت ایسی ہو کہ آپ اس سے بات کرنا گوارہ نہ کریں تو وہاں تھانے کا جو ایس ایج ادھوتا ہے وہ انھوں کھڑا ہو جاتا ہے اور کہتا ہے:

Yes Sir, what i can do for you?

لیکن ہمارے ہاں اور خاص طور پر ہمارے ملک میں ایک اس بات کی بڑی محرومی ہے کہ لوگوں کو ان کی عزت نفس اور تو قیری ذات سے محروم رکھا گیا ہے اور ہماری سب سے بڑی کمزوری اور زیوں حالی کی وجہ یہ ہے۔ میں پہلے بھی کہتا ہوں اور اب اس کو دہراتا ہوں کہ 20 لاکھ کے قریب ایسے لوگ ہیں جو صاحب حیثیت ہیں، صاحب ارادہ ہیں اور جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ یہ اندازہ میرا اپنا ہے۔ تعداد میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ ان 20 لاکھ افراد میں، ہم راستروں کیلئے تاجر، اکٹھ اور فیوڈل لارڈ بھی شامل ہیں۔ یہ تھیک ٹھاک چلتے چلتے جا رہے ہیں ان کا باقی چودہ کروڑ عوام سے تعلق نہیں ہے۔ وہ باتی لوگوں کو اپنا ساتھی نہیں سمجھتے۔ آپ ان دوسرے لوگوں کو اس صورت میں بھی ساتھی سمجھ سکتے ہیں کہ انہیں ان کی عزت نفس داپس لوٹا دیں۔ ایسے نہیں کہ ”غربی مکاؤ“ کا ایک پروگرام شروع کریں یا اس نظریے کے قائل رہیں کہ جب تک تعلیم عام نہیں ہوگی اس وقت تک کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

عزت نفس کا حصول تو ہر شخص کا بنیادی اور پیدائشی حق ہے۔ بابے لوگوں کو بھی ایسی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک بار ہمارے بابا جی نے کہا کہ جب اس کرہ ارض پر دوسرا آدمی پیدا ہو گیا تھا تو پہلے کا حق آدھا ہو گیا تھا جبکہ ہم کہتے ہیں کہ ہمارا حق تو پورے کا پورا ہے۔ یہ دوسرے تو ایسے ہی ہیں۔ انہیں چھوڑ دفع کرو۔

بعض اوقات بے خیالی میں ہم سے ایسی کوتاہی بھی ہو جاتی ہے کہ ہم حق رکھنے والوں کو تحریر و تقریر میں حق اس لیے نہیں لوٹا سکتے کہ یہ لوگ جاہل ہیں یا تعلیم یافت نہیں ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ جب تک تعلیم عام نہیں ہو گی یہاں Democratic System تھیک نہیں ہو سکتا اور ہمارے اخبار والے عموماً اسے لکھ دیتے ہیں کہ جی ملک میں 85 فیصد جاہل لوگ رہتے ہیں۔ میں ان اخبار والوں سے درخواست کرتا رہا ہوں کہ صاحب اتنے سخت لفظ استعمال نہ کیا کریں۔ آپ ان کو جاہل لکھتے ہو جو گندم آگا کے بوریوں میں بھر کے آپ کے گھروں تک پہنچا دیتے ہیں۔ یہ جاہل لوگ ہیں جو آپ کے لیے جوتے ہی کرڈیوں میں بند کر کے آپ کو پہنچاتے ہیں۔ آپ خدا کے واسطے ایسے ہی انہیں جاہل نہ کہیں۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ عزت نفس اس وقت تک عطا نہیں کی جاسکتی جب کہ عطا کرنے والا خود معزز نہ ہو۔ ہم جب تک اپنی نظروں میں خود محترم نہیں تھیمیں گے اس وقت تک عزت نفس لوٹانے کا کام نہیں کر سکیں گے۔ ہم نے ایک تحقیقی سردے میں اکیس بندوں سے دریافت کیا کہ وہ رشوت کیوں لیتے ہیں؟ ان لوگوں میں بڑے لوگ بھی تھے جو ایک لاکھ روپے کے قریب رشوت لیتے تھے۔ بہت بھلے

آدی تھے اور سوٹ پہنچتے تھے اور ہر نماز کے وقت سوٹ ثانی اتار کر شلوار قمیض پہن کر نماز ادا کرتے تھے۔ نماز کے بعد پھر سوٹ پہن لیتے۔ میں نے ان سے ایک بار کہا کہ جی نماز سوٹ میں بھی ہو جاتی ہے تو کہنے لگے نہیں اس طرح بر الگتا ہے۔ ہمیں ان سے ایک مشکل سا کام تھا جو انہوں نے کر دیا۔ ان کے استشنا نے مجھے کہا کہ ”اشفاق صاحب ہم آپ کی بڑی ”ماتا“ کرتے ہیں اور ہمیں آپ سے بڑی محبت ہے آپ اس طرح کریں کہ ہمیں 75 ہزار دے دیں۔“ میرے ساتھ یہ اکثر تھا جس کا کام تھا اس نے انہیں تودہ پیسے دے دیئے ہوں گے۔ جب میں اٹھ کر آنے لگا تو وہ صاحب جو سوٹ بدلتے کے نماز پڑھ کر پھر سوٹ پہن لیتے تھے انہوں نے مجھے سے کہا کہ آپ اگر برانہ مانیں تو ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

میں نے کہا فرمائی۔ تودہ کہنے لگے کہ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ میری نمازوں اور دائری پر نہ جائیں اور میرے حصے کے پیے الگ دیں۔ ان کے اس طرح ڈائریکٹ الفاظ کہنے سے مجھے تکلیف بھی ہوئی اسی لیے اس نے کہا کہ آپ محسوس نہ کرنا یہ تو ہمارا..... ان اکیس لوگوں سے تحقیق کرنے کے بعد پتہ یہ چلا کہ سب سے پہلے رشتہ لینے والا خود کو ایک بے عزت شخص خیال کرتا ہے۔ وہ خیال کرتا ہے کہ ”میں تو دو لکھ کا آدی ہوں۔ نہ میرے کوئی آگے ہے نہ پیچھے ہے۔ وہ ایسا لاشعوری طور پر سمجھتا ہے۔ باہے کہتے ہیں کہ جب تک آپ اپنے آپ کو عزت عطا نہیں کریں گے اس وقت تک کام نہیں بنے گا۔“

لاہور میں اب جس جگہ واپسیا ہاؤں ہے جب یہ بلڈنگ نہیں تھی تو ایک زمانے میں اس جگہ ایک سپاہی کھڑا ہوتا تھا۔ اشارہ نہیں ہوتا تھا اور وہ ٹرینک کو کنشروں کرتا تھا۔ اس کے ساتھ نیلی وردیوں والے خوبصورت اور چاک و چوبند آٹھ سات سکاؤٹس کھڑے ہوئے تھے۔ ایک سکاؤٹ نے سپاہی کو آ کے سیلوٹ کیا اور کہا کہ سروہ شخص خلاف ورزی کر کے گیا ہے تو سپاہی نے کہا کہ یار جانے دو کوئی بات نہیں۔ پھر دوسرا سکاؤٹ آیا اس نے کہا کہ وہ موٹرسائیکل والا قانون کی خلاف ورزی کر کے گیا ہے تو تباہی سپاہی نے کہا کہ یار پہلے گازی والے کو چھوڑ دیا ہے تو اس موٹرسائیکل والے کو بھی جانے دو۔

(اب میں وہاں لھڑا تماشہ دیکھ رہا ہوں) پھر جب تیر سکاؤٹ کوئی شکایت لے کر آیا تو میں نے سپاہی سے آ کر کہا یار تو تو باکمال اور چودھری قسم کا سار جنت ہے سب کو چھوڑ رہا ہے اور یہ ساری سکاؤٹ تمہیں سیلوٹ مارے ہیں۔

وہ کہنے لگا کہ یہ سارے اپنی سن کا لج کے لڑ کے ہیں ان کے گھر والے انہیں گازیوں پر یہاں چھوڑ گئے ہیں اور لخت ہے کہ تین دن ہو گئے ہیں ایک پیسہ کسی سے نہیں لے سکا۔ میں نے اس سے کہا

کہ اس وجہ سے کہ یہ سارے آپ کے سر پر کھڑے ہیں۔ آپ پیسے لیں یہ بھلا آپ کو روکتے ہیں۔ تو کہنے لگا کہ نہیں سراس وجد سے نہیں کہ یہ میرے سر پر کھڑے ہیں۔

بات یہ ہے کہ یہ آ کر مجھے سیلوٹ کرتے ہیں اور ”سر“ کہتے ہیں۔ کہتا ہوں اگر ایک بھی پیسہ لوں تو میں لعنتی ہوں کیونکہ ان کا سیلوٹ مجھے ایک معزز شخص بنادیتا ہے اور معزز آدمی رشوت نہیں لیتا۔ اس نے کہا کہ اس کی بیوی رشوت کے پیسے نہ لانے کے باعث ناراض ہے اور یہ آنھوں دن سے اس کو سیلوٹ کیے جا رہے ہیں۔ وہ سپاہی کہنے لگا کہ سر میں سوکھی روئی کھاؤں گا اور جب تک یہ مجھے سر کہتے ہیں اور سیلوٹ کرتے ہیں رشوت نہیں لوں گا۔

(حاضرین محفل میں سے ایک خاتون)

زندگی کے ہر شعبے میں چاہے وہ رشتہ ہے یا کار و بار یا دوستی ہے اس میں عزت نفس درکار ہے۔ میں ایک عورت ہونے کی حیثیت سے گھر کی مثل دلوں گی اور گھر کے ماحول کی عکاسی کروں گی کہ میاں بیوی میں یا بہن بھائی کو ایک دوسرے کی عزت نفس کا خیال رکھنا چاہیے۔

اشفاق احمد۔ جی بڑا اچھی بات ہے اور ہم بھی یہ بات کر رہے ہیں کہ جو جو بھی رشتے ہیں وہ عزت ملتے ہیں لیکن عزت نفس پر دھاری توجہ اس لیے نہیں ہے کہ ہم نے خود اپنی ذات کو عزت عطا نہیں کی ہوئی اور ہم سے ایسے فعل سرزد ہو جاتے ہیں اس لیے ہم دوسرے کو عزت نہیں دے سکتے۔ یہاں پر آ کر رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔

آپ کو یاد ہو گا جب شارجہ میں میانداز نے چھکا لگایا تھا۔ میں شادمان کے علاقے میں جارہا تھا کہ میری گاڑی میں خرابی پیدا ہو گئی۔ میں نے نیچے اتر کر دیکھا تو اس کو تھیک کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ایک خاتون گھر سے باہر آئیں۔ انہوں آ کر دیکھا اور پھر کہا کہ یہ آپ سے تھیک نہیں ہو گی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں کہیں جلدی جانا چاہتا ہوں۔ اس نے کہا کہ آپ گاڑی کو یہاں چھوڑ دیں۔ میرا بھائی آٹو انھیں ترے ہے وہ اسے دیکھ لے گا۔ میں بلاقی ہوں۔ اس لڑکے نے آ کر کہا کہ انکل آپ جا کر اندر بیٹھیں میں دیکھتا ہوں اور وہ کام کرنے لگا۔ میں ان کے گھر میں جا کر بیٹھ گیا۔ وہاں اپنی وی لگا ہوا تھا۔ اس دوران میں میانداز آیا اس نے چھکا لگایا اور پاکستان جیت گیا۔ اس وقت پوری قوم اُوی اور ریڈ یوسمیٹوں سے چھپی ہوئی تھی۔ اس لڑکے کی ماں نے مجھے آ کر کہا کہ گاڑی تھیک ہو گئی۔ میں نے اس لڑکے سے آ کر کہا کہ یار تم نے مجھ نہیں دیکھا۔

وہ کہنے لگا کوئی بات نہیں۔ آپ نے دیکھ لایا تو میں نے دیکھ لیا۔ آپ کی دقت ختم ہو گئی۔ خواتین و حضرات! اس نے یہ چھوٹی سی بات کہہ کر مجھے خرید لیا۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن اس نے مجھے ایسی چیز عطا کی جس کا میں آج تک دینے دار ہوں۔ ہم اپنی والدہ کو ”پھر نتو“

کہتے تھے۔ وہ آزاد منش خاتون تھیں اور عموماً اپنے کمرے میں نہیں رہتی تھیں بلکہ ادھر ادھر پھرتی رہتی تھیں۔ اتنی پڑھی لکھی بھی نہیں تھیں۔ میرے بڑے بھائی انہیں کہتے تھے کہ ”ان کو ہم گھر والوں نے آوارہ گردی کے جرم میں پکڑنا ہے۔“

جب بھی دیکھیں کمرے کا چکر لگا کے باور پچی خانے میں پہنچی ہوتیں۔ انہیں جہاں بھی چھوڑ کر آتے تھوڑی دیر کے بعد وہ پکن میں ”کڑھم“ کر کے موجود ہوتیں۔ ایک بار وہ پھر کے وقت وہ باور پچی خانے میں کھڑی تھیں اور سب سوئے ہوئے تھے۔ میں نے پوچھا تھی کیا کہ رہتی ہیں تو وہ کہنے لگیں کہ بندر والا مداری آیا تھا وہ بھوکا تھا اس کے لیے پکوڑے تسلی رہی ہوں۔ میری اماں کا سارا سینٹر باور پچی خانہ تھا وہ بھی کہتیں کہ میری زندگی کا مرکز ہی یہ ہے اور مجھے لوگوں کو پچھھے عطا کر کے خوشی ہوتی ہے۔ میں اب سوچتا ہوں کہ انہوں نے خود کو ایک عزت عطا کر کھی تھی۔ اس زمانے کی شاید ساری عورتیں اس نظریے کی قائل تھیں۔ یہ تو اب عورتوں کو سمجھایا گیا ہے کہ آپ بینکنگ کریں باہر نکل کر لوگوں کی خدمت کریں شاید مردوں کو بینکنگ نہیں آتی خیر یا ایک الگ کہانی ہے۔ اگر آپ اپنی زندگی کو کبھی غور سے دیکھیں اور چھوٹی چھٹی کے ساتھ زندگی کے واقعات چنتے رہیں تو آپ کو بے شمار چیزیں ایسی نظر آئیں گی جو ایسی ہی آپ کی نگاہ سے او جھل ہو گئی ہیں لیکن وہ بڑی قیمتی چیزیں ہیں۔ خیراگلی میں میرا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ اس کے دو کمرے تھے۔ ہم کبھی کبھی وہاں جاتے تھے۔ جب کبھی وہاں جاتے تو آتے وقت اس کی دیکھ بھال غلام قادر کو سوتپ دیتے۔ وہ وہاں ڈاکخانے میں ملازم بھی تھا۔ میری بیوی نے چاہیاں دیتے ہوئے اسے کہا کہ ”غلام قادر سر دیاں آنے سے پہلے یا سر دیاں آنے کے بعد چیزیں گھر سے باہر نکال کر انہیں دھوپ لگالینا۔“ اس نے کہا کہ ”بہت اچھا تھی۔“

غلام قادر نے وہ چاہی لے کر ایک دوسرا چاہی بانو نقدی سے کو دے دی تو اس نے کہا یہ کیا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ جی یہ میرے گھر کی چاہی ہے جب آپ نے اپنے گھر کی چاہی مجھے دی ہے تو میرا فرض بتتا ہے کہ میں اپنے گھر کی چاہی آپ کو دے دوں۔ کوئی فرق نہ رہے۔ آپ مجھ پر اعتماد کریں اور میں نہ کروں یہ کیسے ممکن ہے۔ میری بیوی اس کی بات سن کر جیران رہ گئی۔

خواتین و حضرات یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اللہ نے ایسی عزت عطا کی ہوتی ہے کہ وہ عزت سے محروم نہیں ہوتے اور کہیں سے پچھینا چھپتی کر کے اکٹھی نہیں کرتے۔ میں ایک لکھنے والا ہوں۔ مجھے جگہ جگہ سے عزت ٹوٹنے حاصل کرنے کی عادت ہے۔ پیسے کا لالج سب سے بڑی بات ہے لیکن جو دوست مند شخص ہوتا ہے وہ کسی بھی وقت چیک بھر کے پیسے متکو اسلتا ہے۔ جب میری لکھنے والے کی دیگر ڈرامہ کرنے والے ایکٹر گانے بجانے والے یا کسی اور آرٹسٹ کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی ساری رسیاں لوگوں کے ہاتھ میں ہوتی ہیں۔ اس کے پاس اپنی چیک بک نہیں ہوتی اس لیے وہ ترپتار ہتا ہے

اور آزادی تارہتا ہے کہ لوگوں خدا کے واسطے رسی سنبھال کے رکھنا۔ اگر تم نے رسی چھوڑ دی تو میں پھر مر گیا۔ اس کو یہ مصیبت پڑی ہوتی ہے اس لیے اس مشکل سے نکلنے کے لیے جب تک اس غلام قادر جیسی طبیعت نہیں ہو گی بات نہیں بنے گی۔ چیلی یا لندن کا وہ لارڈ بننا ضروری ہے جو دوسروں کو بھی اتنی ہی عزت دینا چاہتا ہے اور لارڈ ان مانچھے گاموں کو بھی عزت دیتے ہیں۔ حقیقت وہ خود رکھتے ہیں۔

(حاضرین میں سے ایک صاحب بات آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں)

کسی کو عزت دینی ہو تو شہر کی چابی پیش کی جاتی ہے۔ یہ عزت دینے کی ایک symbol ہے۔

اشفاق احمد: بہت خوب۔ بالکل ٹھیک ہے۔
ہمارے بچپن کے زمانے کی بات ہے۔ ہمارے ماشرڈا صاحب ہوتے تھے۔ وہ فرانس سے آئے تھے اور انہوں نے وہاں سے آکر سکول کھولا تھا۔ ان کی بیوی فوت ہو چکی تھی۔ ایک بیٹی تھی جو بڑی اچھی خوش شکل تھی اور سازی ہمی پہنچتی تھی۔ انہوں نے سکول کے پاس ایک خوبصورت سی گھاس پھونس کی "جھگی" (کٹیا) ڈالی ہوئی تھی۔ ان کی ایک گائے تھی۔ ہم جتنے بھی چھوٹے چھوٹے شیئے سے جو سوڑنے تھے۔ بہت سارے بچے ان کے پاس آتے تھے۔ وہ ہمیں گانے بھی سناتے تھے۔ ایک مرتبہ دلی میں ایک بہت بڑا سکول کھلا جس کا پرنسپل بھی انگریز ہی مقرر کیا گیا۔ اس پرنسپل کو آب و ہوا راس نہ آئی تو وہ چلا گیا۔ پھر دوسرا منگولیا گیا وہ بھی یہاں ہو گیا اور اسے بیچیں لگ گئے۔ کسی نے واکرائے کو رائے دی کہ آپ اگر ان (دولر صاحب) کو بلا میں تو وہ سکول چلا سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارے سکول میں ایک انگریز آگیا اور اس نے آکر ماشر صاحب سے پوچھا کہ:

What about joining that School?

ماشر صاحب نے کہا کہ why

اس طرح جھکڑا ہو گیا۔ ہم اپنے چھپروں کے نیچے کا سوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کی بیٹی بھی وہاں آگئی۔ اس انگریز نے ماشر صاحب سے کہا کہ

We will give you more money.

بھر کیف آخ کار ماشر صاحب نے اس سے کہا کہ میں تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں یعنی

you expand my stomic accordingly.

(پہلے میرا معدہ کھینچ کر اتنا بڑا کر دو کہ اس میں وہ ذہیر سارے پیسے سا جائیں جن کی تم آفر کر رہے ہو)

ماشر صاحب نے اس سے کہا کہ میں ان بچوں کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں گاؤں گاؤں اور گھر

گھر جا کر ان بچوں کو اکٹھا کر کے لا لایا ہوں اور اب میں ان کو ایک دم سے کیسے چھوڑ کر چلا جاؤں۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔

وہاں ایک گارڈر کو بجا کر اور تین ٹن کر کے ہمارے آئے اور جانے کی گھنٹی بجائی جاتی تھی لیکن جب تین دفعہ وہ گھنٹی بجتی تو وہ دو لر صاحب کی آمد سے پہلے بجتی تھی۔ جب وہ گھنٹی تین بار بجی تو ہم پریشان ہو گئے اور بھاگ کر باہر آ گئے اور کھڑے ہو گئے۔ دو لر صاحب سب بچوں کو خاطب کر کے کہنے لگے کہ ”بندہ نواز و تم کو پوتہ ہے کہ میں بندہ ہوں اور آپ بندہ نواز ہیں۔“ ہم نے کہا کہ ہاں بھی (حالانکہ نہیں کیا پتہ تھا کہ یہ بندہ نوازی کیا ہے)۔

انہوں نے پھر آپ واز بلند کہا کہ میں تمہارا خادم ہوں۔ ایک ظالم اور خونخوار آدمی آیا تھا جو مجھے تم سے چھین کر اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ وہ آقریر کرتے ہوئے رو بھی رہے تھے۔ دو لر صاحب نے کہا کہ اگر میں اپنی بیٹی کی بات مان کر یہاں سے چلا جاتا جو دلی جانے کی بڑی خواہش مندی تو نہیں آپ سے مل سکتا اس آپ مجھے مل سکتے۔ جب وہ رور ہے تھے اور ہمیں بہت پیارے تھے تو ہم بھی ان کی ناگلوں سے چمٹ کر رونے لگے۔ ایک عجیب حال دوہائی وہاں پنج گنی۔ وہ ایک باعزت آدمی تھے۔ انہوں نے اپنی ذات کو عزت عطا کی ہوئی تھی حالانکہ اتنے بڑے مالی فائدے سے محروم رہے۔ وہ جب بھی دنیا سے گئے ہوں گے اس اعزاز کے ساتھ گئے ہوں گے جس کی لوگ تمنا کرتے ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

ذات کی تیل بدی

پرسوں میرے ساتھ پھر وہی ہوا جو ایک برس اور تین ماہ پہلے ہوا تھا۔ یعنی میں اپنی گاڑی کا فلٹ اشیش پر تیل بدی کروانے گیا تو وہاں لڑکوں نے چیخ مار کر کہا کہ سر آپ وقت پر تیل نہیں بدلواتے، گاڑی تو اس طرح چلتی رہتی ہے لیکن اس کا اقصان بہت ہوتا ہے لیکن آپ اس کی طرف تو جنہیں دیتے۔ میں نے کہا بھی اس میں اکیلے میراہی قصور نہیں ہے میرے ملک میں تیل کی بدی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔ ہم پڑول ڈالتے ہیں، گاڑی چلتی رہتی ہے اور ہم ایسے ہی اس سے کام لیتے رہتے ہیں۔ پھر اچانک خیال آتا ہے تو تیل بدی کرواتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ گاڑی کا سارا تیل اتنا خراب ہو چکا ہے کہ اسے باہر نکالنا مشکل ہو گیا ہے۔

میں نے کہا کہ یار چلتی تو رہی ہے۔ تو انہوں نے کہا کہ آپ تو سر پڑھے لکھے آدمی ہیں اور گاڑی کا وقت پر تیل بدلوانا بہت ضروری ہے۔ پچھلے سال بھی انہوں نے مجھ سے یہی بات کہی تھی اور مجھ سے بدستور یہ کوتاہی سرزد ہوتی رہی۔ جب وہ لڑکے تیل تبدیل کر رہے تھے تو میں سوچنے لگا کہ میں باقی سارے کام وقت پر کرتا ہوں۔ بنیک بیلٹس چیک کرتا ہوں، یوٹیلنی بلز وقت پر ادا کرتا ہوں اور یہ ساری چیزیں میری زندگی اور وجود کے ساتھ گلی ہیں لیکن میں نے کبھی اپنے اندر کا تیل بدی نہیں کیا۔ میری روح کو بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ اس میں بھی تبدیلی پیدا کی جائے لیکن اس بابت میں نے کبھی نہیں سوچا۔ میں یہ بات سوچ کر پریشان ہوتا رہا کہ کیا مجھ پر ایسا وقت آ سکتا ہے کہ میں دنیاداری کے اور سارے کام کرتا ہو اور خوش اسلوبی سے ان کو تجھا تاہو اپنی روح کی طرف بھی متوجہ ہو کر اس کی صفائی اور پاکیزگی کا بندوبست کروں۔ میں نے ان کے گزشتہ سارے سالوں کا حساب لگایا لیکن میں ایسا کرنہ سکا۔ میری نیت تو شاید نیک تھی اور میں اچھا آدمی بھی تھا لیکن یہ کوتاہی میری زندگی کے ساتھ ساتھ چلتی آ رہی تھی اور میرا کوئی لبس نہیں چلتا تھا۔ میرے ساتھ ایسی بے اختیاری وابستگی کی میں اس کو اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا تھا۔ میرے خیال میں اپنی روح کے تیل کو تبدیل کرنے کی اپنے بدن کی

صفائی سے بھی زیادہ ضروری ہے جس کی طرف آدمی کسی وجہ سے توجہ نہیں دے سکتا وہاں بھی ہمارا مزاج اپنی گاڑیوں سے سلوک کی طرح سے ہی ہے۔ جیسا کہ ہم اپنی گاڑیوں میں پڑول ڈال کے تو چلتے رہتے ہیں لیکن پڑول سے مفید تر تیل بدی کا کام ہم نہیں کرتے تاکہ گاڑی کا انجمن محفوظ رہے۔ ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ وہاں سوچتے سوچتے اور بیٹھے بیٹھے مجھے خیال آیا کہ کچھ لوگ بڑے خوش نصیب ہوتے ہیں جن کی توجہ اپنی تیل بدی کی طرف زیادہ ہوتی ہے اور وہ انسانیت کے گروہ میں زیادہ خوبصورت بن کر ابھرتے ہیں اور لوگوں کی مزاج کے لیے کچھ کہنے والے بغیر بہت سارے کام کر دیتے ہیں۔ اللہ نے پتہ نہیں ان کو کس طرح سے ایسا ملکہ دیا ہوتا ہے۔

بڑے سالوں کی بات ہے جب 1952ء میں بہت بڑا Flood آیا تھا اس وقت بھی لا ہو رکھ سیلا ب سے بچانے والی فصیل بھی نہیں بنی تھی جسے آپ بند کہتے ہیں۔ اس وقت لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر ایسی ایسی جگہوں پر جا بیٹھے تھے جہاں زندگی بسر کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے طور پر یہ سوچ کر وہاں گئے کہ شاید وہاں ہمارا جانا مفید ہو یا پھر جس میں بطور صحافی ہم کچھ دوست وہاں گئے تو وہاں ایک بوڑھی مائی دو تین میں کے ڈبے رکھ کر بیٹھی تھی اس کے پاس ایک دیکھی تھی اور یوں لگتا تھا کہ اس نے کل شام وہاں چولبا بھی جلا یا ہے اور اس سے کچھ پکایا بھی ہے۔ اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں تھا۔ وہاں ان خیموں میں لوگ دور دوست کھلیے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھ آئے ہوئے متاز مفتی نے اسے دیکھ کر کہا کہ یا راس کی حالت تو بہت ناگفت اور خراب ہے۔ میں نے کہا کہ ظاہر ہے اور بھی بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہیں۔ اس خراب حالت میں اس کے چہرے پر ایک عجیب طرح کا اطمینان و سکون تھا۔ وہ بڑی تشنی کے ساتھ بیٹھی تھی اور اس کے چہرے پر کوئی شکایت نہیں تھی۔ متاز مفتی نے اس سے کہا کہ ”بی بی اگر تم کو دوسرا وہ پہلے جائیں (دو سو کان کراس کی آنکھیں روشن ہوئیں) تو پھر تو ان کا کیا کر دے گی؟“

کہنے لگی ”بھاجی لوگ بڑے غریب نہیں میں اونہاں دیج و نہ دیاں گی“

اب اتنے ہر س کے بعد مجھے اس مائی کا چہرہ بھی یاد آ گیا اور میں نے سوچا کہ اس نے اپنی روح کی تیل بدی بڑے وقت پر کی تھی اور اس کی شخصیت و فردیت اور برتری وہاں گئے ہوئے ہم سارے دانشوروں، رائشوں اور صحافیوں سے زیادہ اور بڑے درجے پر تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ پہلے سال اور اس سال کے درمیان مجھ میں ایک صلاحیت البتہ پیدا ہو گئی ہے اور وہ بھی کچھ اچھی صلاحیت نہیں ہے۔ اس میں تھوڑی سی مکینگی کا عنصر شامل ہے۔

وہ صلاحیت یہ ہے کہ میں اپنے مدد مقابل جب کسی نئے آدمی کو دیکھتا ہوں تو مجھے اتنا ضرور پڑے چل جاتا ہے کہ باوصاف اس کے یہ شخص بڑی مضبوطی اور تیز رفتاری کے ساتھ اپنی زندگی کا سفر کر رہا ہے

لیکن اس کا تیل اندر سے بہت گندہ ہے۔ پچھے لوگ زندگی میں ایسے بھی ملتے ہیں اور وہ ہر روز ملتے ہیں جنہوں نے کسی وجہ سے سارے کام کرتے ہوئے اس کی طرف بھی توجہ مرکوز رکھی کہ میری روح کے اندر اور میری کارکردگی کے اندر کی قسم کی آلاتش نہ آنے پائے۔ جب میں روم میں تھا تو وہاں کے ایک بڑے اخبار کے مالک جس کے دہنچنگ ایڈیٹر بھی تھے انہوں نے اپنے جرناشوں کو دعوت دی۔ انہوں نے مجھے بھی مدعا کیا۔ گوئیں کوئی برا کام کا راستہ بھی نہیں تھا۔ وہ بڑی عظیم الشان دعوت دی۔ وہاں بڑا پر تکلف اہتمام کیا گیا تھا۔ جب ہم کھانا وانا کھا چکے تو پچھے صاحبوں نے اس اخبار کے مالک سے فرمائش کی کہ آپ اپنا گھر ہمیں دکھائیں کیونکہ ہم نے سنائے کہ آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے۔ ہم اسے اندر سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ضرور و دیکھنے اور آئیے۔ ہم نے گلریوں کی شکل میں ان کے گھر کا اندر سے نظارہ کیا۔ بڑا خوبصورت تھا۔ اس گھر کے جو بڑے بڑے ڈیکوریشن والے اور مجسموں سے بھرے کمرے تھے اور ان میں خوبصورت پینٹنگز بھی لگی ہوئی تھیں۔ ایک بڑے خوبصورت کمرے بارے ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ کس کا کمرہ ہے۔ وہ کہنے لگے یہ میرے ذرا سیور کا کمرہ ہے۔ ہم بڑے حیران ہوئے۔ ہم نے دوسرے کمرے بارے پوچھا جو پہلے سے بھی اچھا تھا تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ باورچی کا کمرہ ہے۔ اس طرح ایک سے ایک اعلیٰ اور بڑھ کر کمرے دیکھے جو سارے گھر کے ملازموں کے تھے۔ پھر ہم نے وہاں ایک چھوٹا سا کمرہ دیکھا جس میں ٹیلیفون، ایک میر تھا جو کوئی پانچ آنھوں کا تھا۔ اس میں ایک بیڈ لگا تھا جو فولاد بھی ہو جاتا ہے۔ ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ ”یہ میرا اکمرہ ہے۔“

ہم نے کہا کہ سرآپ نے تو کروں کے لیے تو اعلیٰ درجے کے کمرے بنائے ہیں اور اپنے لیے یہ ہے۔ یہ کیا ماجرا ہے؟

وہ کہنے لگے کہ آپ کوشید معلوم نہیں کہ میری ماں روم کے ایک بہت بڑے لارڈ کے گھر میں باور جن تھی اور انہیں جو کمرہ ملا ہوا تھا وہ بڑا اتھک تھا۔ اس کمرے میں ہم اپنی ماں کے ساتھ تھیں بہن بھائی بھی رہتے تھے۔ جب میں نے گھر بنا�ا تو میں نے کہا کہ ملازموں کے کمرے بڑے خوبصورت اور Well Decorated ہونے چاہئیں اور میں تو ہوں ہی ایک بڑا آدمی اس لیے مجھے کسی بڑے کمرے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اس کو دیکھ کر اور اس کی بات سن کر ششدار رہ گئے کہ دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں۔

اس کے ملازم بڑے بخوبی اور مزے کرنے والے تھے۔ میں اس اخبار کے مالک کی خوبی اب محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے بھی اپنی ساری توجہ اپنی زندگی کو چلانے کے لیے اپنے پڑوں پر نہیں دی تھی بلکہ اس تیل پر دی تھی جو تبدیل کر کے انسانی زندگی کو سہولت کے ساتھ آگے لے جاتا ہے۔ ہم

سے یہ کوتا ہی عموماً ہوتی رہتی ہے۔ ہم بھی اپنی زندگیوں کو کم از کم ایک دفعہ تو اس انداز سے چلانیں جس طرح سے سائنس کہتی ہے یا میکنیکل کو سمجھنے والے کہتے ہیں کہ آپ کے انجن اور مشین کو اتنے گھنٹوں یا دنوں کے بعد تیل بدلتی کی ضرورت ہے اور وہ پڑول سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہم اپنے وجود کو اس طور سے چلانیں۔ کچھ لوگ جن سے میری فطرت بھی ملتی ہے اور میں ان کو آسانی سے پہچانا ہوں کہ ان کی طبیعت کے اندر تیل بدلتی والی خاصیت شاید ہوتی تو ہے لیکن کم ہوتی ہے۔ آپ کو زندگی میں بڑے بڑے امیر لوگ ملیں گے چاہے آپ کل سے اس کا تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ وہ زندگی میں بڑے کامیاب ہوں گے اور بڑے اوپر نے عبدوں پر فائز ہوں گے لیکن زندگی کے میدان میں اور جوانانیت کے کھیل کا میدان ہے اس میں وہ کمزور ہوں گے۔ کہیں نہ کہیں آکر ان کا انسانی رشتہ گھشن کا شکار ہوتا ہے جیسا کہ گاڑی کے اندر Fresh Oil شہزادہ الاجائے تو وہ گھشن کے ساتھ چلتی ہے اور ایک ماہر ڈرائیور بیٹھتے ہی بتا دیتا ہے کہ اس کے تیل کی تبدیلی نہیں ہوئی حالانکہ وہ دوڑ رہی ہوتی ہے لیکن جو نبی اس کے تیل کی تبدیلی ہوتی ہے تو وہی ماہر ڈرائیور کہتا ہے کہ سراب یہ زیادہ رو اس چل رہی ہے۔ لگتا ہے پرسوں ہی تیل تبدیل کیا ہے۔ زندگی کا معاملہ بھی بالکل اسی طرح سے ہی ہے۔ میں اپنے بچوں اور بیویوں پر یہ توجہ دے رہا ہوں کہ میں ان کو ایک کام کراؤں یا فلاں ڈگری دلوادوں اور لاکن بنا دوں اور کہیں فٹ کراؤں۔ یہ زندگی کی کامیابی نہیں ہے۔ زندگی میں کامیاب ہونے کا سارا اعلقہ ہم نے اتنا کس سے واہستہ کر لیا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں۔ اچھے آدمی ہیں لیکن طبیعت کے ذرا خت ہیں (اور اب میں اس پروگرام کے بعد ڈاٹریکٹ انہیں کچھ کہنے کے لیکن کہوں گا کہ جناب آپ اپنا "تیل بدلتی" کر لیں۔ اس پروگرام کے بعد کہی لوگ آپ سے ملیں گے گودھ اچھے ہوں گے اور اگر آپ کسی سے تھوڑے بے تکلف ہوں گے تو اپنے کسی دوست سے یہ ضرور کہیں گے کہ یا رہا "تیل بدلتی" کرو لیں یا تمہارا تیل بدلتی ہونے والا ہے۔)

وہ ایک شام اخبار پڑھ رہے تھا تو تھانے سے ٹیلیفون آیا اور کسی نے کہا کہ سرہم نے آپ سے استفسار کرنا ہے۔ کہنے لگے ہاں جی فرمائے۔ اس نے کہا کہ آپ کی بیگم صاحب گاڑی لے کر جاری تھیں۔ انہوں نے گاڑی کی کسی اور گاڑی کے ساتھ ٹکر مار دی ہے۔ کوئی خاص نقصان نہیں ہوا اور انہوں نے (بیگم صاحبہ) اس امر کا اعتراض کر لیا ہے کہ یہ ٹکر میری غلطی سے ہوئی تھی۔ اس شخص کی فون پر بات سن کر میرا دوست بولا کہ اگر اس خاتون نے اعتراض کر لیا ہے تو وہ میری یہوی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس نے آج تک اپنی کسی غلطی کا اعتراض نہیں کیا اور وہ یہ کہہ کر دوبارہ اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گئے۔ اس فون کرنے والے نے کہا کہ جی وہ اپنانام شاکستہ بتاتی ہیں تو صاحب نے کہا کہ اس نام کی کتنی خواتین ہیں۔ وہ میری یہوی ہو ہی نہیں سکتی۔

یہ تسلی بدلی والی بات ان پر بھی صادق آتی ہے اور یہ ایک سخت مثال ہے۔ جب میں ایک پسمندہ سے گاؤں کے ایک سکول میں کچی میں داخل کرایا گیا تو وہاں ایک بابا دال چپاتی ہوا کرتے تھے۔ ان کے پاس سرخ گاڑی تھی۔ وہ لمبا سا جب پہن کے رکھتے تھے اور پوپی کے کسی علاقے سے آئے تھے۔ جب بھی ہم گلی میں باہر نکلتے اور ان کی ریچ میں آتے تو وہ بابا دال چپاتی آگے بڑھ کر ہم کو پکڑ لیتا۔ ہم چھوٹے ہوتے تھے اور ڈر سے ہم چینیں مارنے لگتے تھے اور روٹے تھے لیکن وہ بابا ایک ہی بات کہتے تھے کہ ”جا تو آگے اور دیکھ تماشا! بھی اللہ کا فضل مجھے پکڑ لے گا اور دال چپاتی تیرے پیٹ میں ہے۔“

ہمیں لگتا ہا کہ اللہ کا فضل برا خوف ناک ہوتا ہے لیکن وہ ہمیشہ یہی کہتے جب میری ماں مجھے قاعدہ دے کر سکول بھیجتی تو میں کہتا کہ ”وہاں باہر بابا دال چپاتی ہو گا وہ مجھے پکڑ کر اللہ کے فضل کے حوالے کر دے گا۔“

جب میں برا ہوا تو عید کا ایک دن تھا۔ ہم جب نماز پڑھ کے مسجد سے باہر نکل رہے تھے تو میرے والد صاحب جو کہ قبے میں بڑے معزز تھے انہوں نے بابا دال چپاتی کی جوتیاں اٹھا کر پہننے کے لیے سیدھی کیں تو وہ کہنے لگے کہ ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر صاحب یا آپ کیا کر رہے ہیں۔ رہنے دیں میں ایسے ہی پہن لیں گا۔ میرے اباجی کہنے لگے کہ مجھے یہ سعادت حاصل ہونے دیں کہ میں آپ کی جوتیاں سیدھی کروں۔ وہ بابا کہنے لگے ڈاکٹر صاحب آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں۔ میں بڑا حیران ہوا کہ اباجی ایک معمولی سے آدمی کو اتنا بڑا مام سامان دے رہے ہیں اور آخر کیوں؟

میرے اباجی کہنے لگے کہ آپ ہم سب مسلمانوں کے لیے فخر کا باعث ہیں۔ تو وہ بابا دال چپاتی کہنے لگے کہ میں ایک اچھا انسان تو ضرور ہو سکتا ہوں لیکن اچھا مسلمان ہونے کا فاصلہ بھی بہت طویل ہے۔ اچھا انسان ہونا بہت مشکل ہے۔

خواتین و حضرات! آپ کو کچھ لوگ ایسے بھی میں گے جو اتنے زیادہ سخت طبیعت کے تو نہیں ہوں گے لیکن ان میں کچھ عجیب سا بیٹھن ہو گا۔ ہمیں اپنے دل کے اندر کوئی خباثت یا غلاظت نہیں پائی چاہیے۔ گزشتہ سال بڑی بارشیں ہوئی تھیں اور شدید بارش میں ہم جمعہ پڑھنے گئے تو نوجوان سے مولوی صاحب خطبہ دے رہے تھے۔ خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ویکھیں کیا اللہ کی رحمت ہے اور اس کی کیا مہربانی ہے اور کیسی خوبصورت اور دلفریب موسلا دھار بارش ہو رہی ہے اور ہم اندر پیٹھے ہوئے اللہ کے الطاف و کرم سے فیض اخخار ہے ہیں اور جو لوگ گاڑیوں پر جمعہ پڑھنے آئے ہیں ان کی گاڑیاں مفت میں داخل رہی ہیں۔

یہ بڑی باریکی بات تھی اور اس سے یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ابھی ایک ماہ کے

اندر اندر مولوی صاحب کو اپنی تیل بدلی کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ ہم ان کو ابھی پوری کی پوری داد نہیں دے سکتے۔ میں آپ سے جاتے جاتے یہ درخواست ضرور کروں گا کہ آپ اپنی موڑ کی تیل بدلی بھی وقت پر کروائیں اور اپنی روح اور رذالت کی تیل بدلی بھی وقت پر کریں ورنہ وقت بہت کم رہ جائے گا۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

رہبانیت سے انسانوں کی بستی تک

ہم سب کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پہنچے۔ ہمیں دوسروں کے مقابلے میں ہدایات، احکامات، اشارات اور Instructions ذرا مختلف قسم کی دی گئی ہیں۔ دوسرے مذاہب، امتیں اور قوموں کے لیے ذرا مختلف پروگرام ہے اور ہمارے لیے ان سے کچھ علیحدہ حکم ہے۔ مثال کے طور پر ہندوؤں میں چار طریقوں سے زندگی کے مختلف حصوں کو الگ الگ کر کے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ پہلے حصے کو ”بال آشرم“ کہتے ہیں۔ یہ وہ عرصہ ہے جب آدمی چھوٹا یا بال (چور) ہوتا ہے۔ تب وہ کھیلتا ہے، کھاتا اور پڑھتا ہے اور آگے بڑھتا ہے۔ اس کے بعد اس کا ”گھرست آشرم“ آتا ہے۔ گھرست میں وہ شادی کرتا ہے اور تب وہ پیچس بر س کا ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ دنیا کے میدان میں پوری توانائی کے ساتھ داخل ہو جاتا ہے۔ تیر سے نمبر پر آدمی کا وان پرست آشرم شروع ہوتا ہے۔ اس آشرم میں ایک شخص دنیاداری کا کام کرتے ہوئے بھی اس سے اجتناب برتا ہے۔ دنیا کا رو بارہ دکان چھوڑ کر وہ گھر آ جاتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ دنیاداری سے کمل طور پر غیر متعلق نہیں ہوتا بلکہ تھوڑا سا تعقل رکھتا ہے۔ اپنے بچے کو دکان یا کاروبار پر بھیج دیتا ہے اور وہ بچے اس کے نائب کے طور پر کام کرتا ہے اور اس کا کام صرف اتنا ہی ہے کہ وہ گھر بیٹھے بیٹھے بچے کو Instruct کرتا رہتا ہے اور اشارے دیتا رہتا ہے کہ یہ کام کرنا ہے، یہ نہیں کرنا اور خود و فترت یا کام پر نہیں جاتا۔ آخر کے چوتھے آشرم یعنی 75 سال کی عمر کو جب انسان بچنے جاتا ہے تو اس درجے کو ”سیاس آشرم“ کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دنیا چھوڑ کے اور اپنی رسی اور لوٹا لے کر وہ ”بند اس“ پہ چلا جاتا ہے۔ گودہ عملی طور پر باہر جائے نہ جائے لیکن اس کا دنیا سے کوئی دخل نہیں رہ جاتا۔ میں آپ کو تفصیل سے اس لیے بتا رہوں کہ آگے چل کر اس موضوع پر ہم بات کریں گے۔ ہندوؤں کی طرح سے جیسی مذہب ہے۔ یہ ہندوؤں سے بالکل مختلف ہے۔ آپ نے ایسے ہی ہمارے لاہور کے جیسی مندر کو تکلیف پہنچائی گئی حالانکہ اس کا ہندو مذہب سے کوئی تعقل نہیں (بابری مسجد کی شہادت کے ساتھ کے وقت مشتعل ہجوم نے لاہور کے جیسی مندر کی بھی توڑ چھوڑ کی تھی۔)

اسی طرح سے بدھ مذہب ہے وہ اپنے بھکشو تیار کرتا ہے۔ اسی طرح عیسائی کہتے ہیں کہ پادری بنو دنیا سے ناتا چھوڑ دیں۔ عورتوں سے کہتے ہیں نن بن جاؤ شادی نہ کرو۔ ان مذاہب کا کہنا ہے کہ آپ ترکِ دنیا کے زندگی بر کرو۔ ہمارے ہاں اس سے مختلف ہے کہ آپ کو دنیا بھی ساتھ لے کے چلتی ہے اور دین بھی ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔ خاصاً مشکل کام ہے کہ دین کو بھی پورے کا پورا سنبھالنا ہے اور دنیا کو بھی سہارا دینا ہے اور اس صورتحال سے بھاگ نہیں اور سنیاس اختیار نہیں کرنا ہے۔ تارکِ دنیا یا راہب نہیں بنتا ہے۔ راہب وہ ہوتے تھے جو پیہاڑوں کی گفاؤں اور ریت کے ٹیلوں یا پھر جنگلوں میں جا کر بیٹھتے تھے۔ کسی کو ملتے نہیں تھے اور اللہ اللہ کرتے رہتے تھے۔ ہم کو یہ حکم ہے کہ دنیا میں رہیں اور اللہ کے ساتھ رشتہ بھی مضبوط رکھیں اور اس کے لیے کہیں چل کر جانے کی یا سفر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سفر کے لیے یا ہر لکھنا پڑتا ہے لیکن یہ سفر ایسا ہے کہ اس کے لیے کہیں جانا نہیں ہے لہس اپنی شرگ تک پہنچا ہے۔ جہاں پر اللہ تشریف فرمائیں اور سب کا اللہ اس مقام پر موجود ہے۔ ایک بار ہمارے بابا جی کے ڈیرے پر ایک آدمی آیا۔ وہ کچھ عجیب طرح کا صدی یا لڑائی کرنے والا آدمی قفا اور چی بات تو یہ ہے اللہ مجھے معاف کرئے اس کی شکل بھی کچھ اتنی اچھی نہیں تھی۔ جیسا کہ آدمی اس شخص کے پہلے ہی بہت سارے نمبر کاٹ لیتا ہے جس کی شکل و صورت اچھی نہ ہو اور اس سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اس لیے میں اس کے ساتھ ذرا بختری کے ساتھ پیش آیا۔ اس نے کچھ خراب سی بات کی تھی تو میں اس سے کہنے لگا کہ مجھے یہ کس نے کہا فلاں فلاں..... بابا جی نے کہا کہ آپ اس کو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ میں نے کہا کہ کیوں؟ وہ کہنے لگے اس طرح تو آپ اللہ کو جھپڑ کیاں دے رہے ہیں۔ میں نے کہا جی تفویض باللہ وہ کیسے؟ بابا جی کہنے لگے کہ اللہ تو اس کی شرگ کے پاس ہے۔ وہاں تو اللہ میاں کری ڈال کر بیٹھے ہیں اور تم اس کے ساتھ زیادتی کر رہے ہو۔ تمہیں اس کا احترام کرنا پڑے گا۔ یعنی جس بندے کی بھی شرگ کے پاس اللہ موجود ہے اس کا احترام کرنا آپ کا فرض ہے۔

اب اس دن سے مجھے ایسی مصیبت پڑی ہے کہ ہمارے گھر میں جومائی جھاڑ دینے آتی ہے وہ بہت تنگ کرتی ہے۔ میری کتابیں اٹھا کر کبھی ادھر پھینک دیتی ہے کبھی ادھر پھینک دیتی ہے۔ اب میں اس سے غصے بھی ہونا چاہتا ہوں لیکن کچھ کہتا نہیں ہوں۔ باونقد سیر کہتی ہے کہ آپ اسے جھڑک دیا کریں۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ نہیں اس کے پاس تو اللہ ہے میں اس کو کیسے کچھ کہوں۔ مجھے اس دنیا سے مصیبت جاں پڑی ہوتی ہے۔ تارکِ دنیا ہو کر اللہ کو یا نہیں کرتا بلکہ اللہ کو ساتھ رکھ کے یاد کرنا ہے۔

پیارے بچو!

حیرانی کی بات یہ ہے کہ ہمارے سامنے ہماری زندگیوں میں اور ہمارے ہی ملک میں تقریباً

سارے کے سارے لوگ تارک الدنیا ہو کر بنیتھے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے یہ بابا کیسی بات کر رہا ہے۔ ہمارے اباجی ماموں تائے سارے گھر آتے ہیں اور فیکٹری چلاتے ہیں، کام کرتے ہیں، یہ کیسے راہب ہو گئے۔ میں نے لوگوں کو غور سے دیکھا ہے اور ان پر غور کیا ہے کہ یہ راہب لوگ اور اب تو ہم سارے ہی تقریباً تقریباً راہب بن چکے ہیں۔ یہ بڑے بڑے شہروں میں بھی رہتے ہیں اور وہ کاروبار زندگی بھی کرتے ہیں اور اس کے باوصف کہ یہ اتنے سیانے اور سمجھدار ہیں۔ سارے رہبانیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور ہمیں پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ راہب لوگ ہیں۔ راہب لوگ وہ ہوتے ہیں جو اپنے لوگوں سے تعلق توڑ کر، بستی چھوڑ کر کسی اور جگہ پر جائیں اور کسی سے تعلق نہ رکھیں یہ اس کی چھوٹی تعریف ہے۔ اب آپ بھی اسلام آباد تشریف لے جائیں وہ بڑا چھاخو بصورت اور پیارا شہر ہے۔ وہاں جتنے بھی لوگ ہیں وہ سارے کے سارے راہب ہیں۔ کسی بھی سیکرٹریٹ کے کسی بھی دفتر میں چلے جائیں آپ کسی کو آسانی سے نہیں مل سکتے، سب راہب بنے ہیں۔ راہب سے ماناں لیے مشکل ہوتا ہے کہ وہ اپنی گفایں بیخدا ہوتا ہے۔ کسی سے ملتا ہی نہیں ہے۔ میں ایک ڈپٹی سیکرٹری کے دفتر میں بیخدا تھا کہ وہاں ایک آدمی آگیا۔ وہ ڈپٹی سیکرٹری صاحب اے دیکھ کر گھبرا گئے۔

حیرت اور گھبراہٹ سے اس سے کہنے لگے گا جی آپ کیسے یہاں آئے؟
اس نے کہا کہ جی میں بڑے دروازے سے آیا ہوں۔

انہوں نے کہا کہ وہ اپنے دروازے سے تو آئے ہو لیکن آپ کو آنے کس نے دیا ہے؟
اس نے کہا کہ جی وہاں پر جودرباں ہے اس نے مجھ سے کہا کہ آپ آج نہیں کل چلے جاتا۔
یہ سن کر میں گھر چلا گیا۔ میں آج آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔

وہ پوچھنے لگے کہ آپ اور کیسے آئے؟
وہ شخص کہنے لگا کہ جی میں سیرھیاں چڑھ کر آیا ہوں۔ میں نے لفت والے سے کہا تھا کہ مجھے اوپر لے جائیں اس نے کہا کہ یہ افسروں کی لفت ہے۔ میں نے کہا کہ یہ دوسرا لفت ہے اس سے بھیج دو۔ تب اس نے کہا کہ یہ ڈپٹی سیکرٹری کی لفت ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تیسرا.....
اس نے کہا کہ یہ سیکرٹری صاحب کے لیے ہے اور اس لفت والے نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ نے اور جانا ہی ہے تو آپ سیرھیاں چڑھ کر چلے جائیں اور میں سیرھیاں چڑھتا چڑھتا آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

ڈپٹی سیکرٹری صاحب نے کہا کہ آپ کو کیا کام ہے۔
اس نے جواب دیا کہ مجھے فلاں فلاں کام ہے تو انہوں نے کہا کہ اس کام کے لیے آپ کو خط لکھنا چاہیے تھا۔

اس شخص نے کہا کہ جی میں نے لکھا تھا۔

تب انہوں نے کہا کہ مجھے نہیں ملا۔

اس بچارے شخص نے کہا کہ نہیں جی وہ آپ کو پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ میں نے اسے رجسٹری میں ارسال کیا تھا۔

اس پر ڈپنی سیکریٹری صاحب نے کہا کہ اگر تم نے وہ بذریعہ رجسٹری بھیجا تھا تو تمہیں پہلے ڈاکنے سے اس کی قصیدت کرنی چاہیے تھی کہ کیا وہ ٹھیک طرح سے ڈیلیور ہو گئی ہے کہ نہیں ہوئی۔

اس نے کہا کہ میں جناب عالیٰ ڈاکنے سے تحقیق کر جانے کے بعد ہی حاضر ہوا ہوں۔ وہ ٹھیک ڈیلیور ہو گئی ہے اور چودہ تاریخ کو آپ کے دفتر میں پہنچ گئی ہے۔ صاحب نے کہا کہ پھر آپ کو فون کرنا چاہیے تھا۔ آپ یہاں کیوں آگئے۔ وہ افسر تارک دیا تھا۔ راہب بن چکا تھا جو اس شخص سے اس انداز میں مخاطب ہو رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ میں تو ایسے ہی لوگوں سے نہیں ملتا۔ ڈپنی سیکریٹری صاحب کی یہ باتیں سن کر وہ شخص شرمندہ اور پریشان ہو کر واپس سیر ہیں اتر گیا اور جانے سے پہلے کہنے لگا اچھی جی میں پھر کسی کولاوں گایا کوئی زور دالا ووں گا کیونکہ اس گفا (غار) میں جو شخص بیٹھا ہے وہ میری بات نہیں سنتا۔ وہ تو اللہ سے لوگا کے بیٹھا ہے۔ یہ تو ہمارے ملک کے بندے کی بات تھی۔ باہر کے ملکوں کے لوگ جو ہمارے ملک میں تجارت کرنا چاہتے ہیں، فیکٹریاں یا کارخانے لگانا چاہتے ہیں اور انہیں ون ونڈو سسٹم کا یقین دلایا گیا ہے۔ ون ونڈو سسٹم کا مطلب یہ ہے کہ آپ ایک ہی کھڑکی پر آئیں۔ اپنام ع بیان کریں اپنی فرمبلی رپورٹ وہاں پیش کریں تو وہ ایک ہی ونڈو والا با بو صاحب یا ڈپنی سیکریٹری کہے گا کہ جی آپ کا ہنس کا چھایا پتوکی جہاں آپ چاہتے ہیں فیکٹری لگا سکتے ہیں۔

اب باہر والے پریشان ہو کر کہتے ہیں کہ یہاں ون ونڈو تو کیا کوئی ونڈو ہے ہی نہیں۔ ہم آدمی تلاش کرتے پھر تے ہیں، ہمیں یہاں کوئی آدمی ہی نہیں ملتا۔ یہاں تو رہا بہت ہے۔ سارے راہب لوگ رہتے ہیں اور ان سے ملتا بہت مشکل ہے۔ اب اس سارے عمل میں آپ کا لوگوں سے تعلق کس طرح نہ تھا۔ یہ ایک غور طلب بات ہے۔ گھروں میں بھی بعض اوقات ایسا ہوتا ہے۔ ہمیں پتے نہیں چلتا۔ ہم میں سے کئی لوگوں کا گھروں میں بھی رویہ بالکل راہبوں جیسا ہوتا ہے۔ ایک دفعہ ہم پیشے تھے میرا ایک کزن جو میرا ہم عمر ہی ہے اس کا نام اکرام ہے۔ وہ اپنے پہلے بچے کی پیدائش کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ بچوں میں بڑے زمیندار ہیں۔ وہاں ان کی زمیں ہیں۔ وہ بتانے لگے کہ جب ان کے بچے کی پیدائش کا وقت آیا تو شب شام یا رات کا وقت تھا اور وہ تھوڑے پریشان ہوئے۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا کہ گاڑی نکالیں، ہمیں لا ہو رہا جانا چاہیے اور آدمی رات کو لا ہو رہنچ گئے۔ ہم سب گھر کے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں میری چھوٹی بہن بھی موجود تھی اس نے کہا کہ اکرام بھائی اگر خدا خواستہ

رات کو سفر کے دوران کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تب آپ کیا کرتے تو وہ کہنے لگے اگر کوئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی تو میں فوراً ریحانہ (بیوی) کوڈ رائیونگ سیٹ سے اٹھا کر پیچھے نا دینا اور خود گاڑی چلانے لگ جاتا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ اس نے ساری رات ڈرائیونگ بھی اپنی بیوی ہی سے کرانی ہے اور خود مزے سے لیٹنے رہے ہیں۔ یہ گھروں کے راہب ہوتے ہیں جن کا آپ کو پہنچنیں چلتا۔ آپ نے گھروں میں اپنے بھائی بڑوں کو دیکھا ہو گا کہ وہ کسی کام میں دخل ہی نہیں دیتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید دخل نہ دینے سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے حالانکہ اس سے ہرگز ہرگز کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ جیرانی کی بات یہ بھی ہے کہ ہمارے ملک میں جتنے بھی تاجر اور دکاندار ہیں وہ بھی تمام کے تمام رہبانتی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ان کو سوائے اپنی ذات کے اور اپنی زندگی کے اور کسی چیز سے کوئی تعلق یا سروکار نہیں ہے۔ مزے سے تجارت کر رہے ہیں۔ ان کی جھوٹی سی دنیا ہے اور وہ اپنی اسی تجارت کے اندر گھومن گھیری انداز سے چکر کاٹ رہے ہیں۔ باہر لوگ کیسے آباد ہیں۔ ان کی کئی مشکلات ہیں ان کو کیا کرنا چاہیے وہ اس بارے بالکل کچھ نہیں جانتے۔ وہ سارے کے سارے اپنی غاروں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ میرے حساب سے نک نک کر کے تسبیح پھیرنے والے دنیا سے لاتعلق لوگ ہیں۔ ان کا اپنی ہی ذات سے واسطہ ہے۔ ہمارے کیا تقاضے ہیں۔ ہم ان سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ہم سے بات نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے لاہور میں ایک بہت بڑا برادر تھا رودھ ہے۔ وہاں ماشاء اللہ بڑے امیر لوگ رہتے ہیں۔ کراچی میں بڑے امیر ترین لوگ ہیں۔ فیصل آباد کی سورہ منڈی دنیا کا امیر ترین علاقہ ہے لیکن جتنے بھی لوگ وہاں بیٹھے ہیں، پہن تو وہ ہمارے درمیان اور رہتے بھی اسی دنیا میں ہیں، لفڑو ہماری جیسی کرتے ہیں، کھانا بھی ہمارے جیسا کھاتے ہیں لیکن وہ ہمارے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے۔ جب ہم پلٹ کرائے اس دکھ کا اطمینان اپنی ذات سے کرتے ہیں تو یہ یہ چلتا ہے کہ ہم بھی ایسے ناقہ ہیں کہ بس تقید کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں اور ہم بھی ان دوسرا راہب ہی کی طرح سے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ پہنچنیں چلتا۔ ہم بھی راہب لوگ ہیں۔ کس کو ہماری ضرورت ہے، ہم کس کی کس طرح سے مدد کر سکتے ہیں، ہمارے ملک کے کسی باشندے کو کیا تکلیف ہے، ہمیں معلوم نہیں۔ ہم بھی بھائی اکرام جیسے ہی ہیں اور سوچتے ہیں کہ اگر تکلیف ہو گئی تو میں موڑ چالا لوں گا اور نہ بیوی گاڑی چلاتی رہے۔

ہمارا ضمیر بھی اسی طرح سے ہو گیا ہے۔ یہ کوئی ایسی خوشنوار بات نہیں ہے۔ لیکن وہ حکم جو ہمیں دیا گیا ہے کہ ہم دنیا کے ساتھ ساتھ دین بھی رکھیں وہ شاید ہم نے اپنی کوشش کے باوجود دسارے کا سارا اپنی دنیا کے اندر اس طریقے سے ڈال دیا ہے کہ ہم ان لوگوں سے بھی زیادہ لاتعلق ہو گئے ہیں جو لوگ رہبانتی کی زندگی بس کر رہے ہیں۔ لوگ آپ سے ہم سے بار بار پوچھتے ہیں استحکام پاکستان کی بھی بات ہوتی ہے، ہمارے معاشرے کو مغربی عطا کرنے کی بھی بات ہوتی ہے اور ارادے باندھے

جاتے ہیں۔ یہاں پر بننے والے گروہ انسانی کو بھی تکڑا کرنے کی بات کی جاتی ہے لیکن ہم سب کچھ کیسے کریں۔ ہم کس طرح سے ایسے ہو جائیں کہ ہمارا یہ علم عمل کی صورت اختیار کر جائے اور ہم رہنمائی سے نکل کر اس حکم میں داخل ہو جائیں جس کا ہمیں بڑی شدت اور زور سے آرڈر دیا گیا ہے۔ میں تو کسی تیجہ پر پہنچ نہیں سکا۔ میں سمجھتا ہوں کہ غرض مندی اور اپنی ذات کے بارے ہی میں سوچتے رہنا ہمار اوپریہ ہو گیا ہے اور ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ میں اس موقع پر باہر کے ملکوں کی مثال نہیں دینا چاہتا کیونکہ میں وہ دیا نہیں کرتا لیکن جب آپ اپنے اردوگرد سمجھتے ہیں تو آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے گروہ انسانی وہ اس اعتبار سے بہت بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں جس اعتبار سے ہمیں کرنی چاہیے تھی اور ہمیں کرنی پڑے گی۔ آپ ماشاء اللہ ذہین اور پڑھنے لگھنے والے بچے ہیں آپ اسے سوچ کر میرے کسی اگلے پروگرام میں اس بارے میری رہنمائی ضرور تکمیل کرے گا کہ ہم ذاتی غرض مندی سے کیسے نکلیں؟

اور ہمیں کب اور کیسے محسوس ہونے لگے کہ ہمارے اردوگرد ہمارے بازاروں میں کچھ اور لوگ بھی لختے ہیں اور ان کا احترازم بھی کیا جانا چاہیے۔ جب ہم اپنے بچپن میں ولائی استادوں سے پڑھتے تھے تو اس بات پر برازور دیا کرتے تھے

You have not to forget the words' thank you and i am sorry.

اب پتہ چلتا ہے کہ ان الفاظ کی ادائیگی سے ایک رشتہ قائم ہوتا ہے۔ ہماری تربیت کی ہی مثال لے لیجئے لیکن کسی پر کیا الزام دیں اپنی ذات کے اندر ہی جھاٹک کر دیکھیں۔ اب مجھے بھی کئی ٹیلیفون آئیں گے کہ اب تو آپ بھی راہب نہ نہیں میرا یہ کام کروادیں اور میں اس سے پلت کے یہ نہیں پوچھ سکوں گا کہ کیا آپ نے کسی اور کا کام کر دیا ہے۔ آپ کو یاد ہے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ”وتے وچوں دینا اے“ یہ بڑی دیری کی بات ہے تو مجھے لوگوں نے کہنا شروع کر دیا کہ مجھے جی ہزر روپیہ دے دیں کوئی پانچ ہزار روپیہ مانگنے لگ گیا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے بھی ”وتے وچوں دینا اے“ اس طرح کی پیاری سی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔

آج تھوڑا سا بوجھ میں نے آپ کی طبیعتوں پر ڈال دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور اس کا کوئی حل نکالیں گے اور میری رہنمائی ضرور کریں گے اور میں آپ کی شکر گزاری کے ساتھ اگلے پروگرام میں ایک ایک کا نام لے کر یہ بتاؤں گا کہ آپ نے کیا رائے دی۔

اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔
آمین۔

Salute to Non-Degree Technologists

آپ سب کو ال زادی کی طرف سے سلام پہنچے۔ ہم اس پروگرام کے شروع ہونے سے پہلے تعلیم اور علم کی بات کر رہے تھے، علم ایک ایسا موضوع ہے جس پر آپ صدیاں بھی لگا دیں تو فتح نہ ہو کیونکہ یہ موضوع بڑی دیر سے چلتا آ رہا ہے کہ علم کیا ہے؟ اور اسے کیسے منتقل کیا جاسکتا ہے۔ اب جو موضوع دنیا کے سامنے ہے وہ یہ ہے کہ کیا علم کے ساتھ Ethics and Morality یا اخلاقیات کو بھی لیا جانا چاہیے یا کہ خالی نیکنا لو جی اور سائنس پڑھادی نی چاہیے۔ ابھی تک دنیا نے اس حوالے سے کوئی خاص اور حصی فیصلہ نہیں کیا۔ ہم مشرق والوں نے ایک زمانے میں یہ فیصلہ کیا تھا اور دوسرے علم کے ساتھ اخلاقیات کی تعلیم رومی اور سعدی پڑھاتے رہے ہیں اور اخلاقیات پر بنی اکتابیں کورس میں ہوتی تھیں لیکن اب کہا جاتا ہے کہ اب اس کی چند اس ضرورت نہیں ہے۔ آدمی کو ایک Given Specific Specialisation کرنی چاہیے اور اس کے بعد اسے چھوڑ دینا چاہیے۔ اکثر آپ بڑے پیشہ والوں کی شکایت کرتے ہیں جن میں ڈاکٹر، انجینئر، زیور و کریں شامل ہیں اور آپ کہتے ہیں کہ ہم فلاں افسر یا ڈاکٹر صاحب کے پاس گئے تھے لیکن انہوں نے ہم پر کوئی توجہ نہیں دی۔ بس وہ اپنی بات کرتے رہے جبکہ ہم چاہتے تھے کہ وہ ہمارے ساتھ ویسا سلوک کریں جیسا انسان انسانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ اب ڈاکٹر صاحب کے پاس یہ جواز ہے کہ ہم اس علم کو جانتے ہیں جس کی آپ کے بدن کو ضرورت ہے۔ جس علم کی آپ کی روح اور جذبات و احساسات کو ضرورت ہے۔ وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وہ آپ کسی اور جگہ سے جا کر لیں پھر آپ جگہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ پرانے زمانے میں جب علم اتنا عام نہیں تھا تو جس بارے کے پاس علم ہوتا تھا اس کے پاس شفقت بھی ہوتی تھی، محبت بھی ہوتی تھی، آپ کے مشکل سوالوں کے جواب بھی ہوتے تھے اور اگر جواب نہیں آتا تھا تو اس کے پاس وہ تھکلی ہوتی تھی جس سے سارے دکھ اور درد ور ہو جاتے تھے لیکن اب اس طرح سے نہیں ہوتا۔ میں بھی دیکھتا ہوں اور آپ بھی

دیکھتے ہوں گے کہ ہم سائنس اور تکنالوجی کی بڑی تو قیر کرتے ہیں۔ یہ ایک اچھی بات ہے وہ ممکن جو اس میدان میں پیچھے ہیں مشکل میں بٹتا ہیں اور اس مشکل سے نکلا چاہتے ہیں لیکن میں نے اس بات کا جائزہ لیا ہے اور اس قریب سے دیکھا ہے کہ ہم Technologist یا پیشہ والوں کو اس محبت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے جس محبت کے انداز سے ہم ان کے بارے میں انگریزی اور اردو کے اخبارات میں مضمون لکھتے ہیں۔ میرے ساتھ ایک واقعہ پیش آیا۔ گوجرانوالہ کے پاس ایک قصبہ کا مونگی ہے اس کے پہلو میں جاتے ہوئے میں نے دیکھا کہ پانی سے بھرے ہوئے کھیتوں کے اندر گھٹنے گھٹنے پانی میں لڑکیاں دھان کی پیپری لگا رہی تھیں جسے ”لایں“ لگانا کہتے ہیں۔ وہ آنھوں نے لڑکیاں ایک سیدھی قطار میں پیپری کا پودا لگا رہی تھیں حالانکہ ان کے پاس کوئی فنا یا ڈوری باندھی ہوئی نہیں تھی لیکن وہ نہایت خوبصورت انداز میں بالکل سیدھی قطار میں پیپری لگا تیں اور پھر ڈریڑھفت پیچھے ہٹ جاتیں اور تقریباً ڈریڑھفت پیچھے ہٹ کے ویسی ہی ایک اور قطار میں وہ پیپری یاد دھان کا پودا لگا تیں۔ یہ میرے لیے ایک نئی چیز تھی اور میں وہاں کھڑا ہو کر انہیں دیکھنے لگا۔

ایک لڑکی نے کہا بابا جی آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟

میں نے کہا کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم ایک سیدھی لائن میں ایک دی ہوئی یا باریک Given Space کو کس طرح سے Follow کرتی ہو؟ اس نے کہا کہ یہ تو ہمارا صدیوں کا کھیل ہے۔ ہماری نانی، دادی اور ماں یہ کام ہی کرتی آئی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ تو ٹھیک ہے کہ آپ کے وجود کے کپیوٹر میں چپ لگا ہوا ہے کہ کس طرح سے کام کرنا ہے لیکن میں تخلیل کا آدمی ہوں۔ مجھے دل کے اندر اس تخلیل کو آگے بڑھا کر دا تو دینے دو۔ اس نے کہا کہ بابا جی آپ کی بڑی ہی مہربانی۔ میں ان کا کام دیکھتا رہا اور ان سے پوچھتا رہا کہ تم کو اس کام کے کتنے میں ملتے ہیں۔ انہوں نے وہ بھی بتایا اور یہ بھی بتایا کہ پانی میں مسلسل کھڑے رہنے سے ان کے پاؤں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے اور شلواروں کے پاس پیچے چھٹ جاتے ہیں۔ جب میں بچوں سے کہتا ہوں کہ ان لڑکیوں کا کام بھی ایک علم ہے تو یہ ناراض ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو ان پڑھ لڑکیاں ہیں وہ علم پھر کیسے ہو سکتا ہے؟ علم تو صرف ان لڑکیوں اور خواتین کے پاس ہے جو کانجی یا یونیورسٹی سے حاصل کرتی ہیں۔

چرخ دکھاتے والی مالی کا کام تو علم نہیں ہے حالانکہ وہ متند بھی نکالتی ہے، کپڑا بھی بنائے دیتی ہے اور ہم کھیس اور رضائی بھی اس کے ہاتھ کے کھاتے ہوئے سوت کی لیتے ہیں لیکن ہم اسے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ان لڑکیوں کو کام کرتے دیکھ کر اور واپس آ کر میں نے اپنے شہر کے لوگوں کا جائزہ لینا شروع کیا تو محبوس کیا کہ یہ بڑا ہی خوش نصیب ملک ہے اور یہ ملک Technologists سے بھرا ہوا ہے۔ سڑک کنارے ایسے ایسے کمال کے ذہین موڑ کلینک بیٹھے ہیں جو

آپ کو ایک اعلیٰ درجے کی اپورنہ موثر کو خراب ہونے کی صورت میں آسانی سے ٹھیک کر کے دے دیتے ہیں۔ میں نے اپنی ایک کمپنی اور پڑھے لکھنے لوگوں کے آگے ایک درخواست پیش کی کہ ان کو بڑے خوبصورت سرٹیفیکیٹس چھاپ کر دیتے ہیں اور ان پر ہم سب دستخط کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم زمکن کنارے پیشے ہوئے لوگوں کو بھی سندیں دیں۔

لیکن اس کمپنی نے میری اس بات کو اچھا نہ سمجھا اور ان پر ناگوار گزرا اور کہنے لگے آپ بھی کیا فضول بات کرتے ہیں۔ وہاں ایک بڑے صاحب تھے جو جج بھی رہ چکے ہیں اور آپ سارے انہیں جانشین ہیں انہوں نے کہا اشراق صاحب اگر انہیں کچھ دینا بھی ہوا تو کیا آپ ان کا ٹائمیٹ لیں گے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنی بیالیں لا کھکی گاڑی کی بغیر ٹائمیٹ لیے ان کو دے آتے ہیں اور کہتے ہیں ”بھا صدقیق اسے ٹھیک کر دینا“ اور وہ کہتا ہے کہ مجھی اسے ٹھیک کرنے میں متن دن سے کم نہیں لگیں گے۔ اس کی خرابی بڑی یچیدہ ہے (میں بھا صدقیق کی وہ بات سن رہا تھا) اس نے مزید کہا کہ مجھی اگر جاپان والے آئیں تو انہیں ہم سے ضرور ملوانا انہوں نے اس گاڑی میں ایک بنیادی غلطی کی ہے اور اگر وہ فلاں جگہ پر آدھے انج کی جھری دے دیں اور ایک قابلہ ادھر لگا دیں تو یہ خرابی اس میں پیدا ہوئی نہیں سکتی۔ میں نے کمپنی والے صاحبان سے کہا کہ آپ ان ہنزمندوں کو مجھے سلام کر لینے دیں۔ پھر میں نے ان بڑے لوگوں سے ڈرتے ڈرتے کہا کہ بہت لائق لڑکیاں ہیں جنہوں نے ایگر لیکچر میں ”لا بیں“ لگانے میں ایم ایمس سی کر رکھی ہے کیا انہیں سرٹیفیکیٹ دے دیں تو جواب ملا۔

”دفع کریں جی۔“

اب ان کے خیال میں ان کے پاس کوئی علم سرے سے ہے ہی نہیں۔ علم تو ان کے خیال میں وہ ہے جس پر وہ ٹھپہ لگا دیں اور یونیورسٹی اس ٹھپے کی قصدیق کر دے۔ ہماری اس کمپنی میں ایک ہارٹ سرجن بھی تھے۔ وہ کہنے لگے کہ اشراق صاحب آپ نے جو سرٹیفیکیٹ چھپا دیا ہے ایسا تو میرے پاس بھی نہیں اور یہ تو اس سے بھی خوبصورت ہے جو میں نے ایف آری ایمس کرنے پر ایڈنبر اسے لیا تھا۔ کیا آپ یہ سرٹیفیکیٹ ایسے ہی دے دیں گے اور یہ کس کو دیں گے؟

میں نے کہا، میں یہ سرٹیفیکیٹ اس ویلڈ روکو دوں گا جو آپ کے ہپتال کے باہر بیٹھا ویلڈ نگ کرتا تھا۔ وہ کہنے لگے آپ اسے کیوں دیں گے؟

میں نے کہا ڈاکٹر صاحب میں آپ کو اس کی ویلڈ نگ گن لے دیتا ہوں اور آپ سے کہتا ہوں کہ پیتل اور تانبے کا ٹانکا لگا دیں لیکن آپ ایسا نہیں کر پائیں گے۔ جس طرح وہ آپ کا کام نہیں کر سکتا اس طرح آپ اس کا ہنر نہیں جانتے۔ آپ ڈاکٹر صاحب مجھے ان بے ڈگر یوں کے پیارے ہنزمندوں کو اتنی توزع تذمیر دینے دیجیے جتنی کہ آپ کوئی رہنی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ

اس خیال کو چھوڑ دیں۔ ویسے ہم ان لوگوں کی عزت کرنے کے لیے لکھتے اور چھاپتے رہیں گے۔ اس سے خواتین و حضرات میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں کو ان کی عزت نفس لوٹانا ہی نہیں چاہتے۔ آرٹسٹ، موچی، نائی، ہر ایک انسان کی عزت ہوتی ہے اور دوسری اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ پاکستانی ہے اور مجھے اس کو اتنی عزت تو دیتی چاہیے جتنی میں باہر سے آئے ہوئے گورے کو دیتا ہوں۔ ہمارے مزاج اتنے کیوں بگزئے ہمارے معاشرے میں عزت نہ دینے کا رہ جان کیسے آیا، ہمارے سکول اور درس کا ہیں اخلاقیات کی تعلیم کیوں نہیں دیتی ہیں۔ یہ بات میں سمجھ نہیں سکا ہوں۔ میں ایک چھوٹے اور عاجز لکھاری کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ میرے ملک کے چودہ کروڑ آدمی روٹی، کپڑے اور مکان کی تلاش میں اتنے پریشان نہیں جتنے وہ عزت کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ وہ سارے کے سارے کسی ایسے کندھے کی تلاش میں ہیں جہاں وہ سر رکھ کر رو سکیں اور اپنا دکھ بیان کر سکیں لیکن انہیں اس بھرے پرے اور طاقتور ملک میں کندھا نہیں ملتا ہے اور قسمتی سے ہم انہیں وہ مقام نہیں دے سکتے ہیں جو ہم بیرون ملک جاتے ہی وہاں کے ڈرامیروں اور قلیوں کو سر کپڑہ کر دیتے ہیں۔ جب میں ان خیالات کی مصیبت میں جلا تھا تو میرے پاس ایک بابا ابرا ہیم آیا وہ ضلع شخون پورہ کا رہنے والا تھا۔ اس نے مجھے آکے کہا کہ ”میں نے تمہارا بڑا نام سنایا ہے اور تم بڑے اپنے حیلم طبیعت کے انسان ہو۔ میں ریڈی یا اورٹی وی سے تلاش کرتا ہو اتمہارے پاس پہنچا ہوں۔“ تم مجھے پڑھنا سکھا دو۔“ میں نے کہا ”بaba تم اس عمر میں پڑھ کر کیا کرو گے؟“ اس نے کہا کہ میری اس وقت عمر 78 سال ہے۔ میں بارہ سال کا تھا جب میرا باپ مجھے چاول کی پیزیری لگانے کھیت میں لے آیا۔ میں اس وقت سے لے کر بات تک دھان اگاتار ہوں۔ اب اللہ نے مجھے بارہ سال بعد خوشیاں دی ہیں اور میرے بیٹے کے ہاں بیٹا اور بیٹی پیدا ہوئی ہے۔ وہ دونوں بچے اب سکول جاتے ہیں۔ صبح سوریے اٹھ کر جب چوٹے پر میں گڑ کی چائے بنارتا ہوتا ہوں تو وہ دونوں پڑھر ہے ہوتے ہیں اور اندر سے ان دونوں کی جو آواز آ رہی ہوتی ہے وہ مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ وہ پڑھتے ہوئے جب پہ کہتے ہیں کہ ”میں پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنوں گا۔ ملک و قوم کی خدمت کروں گا۔ ان پڑھ آدمی ڈھور گفر (جانوروں) سے بدتر ہوتا ہے اس لیے علم حاصل کرنا چاہیے۔“

تو میں یہ سن کر باہر بیٹھ کر روتا ہوں کہ میں ڈھور ڈھور گفر ہوں اور میں مرنے سے پہلے پہلے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا بابا، تو تو سامنہ برس تک ہم کو چاول کھلاتا رہا ہے، تیرے سے زیادہ خدمت تو کسی اور نے نہیں کی۔ وہ کہنے لگا کہ کتاب میں یہ لکھا ہے کہ ”پڑھ لکھ کر ملک کی خدمت کروں گا۔“ لیکن میں پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ اب مجھے کسی نے بتایا ہے کہ تو لا ہور میں اشراق احمد کے پاس چلا

جادہ تمہیں پڑھا دے گا اور میں نے یہ بھی سنائے ہے کہ لاہور شہر میں یوڑھوں کو پڑھانے کا بھی انتظام ہے اور اگر مجھے الف ب والا کچا قاعدہ آگیا تو میرا بیڑا اپار ہے۔ اللہ مجھے شاباش کہے گا اور کہے گا کہ تو ملک و قوم کی خدمت کرآ یا ہے۔ اب میں شرمندہ بیٹھا اس کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یا اللہ ہم جوان لوگوں کے بارے اُوت پنگ بول جاتے ہیں اس کا توبابے کو علم ہی نہیں۔ جب میں نے اس بارے سے چاول کھلانے والی خدمت کا کہا تو وہ کہنے لگا تمہیں اس کے تو میں پیسے لیتا رہا ہوں۔ میں نے کہا بایا جو کام ہم کرتے ہیں ہم بھی اس کے پیسے لیتے ہیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ ہم پڑھے لکھے لوگ مفت میں ہی بغیر تنخواہ پیش کے فرم کی خدمت کرتے ہیں۔

اب وہ میری جان کے پیچھے پڑ گیا اور اٹھے تا۔ میں نے اس سے جان چھڑانے کے لیے کہا کہ بابا تو کوئی ایسا کام جانتا ہے جو گاؤں میں لوگ کرتے ہیں۔

کہنے لگا مثلاً کیا کام؟

میں نے کہا کہ گاؤں میں جب کسی لڑکی کی بارات آتی ہے تو لوگ بارات کی خدمت کرنے کے لیے بھاگے پھرتے ہیں اور مفت میں کام کرتے ہیں کیا تو ایسا کر سکتا ہے؟ کہنے لگا نہیں۔

میں نے کہا کہ جب گاؤں میں کوئی ڈھکی وچھی (بیل گائے) بیمار ہو جاتی ہے تو اس کا تمہیں کوئی علاج آتا ہے جیسا کہ اچھارے میں کاڑھادیا جاتا ہے۔ کہنے لگا نہیں میں کوئی نہیں جانتا۔ اب میں اس سے جان چھڑانے کے لیے اسے گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

کہنے لگا کہ مجھے دوسرے گاؤں والے گھوڑی پر بھاکے لے جاتے ہیں اور اپنی فصل و کھاتے ہیں تو میں انہیں بتاتا ہوں کہ یہ جو بارہ پودے سر پھینک کے کھڑے ہیں یہ نئے جائیں گے اور وہ جو سینہ تانے کھڑے ہوئے ہیں مر جائیں گے اور انہیں فصل کی اچھائی اور کمزوری بابت بتاتا ہوں۔

میں نے اس سے کہا بایا تو تو ایگر پلکچر کاپی اچھی ڈی ہے ”اوہ ظالماتو نے اب اور پڑھ کے کیا لیتا ہے۔“

کہنے لگا نہیں مجھے داخل کر ادیں کیونکہ کتاب میں یہی لکھا ہے کہ ان پڑھو ڈھور ڈنگر ہیں۔

اب دیکھئے وہ بیان پاکستان اور جاپان دونوں کو چاول کھلا رہا ہے اور بہت بڑا Technologist ہے لیکن ہمارے ہاں کیا اور کہاں پر خرابی ہے کہ ہم اپنے نیکیں ناوجست کو نیکیں ناوجست نہیں سمجھتے۔ صرف انہی کو نیکیں ناوجست کر دانتے ہیں جن کے اوپر ایک ڈگری لگا دی گئی ہے۔ اگر یہ طبق اسی طرح سے رہی تو پھر ہماری طاقت ایسے ہی کم ہوتی رہے گی جنکی کا ایک ڈگری لگا دی گئی ہے۔ جو ملک سارے کے نقوص والے مقروض ملک کی ہوتی ہے جسے علم ہی نہیں ہوتا کہ ملک کدھر کو جارہا ہے۔ جو ملک سارے گروہ کو ساتھ لے کر چلتے ہیں وہ آگے نکل جاتے ہیں۔ امیری غربی سارے ملکوں میں ہے اور یہ رہے

گی لیکن سب گروہوں کو ساتھ لے کر چلنے والے ملک کی ضلع کچھری میں ایک غریب آدمی کی آتی ہی عزت ہے جتنی امیر آدمی کی ہے۔ جب ہم نے پاکستان بنایا تھا اور میں اس وقت بی۔ اے کرچکا تھا تو آزادی کی تحریک میں جب ہم مختلف دیہاتوں میں تقریروں کرنے جاتے تھے تو یہی کہتے تھے کہ جب پاکستان بنے گا تو تم دیکھو گے کہ تمہیں عزت دی جائے گی۔ وہ دودھ کی نہریں نہیں ہوں گی لیکن تمہیں عزت میر آئے گی۔ وہ لوگ ہم سے ہاتھ اٹھا کے پوچھتے تھے کہ کیسے عزت ہوگی۔ میں انہیں کہتا کہ یہ غلامی کی جگہ ہے اور انگریز تمہارا حاکم ہے لیکن جب پاکستان بنے گا تو ضلع کچھری میں تم سے کوئی بے ادبی یا بد تیزی سے پیش نہیں آئے گا اور تمہیں وہاں ”بھجا ولد بھا حاضر ہو“ کی آواز نہیں لگے گی بلکہ وہاں کریاں گئی ہوئی ہوں گی۔ آپ کو ناسب کورٹ آ کے سلام کرے گا اور کہے گا ”تشریف لائے آپ کی باری ہے۔“ وہ بے چارے اس دھوکے میں آگئے اور عزت کی خاطر چل پڑتے اور نفرے مارتے اور وہاں سکھ ہندو ”محنگ“ کی طرح بیٹھ جاتے تھے کہ یہ وعدہ جوان سے کیا جا رہا ہے یہ پورا ہی ہو گا اس لیے لوگ ان کے نفرے لگا رہے ہیں۔ خواتین و حضرات میں ان کو عزت نفس دیے جانے کے خواب دکھا کرایے ہی گناہ کرتا رہا ہوں۔ اب میں عمر کے آخری حصے میں ہوں اور وہ لوگ جن سے ہم وعدہ کرتے تھے وہ عارف والا اور خانیوال میں آباد ہیں اور میری طرح عمر سیدہ ہو گئے ہیں لیکن میں انہیں ان کی عزت نفس لوٹا یا دلوں نہیں سکا اور اب کچھ ہونا بہت مشکل ہے۔

میں اپنے چھوٹوں اور ساتھیوں سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ خدار انہیں کچھ نہ دیں، انہیں دولت نہیں چاہیے انہیں صرف ان کی عزت نفس لوٹا دیں پھر دیکھیں یہ کیسے شیروں کی طرح کام کرتے ہیں اور جس کی ہمیں اور آپ کو آرزو ہے۔ یہ آپ کو بد لے میں دیں گے لیکن ابھی تک یہ کام رکا ہوا ہے اور مجھے ساتھ ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ ”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ اگر مجھے کہیں سے اس بات کی تھوڑی سی بھی بھنک پڑتی رہے کہ انہیں عزت نفس لوٹا دی جائے گی تو مجھے حوصلہ ہو گا اور شاید اس بھنک کی وجہ سے صبر کا دامن میرے ہاتھ میں ہی رہے۔ یہ عزت نفس لوٹانے سے ہمارے پلے سے تو کچھ نہیں جائے گا۔ کسی کو کوئی پیرس دھیلانہیں دینا بس عزت دینی ہے احترام اور تکریم دینی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے آج یہ جوبات ذاتیکت ہوتی ہے اس کا کچھ نہ کچھ ثابت اثر ضرور ہو گا کیونکہ آپ کے چہرے بتا رہے ہیں کہ آپ اس دلیل کو تسلیم کرتے ہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

تحری پس میں ملبوس بابے اور چغلی میٹنگ

میں اکثر اس پروگرام میں اور کبھی بھی اس پروگرام سے ماوراء و میرے موقعوں یا پروگراموں میں بابوں کا ذکر کرتا رہتا ہوں اور ڈریوں کی بابت عموماً باتیں کرتا ہوں جس کے باعث عموماً راہ چلتے ہوئے اور دیگر کئی جگہوں پر سب لوگ مجھے روک کر پوچھتے ہیں کہ آپ کے بابے کیا ہوتے ہیں اور ان میں ایسی کونسی صفت ہوتی ہے جو آپ ان سے اس قدر مرغوب ہیں اور ان ہی کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں حالانکہ آپ بڑے پڑھے لکھے آدمی ہیں اور یہاں کے ہی نہیں ولایت سے بھی پڑھ کر آتے ہیں۔ وہاں پڑھاتے بھی رہے ہیں۔ آپ ہمیں بھی بتائیے کہ ان بابوں میں کونسی ایسی خوبی ہوتی ہے جو آپ کو متاثر کرتی ہے۔ میں ان سے یہ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ کبھی ان سے ملیں یا ان سے آئیں تو پھر آپ کو پوتہ چلے کے یہ کس حد تک ہم عام لوگوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ بابوں سے میری مراد نہیں کہ ایک آدمی جس نے سبز رنگ کا الباس پہنانا ہوا ہو۔ اس کے سر کے لمبے بال یا اس نے لمبی دلیں، رکھی ہوتی ہوں؛ گلے میں تسبیحات اور منکوں کی مالائیں ڈالی ہوئی ہوں ضروری نہیں وہ بابا ہی ہو۔ بہرحال کچھ بابے ایسے روپ میں بھی ہوتے ہیں لیکن اکثر بابے جواب آپ کی زندگی میں آپ کے قریب سے اور گرد و پیش سے گزر جاتے ہیں وہ تحری پیں سوٹ زیب تن کرتے ہیں، سرخ رنگ کی نالی لگاتے ہیں اور ان کی اس سرخ نالی میں سونے کی پینگی ہوئی ہوتی ہے لیکن آپ کو اس بات کا اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ شخص جو میرے اس قدر قریب بیٹھا ہے یا میرے اس قدر قریب سے اٹھ کر گیا ہے اس کے اندر وہ اسی کوئی بات تھی جسے میں پکڑنہیں سکا اور میں اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ خواتین و حضرات فائدہ اٹھانے کے لیے اپنے وجود کا ایسا ریڈ یو سیٹ بنانا پڑتا ہے جس پر تمام اسٹیشن آسانی سے پکڑے جاسکیں۔ میں ایک سنگل بینڈ کار ریڈ یو ہوں۔ میرے اور صرف لاہور ہی نالی دیتا ہے۔ لیکن میرے کمرے میں دنیا بھر کی آوازیں اکٹھی ہوتی ہیں اگر میرا اچھا ہو گا تو میں دوسری چیزیں بھی بڑی آسانی کے ساتھ پکڑ لوں گا لیکن اگر وہی Recieving Center

Dullness کو دور کرنے کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی ایسے لوگوں سے ملتا رہے جن کے اندر آپ کو اپنے سے مختلف کوئی چیز نظر آئے چاہے وہ کسی بھی طرح کی اچھی چیز ہو۔ مغرب والے اس طرح کے رویے کا اظہار کرتے ہیں وہ بڑے تجسس قسم کے لوگ ہیں۔ انہیں جو نبی کوئی ذرا مختلف ذرائع امام حالات سے ہٹ کے انہیں کوئی کردار ملا وہ رک کر اسے دیکھتے ہیں اور اس سے پوچھتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے؟ اس کی تحقیق کرتے ہیں۔ یقینتی سے ہمارے ہاں ایک بات طے شدہ ہے کہ اگر ہم نے کسی کو غلط کہہ دیا تو وہ غلط ہو گیا۔ آدمی کسی غلط شخص کے اندر یہ دیکھتا ہی نہیں کہ شاید اس میں بھی کوئی اچھی بات ہو۔ جسے اپنی طرف سے غلط یا خراب قرار دے دینا جاتا ہے۔ اس میں سے اچھائی تراشنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ باپوں کے پاس ایک عجیب و غریب جذبہ ہوتا ہے وہ ہم میں نہیں ہے۔ وہ جذبہ انسانوں سے محبت کرنے کا جذبہ ہے۔ ہم کتابی طور پر تو کہہ لیتے ہیں کہ جناب ہم محبت کرتے ہیں یا ہم یہ ذکر کرتے ہیں کہ ہمیں ان سے بڑی محبت ہو گئی ہے لیکن محبت کے اندر داخل ہو کر اس کو اپنی ذات پر وارو دکرنا یہ ایک مشکل اور مختلف کام ہے جس طرح بارش کا ذکر اور بارش کے اندر بھیگ جانا و مختلف عمل ہیں۔ بارش کا ذکر کرنے سے جس طرح آدمی بھیکتا نہیں ہے۔ باپے محبت کے عمل میں اس آسانی سے داخل ہو جاتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور ہمیں تادم مرگ یہ حسرت ہی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ایک نہایت بے ہودہ اور غیر توجہ طلب انسان کے اندر سے بھی کوئی اسی چیز تلاش کر لیتے ہیں جو اس کی خوبی ہوتی ہے اور وہ اس کی خوبی کو ڈھونڈ رکھاتے ہیں۔ ہم سے وہ قادر نہیں اٹھائی جاتی جو باپے اٹھا لیتے ہیں۔ ہم سے ان کی طرح وہ چھپا ہوا حصہ اجاگر نہیں ہو پاتا۔ ہماری ٹریننگ کچھ اس طرح کی ہے کہ ہم جب بھی کسی شخص سے ملتے ہیں، ہم اس شخص کی اچھائیوں پر نظر نہیں کرتے۔ صرف اس کی برائیاں ہی ہمیں نظر آتی ہیں۔ شاید ہماری تربیت ہی کچھ اس طرح سے ہوتی ہے۔ مجھے ایک بہت پرانا طیفہ یاد آ رہا ہے جو آپ کو بھی سناتا ہوں۔ ایک میراثی تھا جو بڑا بزرگ آدمی تھا تو اس کی بیوی نے اسے آ کر ”ٹھڑا“ (ٹھوکر) مارا اور کہا کہ تو ادھر بیٹھاد عائیں ماںگ رہا ہے اٹھ کر کوئی کام و ام کرو۔ بیوی کی اس حرکت سے اسے جلال آ گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ ہو ایں اجھرا آ سانوں میں چھا گیا اور اس نے آ سان کے تین چار بڑے بڑے چکر لگائے۔ اس کی بیوی نیچے کھڑی اسے دیکھتی رہی اور دل میں سوچتی رہی کہ یہ کوئی اللہ کا بڑا پیارا ہے۔ وہ میراثی جب نیچے اتر آیا تو اس نے بیوی سے کہا دیکھا تو نے ہمارا کمال! اس کی بیوی کہنے لگی کون سا کمال؟ کہنے لگی وہ اللہ کا

کوئی پا کیزہ بند اخفا۔

وہ کہنے لگا ”اوہ میں سی۔“

تو وہ پھر کہنے لگی اچھا!

”ایسے لئی میزدھائیڈھاؤڑ رہیا۔“ (اسی لیے میزدھے میزدھے اڑ رہے تھے۔)

یہ بڑی پرانی بات ہے لیکن اب ہم جب بھی کسی بندے سے ملتے ہیں ہمیں اس میں سے میزدھ نظر آتی ہے۔ جب میزدھ ہمیں نظر آتی ہے تو پھر ہماری زندگی میں ہماری ذات اور ہمارے وجود میں بھی ایک میزدھ پیدا ہو جاتی ہے اور وہ میزدھ نکلتی نہیں ہے اس لیے اللہ نے ہم پر خاص مہربانی فرمائی ہے میں غیبت سے منع فرمایا ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کا ہمیں پتہ نہیں چلا۔ کافی عرصے کی بات ہے کہ ہم کسی بابے کی ذکر کی محفل میں داخل ہوتے تاکہ اپنی ٹریننگ کی جائے۔

انہوں نے کہا کہ حضور نبی اکرم نے فرمایا ہے کہ انسان کے وجود کے اندر ایک ایسا عضو ہے جو اگر خراب ہو جائے تو سارے کاسار ابندہ خراب ہو جاتا ہے اور وہ عضو دل ہے۔ اس طرح سے ہم اور آپ لوگوں کے دل خراب ہو گئے ہیں اور ان کے اوپر ”راکھ“ جم گئی ہے جیسے پرانی دلپتی جس میں چائے پکاتے ہیں وہ اندر اور باہر سے ہو جاتی ہے بالکل اس طرح سے ہمارے دل ہو گئے ہیں اور ہم اللہ کے ذکر سے اس کو صاف کرتے ہیں اور اس کو ”مانجا“ لگاتے ہیں اور اللہ ہو کے ذکر سے اس زنگ اور کالی گلے دل کو صاف کرتے ہیں اور یہ خرابی بے شمار گناہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ یقین کیجیے کہ جب میں اس محفل میں تھا اور میں اس میں شامل ہونے والا تھا تو میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ میں تو ایک اچھائیک سانوجوان ہوں اور میں نے کوئی خاص گناہ نہیں کیا تو میرا دل کیسے کالا ہو گیا اور میں اس کو ”مانجا“ لگا دیں۔ یہ ایک خیال سایرے ذہن میں آ گیا اور کافی دریک میں یہ سوچتا رہا۔ محفل ذکر سے قبل وہ بباباجی کہنے لگے کہ بیشتر اس کے کہ ہم محفل شروع کریں شاید بہت سارے اصحاب یہ سوچتے ہیں کہ وہ تو اچھے ہیں انہوں نے تو کوئی گناہ نہیں کیا۔ تو پھر کیسے ہمارا دل کالا ہو گیا۔ کوئی بڑا گناہ نہیں کیا۔ کوئی چوری چاری نہیں کی۔ کسی کے گھر پر قبضہ نہیں کیا۔

باباجی کہنے لگے کہ ایسا سوچنے والوں کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ بہت بڑے گناہوں میں سے ایک بہت بڑا گناہ غیبت ہے۔

خواتین و حضرات! اب غیبت تو ہم سارے ہی کرتے ہیں۔ اس کے بغیر ہم کھانا نہیں کھاتے۔ ہمارے گھر میں میری بہوں میں کہتی ہیں کہ ماں اب ہمارا غیبت کا نائم ہو گیا ہے۔ دس بجے ان کی ”چغلی میٹنگ“ ہوتی ہے۔ وہ ہر بار ایک دوسرے کے گھر میں جاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اس بار ہم نے چغلی میٹنگ رضیہ کے گھر میں رکھی ہے اور دس بجے سے لے کر بارہ بجے تک وہ چغلی کرتی ہیں۔ میں

نے ان سے کہا کہ تم اتنی زیادہ چغلی کیوں کرتی ہو۔ وہ کہتی ہیں کہ ساری دنیا میں اور پورہ کرہ ارض پر چغلی ہوتی ہے۔ جتنے بھی اخبارات چھپتے ہیں وہ سارا چغلیوں سے ہی بھرا ہوتا ہے۔ جو بھی کالم چھپتے ہیں ان میں لوگوں کی خرمیاں ہی بیان کی ہوئی ہوتی ہیں۔ کسی کی اچھائیاں تو نہیں ہوتیں ان میں اور فلاں برا فلاں برا کی گردان بھی ہوتی ہے اور اس سے ہم نے سبق لے کر یہ کام سیکھا ہے۔ ہم نے بابا جی کے ہاں ذکر کی محل میں شرمندگی سے ذکر شروع کیا کہ واقعی ہم چغلی تو بہت زیادہ کرتے ہیں اور روز کرتے ہیں۔ چغلی اس لیے کرنی پڑتی ہے کہ اپنی ذات میں چونکہ کوئی صفت یا خوبی نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے اور ہم دوسرے کو نیچے پانی کے اندر دھکیل کے اور ڈبو کے اپنے آپ کو اوپ راچھاتے ہیں۔ ہم نے بابا جی سے کہا کہ جی آپ کیسے خوبی تلاش کر لیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ کسی شخص کے اندر داخل ہوں اور اس کے متعلق صاحب حال ہوں تو پھر آپ کو آسانی ہوگی اور آپ بھی اس بات یا خوبی کو پکڑ لیں گے جس کو ہم پکڑ لیتے ہیں۔ ماںکل انجلو ایک بہت بڑا مجسم ساز تھا۔ اس نے بہت خوبصورت مجسم بنائے۔ اس نے حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کے بہت سے مجسمے بنائے۔ اس کا بنایا ہوا ڈیوڈ کا انحصارہ فٹ اونچا مجسم فلورنس میں بھی ہے جسے ساری دنیا دیکھنے جاتی ہے۔ اسے ہم نے بھی دیکھا۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ ماںکل یہ بتاؤ کہ تم کس طرح سے یہ مجسمہ بناتے ہو۔ ایسا خوبصورت مجسم کیسے بنالیتے ہو؟ یہ تو انسانی کمال کا ایک آخری حصہ ہے۔ اس نے کہا کہ میں تو مجسمہ نہیں بناتا اور نہ ہی مجسمے بنانا آتا ہے۔ میں سنگ مرمر کا ایک بڑا مکڑا کہیں پڑا ہوا دیکھتا ہوں اور مجسمے اس میں ”ڈیوڈ“ نظر آن لگتا ہے اور میں چھینی، ہمتوڑی لے کر اس پتھر میں سے ڈیوڈ کے ساتھ پتھر کا فضول حصہ اتار دیتا ہوں اور اندر سے ڈیوڈ (حضرت داؤڈ) نکل آتے ہیں۔ میں کچھ نہیں کرتا۔ مجسمے تو ڈیوڈ صاف نظر آ رہے ہوتے ہیں میں بس ان کے ساتھ غیر ضروری پتھر اتار دیتا ہوں۔ اس طرح سے یہ بابے جو ہیں یہ انسان کی غیر ضروری چیزیں اتار دیتے ہیں اور نیچے سے بڑا پا کیزہ اچھا اور خوبصورت سماں نکال کے اپنے سامنے بٹھا لیتے ہیں اور پھر اس کو اپنی توجہ کے ساتھ وہ سب کچھ عطا کر دیتے ہیں بشرطیکہ وہ شخص اس کا آرزومند ہو اور صبر والا ہو۔ لیکن جو آرزومند ہو وہ صابر بھی ہونا چاہیے۔ مجسمے خداوند کریم فرماتا ہے کہ

انما اللہ معا الصابرین ۱۰

(بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔)

اگر کسی نے اللہ کو پاتا ہو تو وہ صبر کرنے لگ جائے تو اس کا کام بن جاتا ہے جبکہ لوگ اس کے لیے ورذہ ظیفہ کرتے ہیں۔ ناک رگرتے ہیں لیکن اللہ کو صبر کرنے والے پالیتے ہیں۔ میں نے شاید اسی محل میں پہلے بھی یہ بات بتائی ہے کہ میری ایک تائی تھیں۔ وہ تیلن تھی۔ اس کا شوہر فوت ہو گیا۔ وہ

تاکی بے چاری کو لہو پہنچی تھی۔ نہایت پاکیزہ عورت تھی۔ وہ اخبارہ سال کی عمر میں یوہ ہوئی لیکن اس نے شادی نہیں کی۔ جب میں اس سے ملا تو تائی کی عمر کوئی سانچھ برس کے قریب تھی۔ اس کے پاس ایک بڑی خوبصورت ”رکنیل پیری ہمی“ تھی وہ اسے ہر وقت اپنی بغل میں رکھتی تھی جب بیتل کے پیچھے چل رہی ہوتی تو توب بھی وہ اس کے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ وہ ساگ بہت اچھا پاکتی تھی اور میں سرسوں کا ساگ بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ وہ مجھے گھر سے بلا کے لاتی تھی کہ آکے ساگ کھائے میں نے تیرے لیے پکایا ہے۔ ایک دن میں ساگ کھانے اس کے گھر گیا۔ جب بیٹھ کر کھانے لگا تو میرے پاس وہ ”پیری ہمی“ پڑی تھی میں نے اس پر بیٹھنا چاہا تو وہ کہنے لگی ”ناں ناں پُر ایس تے نجیں بیٹھنا“ میں نے کہا کیوں اس پر کیوں نہیں بیٹھنا۔ میں نے سوچا کہ شاید یہ زیادہ خوبصورت ہے۔ میں نے اس سے پوچھا ہی لیا کہ اس پر کیوں نہیں بیٹھنا۔ کیا میں تیرا پیارا بیٹھا نہیں۔

کہنے لگی تو میرا بہت پیارا بیٹا ہے۔ تو مجھے سارے گاؤں سے پیارا ہے لیکن تو اس پر نہیں بیٹھ سکتا۔

کہنے لگی بیٹا جب تیرا تایافوت ہوا تو مسجد کے مولوی صاحب نے مجھ سے کہا کہ ”بی بی تیرے اوپر بہت بڑا حادثہ گزرا ہے لیکن تو اپنی زندگی کے بیتل کو سونا بھی بنا سکتی ہے۔ یہ تجھے اللہ نے عجیب طرح کا چانس دیا ہے۔ تو اگر صبر اختیار کرے گی تو اللہ تیرے ہر وقت ساتھ ہو گا کیونکہ یہ قرآن میں ہے کہ ”اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“ تائی کہنے لگی کہ میں نے پھر صبر کر لیا جب کئی سال گزر گئے تو ایک دن مجھے خیال آیا کہ اللہ تو ہر وقت میرے پاس ہوتا ہے اور اس کے بیٹھنے کے لیے ایک اچھی سی کری چاہیے کہ نہیں؟ تو میں نے ”رکنیل پیری ہمی“ بنوائی اور اس کو قرینے اور خوبصورتی سے بنوایا۔ اب میں اس کو ہر وقت اپنے پاس رکھتی ہوں اور جب بھی اللہ کو بیٹھنا ہوتا ہے میں اسے اس پر بٹھا لیتی ہوں۔ میں کپڑے دھوئی ہوں اپنا کام کرتی ہوں، روٹیاں ساگ پکاتی ہوں اور مجھے یقین ہے کہ میرا اور اللہ کا تعلق ہے اور وہ صبر کی وجہ سے میرے ساتھ ہے۔ خواتین و حضرات ایسے لوگوں کا تعلق بھی بڑا گہرا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے اس بات کو یہاں تک محسوس کیا۔ وہ قرآن میں کہی بات کو دل سے مان گئے وہ خوش نصیب لوگوں میں سے ہیں۔ ہم جیسے لوگ جو ”تائک تو نیاں“ مارتے ہیں اور ہمارا رخ اللہ کے فضل سے سیدھے راستے ہی کی طرف ہے۔ ہم سے کچھ کوتا ہیاں ایسی ضرور ہو جاتی ہیں جو ہمارے کیے کرائے پر ”کوچی“، ”پھیر دیتی“ ہیں۔ جس سے ہمارا بدن روح دل خراب ہو جاتا ہے۔

مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے اعظم خورشید کہہ رہے تھے کہ ہمارے ہاں نفرت کی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ یہ نفرت کی فضا کس وجہ سے پیدا ہوئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معاشرے میں مختلف گروہ انسانی وہ نفرت میں بنتا ہیں۔ اس کی کمی وجود ہات ہیں ایک یہ ہے کہ ہم اس علاقے کے رہنے

والے میں اور ہم ان لوگوں سے ہٹ کے مسلمان ہوئے ہیں جو انسانوں کو پسند نہیں کرتے، وہ لوگ برہمن تھے۔ ہم ایک اعتبار سے Convert ہیں۔ ہمارے اندر وہ پہلی سی کچھ کچھ چیز چلی آ رہی ہے کہ ہم کو ایسا آدمی جو خدا نخواستہ چھوٹے درجے پر ہو وہ اچھا نہیں لگتا۔ نبی اکرم نے ہمیں جاتے ہوئے یہ فرمایا ہے کہ گورے کو کالے پر اور کالے گورے پر فوقیت نہیں ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہاں اگر تم فوقیت کا کوئی راستہ جانتا ہی چاہتے ہو تو وہ تمہیں تقویٰ میں ملے گی اور تقویٰ اسی چیز ہے جس میں آپ جتنے بیچے ہوتے جائیں گے اتنے ہی اوپر ہوتے چلے جائیں گے کیونکہ تقویٰ میں عاجزی ضروری ہے۔ بابا جی سے ہم یہی دریافت کرتے رہے کہ لوگوں سے محبت کیے کرنی ہے کیونکہ لوگوں سے محبت کیے بغیر اللہ کا راستہ نہیں ملتا۔ ہم محبت کے بغیر اللہ کے پاس ڈائریکٹ نہیں جا سکتے۔ لوگوں کی خدمت کر کے اور انہیں انسان مان کے ہی کسی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ اگر خدمت نہ بھی کریں یہ ماں تو سہی کہ یہ بھی انسان ہیں۔ ہمارے بابا جی کے ڈیرے کے پاس ایک بابا لہذا جھاڑو دیا کرتا تھا وہ جب بھی آتا تھا تو بابا جی اس کی اتنی عزت کرتے کہ کھڑے ہو جاتے۔

میں نے کہا کہ جی یہ تو جعدہ اڑے چھوڑیں۔ وہ کہتے تھے نہیں نہیں یہ برابر اعزت آدمی ہے۔ ہم کو کھانے میں وہاں دال ملتی تھی لیکن جب وہ آتا تھا تو پیڑھی کے بیچے سے مکھن بھی نکل آتا تھا، چھٹی بھی نکل آتی تھی، کاتا ہوا پیاز، کھیرے بھی نکل آتے اور یہ ساری چیزیں لہتنا صاحب کو ملی تھیں۔ میں نے کہا کہ جی بتائیں ہم تو ایم۔ اے پاس کر کے آئے ہیں اور پڑھے لکھہ لوگ ہیں اور آپ ساری چیزیں اس کو دے دیتے ہیں۔

بابا جی کہنے لگے کہ حکیم کو پتہ ہوتا ہے کہ مریض کو کیسی خداد دینی ہے۔ آپ اپنی شکلیں دیکھو اور شکر کرو کہ تم کو کھانے میں دال روٹی مل جاتی ہے۔ خواتین و حضرات یہ ڈیرے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ میں بات کر رہا تھا کہ کسی آدمی کے اندر ساری خرامیاں دیکھ کر نیٹھی ہائی چاچنا و دیکھ کے، اس کا لفڑا اپن دیکھ کے اس کے اندر ایسی چیز کو علاش کرنا کہ یہ اس کی خوبی ہے جو کسی وجہ سے اس پر بھی نہیں کھل سکی اور ایسے شخص کے ساتھ محبت کرتے چلے جانا آپ کے دل کو روشنی عطا کرتا ہے اور اس کو بغیر کسی ورد کے صاف بھی کرتا ہے۔ دل کو صاف کرنے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ محبت کریں، چلیں محبت کرنا مشکل کام ہے آپ انسان کو انسان تسلیم کر لیں۔ گو مجھ سے اسی برس کی عمر تک پہنچ جانے کے باوجود یہ نہیں ہو سکا کہ میں جو یہ مخالف ہے اس کی شرگ کے قریب بھی اللہ موجود ہے اور کم سے کم درجے کے آدمی کے پاس بھی اللہ ہے۔ ہمیں تو اس کی عزت کرنی ہے۔ ولا نیت کے لوگوں کے بارے میں جو ہم تاثر رکھتے ہیں کہ وہ لوگوں سے اچھا سلوک کرتے ہیں میں ان کے بارے میں بھی یہ کہا کرتا ہوں کہ وہ اخلاق نہیں ہے جس کا اللہ تقاضا کرتا ہے۔ ان کے پاس اخلاق کا عکس ہے

اصلی اخلاق نہیں ہے۔ اگر ان کے پاس اصلی اخلاق ہوتا تو وہ افغانستان پر ایسی بمباری نہ کرتے۔ بغیر کسی جواز اور دلیل کے انہوں نے ایسا کیا۔ وہ بھی اصلی اخلاق سے محروم ہیں لیکن آپ کے اور میرے دلوں پر ان کا بڑا دبدبہ ہے کہ جی وہ جو وعدہ کرتے ہیں یا سودا کرتے ہیں پورا کرتے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں ان سے بازی لے جانی ہے کیونکہ ہمیں اللہ کی طرف سے ایسی رحمت عطا کی گئی ہے جو ان لوگوں کو عطا نہیں کی گئی۔

مسلمان ساری دنیا میں اتنے ذلیل و خوار کیوں ہیں؟ کیوں اتنی مشکل میں پڑے ہوئے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پوری کائنات میں جو مسلم ام ہے وہ دوسروں کے مقابلے میں برتر ہے۔ اگر برتر چیز کو ناپاکی کا ذرا سا بھی چھینتا لگ جائے تو وہ برتر نہیں رہتی۔ غلطی چیز کو جس طرح کامبھی گند لگ جائے وہ اس کا کوئی نقصان نہیں کرتی۔ آپ انسانیت کی دستار ہیں۔ آپ کے اوپر اگر گو بر کا ذرا سا چھینتا لگ گیا تو یہ دستار اتار کے چھینکنی پڑتی ہے۔ یہ اہم ذمہ داری ہم پر ہا نکد ہے کہ ہم نے اپنی دستار کو کیسے منحال کر رکھنا ہے اور اپنی دستار کو اچھی طرح سے اور منحال کر رکھنے کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ ہم اپنے بھائی، انسان اور آدمی کے ساتھ اپنا بر تاؤ اور سلوک اچھار کھیں اور اس کے ساتھ ساتھ چغلی میٹنگیں بند کریں۔ انشاء اللہ ہم اپنی اس کوتا ہی کو ختم کر کے دم لیں گے اور اس جانب توجہ دیتے رہیں گے اور دلاتے رہیں گے۔ اللہ آپ کو آسمانیاں عطا فرمائے اور آسمانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

"Mind Over The Matter"

یہ ذہن کا بازار بھی عجیب منڈی ہے جس میں کبھی کوئی چھٹی نہیں ہوتی۔ دن کو ذہن کام جاری رکھتا ہے اور رات کو موجودانے پر خوابوں کی صورت میں اپنے عمل میں مصروف رہتا ہے اور اس میں ایک دلچسپ اور نہایت عجیب بات یہ ہے کہ اس منڈی میں باہر کے تاجر بھی آتے رہتے ہیں۔ کچھ قافلے سفر قند و بخارا سے کچھ گلف اور ولاجیت سے آتے جاتے اور شامل ہوتے رہتے ہیں۔ عمل رکنے اور ختم ہونے کو نہیں آتا اور اکثر یوں بھی ہوتا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی آ کر ذہنی و فکری عمل میں شامل ہو جاتے ہیں جن کی بہت سی چیزیں مستعار بھی لئی پڑتی ہیں اور انہیں اپنا بھی پڑتا ہے اور کچھ ایسے سوالات ذہن میں گھر کر لیتے ہیں جن سے جان چھڑانا مشکل ہو جاتی ہے اور کچھ کوتوزندگی میں باقاعدہ شامل کرنا پڑ جاتا ہے مثلاً خدا کے بارے میں بہت سوال کیے جاتے ہیں اور پوچھا جاتا ہے کہ خدا کیوں ہے؟ کیسے ہے؟ کس طرح سے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ ہم اسے اپنے حواس خمسہ سے جان نہیں سکتے۔ ایسے اور کئی طرح کے سوال آپ کے خیال میں اترتے ہوں گے۔

لوگ تین چار قسم کے سوال بہت پوچھتے ہیں ایک یہ کہ ایک بچ جو ایک خاص گھرانے میں اور خاص مذہبی خیالات رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہوا الاحوال طور پر اس کا مذہب بھی وہی ہو گا جو اس کے والدین کا ہے۔ اس بچے میں تبدیلی لانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے اور اس کو اس بڑی شاہراہ پر کیسے لایا جائے جس کی ہم ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ سوال بھی عموماً پوچھا جاتا ہے کہ کیسے غیر مسلم جنمیوں نے بڑے نیکی کے کام کیے تو کیا یہ لوگ بہشت میں نہیں جائیں گے جس طرح گنگارام نے اور گلاب دیوی نے ہسپتال بناؤئے تھے۔ اس پر ہم کسی اور پروگرام میں بات کریں گے۔ اس طرح ذہن کی منڈی میں ہر طرح کا سودا چلتا رہتا ہے اور جب خدا کی ذات کا سوال آتا ہے تو پھر کافی مشکل پڑتی ہے۔ ہمارے یہاں بھی اس معاملے پر چند روز قبل بڑے پڑھے لکھئے جید اور سیانے یہ بات کرتے رہے اور ہم بھی سنتے رہے اور اس میں شامل بھی ہوتے رہے۔ خواتین و حضرات نتیجہ یہاں تک پہنچا کہ

مری (دیکھی جانے والی) چیز زیادہ طاقتور ہوتی ہے یا غیر مری زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ سامنے نظر آنے والی چیز تو طاقتور ہے ہی تو کیا جو چیز نظر نہیں آتی وہ بھی طاقتور ہو سکتی ہے؟ اور اگر ان دونوں کا مقابل کیا جائے تو کوئی چیز زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ یہ نہایت اچھا ہے، ہی حیران کن اور توجہ طلب سوال تھا۔ آپ بھی یہ سن کر حیران ہوں گے کہ حقیقی بھی غیر مری Invisible چیزیں ہیں وہ بڑی طاقتور ہوتی ہیں اور نظر میں آنے والی چیزوں سے زیادہ فوکیت اور تقویت رکھتی ہیں۔ ہوا نظر نہیں آتی لیکن ہوا کے دونوں روپ چاہے وہ آسکیجن کی شکل میں ہوں یا کار بن ڈائی آسائیز کی شکل میں ہوں ہوں زندگی عطا کرنے والے ہیں اور ہمارے ایک سائنس کے بالکل قریب ہی دوسرا سائنس کھڑا ہوتا ہے اور موجود ہوتا ہے اور دنیا کی قیمتی ترین شے آسکیجن ہمیں مفت ملتی ہے اور کسی غریب یا امیر میں تمیز کے بغیر ملتی ہے، فرض کیجیے کہ اگر خدا نخواستہ زندگی کا یہ قیمتی ترین سرمایہ ہمیں دکان سے جا کے لینا پڑتا تو کیا سماں ہوتا۔ صحیر کوئی اپنا اپنا ڈب لیے آسکیجن بھروانے نکلا ہوتا۔ پھر دفتر، سکول یا کالج جانے کی بات کرتا۔ ہم تو چھوٹے کام نہیں کر سکتے، ایسی صورت حال اور جانوروں جانداروں اور انسانوں کی حکم قیل اور بھیڑ میں سب چکرا کر مرجاتے۔ ہوا اپنے دونوں روپوں میں نظر نہیں آتی لیکن اتنی طاقتور ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو ہماری زندگی ہی ختم ہو جائے۔ چند پرندوں جو بھی ختم ہو جائیں۔ ایسے ہی آپ غور کریں تو ایسی نوعیت کی اور بھی کسی چیز موجود ہیں لیکن اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ اگر آپ کھڑے ہوں اور کسی بلڈنگ یا پل ازے سے کوئی پھر نوٹ کر آپ کے سر پر لگے تو آپ کو آئے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے۔ ابھی پچھلے دونوں نزلے نے کیا تباہی مجاہی ہے، کتنا ہی لوگوں کا جانی نقصان ہو گیا۔ اس طرح سب سے سخت اور طاقتور چیز تو پھر ہے لیکن آپ ہوا کو طاقتور گردان رہے ہیں حالانکہ نظر میں آنے والی چیز زیادہ طاقتور ہے لیکن ہم اس بات پر توجہ نہیں دیتے اور نہیں دیتے رہے کہ یہ پھر پہاڑ، چٹانیں اور نزلے سے گرنے والے بھاری بھر کم گارڈرستون اور بینار جو کئی زندگیاں ختم کر دیتے ہیں اگر کشش ثقل یا Gravity نہ ہو یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور کشش ثقل ایسی چیز ہے جو نظر نہیں آتی۔ فرض کیجیے کہ زمین میں کشش نہ ہو تو اپر سے کتنا ہی بڑا پھر کیوں نہ گرے وہ تو بس ڈانس کرتا ہوا ہی رہ جائے گا اور اگر آپ اس کو پھر ماریں گے تو وہ ڈانس کرتا ہوا دوسری سمت چلا جائے گا کیونکہ اس میں تو کوئی جان بھی نہیں ہوگی۔ امریکہ نے افغانستان میں ڈیزی کٹر بجبوں کے ساتھ حقیقی بمباری کی ہے اور 52 بی طیاروں سے جو بڑے بڑے بم گرائے ہیں یہ سب کشش ثقل کی بدولت ہی ممکن ہوا ہے۔ اگر زمین میں کشش نہ ہوتی تو اس وقت افغانستان کے بچے ان بجبوں سے فٹ بال کھیل رہے ہوتے۔ اس سے ثابت یہ ہوا کہ غیر مری چیز زیادہ طاقتور ہوتی ہے اور اس کی طاقت کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے۔ آپ روشنی کو دیکھیں یہ نظر نہیں آتی۔ یہ ہر چیز کو منور ضرور کرتی ہے لیکن نظر نہیں آتی۔ بلب سے نکلنے والی روشنی اور مجھ سک پہنچنے والی

روشنی یا فرش کے اوپر بالہ بنانے والی روشنی کے درمیان جو روشنی کا سفر ہے وہ نظر نہ آنے والا ہے۔ آپ یہ سن کر بھی حیران ہوں گے کہ سورج جو اس قدر روشن سیارہ ہے اور ہماری زندگیوں کا دار و مدار اس پر ہے وہ ساری روشنی جو سورج ہمیں عطا کرتا ہے اور جو زمین پر پڑتی ہے اگر ہم سورج اور زمین کے درمیان سفر کریں اور اس حد کو عبور کر جائیں جہاں سے روشنی Reflect نہیں ہوتی تو آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ سورج اور زمین کے درمیان اتنا اندر ہیرا ہے جس کا آپ اندازہ نہیں لگا سکتے بالکل Pitch Darkness ہے جب روشنی پڑنے کے بعد منغلاں ہوتی ہے تو ہم تک پہنچنی ہے۔ وہ روشنی جو ہم کو دکھانی نہیں دیتی، محسوس نہیں ہوتی جس کو ہم چھوٹیں سکتے وہ طاقت رکھتی ہے۔ اسی طرح سے گرمی کو لے لیجئے۔ گرمی یا حدت بھی نظر نہیں آتی۔ اس کا کوئی بُت نہیں، وجود یا نقص نہیں ہے لیکن یہ گرمی اور Heat ہے جو آپ کے کھیتوں کو پکا رہی ہے۔ پھولوں، پھلوں اور پودوں کی نشوونما کر رہی ہے لیکن اگر آپ یہ کہیں کہ یہ حدت میں نے آتی ہوئی دیکھی اور چونے آم پر پڑتی ہوئی دیکھی اور اس آم کو پکتے ہوئے دیکھا، ایسے ہو نہیں سکتا۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کہ "Mind Over The Matter" کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ ذہن کی جو ایک منڈی گلی ہے اس کی طاقت آپ کے اچھے تو انہا اور خوبصورت وجود پر شدت سے حاوی ہے۔ ذہن میں غصہ، غم، چالاکی، نفرت، شدت اور خوف جو ہیں یہ ساری چیزیں بھی Invisible ہیں۔ یہ نظر نہیں آ سکتیں اور نظر نہ آنے والی چیزوں نے آپ کی میری اور ہم سب کی زندگی کا احاطہ کر رکھا ہے اور ہم کو بری طرح سے جکڑ رکھا ہے کہ ہم اس کے سامنے بے بس ہیں۔ اگر مجھے غصہ نظر آتا، نفرت کہیں سے بھی دکھانی دے جاتی تو میں اسے چھوڑ دیتا۔ اگر نفرت کی صورت پر چھپتے چلتا کہ یہ لکن بدشکل چیز ہے۔ اس کے کئی پاؤں ہوتے، گندی ہی ہوتی۔ آدمی بیلی اور آدھے چوہے کی صورت والی ہوتی۔ لیکن اسے ہم دیکھی یا چھوٹیں سکتے لیکن ہمارے دیکھے جانے والے وجود پر ان چیزوں کا قبضہ ہے۔ اب آپ اس بات پر تذمیر پڑھتے ہیں کہ خدا کے واسطے ہماری نفرتیں ختم ہوں، ہمارے ملک میں وہ سہولتیں آئیں جن کا اللہ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ ہم اپنے لوگوں میں آسانیاں تقسیم کریں گے۔ وہ وعدہ پورا کرنے خدا کرے وقت آئے لیکن وہ ہماری یہ خواہش پوری اس لیے نہیں ہوتی کہ غیر مریٰ چیزوں نے ہمیں پکڑا اور جکڑ رکھا ہے۔ جب آپ اپنے گھر والوں، دشمنوں یا دشمنوں کے ساتھ لاڑتے ہیں تو آپ اپنا غصہ یا نفرت کسی جسم رکھنے والی چیز کی صورت میں دکھانیں سکتے، محسوس کرو سکتے ہیں۔ آپ عموماً ایسی خبریں اخبار میں پڑھتے ہوں گے کہ چچی کو آشنا کے شب میں نوکے کے وار سے ہلاک کر دیا۔ ایک بندہ گھر آیا اس نے اپنے بچوں کو بھی مار دیا۔ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔ مائدہ اس پر اتنی شدت سے حملہ آور ہو رہا ہے کہ اسے اور کچھ سو جھی ہی نہیں رہا ہے اور وہ ذہن کے قبیلے سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ پتہ چلا کہ نظر میں نہ آنے والی چیزوں نے مجھ نظر میں آنے

والے کو اور میرے اروگر وجود نیا آباد ہے جو بڑی خوبصورت دنیا ہے اس پر تسلط جما رکھا ہے اور کسی کو ہٹنے نہیں دیتیں۔ اس نظرت آنے والی چیز جسے سائنسدان "Mind Over The Matter" کہتے ہیں اس نے میرے وجود پر قبضہ کر رکھا ہے۔

اخبار میں ہم اس طرح کے جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا خبریں پڑھتے ہیں۔ ان میں کوئی خوبیں بات نہیں ہوتی۔ بس ذہن میں پیدا ہونے والی بات کی کارستانی ہوتی ہے اور ہم یہ شک یا خیال قائم کر لیتے ہیں کہ یہ خابی فلاں گروہ نے کی ہو گی اور ہم بغیر کسی دلیل، منطق یا Reason کے بمباری شروع کر دیتے ہیں جیسے افغانستان پر کی گئی۔ یہ کام ان پڑھنیں کرتے بلکہ پڑھے لکھے اور بہت زیادہ پڑھ لکھے لوگ کرتے ہیں۔ ایسا انفرادی طور پر بھی ہوتا ہے اور اجتماعی طور پر بھی ہوتا ہے۔ انبیاء جو ہم کو تعلیم دیتے رہے یا ایسی بات کی تعلیم دیتے رہے کہ اے اللہ کے بندو خدا کے واسطے اس پیغام کی طرف رجوع کرو جو تمہیں غیر مریٰ خدا نے دیا ہے۔ خواتین و حضرات خدا کی ذات سے زیادہ غیر مریٰ چیز تو اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ حواسِ خمس سے بہت باہر ہے اور بہت دور ہے لیکن اگر غیر مریٰ چیزیں ہی طاقتوں ہو سکتی ہیں تو اللہ جس میں Invisible ہے وہ تو پھر سب سے زیادہ طاقتوں ہو انہی اور وہ سب سے زیادہ طاقتوں ہے بھی۔ لوگ کئی دفعاً اس بات میں الجھ جاتے ہیں کہ کیونکہ ہمیں خدا نظر نہیں آتا ہے تو اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ پسون اس بات پر جھگڑا بھی ہو رہا تھا اور میں ان سے بار بار یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ مت کیجیے کہ چونکہ خدا ہمیں نظر نہیں آ رہا ہے، کششِ ثقل دکھانی نہیں پڑ رہی ہے اور ہوا نظر نہیں آ رہی ہے تو اس کا پھر سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ آپ کے حواسِ خمس، بہت مدد و ہیں لیکن انسانی زندگیوں میں ایسے بھی بے شمار وقت آئے جب انسان پر سکون ہو کر مراقبی اور Meditation میں بیٹھا اور پھر وہ اپنے حواسِ خمس سے الگ ہو کر ایک اور دنیا میں داخل ہوا تو پھر اس کا لکھن اں چیزوں سے ہوا جو غیر مریٰ چیزوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ بحر الکاہل میں بہت جزیرے ہیں جہاں سے کرک کھلینے والے بھی آتے ہیں۔ ہاں یاد آیا کہ کثر لارا کے ملک ویسٹ انڈیز کے قریب ایک جزیرہ ہے۔ اس جزیرے پر لوگوں نے بڑی چاہت کے ساتھ ایک عبادت کدہ بنایا جس میں دنیا کی مختلف دھاتوں کو ملا کر ایک گھنٹیاں بنائیں جو نہایت سریلی اور لکھ آوازیں پیدا کرتی تھیں اور دور دور سے لوگ آ کر اس عبادت کدے میں پرستش کیا کرتے تھے جا ہے ان کا کسی بھی مذہب سے تعلق کیوں نہ ہوتا۔ لوگ اس سرمدی باجے کی آوازوں میں اپنے اللہ کو یاد کرتے تھے۔ پھر سنتے ہیں کہ وہ جزیرہ آہستہ آہستہ غرق آب ہو گیا لیکن اس کی خوبصورت گھنٹیوں کی آوازوں کو سنائی دیتی تھی۔ چند سال پیشتر فرانس کا ایک صحافی اس جزیرے کی گھومنگ میں انکا اور اس جزیرے کو جغرافیائی طور پر تلاش کرنے کے بعد ہاں ان گھنٹیوں کو سینے کی کوشش کرتا رہا جو پانی کے نیچے اتر چکا تھا کیونکہ لوگ کہتے تھے کہ اگر کوئی

صاحبِ گوش ہوتوا سے ان گھنٹیوں کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ وہ صحافی لکھتا ہے کہ میں بڑی دیر تک وہاں بیٹھا رہا۔ کئی دن اور ہفتہ وہاں گزارے لیکن مجھے سوائے سمندر کی آوازوں کے اور شور کے اور سمندری بگلوں کی آوازوں کے اور کچھ سنائی نہ دیا۔ اس نے سوچا کہ یہ شاید پرانی کہانیوں میں سے ایک کہانی ہے چنانچہ وہ جانے سے بیشتر آخربار اس مقام کو سلام کرنے کی غرض سے گیا۔ وہ وہاں بیٹھا اور اس نے افسوس کا اظہار کیا کہ میں اتنی دوڑ ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے یہاں آیا اور اتنے دن یہاں گزارے لیکن وہ گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا جس کی آرزو لے کر وہ چلا تھا۔ وہ انتہائی دکھ کی کیفیت میں وہاں بیٹھا رہا۔ وہ کہتا ہے کہ میں وہاں مایوی کی حالت میں لیٹ گیا اور اس نے اپنے پاؤں گھنٹوں تک ریت میں دبائیے تو اسے گھنٹیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ ایسی آواز جو اس نے پہلے بھی نہیں سنی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور وہ صدائیں اور ہوا نیں جو پہلے اسے سنائی دے رہی تھیں ایک دم سے خاموش ہو گئیں اور ان گھنٹیوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔ وہ نظر نہ آنے والی آوازیں پانی کے اندر سے آنے لگیں۔ وہ صحافی کہتا ہے کہ جتنی دیر میرا دل چاہا میں وہ سریلی اور مدھراً آوازیں ستارہا اور میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر صدیوں پہلے ڈوبے ہوئے عبادت کدے کی گھنٹیوں کی آواز سنی ہے تو سمندر کا شور سننا ہو گا اور اگر اپنے اللہ سے ملتا ہے تو اس کی مخلوق کو سنتا ہو گا۔ یہی ایک رستہ ہے کیونکہ اللہ نظر نہ آنے والا ہے جبکہ اس کی مخلوق نظر آنے والی ہے۔ اگر آپ اس کی مخلوق کے ساتھ رابطہ قائم کریں گے تو بڑی آسانی کے ساتھ وہ سڑک مل جائے گی جو گھنٹیوں والے عبادت کدے سے ہو کر ذات خداوندی تک پہنچتی ہے۔ آج ہماری گفتگو میں یہ بات معلوم ہوئی کہ نظر نہ آنے والی چیز نظر آنے والی چیز سے زیادہ طاقتور اور قوی ہوتی ہے اور یہ نظر نہ آنے والی ساری صفات ہمارے گوشت پوست کے انسان پر اور ہماری زندگی پر کس طرح سے حاوی ہیں اسے ہم تھا بیٹھ کر بخوبی اندازہ کر سکتے ہیں اور ان چیزوں نے ہمیں اذیت میں ڈال رکھا ہے اور یہ ہماری اچھی سی زندگی کا "مسیر" بن کر بیٹھ ہوتی ہیں۔

میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

من کی آلوگی

آج سے چند روز پیشتر ہم Pollution کی بات کر رہے تھے اور ہمارا کہنا تھا کہ ساری دنیا آلوگی میں مستغرق ہے اور یہ آلوگی نہ صرف انسانی زندگی بلکہ شجر و حجر اور جیوانات کو بھی کھائے چلے جا رہی ہے۔ اس کے دور میں نقصانات ہیں اور اس کے خاتمے کی طرف خصوصی توجہ دی جانی چاہیے۔

جب ہم اس گفتگو میں بحثیت ایک قاری یا ناظر کے شریک تھے تو مجھے خیال آیا کہ انسانی زندگی میں دو متوازنی لہریں ایک ساتھ چلتی ہیں۔ ایک تو ہماری اپنی زندگی ہوتی ہے اور ایک زندگی کا نامعلوم حصہ ہوتا ہے۔ اس حصے کو ہم گو جانتے نہیں ہیں لیکن محسوس ضرور کرتے ہیں۔ یہ حصہ ہماری زندگی کی اس لہر کے بالکل ساتھ چل رہا ہوتا ہے جو اس دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔ اس وقت مجھے اپنے ان بابوں کا خیال آیا جن کا میں اکثر ذکر کرتا رہتا ہوں کہ وہ بابے Pollution کے بارے میں خاصے مقاطع ہوتے ہیں اور انہیں اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ کسی بھی صورت میں آلوگی نہ ہونے پائے اور وہ اس حوالے سے خاص اہتمام کرتے۔ یہ International Pollution Compaign سے پہلی کی بات ہے جب ڈیروں پر ایک ایسا وقت بھی آتا تھا کہ ڈیرے کا بابا اور اس کے خلیفہ آلوگی کے خلاف اپنے آپ کو باقاعدہ اور بطور خاص اہتمام میں مصروف رکھتے اور آنے جانے والوں کو اس آلوگی بابت آگاہ کرتے تھے جو انسان کی اندر ورنی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ ان بابوں کا باہر کی Pollution سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا۔ ان بابوں کا خیال ہے کہ جب تک انسان کے اندر کی آلوگی دور نہیں ہو گی باہر کی آلوگی سے چھکنا کارہ حاصل کرنا مشکل ہے۔ جب تک انسان کے اندر کی معیشت ٹھیک نہیں ہو گی چاہے باہر سے جتنے بھی قرضے لیتے رہیں باہر کی معاشی حالت درست نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اندر کی طرف زیادہ توجہ دینی چاہیے۔ ان بابوں کا یہ خیال تھا جو بڑا جائز خیال تھا کہ ہماری بہت سی بیماریاں ہماری اندر ورنی آلوگی سے پیدا ہوتی ہیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دل کے قریب ایک بہت بڑا طاق پہ ہے اور اس طاق پہ کے اندر بہت گہرے دراز ہیں۔ ان درازوں کو نکال کر اونڈھا کر کے

صاف کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ان میں عرصہ دراز سے جالے گئے ہوئے ہیں۔ تو کہیں چوہے کی مینکنیں پڑی ہیں اور طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں۔ آپ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کے دل کے والو (Valve) بند ہو رہے ہیں اور ظاہر کی زندگی میں یہی تصور ابھرتا ہے۔ دل کی نالیاں بند ہو جانے کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ اس کے ارد گرد آلو دگی جمع ہو چکی ہوتی ہے اور وہ خطرناک حد تک جمع ہو جاتی ہے اور انسان کو اس کا پتہ ہی نہیں چلتا۔ انسان خود کو چنگا بھلا اور نمیک ٹھاک خیال کرتا ہے میں دل کے قریب آلو دگی بڑھتی چلی جاتی ہے۔

خواتین و حضرات! دل کی آلو دگی جانے کے لیے تو ایک اور طرح سے جھائختنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہاں نگاہ ڈالنے کے لیے ایک اور زاویہ نظر سے دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان بابوں کا خیال ہے کہ نفرت کی وجہ سے پہپا نمائش بی پھیلتی ہے۔ اس بیماری کا سبب شدید نفرت ہے۔ پہلے یہ بیماری اتنی نہیں تھی۔ ایک وہ زمانہ تھا جب پاکستان نیا نیا بنا تھا اور ہم اس وقت نوجوان تھے۔ ہم تج خوشی کے ساتھ گھومتے پھرتے تھے اور جب ہمیں کوئی کار بڑی خوبصورت لگتی تو اس کو ہاتھ لگاتے تھے اور بڑے خوش ہوتے تھے۔ ہم نے مال روڑ پر لکھتی ہی خوبصورت کاروں کو ہاتھ لگایا۔ ہمیں تب یہ معلوم بھی نہ تھا کہ Jealousy بھی ہوا جاتا ہے۔ اب برا داشت نہیں ہوتا۔ اب یہ یکیفیت ہے کہ اب والد میٹے اور بیٹا والد سے حسد کرتا ہے۔ رسم سہرا ب کی طاقت شہرت اور اس کی ناموری سے حسد ہوتا تھا اور دنوں کا آپس میں نکراو بھی ہوتا تھا اور سہرا ب اپنے سے میٹے رسم کو قتل بھی کرتا ہے۔ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ اس کی شدید نفرت خود اسے ہی کھائے جا رہی ہوتی ہے۔ گواں نے اپنے اوپر عجیب طرح کا خول بد نیتی سے نہیں چڑھایا ہوتا ہے بلکہ معاشرتی تقاضوں کی بدولت ہی ایک خول اس پر چڑھ جاتا ہے۔ بہت بڑے آرٹسٹ خدا بخشے زوبی ہوتے تھے۔ ان سے ایک دفعہ ایک بلوچ جا گیردار نے تصویر بنوائی۔ جب ان جا گیردار صاحب کی خدمت میں وہ تصویر پیش کی گئی تو انہوں نے کہا کہ اس میں تو میری شکل ہی نہیں ملتی۔ یہ تصویر میری لگتی ہی نہیں ہے۔ وہاں ان کے جو پندرہ میں حواری بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے بھی کہا کہ ”جب سائیں یہ شکل تو آپ سے ملتی ہی نہیں ہے۔“ اب وہ آرٹسٹ بڑے شرمende ہوئے اور ان کی طبیعت پر بڑا بوجھ پڑا۔ وہ تصویر واپس لے آئے۔ کراچی میں ان دنوں ان کے فن پاروں کی نمائش ہوئی تو انہوں نے اس نمائش میں اسی تصویر کے نیچے جا گیردار کا نام منا کر ”چور“ لکھ دیا۔ اب ان صاحب کو بھی اس بات کی خبر پہنچی وہ اپنا موزریا تکوار لے کر وہاں سے بھاگے اور انہوں نے بھی آ کر وہ تصویر دیکھی جس کے نیچے ”چور“ لکھا ہوا تھا۔ وہ پھر سخت لمحے میں آرٹسٹ سے گویا ہوئے اور کہا کہ تمہیں ایسی حرکت کرنے کی جرأت کیسے ہوئی۔ آرٹسٹ نے کہا کہ ”یہ آپ کی تصویر نہیں ہے اور آپ نے خود ہی کہا تھا کہ میری اس تصویر سے شکل نہیں ملتی اور آپ کے حواریوں نے بھی یہی کہا تھا کہ حضور یہ

آپ کی تصویر نہیں ہے۔ آپ نہ میرے اوپ کوئی کلیم کر سکتے ہیں اور نہ کوئی مقدمہ کر سکتے ہیں۔ جا گیردار صاحب کہنے لگے کہ پکڑو پیسے اور یہ تصویر میرے حوالے کرو اور بتیں ہزار روپے دے کر بغل میں اپنی تصویر مار کر چلے گئے۔“

خواتین و حضرات! انسان کو پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ چور ہے یا سعد ہے۔ نیک ہے یا بد ہے۔ وہ چاہے جتنی بھی کوشش کرے اس پر اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ اس کے پاس مراثیب کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو Face کرنے کے بعد ہی خوبیاں خامیاں عیاں ہوں گی اور انسان اپنی خرابیاں دور کر سکے گا۔ جب آپ کو پتہ چلتا ہے کہ میرے چہرے پر ایک چھپی ہو گئی ہے تو وہ آپ کو ڈسٹریب کرتی ہے لیکن جب وجود کے اندر کوئی بیماری آجائی ہے تو پھر اس کا علم نہیں ہوتا۔ ہماری آپاصالح کہا کرتی تھیں (خدابخش نہیں) کہ اشراق اللہ نے یہ جو کائنات بنائی ہے اس میں ہر طرح کے انسان ہیں۔ جھوٹے بے ایمان، دغabaڑے، چور، مقصوم، نیک بھولے صوفی درویش مکار ہر طرح کے انسان پائے جاتے ہیں اور پھر وہ بھی فہرست گنو کر کھینچیں کہ خدا کا شکر ہے کہ ان تمام انسانوں میں سے نہیں ہوں۔ خواتین و حضرات نہیں یہ پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ انہوں نے جتنی قسمیں گنوائی ہیں وہ ان میں سے باہر جاہی نہیں سکتیں۔ ہمارے بابے ایک بات پر بڑا ذریعہ یا کرتے تھے۔ ان کا فرمان تھا کہ آپ نے دل کے دراز کے مختلف کنوں میں جو گلدستے پھیلے ہوئے ہیں، جو عقیدت کے گلدستے ہیں انہیں نکال کر باہر پھینکو کیونکہ ان کی بدبو بڑی شدید ہوتی ہے۔ آپ لوگوں کو پتہ ہے کہ جب گلدستہ پانی میں کافی دریتک پڑا رہے تو پھر اس کے اندر سے بدبو پیدا ہو جاتی ہے اور وہ بدبو سمجھا جائیں جاتی ہے۔ بابے کہتے تھے کہ ان بدبو سیدہ گلدستوں کو نکال کے پھینکنا بہت ضروری ہے۔ اب ہم ان سے جھگڑا کرتے کہ بابا جی عقیدت کے گلدستوں کو کیسے اور کیونکر دل سے باہر نکال پھینکنا جائے۔ انہوں نے کہا کہ دیکھو جن گلدستوں کو تروتازہ رہنا چاہیے تھا وہ آپ کے وجود کے اندر پڑے ہوئے تروتازہ نہیں رہے ہیں اور پڑے پڑے بدبو دار ہو گئے ہیں۔ وہ اس قدر بدبو دار ہو گئے ہیں لیکن زیادہ دیر پڑے رہنے کے باعث آپ کو ان گلدستوں یا بدبو سے محبت اور عقیدت ہو گئی ہے اور آپ انہیں باہر نہیں پھینکتے ہیں۔ جوں جوں آپ کی بیردنی زندگی میں Mouth Washes بننے جائیں گے اور غرار سے کرنے کی جتنی بھی دوائیں بننی جائیں گی یہ اندر کی بدبو کو ختم نہیں کر سکتیں۔ اب کئی ملنی پیش کپنیاں منہ میں خوشبو پیدا کرنے کے لیے ادویات بنانے کر رہیں ہیں اور کروڑوں روپے اکٹھے کر رہی ہیں لیکن ان ادویات کے استعمال کے باوجود اندر سے بدبو کے ایسے ”بھکے“ اور ”بھجھا کے“ نکلتے ہیں کہ یہ چیزیں اسے کثروں ہی نہیں کر سکتیں۔ حالانکہ خدا نے انسانی جسم بہترین ساخت پر بنایا ہے۔ یہ نہاد ہو کر صاف ہو کر اچھا ہو جاتا ہے لیکن اب اندر کی بدبو نہیں جاتی ہے۔ ہم بابا جی سے پوچھتے کہ جناب یہ کس قسم کی

عقیدت کا گلdestہ ہے۔ فرمانے لگے کہ مثال کے طور پر تم نے ایک گلdestہ بڑا سجا یا ہوا تھا۔ اور اس گلdestہ کا نام ”مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں“ رکھا ہوا تھا۔ اب وہ گل سرگیا ہے، آپ نے اس بات کو تسلیم نہیں کیا کہ مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ بلکہ اسے صرف دکھانے کے لیے گلdestہ کے طور پر رکھا تھا اور اسے ایسے ہی رکھ کر گلنے سرنے دیا ہے۔ آپ نے ایک گلdestہ ”لوگوں کے ساتھ اچھی بات کرو“ بھی رکھا تھا۔ اب وہ بھی پڑا۔ ابد بودار ہو گیا ہے۔ آپ نے عدل و انصاف کے گلdestہ کے کوئی بھی خراب کر دیا ہے۔ بابا جی کہا کرتے تھے کہ عقیدت کا جو گلdestہ سب سے زیادہ خراب ہوا ہے وہ بے انسانی ہے۔ انسان نے عدل سے منہ موڑ لیا ہے حالانکہ انسان اور خاص کر مسلمانوں کے سارے نظام کی عدل پر بنیاد ہے۔ ہمیں ہر جگہ عدل کا حکم ہے۔ آپ کسی کی شکل سے نفرت کرتے ہوئے کسی کو انصاف کی فراہمی روکنے کے مجاز نہیں ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ تم کسی سے محبت نہ کرو۔ اس پر کوئی مواخذه نہیں لیکن بے انسانی اور عدل نہ کرنے پر مواخذه لازم ہے۔ ان گلdestوں کو تروتازہ کرنے کے لیے باقاعدہ ایک عمل کرنا پڑتا تھا اور بابا جی کے پاس بہت دیر تک رہتا پڑتا تھا۔ کچھ راتیں بسر کرنا پڑتی تھیں۔ کچھ ایسے محلول بھی پینے پڑتے تھے۔ آپ کو بتاؤں کہ گاؤز بان اور ایک الائچی اس وقت کھانے کو دی جاتی جب نماز تجدید کا وقت شروع ہوتا اور اس کا ایک مفرح قسم کا قبوہ پینے کو ملتا۔ ہمیں دیرے پر ایک خوبصوردار دو اسٹکھ دس کی چائے پلائی جاتی۔ اس کو دماغ کے جالے صاف کرنے والی دو اکھا جاتا تھا۔ سیانوں کا کہنا ہے کہ میوزک کی دھن بنانا سب سے مشکل کام ہے۔ اس میں سب سے مشکل بات یہ ہے کہ یہ ہمارے ہاں لکھا بھی نہیں جاتا۔ میں ایک چھوٹے درجے کا رائٹر ہوں جو بھی لکھتا ہوں پڑھ سکتا ہوں اور اسے بار بار پڑھ سکتا ہوں لیکن دھن بنانے والا میری طرح چھپلی دھن کو کاغذ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات وہی ضروری ہوتی ہے کہ وہ کہاں سے چلا تھا اور اسے پہلی دھن کو دوسرا تیرسی یا آخری کے ساتھ کس طرح سے جوڑنا ہے۔ ویسے تو اللہ نے آپ کو بہت اچھا اور خوبصورت ذہن دیا ہے۔ اس میں آلو گنی نہیں ہے لیکن اگر آپ کا دل چاہے کہ آپ اندر کی صفائی کریں اور اس عمل میں سے گزریں تو آپ کو ایک بہت بڑی مشکل پیش آئے گی اور آپ کو لگے لگا کہ صفائی ہو رہی ہے لیکن ایسا نہیں ہو رہا ہو گا بلکہ صفائی کے عمل میں ذرا سی کوتا ہی سے اس میں اور آلو گنی شامل ہو جائے گی۔

انسانی زندگی میں عجیب عجیب طرح کی کمزوریاں آتی ہیں اور آدمی ان میں پھنسا رہتا ہے اور جب وہ اپنی اندر وہی طہارت چاہتا بھی ہے اور پا کیزگی کا آرزومند بھی ہوتا ہے تو بھی اس سے کوئی نہ کوئی ایسی کوتا ہی سرزد ہو جاتی ہے کہ وہ بجائے صفائی کے مزید زنگ آلو ہو جاتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں اور یہ میرا پیغام All Over the World کے لیے ہے کہ جب تک اندر کی صفائی نہیں ہو گی اس وقت

تک باہر کی آلوگی دور نہیں ہو سکتی ہے۔ آپ روز شکایت کرتے ہیں اور آپ آئے روز Letter to the Editor لکھتے ہیں کہ جی دیکھیں ہمارے گھر کے آگے گندگی پڑی ہوئی ہے یا ہمارے محلے میں گندگی ہے اور دل سے یہ آپ کی آرزو نہیں ہوتی کہ صفائی ہو۔ آپ نے اپنے اندر ابھی تک یہ طے ہی نہیں کیا کہ آپ نے اب صفائی کرنی ہے۔ یہ بات اس وقت طے ہو گی جب آپ کو پاکیزگی اور صفائی سے محبت ہو گی اور آپ نقی خوبصورتوں کے سہارے زندگی بس رکنے کی بجائے اندر کی آلوگی ختم کر دینے کا تھا سچیں۔ آپ نے بہت سا ہو گا کہ پاکیزہ لوگوں کے بدن کی خوبصورائی مفرح اور مسحور کن ہوتی ہے کہ ان کے قریب بیٹھنے سے بہت ساری آلوگیاں دور ہو جاتی ہیں چاہے انہوں نے کوئی خوبصورائی لگایا ہو۔

آپ بابوں کا طریقہ کار اختیار کریں یا نہ کریں یہ آپ کی اپنی مرضی ہے لیکن انہوں نے روح کی صفائی کے لیے جو ترکیبیں بنائی ہوئی ہیں ان کو آپ اپنا سکتے ہیں اور ان کو اپناۓ جانے کے بعد لوگوں کو بڑی آسانیاں عطا کی جاسکتی ہیں اور پیٹی وی کی طرف سے ہر ہفتے ایک جی دعا ہوتی ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

آن پڑھ سقراط

میں کب سے آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہا ہوں اور آپ کے ارشاد کے مطابق وہی گن
گاتا رہا ہوں جن کی آپ کو ضرورت تھی۔ آج میں آپ سے ایک اجازت مانگنے کی جرأت کر رہا ہوں
اور وہ یہ ہے کہ مجھے اس بات کی اجازت دیجیے کہ میں دلی زبان کی بجائے اوپھی آواز میں یہ کہہ سکوں کہ
جو ان پڑھانسان ہوتا ہے اس کے پاس بھی اچھا اور ہائپھی ملمس دماغ ہوتا ہے۔ وہ بھی سوچ سکتا ہے وہ
بھی سوچتا ہے۔ وہ بھی فاضل ہوتا ہے اور ہرمند ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اور خاص طور پر ہمارے علاقے
میں یہ بات بہت عام ہو گئی ہے کہ صرف پڑھا لکھا آدمی ہی لائق ہوتا ہے اور جو ”پینڈو“ آدمی ہے اور
انکو مخاچھا پہ ہے اس کو اللہ نے داشت ہی نہیں دی ہے۔ اس سوچ نے ہماری زندگیوں میں ایک بہت بڑا
رخنش پیدا کر دیا ہے اور ہم ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔ ہمیں سیاسی، سماجی اور نفسیاتی طور پر بڑی
شدت کا نقصان پہنچ رہا ہے جبکہ دوسرے ملکوں والے اپنی اجتماعی زندگی میں اس نقصان کے متاثر نہیں
ہیں۔ ہماری چودہ کروڑ کی اتنی بڑی کیوٹی ہے۔ اس کو ہم نے ایک طرف رکھا ہوا ہے اور میں آپ اور ہم
سب جو سمجھدار لوگ ہیں جن کی تعداد زیادہ سے زیادہ دولاٹھی ہے ہم نے سارا حساب و کتاب سنبھال
کر رکھا ہوا ہے اور اصل میں ہم ہی اس ملک کے آقا اور حکمران بننے بیٹھے ہیں۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا
ہوں اور وست بست درخواست کرتا ہوں کہ وہ لوگ بھی ہمارے ساتھی ہیں۔ پچھر لگانے والا سائن بورڈ
لگانے والا بڑھتی ترکھان بھی اپنے اندر ایک ہنر رکھتا ہے۔ اگر ہم اس کو مسلمانہ کر سکیں تو کم از کم ان کے
لیے دل میں یہ احترام تور ہیں کہ یہ ویلڈر جس نے کالے رنگ کی عینک پہن رکھی ہے اور تناک الگار ہاہے
وہ بھی تقریباً اتنا ہی علم رکھتا ہے جتنا ہمارث سرجن یا بائی پاس کرنے والے کا علم ہوتا ہے لیکن ہم نے ایسے
ہرمندوں کو ایک طرف رکھا ہوا ہے۔

میں 1971ء کے انتخابات میں ایک جگہ پر ریٹرینگ آفیسر تھا۔ ہم جلدی جلدی ووٹ ڈالوا
رہے تھے وہاں ایک بابا آیا جس نے ریڑھی بنوائی ہوئی تھی۔ وہ معذور تھا اور اس ریڑھی کے ذریعے

حرکت کرتا تھا۔ وہ آکے کہنے لگا کہ جی میں ”تمارنوں ووٹ پانا اے۔“ میں نے کہا کہ بابا جی اسم اللہ تو جہاں کہے گا میر لگا نہیں گے لیکن رش زیادہ ہے تھوڑا انتظار کرلو لیکن اس نے کہا کہ نہیں جی میرے پاس نام نہیں ہے۔ وہاں میرے استشنت کہنے لگے کہ جی اس کا ابھی ووٹ ڈالوادیں۔ میں نے اس کی خوشنودی کے لیے کہا کہ بابا آپ کی ریز ہمی بڑے کمال کی ہے یہ تو نے کہاں سے لی۔

کہنے لگا یہ میں نے خود بنائی ہے۔ پہلے جو بنائی تھی اس کو میں نے بچوں والی سائیکل کے پہنچنے لگائے تھے۔ وہ پکے پر خوب دوڑتی لیکن کچے میں وہ چھن جاتی تھی۔ پھر میں نے لکڑی کے موٹے پہنچنے لگائے تو وہ پکے میں اچھے چلتے تھے اور پکے میں یا سڑک پر بہت شور مچاتے تھے پھر میں نے پیر گنگ لگادیے۔ بس ہر ہفتے میٹی کا تیل ڈال کر صاف کرنے پڑتے ہیں۔ (دیکھئے کہ وہ بابا چنان پڑھتا ہے) میں نے اس سے کہا کہ بابا یہ تو نے کیے بنائی۔ وہ کہنے لگا کہ جی میں نے سوچ سوچ کے بنائی۔

میں نے جب اس سے بار بار پوچھا کہ کیا تو نے یہ خود ہی بغیر کسی کی مدد کے بنائی تو وہ بابا کہنے لگا ”بابا جی تھانوں میرے تے شک کیوں لے رہیا ہے ویکھو نہیں جی اگر بندہ پڑھیا لکھیا ہو وے تے فیر دماغ توں ای کم لینا پیدا اے نا۔“

اس واقعہ کے بعد میں دیکھتا کہ لوگ کیسی کیسی مہارتیں رکھتے ہیں اور عام بغیر ڈگری ہترمند کرتے ہیں ہیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ ان عام ہترمندوں کا انداز فکر بھی برٹش درسل یا استراط ہی کی طرح کا ہوتا ہے اور یہ کسی آنکن شائن سے کم نہیں ہیں۔ یہ بھی ان لوگوں کا چھاپ ہوتے ہیں اور نئی سئی ایجادیں کر رہاتے ہیں۔ یہ زیادہ الفاظ نہیں جانتے ہوں گے لیکن ان کا دماغ عام پڑھے لکھے دماغوں کی طرح سے ہی کام کرتا ہے۔

ایک قبیلہ موڑ کھنڈا ہے۔ وہ بڑا پیار اعلاء ہے۔ اس میں کافی جھگڑے اور لڑائیاں بھی ہوتی ہیں وہاں ایک کسان تھا اور اس کا بیٹا میر اولاق تھا۔ وہ ایم بی بی ایس کا طالب علم تھا اور فاکسل ایئر میں تھا۔ گاؤں میں اس کا باپ حقہ پی رہا تھا۔ وہ کہنے لگا کہ اشغال صاحب میرے بیٹے کو علم دیں جی۔ میں نے کہا کہ کیوں کیا ہوا۔ بہت اچھا علم حاصل کر رہا ہے۔ اس سے اعلیٰ علم تو اور کوئی ہوتا ہی نہیں۔

وہ اپنے بیٹے کو مخاطب کر کے کہنے لگا کہ تو اشغال صاحب کو بتا۔

وہ لڑکا کہنے لگا کہ جی میں ہارٹ پیش لست بننا چاہتا ہوں۔

اس کا باپ پھر کہنے لگا کہ ”بے وقوف ایک بندے وچ اک دل ھوندا اے او ہندہ علاج کر کے انہوں ٹور دیں گا فیر کے آونا نہیں تو دنداس داعلم پڑھ۔“ تھی ہوندے نہیں کہے نہ کہے کوئی نہ کوئی تے خراب ہو وے گا۔ ایس طرح ہتھیواری اک بندہ تیرے کوں آئے گا۔“

خواتین و حضرات! سفر اکسی سکول سے باقاعدہ پڑھا لکھا نہیں تھا۔ کسی کالج، سکول یا یونیورسٹی کا اس نے منہ نہیں دیکھا تھا۔ آپ کے حساب سے جوان پڑھ لوگ ہیں وہ Experiment بھی کرتے ہیں۔ ایک حیران کن بات ہے اور آپ یقین نہیں کریں گے۔ میں جہاں جمع پڑھنے جاتا ہوں وہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ اب جو مولوی صاحب ہوتے ہیں ان کی اپنی ایک سوچ ہوتی ہے۔ انہیں سمجھنے کے لیے کسی اور طرح سے دیکھنا پڑتا ہے اور جب آپ ان کی سوچ کو سمجھ جائیں تو پھر آپ کو ان سے علم ملنے لگتا ہے۔

وہ نماز سے پہلے تمام صفوں کے درمیان ایک چار کنوں والا کپڑا پھراتے ہیں جس میں لوگ حسب تو فتن یا حسب تمنا کچھ میے ڈال دیتے ہیں۔ اس مرتبہ بڑی عید سے پہلے جو جمع تھا اس میں بھی وہ چو خانوں والا کپڑا پھرا یا گیا اور جو اعلان کیا وہ سن کر میں حیران رہ گیا۔ وہ اس طرح سے تھا ”دو حافظہ سے کوئی صاحب آئے تھے۔ انہوں نے مجھے پانچ ہزار روپے دیے ہیں۔ میں نے وہ پیسے دو تین دن رکھے اور پھر میں نے ان روپوں کو سوسا اور پچاس پچاس کے نوٹوں میں Convert کر دیا جنہیں اب میں یہاں لے آیا ہوں جو اس چوکو نوں والے کپڑے میں ہیں۔ عید قریب ہے، ہم سارے کے سارے لوگ صاحب حیثیت نہیں ہیں اور جس بھائی کو بھی ضرورت ہو وہ اس کپڑے میں سے اپنی مرضی کے مطابق نکال لے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم پڑھتے ہیں کہ ”دس دنیا ست آ خرت۔“

آخوندینے سے کچھ فائدہ ہی ہوتا ہے نا! شاید وہ یہ میسٹ کرنا چاہتا تھا کہ یہ بات جو کھنچی ہوئی ہے یہ واقعی درست ہے یا پھر ایسے ہی چلتی چلی آ رہی ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس کپڑے میں سے کچھ لوگوں نے روپے لیے۔ ایک نے پچاس کافنوٹ لیا۔ ایک اور شخص نے سو کافنوٹ لیا۔ کچھ ڈالنے والوں نے اس کپڑے میں اپنی طرف سے بھی نوٹ ڈالے۔ اگلے دن میں مولوی صاحب سے ملا اور ان سے کہا کہ گزر شتر روز آپ کا عجیب و غریب تجربہ تھا۔ ہم نے تو ایسا آج تک دیکھا نہ سن۔ تو وہ کہنے لگا کہ جناب جب میں نے آخر میں اس روپاں یا کپڑے کو کھول کر دیکھا اور گتنا تو پونے چھپ ہزار روپے تھے۔ اب یہ بات میرے چیز ”پڑھے لکھے“ آدمی کے ذہن میں یا ”دانش مند“ آدمی کے ذہن میں نہیں آئی۔ ایک ان پڑھ کچھ بھی ایسے ماحول یا تجربے سے گزرتا ہے اور پھر ایک ایسا نتیجہ اخذ کرتا ہے جو مجھ سکتاب والے کو کھنچی نہیں ملا۔

لا ہور اور شکوپورہ روڈ پر کئی ایک کار رخانے ہیں۔ ایک بار مجھے وہاں جانے کا اتفاق ہوا۔ جب میں وہاں کام کر کے فارغ ہونے کے بعد لوٹا اور گاڑی شارٹ کرنے لگا تو وہ شارٹ نہ ہو۔ خیر میں نے ڈرائیور سے کہا کہ تم اپنی Effort جاری رکھو مجھے جلدی واپس جانا ہے لہذا میں بس پر چلا جاتا ہوں تم بعد میں آ جانا۔ جب میں بس میں بیٹھا تو اور وہاں سواریاں بھی تھیں۔ ایک نیند میں ڈوبا ہوا

نوجوان بھی تھا جس کی گودی میں ایک خالی پنجھرہ تھا جیسے کبوتر یا طوٹے کا پنجھرہ ہوتا ہے۔ وہ نوجوان اس پنجھرے پر دو ٹوٹوں ہاتھ رکھ کے اوپر رہا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو میرے اندر کا تجسس جا گا اور میں نے اس سے بات کرنا چاہی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ خالی پنجھرہ تم گود میں رکھ کے بیٹھے ہو۔ وہ کہنے لگا کہ سری یہ پنجھرہ کبھی خالی ہوتا ہے اور کبھی کبھی بھرا ہوا بھی ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ اس میں میرا کبوتر ہوتا ہے جو اس وقت اپنی ڈیوٹی پر گیا ہوا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں کھاد فیکٹری میں خردی ہے اور دیلہنگ کا کام بھی جاتا ہے اور چھوٹا مونا الکٹریشن کا کام بھی سمجھتا ہے۔ اس نے کہا کہ مجھے ہر روز اور راتنم لگانا پڑتا ہے اور میں پانچ بجے چھٹی کے وقت پھر گھر نہیں جا سکتا اور گھر پر فون ہے نہیں جس پر بتا سکوں کے لیت آؤں گا لہذا میں نے اپنائی کبوتر پالا ہوا ہے۔ اس کو میں ساتھ لے آتا ہوں۔ جس دن میں نے اور راتنم لگانا ہوتا ہے اس دن میں اور میرا کبوترا اکٹھے رہتے ہیں اور میری ڈیوٹی کو پتہ چل جاتا ہے کہ ہم آج رات گھر نہیں آئیں گے لیکن جس دن اور راتنم نہیں لگانا ہوتا تو میں کبوتر چھوڑ دیتا ہوں۔ وہ پھر پھر اتا ہوا رہتا ہے اور سید حامیری ڈیوٹی کی جھوٹی میں جا پڑتا ہے اور وہ قاصد کا کام کرتا ہے اور اسے پتہ چل جاتا ہے کہ آج اس کے خاوند نے گھر آنا ہے اور وہ کھانے پینے کا اہتمام کر دیتی ہے اور اس نے جو بھی مترقبہ بنانا ہوتا ہے تیار کر دیتی ہے اور آج بھی کبوتر اپنی ڈیوٹی پر ہے۔ وہ کہنے لگا کہ صاحب میں پڑھا لکھا تو ہوں نہیں۔ میری چھوٹی سی عقل ہے۔ وہ میرا کبوتر گھر پانچ چکا ہو گا۔ خواتین و حضرات پہلے تو مجھے اس پر بڑا تعجب ہوا کہ اس نے یہ بات سوچی کیسے؟

سوچی جانے والی بات کے حوالے سے حفظ کا ایک بڑا کمال کا شعر ہے۔

لب پر آتی ہے بات دل سے حفظ
دل میں جانے کہاں سے آتی ہے

دل میں بات اس منج سے آتی ہے جہاں سے سب کو علم عطا ہوتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو بھی عطا ہوتا ہے جن کے پاس یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہوتی لیکن خدا کی طرف سے حصے کے مطابق ان کو علم عطا ہوتا رہتا ہے۔ وہ پنجھرے والا کسی کے پیچھے نہیں گیا، کسی کا محتاج نہیں، کسی کی منت سماجت نہیں کی لیکن اس نے اپنی سوچ سے کبوتر کو پڑھایا، سمجھایا اور قاصد کا کام لیا۔

میرے پاس ولائیت اور یہاں کی بے شمار ڈگریاں ہیں لیکن اس سب علم اور ڈگریوں کے باوجود میرے پاس وہ پنجھنیں ہے جو ایک پینڈا مالی کے پاس ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی عطا ہے۔ بڑی دری کی بات ہے، ہم سکن آباد میں رہتے تھے۔ میرا پہلا پچھوٹا یعنی جو نہایت ہی پیارا ہوتا ہے وہ میری گود میں تھا۔ وہاں ایک ڈنگی گراونڈ ہے جہاں پاس ہی صوفی غلام مصطفیٰ قبسم رہا کرتے تھے۔ میں اس گراونڈ میں بیٹھا تھا اور مالی لوگ پچھکام کر رہے تھے۔ ایک مالی میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ماشاء اللہ بہت

پیارا بچھے ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز کرے۔ وہ کہنے لگا کہ جی میرا چھوٹے سے جو بڑا بیٹا ہے وہ بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا ماشاء اللہ اس حساب سے تو ہم قریبی رشتہ دار ہوئے۔ وہ کہنے لگا کہ میرے آٹھ بچے ہیں۔ میں اس زمانے میں ریڈ یو میں ملازم تھا اور ہم فیملی پلانگ کے حوالے سے پروگرام کرتے تھے جب اس نے آٹھ بچوں کا ذکر کیا تو میں نے کہا کہ اللہ ان سب کو سلامت رکھے لیکن میں اپنی محبت آٹھ بچوں میں تقسیم کرنے پر تیار نہیں ہوں۔ وہ مسکرا یا اور میری طرف چھرہ کر کے کہنے لگا ”صاحب جی محبت تقسیم نہیں کیا کرتے۔ محبت کو ضرب دیا کرتے ہیں۔“

وہ بالکل آن پڑھ آدمی تھا اور اس کی جب سے کہی ہوئی بات اب تک میرے دل میں ہے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ واقعی یہ ضروری نہیں ہے کہ کسی کے پاس کی ہنزیر یا عقل کی ڈگری ہو۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ سوچ و فکر کا ذپوہ حاصل کیا جائے۔

ہم نے تعلیم یافتہ اور آن پڑھ کے الگ الگ درجے بنالیے ہیں۔ اب بد قسمتی سے تعلیم میں بھی مسلسلے پیدا ہو گئے ہیں اور تعلیم یافتہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ کا چکر شروع ہو گیا ہے۔ ایک بڑے اور ایک سکم ترکوں کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ چھٹے دنوں ایک ہمندی کا پروگرام تھا میں بھی وہاں تھا۔ تو لڑکیاں ناچتی و اچھتی رہیں اور سخت ہنگامہ رہا۔ وہاں پانچ چھ لاکیاں تھیں۔ وہ میرے ساتھ بات کرنے لگیں۔ انہیں آرزو بھی مجھ سے بات کرنے کی۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو میرے پاس آگئیں۔ جب وہ مجھ سے بات کر رہی تھیں تو میری پوتی چیل کی طرح میرے اوپر جھٹی اور کہا کہ دادا یہ آپ کن سے باتیں کر رہے ہیں یہ تو اردو میڈیم کی لڑکیاں ہیں۔ یعنی یہ بات ہمارے بچوں کے اندر بھی آگئی ہے۔ اس بار عید پر میری بیوی نے ہمارے گواں بیش کو جو طبیعت کا بڑا سخت ہے اس سے کہا کہ ایک سیر دو دھ زیادہ دے دو۔ اس نے کہا ”اچھا آپا جی۔“ ساتھ والوں نے بھی ایسے ہی زیادہ دو دھ لیا اور ساتھ ساتھ کئی گھروں کو ان کی مرضی کے مطابق زیادہ دو دھ دیا۔ میری بیوی نے اس سے بڑی شکایت کی اور اس سے کہا کہ بیشے خدا کا خوف کرو اور کچھ شرم کرو تمہارا بڑا نام اور اچھی شہرت ہے اور تم اس محلے میں کب سے دو دھ دے رہے ہو۔ اس مرتبہ تم ہم کو عید پر پانی والا دو دھ دے گئے۔

اس نے جواب دیا ”آپا جی بات یہ ہے کہ عید کے قریب آکر سب لوگ جب مجھ سے ایک ایک سیر زیادہ دو دھ مانگیں گے تو میں ایک دن کے لیے نبھیں تو خریدنیں سکتا۔ پھر ایسا ہی دو دھ دوں گا۔“ اب میری بیوی کے پاس اس کو دینے کے لیے کوئی جواب نہیں تھا۔ میری آپ کی خدمت میں یہ درخواست ہی ہے اور ایک عرض ہی ہے کہ خدا کے واسطے ہم 20 لاکھ پڑھے لکھے لوگ دوسرے 14 کروڑ کو بھی اہمیت اور احترام دیں۔ انہیں اچھوت نہ سمجھیں اور ان سب کو اپنے ساتھ ملا لیں۔ انہیں مال میں سے حصہ نہ بنا لیں۔ رشتہ داری قائم نہ کریں لیکن انہیں پیار محبت اور عزت تو ضرور دے دیں۔ اگر ہم

ان کو اپنے ترقیت رکھیں گے اور اس حکم کا پاس کریں کہ کسی گورے کو کا لے اور کا لے کو گورے اور عربی کو
عجمی پر کوئی فویضت نہیں ہے اور تم میں سے بڑا وہ ہے جو تقویٰ میں سب سے بڑا ہے۔ اگر اس فرمان پر عمل
کریں تو یہ ان پر ہستہ ادا اور آئن شاکن ہمارے لیے ہی آسانیوں کا باعث نہیں گے اور ہمیں ویسے ہی
عزت لوٹا سکیں گے جیسی ہم ان سے کریں گے۔ عجز و اکساری گواہیک مشکل بات ہے لیکن یہ تقویٰ کے
حصول کے لیے ضروری ہے۔ ہمارے ہاں جتنے "اکھان" (ضرب الامثال) ہیں یہ سب ان پر ہٹ
لوگوں نے اپنے تجربات سے بنائی ہیں کہ

| | | | | |
|----|-------|------|---------|--------|
| مر | جادیں | گا | بھایا | کھوتیا |
| اے | ساوے | پیٹھ | کھلوتیا | |
| اے | آوا | نیوں | مکنا | |
| تے | تو | نیوں | چھٹنا | |

یہ ایک سوچ کی بات ہے ایسے ہی نہیں باہر آ جاتیں۔ یہ دانش کی اور فلسفیوں کی باتیں ہیں۔
آج کے بعد سے آپ ان فلسفیوں کو جن کے پیشے بہت چھوٹے ہیں۔ کوئی کوچوان ہے، کوئی جام ہے،
کوئی موچی ہے لیکن ان کے پاس ان کا ہنر ہے۔ ان کا بھی علم ہے اور یہ عزت کے جائز طور پر مالکی
والے ہیں اور ہم ایمانداری کے ساتھ انہیں ان کی عزت نہیں دے رہے۔ امید ہے کہ آپ میری
درخواست پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں قسم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

بونگیاں ماریں، خوش رہیں

ہم اہل زاویہ کی طرف سے آپ سب کو سلام پہنچے۔ آج کے اس ”زاویے“ میں میرا کچھ سمجھیدہ انداز اختیار کرنے کو جی نہیں چاہتا بلکہ آج کچھ بلکی پھتلی ہی باتیں ہونی چاہئیں اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی بلکی پھتلی باتوں سے ہی عبارت ہے۔ ہم اس پروگرام کے شروع ہونے سے پہلے کچھ سمجھیدہ اور گھم بھیر قسم کی باتیں کر رہے تھے اور میرے ذہن میں یہ لہر بار بار اٹھ رہی تھی کہ پاکستان کے اندر ہماری بہت سی مشکل منازل موجود ہیں جن میں بہت بڑا تھا ان اونچے پہاڑوں کا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کمال مہربانی سے ہم کو عطا کیے ہیں۔ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ کے۔ ٹوپاکستان میں ہے۔ میں اسے سب سے اونچا یوں کہوں گا کہ بہت سے جغرافیہ دان اور ہدایت دان یہ کہتے ہیں کہ ہمالیہ کی چوٹی اتنی اونچی نہیں ہے جتنی کہ کے۔ ٹوکی ہے۔ یہ ہمالیہ سے دو قٹی یاد و فٹ کچھ اونچ اونچا ہے۔ کے۔ ٹوکی چوٹی ہمارے پاس ہے، ناگا پرہت کی چوٹی ہمارے پاس ہے۔ راکا پوشی کی چوٹی کے ہم مالک ہیں۔ مجھے بھی آپ کی طرح ان چوٹیوں سے بڑی محبت ہے۔ اور پری منزل یا ان چوٹیوں پر پہنچنے کے لیے جب انسان رخت سفر باندھتا ہے تو وہ صرف ایک ہی ذریعہ استعمال نہیں کرتا۔ پہلے انسان جیپ کے ذریعے پہاڑ کے دامن تک پہنچتا ہے پھر آپ کوٹھو یا خچر کی ضرورت محسوس ہوگی۔ اس کے بعد ایک مقام ایسا آجائے گا کہ راستہ دشوار گزار ہو جائے گا اور پیدل چلنا پڑے گا۔ پھر ایک جگہ ایسی آئے گی جب آپ کو رسوں کا استعمال کرنا پڑے گا۔ تب کہیں جا کر آپ اور اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔ زندگی میں صحت جسمانی اور صحت روحانی کو برقرار رکھنے کے لیے انسان ایک ہی طریقہ علاج نہیں اپناتکتا ہے بلکہ اسے مختلف طریقے اور ذرائع استعمال کرنا پڑتے ہیں۔ ایلو پیتھک علاج ہے، حکمت ہے، ہومیو پیتھک کا طریقہ ہے اس کے علاوہ چائیز کا طریقہ علاج ہے جس میں وہ صبح سوریے انھ کرقدرت سے کرنٹ حاصل کرتے ہیں۔ ہم نے چائنا میں دیکھا کہ وہ صبح باہر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلاتے رہتے ہیں اور قدرتی انرجی اپنے اندر سینئے رہتے ہیں اور اپنی بیٹری چارج کرتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں اور چیزیں ہمارے ہاں ہمارے

بزرگوں بڑوں اور بابوں نے بھی سوچی ہیں اور ان کی ان باتوں کو جو میرے جیسا آدمی بھی چوری سنتا اور سکھتا رہا ان میں ایک طریقہ علاج یہ بھی ہے کہ وہ روحانی ادویات کا استعمال رکھتے ہیں۔ خواتین و حضرات! یہ روحانی ادویات کہیں فروخت نہیں ہوتیں۔ کوئی ایسا بازار یا مرکز نہیں ہے جہاں سے جا کر ڈاکٹری نسخہ کی طرح روحانی ادویات خرید سکتیں۔ نہ تو یہ گولیوں کی شکل میں ہوتی ہیں نہ یہ پھر ہوتی ہیں نہ ان کی ڈرپ لگ سکتی ہے اور نہ یہ ٹیکلوں کی صورت میں دستیاب ہوتی ہیں۔ یہ تو کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کا کچھ نہ ہونا سمجھی ہونے کی طرح سے ہے۔ میری اور آپ کی زندگی کا سارا ادارہ و مدار وہ یہی ہے کہ کوشش اور جدوجہد کرنی ہے اور یہی ہمیں پڑھایا اور سکھایا گیا ہے۔ لیکن چیزیں فلسفہ تاؤ کے مانے والے کہتے ہیں کہ ٹھوس اور نظر میں آنے والی چیز اور جو ظاہر آپ کو مفید نظر آئے وہ درحقیقت مفید نہیں ہوتی۔ مثال کے طور پر آپ لاہور سے اسلام آباد جانا چاہتے ہیں۔ آپ اپنی کارنگا لئے ہیں اور اسے سڑک پر تیزی سے بھاگتے ہیں۔ آپ کی یہ کوشش اور تیز بھاگنا ایک ساکن چیز سے والستہ ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ تیزی سے گھومتا ہوا پہیہ ایک نہایت ساکن ڈھرے کے اوپر کام کرتا ہے۔ اگر وہ ڈھرا ساکن نہ رہے اور وہ بھی گھونمند لگ جائے تو پھر بات نہیں بنے گی۔ اس کوشش اور جدوجہد میں تیزی سے مصروف پہنچنے کے پیچھے مکمل سکون ہے اور خاموشی واستقامت اور حرکت سے مکمل گریز ہے۔ مجھ سے اور آپ سے یہ کوتا ہی ہو جاتی ہے کہ ہم تیز چلنے کے چکر میں پیچھے اپنی روح کی خاموشی اور سکون کو توڑ دیتے ہیں۔ ہمارے سیاستدان بھی چلو بھاگو دوزو کی رث لگاتے ہیں اور ”آؤے ای آؤے اور جاوے ای جاوے“ کے غرے لگاتے ہیں۔ زندگی اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور اس نے زندگی میں حسن رکھا ہے۔ میرے سامنے پڑی چائے کی پیائی کے درود یا وار اس کا کہنا یہ مفید نہیں ہے بلکہ اس کا خلا مفید ہے۔ ہم پیائی کے کنارے پر چائے رکھنے کی نہیں پی سکتے۔ اس لیے خلا کی اہمیت اس کی نظر آنے والی بیرونی خوبصورتی سے زیادہ ہے۔ ہم جس گھر میں رہتے ہیں وہ گھر کے خلا کے اندر رہتے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح دیوار میں گھس کر نہیں رہتے۔ دیواریں کسی کام نہیں آتیں بلکہ خلا کام آتا ہے۔ آپ زندگی کے ساتھ شدت کے ساتھ نہ چمٹ جایا کریں اور ہر مفید نظر آنے والی چیز کو بالکل ہی مفید نہ سمجھ لیا کریں۔ میں روحانی دو ایک بات کر رہا تھا جو عام کسی طبیب کے ہاں سے نہیں ملتی یا کسی ملٹی نیشنل لیبارٹری میں تیار نہیں ہوتی۔ یہ دو ایک آپ کو خود ہی بنانی پڑتی ہیں اور ان دو ایک کے ساتھ ایسے ہی چلانا پڑتا ہے جیسے بے خیالی میں آپ کسی کھلے رستے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان روحانی ادویات کا نسخہ بھی کسی جگہ سے لکھا ہوا نہیں ملتا ہے۔ یہ آپ کو اپنی ذات کے ساتھ بیٹھ کر اور خود کو ایک طبیعت کے سامنے دوڑانوں ہو کر بیٹھنے کے انداز میں پوچھنا پڑتا ہے کہ بابا جی یہ میری خرابی ہے اور یہ میری الگھن ہے اور پھر آپ ہی کے اندر کا دجو یا طبیب بتائے گا کہ آپ کو کیا کرنا ہے۔ جب آپ خود

اپنی ذات سے خامیاں خوبیاں پوچھنے اور سوال و جواب کرنے بیٹھ جاتے ہیں تو مسئلے حل ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

ہمارے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ڈپریشن کے مرض سے پریشان ہیں۔ گروڑوں روپے کی ادویات سے ڈپریشن ختم کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں اور یہ مرض ایسا ہے کہ خوفناک شکل اختیار کرتا جا رہا ہے اور اچھوت کی یماری لگتا ہے۔ ہمارے بابے جن کا میں ذکر کرتا ہوں وہ بھی اس Stress یا ڈپریشن کے مرض کا علاج ڈھونڈنے میں لگے ہوئے ہیں تاکہ لوگوں کو اس مسودی مرض سے نجات دلائی جائے۔ پرسوں ہی جب میں نے بابا جی کے سامنے اپنی یہ مشکل پیش کی تو انہوں نے کہا کہ کیا آپ ڈپریشن کے مرض کو اس بات پر مال کر سکتے ہیں کہ وہ دن میں ایک آدھ دفعہ ”بونگیاں“ مار لیا کرے۔ یعنی ایسی باتیں کریں جن کا مطلب اور معانی پچھہ نہ ہو۔ جب ہم بچپن میں گاؤں میں رہتے تھے اور جو ہڑکے کنارے جاتے تھے اور اس وقت میں چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا اس وقت بھی پاپ میوزک آج کل کے پاپ میوزک سے بہت تیز تھا اور ہم پاپ میوزک یا گانے کے انداز میں یہ تیز تیز گاتے تھے۔

”مور پاوے پیل“

سپ جاوے گھنڈنوں

بگلا بھگت چک لیاوے ڈنونوں

تے ڈاں دیاں لکھیاں نوں کون موزدا“

(مور ناچتا ہے جبکہ سانپ اپنے سوراخ یا گڑھ میں جاتا ہے۔ بگلامینڈک کو خوراک کے لیے اچک کر لے آتا ہے اور اس طرح سب اپنی فطرت پر قائم ہیں اور مینڈک کی قسمت کے لکھے کو کون ٹال سکتا ہے) ہم کو زمانے کے اس قدر تجدید اور سخت کر دیا ہے کہ ہم بوگی مارنے سے بھی قاصر ہیں۔ ہمیں اس قدر تشقی میں بنتا کر دیا ہے کہ ہم بوگی بھی نہیں مار سکتے باقی امور تو دور کی بات ہیں۔ آپ خود اندازہ لگا کر دیکھیں آپ کو چوہیں گھنٹوں میں کوئی وقت ایسا نہیں ملے گا جب آپ نے بوگی مارنے کی کوشش کی ہو۔ لطیفہ اور بات ہے۔ وہ باقاعدہ سوچ سمجھ کر موقع کی مناسبت سے سنایا جاتا ہے جبکہ بوگی کسی بھی وقت ماری جاسکتی ہے۔ روحانی ادویات اس وقت بنی شروع ہوتی ہیں جب آپ کے اندر مخصوصیت کا ایک ہلاکا سانقطع موجود ہوتا ہے۔ یہ عام ہی چیز ہے چاہے سوچ کر بیاز ورگا کرہی لائی جائے خوبصورت ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبان عقل

بلیکن کبھی کبھی اسے تہبا بھی چھوڑ دے

عقل کو رسیوں میں جکڑنا نہیں اچھا جب تک عقل کو تھوڑا آزاد کرنا نہیں سمجھیں گے۔ ہماری کیفیت رہی ہے جیسی گزشتہ 53 برسوں میں رہی ہے (یہ پروگرام سن 2000ء کو نشر ہوا تھا) صوفیاء کرام اور بزرگ کہتے ہیں کہ جب انسان آخرت میں پہنچ گا اور اس وقت ایک لمبی قطار لگی ہوتی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ وہاں موجود ہوں گے وہ آدمی سے کہے گا کہ ”اے بندے میں نے تجھے جو مخصوصیت دے کر دنیا میں بھیجا تھا وہ واپس دے دے اور جنت میں داخل ہو جا۔“

جس طرح گیٹ پاس ہوتے ہیں اللہ یہ بات ہر شخص سے پوچھ گا لیکن ہم کہیں گے کہ یا اللہ ہم نے تو ایم۔ اے ایل۔ بی یا پی۔ ایچ۔ ذی بڑی مشکل سے کیا ہے لیکن ہمارے پاس وہ مخصوصیت نہیں ہے لیکن خواتین و حضرات! روحانی دوامیں مخصوصیت وہ اجزائے ترکیبی یا انسخہ ہے جس کا گھونٹا لگے گا تو روحانی دوامیاں ہو گی اور اس تجھے میں بس تھوڑی سی مخصوصیت درکار ہے۔ اس دوامی کو بنانے کے لیے ڈبے یا تلیں وغیرہ نہیں چاہئیں بلکہ جب آپ روحانی دوامیں تو سب سے پہلے ایک تھیلی بنا لیں جس طرح جب ہم بدھے لوگ سفر کرتے ہیں تو دوامیں کی ایک تھیلی اپنے پاس رکھتے ہیں۔ بہت سی ہوائی کمپنیاں ایسی ہیں جن کے نکٹ پر لکھا ہوتا ہے کہ Check your passport your visa and their validity and your medicine bag.

آپ کو بھی ایک تھیلی تیار کرنی پڑے گی جس کے اندر تن نیلے منکے یا جو بھی آپ کی پسند کارنگ ہے اس کے منکے اور اعلیٰ درجے کی کوڈیاں ایک تھیلی کا کاپر۔ اگر تھیلی کا پرندہ ملے تو کالے لیکر کا پھل۔ کوئی چھوٹی سی آپ کی پسند کی تصویر۔ چھوٹے سائز میں سورۃ رحمٰن اور اس کے اندر ایک کم از کم 31 دانوں یا مٹکوں والی تسبیح ہوئی چاہیے۔ اس تھیلی میں ایک لیمن ڈر اپ ہونا چاہیے۔ اس تھیلی میں ایک سیٹی اور ایک پرانا بلب بھی رکھیں۔ پھر آپ لوٹ کر مخصوصیت کی طرف آئیں گے۔ یہ میری پسند کی چیزوں پر ترقی تھیلی ہے۔ آپ اپنی پسند پر ترقی چیزیں اپنی تھیلی میں رکھ سکتے ہیں۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے لیکن یہ تھیلی ہوئی ضرور چاہیے کیونکہ ہم مخصوصیت سے اتنے دور نکل گئے ہیں اور اس قدر بحمد اللہ ہو گئے ہیں اور چالاک ہو گئے ہیں کہ اللہ نے جو نعمت ہمیں دے کر پیدا کیا تھا اس سے آج تک فائدہ اٹھاہی نہیں سکے۔ خداوند تعالیٰ نے کہا تھا کہ ”میں تمہارا ذمہ دار ہوں رزق میں دوں گا۔ عزت و شہرت تمہیں میں دوں گا اور اولاد سے نوازوں گا“، لیکن ہم کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو خود پرے عقائد آدمی ہیں۔ یہ ساری چیزیں ہم اپنی عقائد سے پاسکتے ہیں اور اسی زعم میں تسبیح کی زندگی میں بدلتا ہیں۔ میرا چھوٹا پوتا اولیس سکول میں پڑھتا ہے۔ وہ ایک دن سکول سے آیا تو پڑا پریشان تھا اور گھبرایا ہوا بھی تھا۔ اس نے اپنی ماں سے کہا کہ ”ماں آج سکول میں کھلیتے ہوئے میری قمیض کا بٹن ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے اپنا بٹن تو جلاش کر لیا لیکن مجھے وہ دھاگہ نہیں ملا۔ جس سے یہ لگا ہوا تھا۔“

اب آپ اندازہ کریں کہ ہم اپنے بچوں کو کس انتہاد رجے کی اور پریشان کن ذمہ داری سکھا

رہے ہیں۔ میں نے اسے گود میں اٹھالیا اور کہا کہ بینا بن جب گرتا ہے تو اس کے ساتھ دھاگہ نہیں گرتا۔ اس کی ماں ہنپنے لگی کہ دیکھو کتنا بے وقوف ہے۔ میں نے کہا نہیں۔ یہ کتنا بے وقوف نہیں بلکہ کتنا معصوم ہے۔ ہم کتنا بھی بچوں کو سکھالیں لیکن ان سے قدرتی معصومیت تو جاتے جاتے ہی جائے گی۔ خواتین و حضرات اس معصومیت کو نہیں واپس لانا ہے۔ جب تک نہیں ملے گی ہم اپنا علاج نہیں کر پا سیں گے۔ آپ نے جو حلیل بنائی ہے اسے آپ نے ہفتے میں دو تین مرتبہ کھول کر بھی دیکھنا ہے۔ اگر اسے نہیں دیکھیں گے تو آپ کی مشکلات دور نہیں ہوں گی۔ یہ معصومیت کی تھیلی آپ کو سکون فراہم کرے گی۔ آپ کی معصومیت لوٹائے گی۔ اوپنی منزل تک پہنچنے کے لیے ری در کار ہوتی ہے۔ صرف پیدل چل کر ماڈٹ ایورست سرنہیں ہو سکتا۔ میرے خالہ زاد بھائی کی بیٹی جو میری بھتیجی بھی لگتی ہے اس کی شادی تھی اور خصتی کے وقت ہماری وہ بیٹی سب سے مل رہی تھی اور وہ اپنے باپ سے بھی بڑی محبت سے جھمی ڈال کے ملی۔ پھر اس نے اپنے پرس سے کچھ نکال لیا اور وہ نکالی ہوئی پڑیاں اپنے والد کو دے دی۔ اس کے بعد جب وہ مجھے ملنے لگی تو میں نے کہا بینا وہ تو نے پرس سے نکال کر اپنے باپ کو کیا دیا ہے۔

وہ کہنے لگی تایا کچھ نہیں تھا۔

میں نے کہا کہ میری آنکھوں نے کچھ دیکھا ہے۔

وہ کہنے لگی کہ تایا جان میں نے ابو کا کریڈٹ کارڈ انہیں واپس کیا تھا کیونکہ اب میں نے ایک آنو اور پکڑ لیا ہے۔ اس کے پاس بھی کریڈٹ کارڈ ہو گا۔ مجھے اس کا وہ انداز اور معصومیت بڑی پسند آئی۔ اگر میرے جیسا لاپٹپ ہوتا تو کہتا کہ ایک یہ بھی رکھ لیتا ہوں ایک دوسرا ہو گا۔ ابو نے کیا کہتا ہے۔ میں اپنے اور آپ کے لیے یہ جو یونیکروں گا کہ ذپریشن کے مرض کی کسی اور طرح سے گردن نہیں نالی جاسکتی ہے۔ سوائے اس کے کہ آپ اس کی آنکھ میں آنکھ ڈال کے دو عدد یونیکیاں نہ ماریں۔ ان بوئیکیوں سے ذپریشن ڈور بھاگتا ہے۔ سخیدگی کو اگر گلے کا ہار بنا میں گے تو جان نہیں چھوٹے گی۔ ہم اس آرزو کے ساتھ کہ ساری دنیا اور بالخصوص میرے ملک کے لوگوں کو اللہ آسمانیاں عطا فرمائے اور آسمانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

آٹوگراف

میں اب جب بھی اپنے بالا خانے کی کھڑکی کھول کر دیکھتا ہوں تو میرے سامنے ایک بھی گلی ہوتی ہے جو بالکل سنان اور دیران ہوتی ہے۔ جب میں اسے دور تک دیکھتا ہوں تو لے دے کے ایک ہی خیال میرے ذہن میں رہتا ہے کہ یہاں وہ شخص رہا۔ اسے جس نے 1982ء میں میرے ساتھ یہ زیادتی کی تھی کہ اس کے سامنے وہ شخص رہا۔ اس پر یہ ہے جو 1971ء میں میرے ساتھ قطع تعلق کر کے اپنے گھر بیٹھ گیا اور اس کے بعد سے ہم نے ایک دوسرے سے کوئی بات تک نہیں کی۔ سارے محلے میں سارے رشتے کچھ اسی طرح کے ہو چکے ہیں اور باوصف اس کے کہ کہیں کہیں ہم ایک دوسرے سے سلام و دعا بھی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے احوال بھی دریافت کرتے ہیں لیکن اندر سے ہم بالکل کٹ چکے ہیں اور ہمارے اندر جوانسانی رشتے تھے وہ بہت دور چلے گئے ہیں۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ کچھ لوگوں کو فیل ہونے کا بڑا شوق ہوتا ہے اور وہ ساری زندگی Failure میں گزار دیتے ہیں۔ ان کا تعلق ہی ناکای سے ہوتا ہے۔ انہیں اندر یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں میں کامیاب نہ ہو جاؤ۔ خدا خواستہ ایسا نہ ہو کہ میں کامیاب زندگی بس کرنے لگوں اور ایک اچھا Relaxed اور پر سکون شخص بن کر اس معاشرے کو کچھ عطا کر کے پھر یہاں سے جاؤ۔ ان لوگوں میں میں بھی شامل ہوں۔ یہ سارے الزام اور Blames جو مجھ کو میری زندگی میں لوگوں کی طرف سے ملتے رہے ہیں میں انہیں اکھا کر کے گلدستے کی طرح باندھ کے ان کی Catalog کر کے اپنی کالپی یا ذہنے کے اندر ایسے ہی محفوظ کرتا رہتا ہوں جیسے لڑکیاں اپنے الہم بھاتی ہیں۔ گواہ ان کے الجموں میں بھی پہلے ہی تصویریں نہیں رہی ہیں بلکہ ان کے دل کے الجموں میں بھی وہ سارے کے سارے دکھائیے ہی ہیں کہ فلاں شخص نے مجھے طعنہ دیا اور فلاں شخص نے مجھے فلاں کہا اور میں نے اسے نوٹ کر کے دل کی ڈاڑی میں درج کر لیا۔ یہ چیز کچھ اس شدت کے ساتھ عام ہو گئی ہے کہ اس کا نکاح Psychiatrist اور سائنسی سمجھنے کے ماہر افراد اور ڈاکٹروں کے لیے اور ان کے ساتھ ساتھ پیروں فقیروں کے لیے بھی مشکل ہو گیا ہے۔

جب ہم ایسے مسائل لے کر جگہ بے جگہ مارے مارے پھرتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں کنکھجھوڑے کی طرح چھٹا اور جھا جھا خیال کیسے نکلا جائے اور اس سے کیسے چھٹکارہ حاصل کیا جائے۔ اس حوالے سے ہمارے بابے ایک ہی بات کرتے ہیں کہ اس کے لیے مراثی کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ جب تک آپ شام کے وقت مغرب کے بعد کسی تہائی کے ماحول میں اپنی ذات کا مطالعہ نہیں کریں گے تو تک آپ پر یہ حقیقت آشکار نہیں ہو گی کہ میرا رویہ ناکامی کی طرف کیوں بڑھ رہا ہے۔ میں اس کی طرف کیوں رجوع کر رہا ہوں حالانکہ مجھے تو زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور میں ایک کامیاب زندگی کا پیغام لے کر آپ کے پاس آیا ہوں لیکن پریشانی کا معاملہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ذات کا مطالعہ نہیں کر سکتا اور ساری زندگی دوسروں کے ساتھ چھکڑتا چلا جاتا ہے حالانکہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک اعلیٰ درجے کا کپیوٹر دیا ہوا ہے جو اس کی اپنی ذات ہے اور وہ اس کپیوٹر کو آپریٹ بھی کر سکتا ہے اور سکرین کے اوپر ساری تصویر آ سکتی ہے کہ خطا اور خامی کس کی ہے لیکن ہم اس کپیوٹر کو جو ہمارے اندر فٹ ہے اسے Operate کرنا نہیں جانتے ہیں۔ جانتے اس لیے نہیں ہیں کہ کسی نے ہمیں تلاوت وجود کافی نہیں سمجھایا۔ آپ کا وجود بھی کتاب ہی کی مانند ہے۔ اس کی تلاوت کی بغیر آپ پر راز اور حقائق نہیں کھلیں گے اور آپ اس کے بر عکس سیدھے جاؤ اس سمت میں چلتے جاتے ہیں کہ گویا اس شخص نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا تھا تو میں اب اس کے ساتھ یہ سلوک کروں گا جبکہ دونوں کا سلوک اپنے اپنے مقام پر اس بات کا مقاضی ہوتا ہے کہ اس بات کو جانچا اور چھانٹا جائے کہ کہاں میری غلطی ہے اور کہاں اس کی غلطی ہے اور جہاں پر اپنی غلطی نکلے وہاں بھی میں اپنی غلطی کا سہارا لے کر اور خود کو ہی غلط قرار دے کر اس کی طرف رجوع کروں۔

جب ہم لاہور من آباد میں رہتے تھے اس وقت سن آباد ایک چھوٹی سی بستی ہوتا تھا اب تو ماشاء اللہ بہت بڑی ہو گئی ہے۔ وہاں میرے پچھا کا سامنے والے گھر سے بڑا چھکڑا تھا۔ اس گھر میں ایک صاحب اور میرے پچھا کٹھے اسی مسجد نماز پڑھنے جاتے تھے لیکن وہ ایک دوسرے سے بولتے نہیں تھے۔ میں پچھا سے کئی بار کہتا تھا کہ آپ بزرگ ہیں ان سے کوئی کلام کریں تو وہ کہتے یا راغب ہے یا جو تم نے اس کی شکل دیکھی ہے وہ ہے ہی منہوش اور اس کا گھردیکھو۔ بالکل ٹیڑھا ٹیڑھا سا ہے۔ جب اس کا گھر ہی سیدھا نہیں ہے تو یہ کیسے ٹھیک شخص ہو گا۔

میں ان سے کہتا تھا کہ نہیں پچھا آپ کی طبیعت میں غصہ ہے اس لیے آپ کو ایسا لگتا ہے۔ خاتمین و حضرات آپ بھی اپنی ذات پر نظر دوزا کر دیکھیں۔ آپ کو بھی اس طرح کے ہزار قصے میں گے جو آپ کی ذات سے وابستہ ہوں گے۔

ایک روز وہ صاحب جن سے ہمارے پچھا کی لڑائی تھی وہ ایک تحریر لے کر پچھا کے پاس

آگئے۔ وہ عربی کی تحریر تھی۔ انہوں نے پچھا سے جو کچھ بچھے عربی جانتے تھے ان سے کہا کہ خان صاحب آپ ذرا دیکھ لیں کہ یہ کیا لکھا ہے۔ پچھا نے عجیب نگواری سے ”پھوں، پھوں“ کر کے وہ کاغذ ان صاحب کے ہاتھ سے لیا اور دیکھ کر کہنے لگا کہ مجھے تو اس میں ایسی کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ اس صاحب نے پھر کہا کہ خان صاحب میں آپ سے ”اس“ فقرے کے معانی پوچھنا چاہتا ہوں۔ پچھا کہنے لگا کہ میرے پاس اس وقت عینک نہیں ہے، نہیں تو میں آپ کو ضرور بتا دیتا۔ تب ان صاحب نے اپنی عینک آگے بڑھا دی (ہم بدھوں کی عینک کا نمبر تقریباً ایک ہی ہوتا ہے)

پچھا وہ عینک لگا کر پڑھنے لگے اور سراخھا کر ان صاحب کو دیکھا اور مخاطب کر کے کہنے لگے کہ شیخ صاحب آپ کا گھر بہت خوبصورت ہے، تو انہوں نے کہا تھی آپ کی بڑی محربانی۔ پچھا نے پھر اس سے کہا کہ اب تو آپ کا چہرہ بھی اچھا ہو گیا تو انہوں نے (شیخ صاحب) کہا کہ ہاں جی میں دوسال پیار رہا ہوں۔ میں وہاں بیٹھا تھا۔ میں نے کہا پچھا جی یہ ساری شیخ صاحب کی عینک کی برکت ہے۔ جب آپ نے ان کی عینک پہنی ہے تو آپ کو ان کا گھر بہت پیار لگنے لگا ہے اور ان کی شخصیت بھی اچھی لگنے لگی ہے۔ آپ نے بھی ان کو ان کی عینک سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس طرح ہم نے اپنے ساتھیوں کو بھی ان کی عینک اور زاویے سے دیکھا ہی نہیں۔ پھر ہم ان کی مشکلات کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں خاص طور پر لوگوں کے درمیان کدو رتیں پکجھ اس انداز میں بڑھ رہی ہیں کہ وہ حقیقت میں نفرتوں یا کدو روتوں کا درجہ رکھتی نہیں ہیں۔ بس ایک بات دل میں بیٹھ گئی اور ہم اس پر ایمان لے آئے اور اسی لکیر کو پیٹھنا شروع کر دیا۔ میں خاص طور پر بچھوں میں یہ بات آج گل بڑی نوٹ کرتا ہوں کہ ان میں یہ بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اور ان کے دل میں یہ بات Feed ہو گئی ہے کہ ساس تو ایک واہیات سی چیز ہوتی ہے۔ یہ تو اچھی ہوتی ہی نہیں ہے اور جب یہ تہہ کر لیا جائے کہ بس ساس نے تو ایسے ہی ہونا ہے اب میں نے تو ایم اے کر رکھا ہے۔ میں Educated ہوں، میں غلط ہو ہی نہیں سکتا یا سکتی۔ اگر ایک پڑھا لکھا شخص یا لڑکی یہ سوچ بھی کہ میں مثال کے طور پر اپنی ساس کو دوسرے زاویے سے ڈیل کر کے ما جول بہتر بناسکتا ہوں لیکن یہ ہوتا اور وہ ذگریاں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں جیسے جاہل ساس کرتی ہے اس کو دیکھا ہی جواب ملتا ہے۔

ایک بار جب میری نواسی کے لیے رشتے کی بات چلی تو وہ مجھ سے کہنے لگی کہ نانا جب لڑکا دیکھنے جائیں تو آپ ساتھ ضرور جائیں ایک تو آپ میرے خفیہ ابجنت ہیں اور دوسرا مجھے ابوامی اور بہنوں پر اعتبار نہیں ہے اور آپ صرف یہ بات ہی نوٹ کرنا کہ میرا جو ہونے والا شوہر ہے یا جس سے میری بات طے پار ہی ہے اس ”بدجنت“ کی کتنی بہنیں ہیں۔ آپ مجھے میری مندوں کے بارے میں بتاتا۔ یعنی ابھی کوئی بات نہیں ہوئی اس نے کسی کوئی بہنیں دیکھا لیکن تعداد کے اعتبار سے ہی وہ بچاری اتنی

پریشان ہو رہی تھی اور وہ کہہ رہی تھی کہ اگر وہ زیادہ ہوئیں تو میں نے وہاں شادی نہیں کرنی۔ میں نے اسے آکر بتایا کہ بھی وہ پانچ ہیں۔ تین کی شادی ہو گئی اور ابھی دو کی نہیں ہوئی تو اس نے کہا ”دفع دور میں نے وہاں شادی نہیں کرنی۔“

آپ اکثر دیکھتے ہوں گے کہ یہ جو مسلکی اور دینی بھلکے ہوتے ہیں، فسادات ہوتے ہیں اس میں مسلک کا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ کوئی بھی مسلم بھلکے کا درس یا اس کی ترغیب نہیں دیتا لیکن چونکہ الزام دھر دیا جاتا ہے اس لیے اس الزام کو سہارا یوں مشکل ہو جاتا ہے کہ الزام دھرنے والا بھی اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتا کہ وہ جو یہ الزام دھر رہا ہے شاید وہ خود بھی اسی الزام کا مارا ہوا ہے اور وہی خرابی اس میں بھی موجود ہے۔ بہت دیر کی بات ہے میری ابھی شادی نہیں ہوئی تھی اور میں نو جوان تھا۔ ایک دفعہ ہم لاہور سے براستہ بھی تی روڈ پنڈی جارہے تھے۔ دو پھر کوہم نے گھرات میں کھانا وانا کھایا۔ ہم جب کھانا کھا کے چل پڑے تو تھوڑی دور جا کر میری والدہ کو خیال آیا کہ میری عینک تو وہیں رہ گئی ہے اور انہوں نے ”اقبال اقبال“ کہا (وہ میرے بڑے بھائی کا نام ہے) ابا بھی نے کہا کہ سب عورتوں کا بھی حال ہے۔ ان کو کبھی وقت پر کوئی چیز یاد نہیں رہتی۔ انہیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ سفر کر رہی ہیں اور وہ صیان رکھنا ہے۔ بھائی نے کہا کوئی بات نہیں ہم راؤ نہ رُن لیتے ہیں اور عینک لے لیتے ہیں۔ ابھی کون سازیادہ دور گے یہں البشت ہم دوبارہ وہاں پہنچ گئے جہاں سے کھانا کھایا تھا۔ جب ہم عینک لے کر چلنے لگے تو ابا بھی نے کہا کہ لو اگر اب ہم یہاں آہی گئے ہیں تو میں اپنا مظفر بھی دیکھ لوں جو میں یہاں غسل خانے میں بھول آیا تھا۔ اب وہ اماں کی سرزنش تو کر رہے تھے لیکن انہیں اپنی غلطی نظر نہیں آ رہی تھی۔

خواتین و حضرات! انسانی ذندگی میں ہم اکثر ایسی حرکتیں ضرور کر دیتے ہیں اور ہمارے اندر وہ وسعت قلبی پیدا نہیں ہوتی جو ہماری تربیت کا ایک خاصا ہے۔ یہ تو انفرادی مشکلات ہیں لیکن بعض اوقات خاندانوں کے اندر بھی Blame کی کیفیت چلتی چلی جاتی ہے۔ آپ کا کسی اس خاندان کے ساتھ تعلق نہیں ہوتا جس سے آپ کے وادا لڑے تھے۔ نئی نسلیں آجاتی ہیں لیکن آپ کو حکم دے دیا جاتا ہے کہ خود اس خاندان سے بات نہیں کرنی اور وہ کام چلا آتا ہے۔ بھی کیوں بات نہیں کرنی۔ وہ ماضی کی بات تھی گئی آئی ہوئی۔ آپ اپنی سیاسی پارٹیوں میں دیکھیں ان میں کسی داشت اور منطقی بات پر کوئی اختلاف نہیں ہوتا لیکن کہا جاتا ہے کہ نہیں جی بس وہ اس سائیڈ پر اور میں اس سائیڈ پر ہوں اور وہ پارٹی ہی پہنچ پہنچ کے پنج میں سے کچھ اور نکلتی آتی ہے اور اسی وجہ سے ہماری جمہوریت کا اونٹ کسی کروٹ بیٹھتا نہیں ہے اور ہم اس Tradition کو لے کر بس چلے آتے ہیں۔

میں نے ایک قصہ ایسا بھی ساجب میں حضرت مائل جو بڑے صوفی بزرگ تھے۔ وہ مغرب

کی نماز ادا کرنے کے بعد ذکر جہری کیا کرتے۔ جب وہ اوپنی آواز میں ذکر کرتے تھے تو ان کی بیلی جو ذیرے پر رہتی تھی وہ آئے صفوں کو کھدیرہ تاشروع کر دیتی تھی اور شور مچاتی تھی۔ آپ نے حکم دیا کہ جب ذکر شروع ہو تو اس بیلی کو رسی ڈال کے باندھے دیا جائے کیونکہ یہ شراتیں کرتی ہے۔ ان کے خاد میں نماز کے فوراً بعد بیلی کو رسی ڈال کے ایک کھوٹی کے ساتھ باندھ دیتے تھے اور ذکر چلتا رہتا تھا۔ بعد ازاں اس بیلی کو آزاد کر دیا جاتا تھا۔ جب حضرت مائل فوت ہو گئے اور ان کی جگہ جو بھی گدی نشین یا خلیفہ ہوئے انہوں نے بھی ذکر کرنا شروع کر دیا اور بیلی کو بدستور باندھا جاتا رہا۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ بیلی فوت ہو گئی۔ ذیرے پر بھی یہ صلاح و مشورہ ہوا کہ ایک نئی بیلی خریدی جائے اور ایک نئی رسی لی جائے اور اسے بھی عین ذکر کے وقت باندھ دیا جائے چنانچہ ایک نئی بیلی اور رسی خریدی گئی اور اسے بھی اس طرح سے باندھا جانے لگا۔ پچھلی بیلی پر جوان زام تھا وہ نئی بیلی پر بھی اسی طرح عائد کر دیا گیا حالانکہ پہلے والی بیلی مر کھپ پچھلی تھی۔ تاریخ ان لکھتے ہیں کہ اس آرڈر یا اس انداز کا جو حضرت مائل نے شروع کیا تھا اس میں یہ شرط ہے کہ ذکر جہری اس وقت شروع کیا جائے جب کہ ایک بیلی موجود ہو اور اس کو اسی سے باندھا جائے۔ یہ انسانی زندگی میں بھی ایسی ہی رسی سے باندھی ہوئی ایک بیلی ہے جو ہماری معاشرتی زندگی میں بھی داخل ہو چکی ہے اور وہ رسم چلتی چلتی آتی ہے اور ہم اس کو درست کو ختم کرنے کی بجائے جو آپ کی ایک کھڑکی کھولنے سے شروع ہوتی ہے آپ طرح طرح کی اور کھڑکیاں کھولتے چلتے جاتے ہیں اسی لیے میں عرض کیا کرتا ہوں کہ یہ بابوں کے ذیرے ہوتے تھے جہاں بیٹھ کر ایسی ہی مشکلوں اور چیزوں کے علاج کرتے تھے۔ نہ تو وہ ذا کٹر ہوتے تھے نہ وہ کوئی بڑے عالم دین ہوتے تھے نہ ہی بڑے ناصح ہوتے تھے وہ کچھ ایسی محبت کی پڑیا بندے کو عطا کرتے تھے جو نفیاتی مشکلات اور ذا پریشن کا کاث کرتی تھی اور اس سے انسان کی طبیعت اور روح سے بوجھ ختم ہو جاتا تھا۔ آپ سارے صوفیاء کی تاریخ دیکھ کر بتائیں کہ انہوں نے لوگوں کو کس کس طرح سے نہیں کیا اور راحت دی۔ ان کے علاج میں مذہب کی بھی تمیز نہیں ہوتی تھی۔ وہ تمام بندوں کو پانے قریب لے آتے تھے۔ میں سوچتا ہوں کہ بندے کی اکثری آرزو رہتی ہے اور میری بھی ایسی یہ تمنا ہوتی ہے اور میں نوجوانوں کی طرح اس عمر میں اپنی آٹو گراف بک لے کر گھومتا ہوں اور ایسے لوگوں کے آٹو گراف حاصل کرنا چاہتا ہوں جو آسائش اور آسانی کی زندگی بس کر رہے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگوں کو ادا کاروں یا گانے والوں کے آٹو گراف لینے کا شوق ہوتا ہے۔ میں ایسے لوگوں کے آٹو گراف لینے کا خواہش مند ہوں جن پر دنیا کے جنمیلوں کا شغف یا بوجھ نہیں ہے۔ میرے پاس جتنے بھی کاغذ ہیں ان میں دستخط توکم لوگوں کے ہیں جبکہ انگوٹھے زیادہ لوگوں نے لگائے ہیں۔ کسی لکڑہارے کا انگوٹھا ہے، کسی ترکھان کا ہے، کسی قصائی کا ہے اور دیگر سخت سخت پیشے والوں کے انگوٹھے بھی ہیں۔ ابھی تازہ تازہ میں نے جو انگوٹھا لگوایا ہے وہ میں نے

لاہور سے قصور کے راستے کے درمیان میں آنے والے چھوٹے سے شہر یا منڈی مصطفیٰ آباد لیانی سے لگوایا۔ میرے بھلے بیٹے کو پرندوں کا بڑا شوق ہے۔ اس نے گھر میں پرندوں کے دانا کھانے کے ایسے ذبے لگا رکھے ہیں جن میں Automatically دانے ایک ایک کر کے رہتے رہتے ہیں اور پرندے شوق سے آ کے کھاتے رہتے ہیں۔ جب ہم قصور سے لاہور آ رہے تھے تو اس نے لیانی میں ایک دکان دیکھی جس میں پانچ پانچ کلو کے قطیلے پڑے ہوئے تھے جن میں باجرہ اور ٹوٹا چاول وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ابو یہ پرندوں کے لیے بہت اچھا دانا ہے۔ میرا بیٹا اس دکان سے چاول اور باجرہ لینے گیا تو اس نے پوچھا کہ آپ کو یہ دانے کس مقصد کے لیے چاہیں تو میرے بیٹے نے اسے بتایا کہ پرندوں کو ڈالنے کے لیے۔ اس پر اس دکاندار نے کہا کہ آپ کنگنی بھی ضرور لیجیے کیونکہ کچھ خوش الحان پرندے ایسے بھی ہوتے ہیں جو باجری نہیں کھا سکتے بلکہ کنگنی کھاتے ہیں۔ وہ بھی پھر کنگنی کھانے آپ کے پاس آیا کریں گے۔ اس نے کہا کہ اسم اللہ کنگنی ضرور دے دیں اور اس رہنمائی کا میں آپ کا عمر بھر شکر گزار ہوں گا۔ وہ چیزیں لے کر جب اس نے پرس نکالنے کی کوشش کی تو نہ ملا۔ جیبوں، گاڑی آس پاس ہر جگہ دیکھا لیں وہ نہ مطابق وہ تینوں تھیلے گاڑی سے واپس اٹھا کر دکاندار کے پاس گیا اور کہا کہ میں معافی چاہتا ہوں میں تو اپنا بٹوہ ہی بھول گیا ہوں۔

اس دکاندار نے کہا کہ ”صاحب آپ کمال کرتے ہیں یہ لے جائیں پیے آ جائیں گے۔“

میرے بیٹے نے کہا کہ آپ تو مجھے جانتے نہیں ہیں!

وہ دکاندار بولا کر میں تو آپ کو جانتا ہوں۔

وہ کسیے میرے بیٹے نے کہا۔

دکاندار گویا ہوا ”صاحب جو شخص پرندوں کو دانا ڈالتا ہے وہ بے ایمان نہیں ہو سکتا۔“

میں نے جھٹ سے اپنی آٹو گراف بک نکالی اور اس کا انگوٹھا لگوایا۔ ایسے ہی میرے پاس کئی لوگوں کے دستخط اور انگوٹھے موجود ہیں۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور ان لوگوں کی طرح جن کے میرے پاس آٹو گراف موجود ہیں۔ ان کی طرح آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”چاہیے“ کاروگ

میں آپ کو اکثر ایسی باتیں سمجھی بتاتا رہتا ہوں جو آپ کے مطالعے، مشاہدے یا نظر سے کم ہی گزری ہوں گی۔ ایک زمانے میں تو ہمارے ہاں بہت سی درگاہیں اور ”زاویہ“ ہوتے تھے جہاں بزرگ بیٹھ کر اپنے طرز کی تعلیم دیتے تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ سلسلہ کم ہونے لگا۔ یہ کمی کس وجہ سے ہوئی میں ان حوالے سے آپ کی خدمت میں درست طور پر عرض نہیں کر سکتا۔ وہ درگاہیں، زاویے اور وہ بزرگ یوں مفید تھے کہ وہ اپنی تمام تر کوتا ہیوں اور کیوں کے باوصاف لوگوں کو ایسی تسلی اور تشفی عطا کرتے تھے جو آج کے دور کا مہنگے سے مہنگا Psychiatrist یا Psychoanalyst ہے۔ خدا جانے ان کے پاس ایسا کون سا علم ہوتا تھا۔ ان کا کندھے پر ہاتھ رکھ دینا یا تشفی کے دو الفاظ کہہ دینے سے بڑے سے بڑا بوجھ آسانی سے ہٹ جاتا تھا۔ ہمارے بابا جی جن کے پاس ہم لا ہو رہیں جایا کرتے تھے ان کی کمی عجیب باتیں ایسی ہوتی تھیں جو ہماری دانست سے نکلا جاتی تھیں اور وہ پورے طور پر ہماری گرفت میں نہیں آتی تھیں کیونکہ ہم ایک اور طرح کا علم پڑھتے ہوئے تھے۔ ہمارا علم سکولوں کا لجوں اور ولائیت کا تھا اور اس نصاب میں وہ بابوں کی باتیں ہوتی نہیں تھیں۔ ایک روز انہوں نے فرمایا کہ دنیا کی سب سے بڑی تکلیف وہ اور گندی بیماری ”چاہیے کاروگ“ ہے۔ ان کی یہ بات ہماری سمجھی میں نہیں آتی تھی کہ آخر ”چاہیے کاروگ“ کیا ہے۔ یہ بات یہاں سے چلی جب میں نے ڈیرے کے غسل خانے کے اس دروازے کو ٹھیک کر لینا چاہیے کی بات کی جس کا ایک دروازہ قبضہ ڈھیلا ہونے کے باعث ایک طرف جھکا ہوا تھا۔ میری اس بات کے جواب میں بابا جی نے فرمایا کہ چاہیے کا ایک روگ ہوتا ہے جو کمزور قوموں کو لگ جاتا ہے اور وہ ہمیشہ یہی ذکر کرتے رہتے ہیں کہ ”یہ ہونا چاہیے“، ”وہ ہونا چاہیے۔“ ہمارے ایک دوست صدر میر تھے جو اب فوت ہو چکے ہیں وہ انگریزی کے Columnist Should Syndrom کی بیماری لکھا تھے۔ انہوں نے بابا جی سے یہ بات سن کر ایک کالم Should یعنی کی بیماری کھانا۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ اخباروں میں چھپتا ہے کہ ہمیں اللہ کی رحیمی کو مضمونی سے تھامے رکھنا

چاہیے۔ ہمارے کئی لیڈر بھی تقریروں میں کہتے ہیں کہ ہمیں ایسا کرنا چاہیے یا ویسا کرنا چاہیے۔ ہمیں آبادی میں کی کرنی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔

خواتین و حضرات اس طرح کی باتیں چاہیے کے چکر میں آ کر ہی ختم ہو جاتی ہیں اور ان کا عملی اور تعییری پھلو سامنے نہیں آتا۔ جب میں نے عسل خانے کے دروازے کی بات کی تو انہوں نے کہا کہ ایسے نہیں بولا کرتے اور ڈیریوں پر ایسا نہیں کہا کرتے ہیں۔ بس دروازوں کو اپنی مرضی کے مطابق صحیک کر دیا کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ چاہے آپ غلط کرتے لیکن چاہیے کہنا درست نہیں۔

میں نے کہا بابا جی اس میں آخر اتنی کیا خرابی ہے۔ کہنے لگے کہ چاہیے کا لفظ سارے زمان و مکان پر حاوی ہے۔ اس لیے برا ہے۔ اس کا نہ مااضی سے تعلق ظاہر ہوتا ہے نہ حال یا مستقبل کے ساتھ تعلق نہتا ہے بلکہ یہ ہر جگہ کھس جاتا ہے۔ اس لیے اس کا لیوں دیمک کا ہے اور یہ دیمک کی طرح سارے ارادوں کو چاٹ جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ وہ کیسے۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب آپ اکثر مااضی کو استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمیں مشرقتی پاکستان کے ساتھ ایسا روایہ اختیار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہمیں بھلی بنانے کے لیے ایک اور ڈیم بانا چاہیے تھا۔ یہ ساری باتیں مااضی کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں جن کو ہم بدلتیں سکتے پھر یہی بدجنت چاہیے حال کے ساتھ آ جاتا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہمیں زیادہ انگلش میڈیم سکول بنادیئے چاہیں، ہمیں جدیدیت اختیار کرنا چاہیے اس طرح کی بے شمار باتیں ہیں اور بھی بہت سے چاہیے ہیں۔ پھر یہ لفظ چاہیے مستقبل کی طرف چلا جاتا ہے اور یہ لفظ حال مااضی اور مستقبل کے درمیان گھومتار بتا ہے اور کسی بات کو تقویت عطا نہیں کرتا اور بد قسمتی سے جو کمزور قویں ہوتی ہیں وہ ”چاہیے“ ہی کا ذکر کرتی رہتی ہیں اور وہ صوبوں کے درمیان مفاہمت پیدا کرنی چاہیے، نیک بن جانا چاہیے پر اصرار کرتی رہتی ہیں اور ”چاہیے“ استعمال کر کے آرام سے اپنا فرض ادا کر کے سوئی رہتی ہیں اور خود کو بری الذمہ خیال کرتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ جی یہ تو روحاںی قسم کا ذریعہ ہے بیہاں پر تو دینی باتیں ہوتی ہیں لیکن آپ نے جوبات کی ہے یہ تو ”ماوزے تنگ“ کی بات سے بہت ملتی ہے۔ 1966ء میں مجھے ایک Girl Silly School کی طرح ماوزے تنگ (چینی رہنماء) کو دیکھنے کا بڑا شوق تھا حالانکہ میں اس وقت بڑی عمر کا تھا۔ میں ان دونوں سفر کرتا ہوا جاننا پہنچا۔ مجھے وہاں چین و اے لے کہیں کہ جناب ماوزے تنگ کو تو کوئی بھی نہیں مل سکتا۔ میں نے کہا کہ میں نے بس یہاں بیٹھنے رہنا ہے اور انہیں مل کر جانا ہے۔ آپ نے وہ فقیری دیکھی ہو گی جو آپ کے پیے دینے سے انکار کے باوجود موڑ کے ساتھ لگ کر بیٹھی رہتی ہے۔ میں بھی چین والوں سے ایسے ہی کرتا رہا اور وہ بڑے زیج ہوئے۔ ان دونوں ان کا Cultural Revolution چل رہا تھا اور انہوں نے مجھے سے جان چھڑانے کے لیے وعدہ کیا آپ کو چار منٹ کے لیے ملادیں گے۔ میں بڑا خوش ہوا کہ چار منٹ

نصیب ہو گئے لیکن انجمانی ماؤزے نگل کی یہ بڑی مہربانی تھی کہ وہ مجھے گیارہ منٹ کے لیے ملے۔ اس ملاقات میں بھی یہ ”چاہیے“ کا ذکر آیا لیکن وہ پچھا اور انداز میں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ نے دیکھتے دیکھتے اتنی ترقی کر لی ہے اور ہم تو آپ سے ایک سال پہلے آزاد ہوئے ہیں لیکن مشکلات سے نہیں نکل سکے۔ آخر آپ نے کیا کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ جب ہمارے ذہن میں کوئی پراجیکٹ یا خیال آتا ہے یا یہ ذہن میں آتا ہے کہ ”ہمیں یہ کرنا چاہیے“ تو اس خیال کے فوراً بعد ہم اس فریم درک کو لانگ مارچ میں شامل کر دیتے ہیں۔ اس کا ذکر بند کر دیتے ہیں اور اسے مکمل کرنے کے فریم درک میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ان دونوں چیزوں میں ایک ”خوفناک چاہیے“ آیا ہوا تھا۔ ماؤزے نگل کہہ رہا تھا کہ پانچ ہزار سال قبل ہمارے شیعی جوگی جو ”آ کو پنچر“ کا طریقہ علاج اختیار کرتے تھے اسے ڈھونڈنا چاہیے جبکہ اس وقت کے ماڑوں ڈاکٹران کی اس بات سے ناراض تھے کہ یہ کیا فضول بات کر رہے ہیں۔ وہ شیعی تو نالائق لوگ تھے۔ سو نیاں لگاتے تھے تکلیف دیتے تھے لیکن ماؤزے نگل نے کہا کہ چلو اس طریقہ کو لانگ مارچ میں لے آتے ہیں اور ڈھونڈتے ہیں۔ جب میں نے ذیرے پر یہ بات کی تو ہمارے بابا جی نے بھی بتایا کہ ہمارے ہاں بھی ایک رسم تھی جس میں لوگ فسد کھلواتے تھے جس میں جسم کے مختلف حصوں پر کٹ دے کر فساد والا یا خراب خون نکال دیا جاتا تھا اور مریض کو آرام آ جاتا تھا۔ حمزہ اسد خان غالب بھی بڑی باقاعدگی سے فسد کھلواتے تھے۔ اس زمانے کے فسد کھولنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ کتنا کٹ دینا ہے اور کتنا خون بہانا ہے اور کب اسے بند کر دینا ہے۔ بہار کے موسم میں یہ علاج کیا جاتا تھا اور مرد گورنیں دونوں فسد کھلواتے تھے۔ تب بلڈ پریشر نامی مرض کا کوئی نام بھی نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ فسد کے ذریعے خون کے دباو کو نارمل رکھتے تھے۔ جب میں نے ماؤزے نگل کی آ کو پنچر والی بات کی توبابا جی نے کہا کہ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں آپ فسد کھولنے والے تلاش کریں۔

خواتین و حضرات! آپ نے سنا ہو گا کہ لوگ فساد والا خون ختم کرنے کے لیے جو نکیں بھی لگواتے تھے۔ اب امریکہ میں بھی جو نکیں لگنا شروع ہو گئی ہیں۔ اب چونکہ بابا جی کا حکم تھا تو میں تلاش کرتے کرتے یہاں وہاں پوچھتے اور تحقیق کرتے پڑے چلا کہ فسد کھولنے والوں کا ایک گھرانہ کوئی نہیں آیا ہے۔ میں کوئی نہیں کیا اور اس گھرانے میں پہنچا تو وہاں نوجوان بڑے اچھے تھے۔ وہ مجھے بڑی محبت سے ملے۔ وہ کہنے لگے کہ جی ہم اب یہ کام نہیں کرتے اور اب ہم یعنی ڈراپس یعنی کھٹھی میٹھی گولیاں بناتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے بابا دادا نے تو پچھے خاص کمایا نہیں لہذا ہم نے یعنی ڈراپس تیار کرنے والی مشینیں لگائی ہیں کیونکہ اس میں زیادہ پیسہ ہے اور اب ہمارا کمائی کا یہ ذریعہ ہے۔ بابا جی کہا کرتے تھے کہ تم چاہیے کے چکر میں نہ آنا بلکہ پچھا کرہا لانا وہ گرنہ تم چاہیے چاہیے ہی میں ڈوب جاؤ گے اور چاہیے کا سمندر بہت گہرا ہوتا ہے۔ تھوڑے دن ہوئے میں سبزی منڈی گیا تو دوساریکل سورا نوجوان میرے

پاس سے بڑی یہ تیزی کے ساتھ گزرے۔ اتنی تیزی سے گزرے کہ مجھے اچانک گاڑی کے بریک لگانا پڑے۔ اچانک بریک لگانے سے میرے پیچھے والی گاڑی میری گاڑی کے ساتھ آ کر تھک سے گئی۔ ہم نے اپنی گاڑیاں ایک طرف کھڑی کر لیں تاکہ دیکھ سکیں کہ کچھ زیادہ تقصیان تو نہیں ہوا ہے۔ میں نے نکر مارنے والے صاحب سے کہا کہ معاونی چاہتا ہوں کہ مجھے سخت بریک لگانا پڑے اور اس نے کہا کہ الحمد للہ آپ کا کچھ زیادہ تقصیان نہیں ہوا وہ بالکل چورا ہاتھا۔ میں نے ان صاحب سے کہا کہ یہاں پر ایک حق ہونی چاہیے یا کم از کم ایک تریکھ والا تو ضرور ہونا چاہیے۔ وہ صاحب کہنے لگے کہ یہ سب غلط بات ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوتا چاہیے۔ پہلے ان دو لڑکوں کو سزا اُنہی چاہیے اور میں ان کو پکڑ کر سزا دوں گا۔ میں نے کہا کہ وہ تو اب کہیں کے کہیں نکل گئے ہوں گے لیکن وہ صاحب کہنے لگے کہ میں ان کو ضرور پکڑوں گا۔ اگر اب تک پکڑ کا تو شام کو یہ گھر تو آئیں گے ہی نا! اس وقت سزا دوں گا۔ میں نے کہا جناب وہ کیسے۔ وہ کہنے لگے کہ یہ دونوں میرے میٹے ہیں۔

خواتین و حضرات! چاہیے زندگی میں بہت جگہ ہم پر دباؤ ڈالتا ہے۔ ہمارے جنم کے علاقے میں روس سے بڑی تعداد میں مرغایاں آتی ہیں اور ہم وہاں شکار کھینے جاتے تھے۔ جنم میں لوگوں کی بڑی زیستیں نہیں ہیں۔ چھوٹے چھوٹے زمیندار ہوتے ہیں اس لیے انہیں ٹریکٹر کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ ہم جس شخص کے گھر میں نہ ہے وہ چاہ رہا تھا کہ میں ٹریکٹر خریدوں۔ وہ گاؤں کا سردار تھا جبکہ اس کی بیوی جو سجادہ اور پرچمی لکھی تھی۔ وہ ٹریکٹر خریدنے کے خلاف تھی اور اس کا کہنا تھا کہ ٹریکٹر کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ رقبہ ہی اتنا زیادہ نہیں ہے جس کے لیے ٹریکٹر کی ضرورت ہو لیکن اس شخص نے کہا کہ میرا شوق ہے اور میں نے ٹریکٹر ضرور لینا ہے۔ اس وجہ سے ان دونوں میاں بیوی کے درمیان ایک چیقلشی تھی۔ اس کی بیوی نے کہا کہ ہمارے پاس دھنی کے بیلوں (اعلیٰ نسل کے بیلوں کی ایک قسم) کی ایک جوڑی ہے وہ خوب مل چلاتے ہیں اور میں ٹریکٹر نہیں آنے دوں گی لیکن وہ شخص بعند تھا۔ جب بات ذرا سی اوپنی ہو گئی تو اس نے بیوی سے کہا کہ میں تم تھیں اس لیے گھر نہیں لایا کہ ”مجھے تم چاہیے تھی“ یا مجھے تمہاری ضرورت تھی بلکہ مجھے تم سے محبت تھی تمہیں اس لیے گھر لایا ہوں اور اسی طرح مجھے ٹریکٹر سے محبت ہے لہذا اگلے دن بیگم صاحبہ خود شور و مگیں اور ٹریکٹر بک کروایا اور گڑ کے چاول پکا کر سارے گاؤں میں تقسیم کیے اس لیے کہ چاہیے اور محبت میں برا فرق ہوتا ہے۔ میرا ایک بھانجا تھا جب وہ انکم تکس آفیسر ہوا تو اس کی تعینتی ملکان میں ہوئی۔ اس کی بیوی اور میری بھو جو بڑی پیاری ہے میں ایک باران کے پاس ملتا گیا۔ گرمیوں کے دن تھے۔ وہ میری بھوکا کہیں جانے کا پروگرام تھا تو اس نے کہا کہ ماموں مجھے تو جانا ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ خوشی سے جاؤ ہم خود ہی پکائیں گے اور مردھی کے بنائے ہوئے کھانے کھائیں گے۔ اس نے جاتے ہوئے اپنے شوہر سے کہا کہ میں نے وہ تمام کام

کافنڈ پر لکھ کر لگا دیئے ہیں جو آپ نے میری غیر موجودگی میں کرنے ہیں اور دیکھوم سست آدمی ہو کوتا ہی شکرنا۔ ان کاموں میں دودھ کے پیسے دین بھائی درزی کے پیسوں کی ادا یگی بھی شامل تھی اس کے علاوہ پودوں کی صفائی اخخاروا لے کا بل اور دیگر کئی چیزیں لکھی ہوئی تھیں آخر میں اس نے لکھا تھا کہ ”مجھ کو بھونا نہیں مجھ سے محبت کرتے رہتا ہے“ وہ 15 دن کے لیے میکے (ساہیوال) جاری تھی۔ جب وہ میکے سے لوٹ کر آئی تو توب بھی میں وہیں تھا اس نے آتے ہی لکھے ہوئے کاموں کو دیکھا جن پر اس کے شوہر نے نک کیا ہوا تھا لیکن آخری بات نک نہیں تھی۔ اس پر وہ چیختے پیٹے اور چلانے لگی کہ تم نے مجھے یاد کیوں نہیں رکھا۔ تمہیں میری کوئی پرواہ نہیں ہے۔ اب وہ (اس کا شوہر) کافی دیرا سے منتظر ہا پھر بولا یہوی میری اچھی یہوی تھیں یاد رکھنا اور محبت کرنا تو عمر بھر کا سودا ہے یہ کیے نک ہو سکتا ہے۔ جب نک میں زندہ ہوں محبت تو میں نے کرنی ہی جانی ہے۔ تم مجھے نک کرا کے اسے بند کرانا چاہتی ہو۔ یہ سن کر وہ اپنے شوہر کو تھوڑی ڈال کے اس کے ساتھ نک گئی اور کہنے لگی نہیں نہیں اسے نک نہیں کرنا ہے ایسے ہی رہنے دیں۔ اس طرح اس کے شوہر نے چاہیے والا کام بند کر دیا تھا۔ ایسے نہیں کیا کہ اس کام کو بھی نک کر دینا چاہیے۔ ہمارے بابا کہتے ہیں کہ جو نبی آپ چاہیے کے چکر میں آتے ہیں آپ کے کندھوں اور ذہن سے سارا بوجھا تر جاتا ہے اور انسان سوچتا ہے کہ اب اس چاہیے میں سارے لوگ شامل ہو گئے ہیں۔ میں بری الذمہ ہو گیا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ ہم پاکستانیوں کو ایک دوسرے سے مل جل کر رہنا چاہیے۔ ہم میں محبت ہونی چاہیے۔ لیکن اس طرح صرف چاہیے پر بات چھوڑ دینے سے بات نہیں بنتی ہے اور یہ Should Syndrom ہماری معاشرتی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔

خواتین و حضرات! جس طرح بڑے لوگ چاہیے کی بجائے عمل پر توجہ دیتے ہیں اور جیسے کو زہ گرا پنی تھوڑی سی مٹی پر دباؤ ڈال کر نہایت خوبصورت برتن میں ڈھال لیتا ہے ویسے ہی ایک اعلیٰ درجے کا کو زہ بنانے کی ضرورت ہے لیکن ہمارے پاس وہ چاہیے خوبصورت کو زے کی بجائے مٹی کا ایک ”تحویہ“ ہی رہ جاتا ہے اور ہم اس چاہیے کو کوئی شکل نہیں دے پاتے ہیں۔ وہ بڑی خوش نصیب قویں ہیں جو یہ بات جان جاتے ہیں کہ اس چاہیے میں صرف باقی لوگ ہی نہیں میں بھی شامل ہوں اور میں اپنی حد تک اپنی ذمہ داری ضرور پوری کروں گا اور خواتین و حضرات بابوں کے علم کی طرف بھی متوجہ رہا کرو ان کی باتیں گوہر نایاب ہوتی ہیں جو کتابوں سے نہیں ملتیں۔ عمل کرنے سے بات بنتی ہے۔ اس سے علم پھوٹنے لگتا ہے۔ آپ عمل کے اندر اس طرح داخل ہوا کریں جیسے ایک سائنس دان لیے ہارہری میں کھڑا ہو کر محنت کرتا ہے اور یہ کرنا چاہیے وہ کرنا چاہیے پرہی نہیں رہتا بلکہ عمل کی صورت میں تحریک کرتا ہے۔ اس طرح سے علم عطا ہوتا ہے ورنہ ہم آپ ہی دیے ہوئے علم پر گزارا اور چاہیے کی گروان ہی الا پتے رہیں گے اور مانگنے کے علم پر ہی رہیں گے۔ علم سیکھنے کا اچھا اور آسان

طریق یہ ہے جو حکامات دیجے جائیں عمل کیا جائے چاہے وہ دینی ہوں، حکومتی یا معاشرتی ہوں۔ آپ لال بتی پر کھڑے ہونے یار کئے سے اس بات پر انکار نہیں کر سکتے کہ پہلے اس سرخ بتی کو نیلی کریں پھر رکیں گے۔ آپ کو سرخ بتی کے فوائد کا تو کھڑے ہونے کا ہی پتہ چلے گا گزر جانے سے تو نقصان ہی ہوگا۔ میں اب آپ سے اجازت چاہوں گا اور جاتے جاتے آپ سے عرض کروں گا کہ آپ کا علم جیسے کہتے ہیں اس دلشیز مشرق جوانی با کا علم ہے اس کی طرف بھی توجہ دیں۔ میری Wisdom of the East دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”چلاس کی محبتیں“

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے پچھلی باتیں بڑی شدت صفائی اور جزویات کے ساتھ یاد آتی چلی جا رہی ہیں لیکن خدا کا شکر ہے کہ ان میں کوئی ایسی ناخوشنگوار بات نہیں ہے صرف اس بات کا ان یادوں میں ضرور احساس پایا جاتا ہے کہ وہ لوگ اور وہ زمانے جس میں شفقت و محبت اور انس زیادہ تھا وہ کہاں چلے گئے اور ہم اس قدر کیوں مصروف ہو گئے۔ اس میں ہماری کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ سارا چکر مصروفیات کا ہے اور ہماری مصروفیات کا عالم ایسا ہے کہ ہم ان شفقوتوں سے کٹ گئے جو محبتیں خدا نے ہمیں عطا کی تھیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ شیق قلوب جو ہیں انہوں نے کتاب سے پڑھ کر شفقت حاصل نہیں کی تھی یا کسی سے سیکھ کر محبت کا علم نہیں پایا تھا بلکہ اللہ نے وہ دل ہی ایسے پیدا کیے تھے کہ ان کے اندر محبت و شفقت بھری ہوئی تھی اور وہ جو بھی کام کرتے تھے ان میں لوگوں کے لیے بے شمار آسانیاں ہوتی تھیں۔ بہت دیر کی بات ہے ہماری ایک سوسائٹی تھی جو کافی دیر تک چلتی رہی اس کا نام ”چھڈیاڑ“ تھا۔ اس میں ہم سات ممبر تھے۔ پہلے میں شامل افراد صرف ریڈ یو سے متعلق تھے پھر شیلوپرین سے بھی آ کر شامل ہو گئے۔ اس سوسائٹی کے چیزیں ممتاز مفتی تھے جبکہ ہمارے لیڈر عمر بقری تھے۔ اس چھڈیاڑ کی انجمن کا نام ہم تے ”چھڈیاڑ“ یہ سوچ کر رکھا کہ دفع کرو دنیا کے گھلوے جیہو نے چھڈیاڑ ان کو اور اٹھ کھڑا ہو، نکل پڑ کیونکہ یہ تو ساتھ ہی چھٹے رہیں گے۔ چنانچہ ایک تاریخ مقرر کر دی جاتی تھی اور اس میں چھڈیاڑ کا لیڈر اعلان کر دیتا تھا کہ ”چھڈیاڑ“ نے 13 تاریخ کو ”اٹھیاڑ“ میں تبدیل ہو جانا ہے۔ اس مقرر کردہ تاریخ کو ہم اپنے سلپنگ بیگ اور اپنے ساتھ مکھن سیب اور ڈبل روٹی وغیرہ لے کر نکل پڑتے تھے اور ہماری منزل نار درن ایریا زیعنی شماںی علاقہ جات ہوتا تھا۔ وہ دنیا کا خوبصورت تاریخ علاقہ ہے۔ یہ بات میں اس لیے نہیں کہتا کہ میں پاکستانی ہوں بلکہ اس سے زیادہ خوبصورت علاقے میں نے امریکہ اور انگلستان میں بھی نہیں دیکھے۔ خدا نے جانے کس طرح سے ان حسین وادیوں کو ترتیب دیا ہے اور بنایا ہے۔ ایک طرف را کاپوش پہاڑ سینہ تانے کھڑا نظر آتا ہے تو دوسری

طرف ناگاپر بست کھڑا ہے۔ ایک بار جب ہم علاقے میں گئے اور ایک جگہ چائے پینے کے لیے رکے تو وہاں اڑھائی سو جرم میں اور ان کے بنچے چار پانیاں کرائے پر لے کر بیٹھے ہوئے تھے اور کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ وہاں اس بس اڈے پر لوگوں نے بتایا کہ یہ ناگاپر بست دیکھنے آئے ہیں۔ ناگاپر بست کا حسن لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ وہ جرم سیاح تین روز سے چار پانیاں کرایہ پر لیے بیٹھنے تھے اور اپنے سامنے ناگاپر بست کو مسلسل دیکھ رہے تھے۔ نہ کھانا کھایا، نہ لیٹے بس چائے کی ایک ایک پیاسی پی اور خدا کی عظیم قدرت کا انتظارہ کرتے رہے۔ ہم وہاں یہ ضرور سوچتے تھے کہ خدا ہمیں بھی یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی چیزوں کو پہنچ کر سکیں اور ان کے قریب آ سکیں۔ ہم شاہراہِ رشم پر چل رہے تھے اور ہمیں شام پانچ چھ بجے کے قریب چلاس پہنچنا تھا۔ چلاس پہاڑی علاقہ ہے اور کافی اونچائی پر ہے۔ یہ خوبصورت علاقہ ہے اور اس کے پہاڑوں کے شگافوں میں ایک سیاہ رنگ کی دوائی (سلامیت) پیدا ہوتی ہے وہ بہت قیمتی ہوتی ہے۔ ہمارے لیڈر نے وہاں رکنے کا بندوبست کیا تھا اور وہاں ایک مکمل ماسٹر کے گھر پر ہمارے ٹھہر نے کا انتظام تھا۔ جب ہم وہاں پہنچنے تو شام پانچ کی بجائے ہمیں رات کے دس نج گئے۔ اس دریکی بابت ہم سب نے فیصلہ کیا کہ اتنی رات کو کسی کے گھر جانا برالگنا ہے چنانچہ ایک صاف سے پہاڑ پر جس پر ایک عدد سرکاری ہتھ بھی لگی تھی ہم اپنے بستر کھول کر اس تھی کے نیچے بیٹھنے گئے۔ بڑی مزیدار ہوا چل رہی تھی۔ وہاں قریب ہی پانی کا ایک ٹل تھا جو کسی بہت ہی خوشگوار پہنچنے کے ساتھ وابستہ تھا۔ ہم وہاں بیٹھے با تین کر رہے تھے کہ اچانک بہت خوفناک طوفان چلنے لگا۔ تیز ہوا کے اس طوفان سے عجیب طرح کا ڈر لگ رہا تھا۔ اس تیز ہوا کے سبب ریت بھی اڑ نے لگی۔ جن لوگوں نے چلاس دیکھا ہے انہیں پتہ ہو گا کہ وہاں اگر تقریباً دو کلو میٹر کا فاصلہ طے کریں تو ریگستان شروع ہو جاتا ہے اور پہاڑوں پر چلتے ہوئے اچانک حد نگاہ تک ریت دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس تیز طوفان کے ساتھ ہی تیز بارش بھی ہونے لگی اور اولے بھی پڑنے لگے۔ ہمارے پاس Protection کے لیے کوئی چیز یا جگہ نہ تھی۔ اس موقع پر ہمارے لیڈر عمر بلقری مرحوم نے کہا کہ ماسٹر صاحب کے گھر چلنا چاہیے۔ خیر ہم نے اس اندھیرے اور طوفان میں آخر کار گھر تلاش کر لیا۔ جب وہاں پہنچنے تو ماسٹر صاحب پریشان کھڑے تھے اور ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کسی کے سوکھ پر گئے تھے لیکن اپنی بیوی کو اشارہ دے کر گئے تھے کہ میرے دوست آئیں گے۔ ان ماسٹر صاحب کی بیوی بھی ایک مکمل ٹھیک تھی۔ جب ہم وہاں بیٹھے با تین واتیں کر رہے تھے تو وہاں اس سخت بادوباراں میں ایک دس بارہ برس کا لڑکا جس کا نام عبد الحمید تھا وہ اپنی بیساکھی نیکتا ہوا آیا۔ وہ بے چارہ ٹانگ سے معدود تھا۔ اس نے دروازہ کھنکھنایا تو استانی صاحب نے دروازہ کھوا اور اس نے کہا کہ میرے اباجی نے کہا ہے کہ ماسٹر صاحب آج قریب کے گاؤں میں گئے ہوئے ہیں اور تو آپا جی کی خبر لیکر آ کر وہ

ٹھیک ٹھاک ہیں کہ نہیں۔ انہیں کوئی مسئلہ تو نہیں ہے۔ اس دوران بارش مزید تیز ہونے لگی اور رثا باری بھی تیز ہو گئی۔ وہ لڑکا ڈر گیا اور کہنے لگا کہ آپا جی آپ کو ڈر لگتا ہے تو میں درمیان میں حماقت یا اپنے علم کا اظہار کرنے کے لیے بول پڑا کہ اس میں ڈرنے والی کیا بات ہے؟ یہ تو موسم ہے لیکن آپا جی کہنے لگیں کہ ہاں مجھے ڈر لگتا ہے اور بالکل ایسے ہی ڈرتی ہوں جیسے تم ڈرتے ہو لیکن جب مرد گھر میں ہوں تو پھر مجھے ڈر نہیں لگتا (اس زمانے میں شاید تحریک نساں نہیں چلی تھی اور مرد عورتوں میں کافی اچھے تعلقات تھے) مجھے بھی ان کی بات سن کر شرمدی کا احساس ہوا کہ یا اللہ میں نے یہ کیا بات کر دی۔ میں اب محسوں کرتا ہوں کہ اس آپا جی نے اتنی سی بات کر کے اس معدود روز کے کو ایک پوری شخصیت عطا کر دی تھی اور وہ بگدا ہو کے کہنے لگا اچھا جی میں اب جاتا ہوں اور اپنے ابا جی کو جا کے بتاتا ہوں کہ وہ خیریت سے ہیں۔

خواتین و حضرات! جی چاہتا ہے کہ کاش میرا دل بھی ایک دن یا ایک ہفتے کے لیے دیا ہو جائے جیسا آپا جی کا تھا لیکن ہوتا نہیں ہے۔ میں زور لگا کر زبردستی شرافت اختیار کر سکتا ہوں لیکن جو پیدائش اور جبلی شرافت میرے پاس نہیں ہے۔ جب ہم اگلے دن سفر کر رہے تھے تو میں اپنے بچپن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جب میں پانچ چھ برس کا تھا۔ اس وقت میری ماں نے اپنی سہیلیوں کی دعوت کی تھی۔ یہ غالباً 1930ء کی بات ہے۔ میری ماں نے اپنی سہیلیوں کے لیے مراد آباد کے برتوں میں کھانا لگایا۔ پھول وغیرہ بھی لگائے۔ جب میں نے اپنی ماں کا اتنا اہتمام دیکھا تو میں نے سوچا کہ مجھے بھی اس میں حصہ بیانا چاہیے۔ میرے پاس ایک طوطا تھا جس طرح کا سڑکوں پر بجومیوں نے کارڈ نکالنے کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ اس کارڈ اصلی طوطے کا تھا لیکن وہ گتے کا بنا ہوا تھا اور اس کے اندر لکڑی کا برادہ بھر ہوا تھا۔ وہ طوطا دو آنے کا ملتا تھا اور اس کے ساتھ ریڑ کا دھاگہ بندھا جو اس کا دھاگہ۔ میں نے وہ طوطا کروہاں رکھ دیا جہاں ماں نے تینیں و آرائش کی ہوئی تھی اور جہاں کھانے کا انتظام تھا اگر شاید آج کی سمجھدار ماں ہوتی تو اس بھدنے سے طوطے کو اٹھا کر پھینک دیتی اور کہتی کہ تم کیا بد تیزی کر رہے ہو لیکن وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھی۔ وہ صرف ماں تھی اسے مانتا کے سوا اور پچھنیں آتا تھا۔ اس نے ایک رکابی کو اونڈھا کر کے اس کے اوپر طوطا رکھ دیا اور جب ان کی سہیلیاں آئیں تو وہ انہیں بتانے لگیں کہ بھی یہ طوطا اشفاق کا ہے جو اس نے خوبصورتی میں اضافہ کرنے کے لیے رکھا ہوا ہے۔ ان کی سہیلیوں نے بھی اس کی تعریف کی۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد مجھے خیال آتا ہے کہ وہ شفیق دل ان لوگوں کو کیسے مل جاتے تھے۔ میری یہ بڑی حسرت ہے کہ ایسا دل چاہے چند روز کے لیے ہی سبی مجھے بھی مل جائے۔

جب میں اٹلی میں تھا تو میرے ایک دوست بالدی کا بھیجا تھا اسے کچھ Tonsillitis کی مشکل آئی اور اس کا ایک پچیدہ سا آپریشن تھا۔ اسے ہم ہاپسٹل لے گئے۔ میرے ان کے ساتھ فیملی

فرینڈ شپ اور گھرے تعلقات تھے۔ وہ لڑکا بھی کہنے لگا کہ یہ (اشفاق احمد) بھی ساتھ جائیں۔ اس لڑکے کے پاس ایک بھالو تھا وہ اس نے ساتھ پکڑا ہوا تھا۔ اس کا باپ کہنے لگا کہ یہ اس بھالو کو چھوڑتا نہیں ہے۔ میں کسی طریقے سے اس کو اس سے الگ کرتا ہوں۔ وہ کوش کرتا رہا لیکن اس نے اسے نہ چھوڑا۔ خواتین و حضرات اس لڑکے کا بھالو کا ناتھا۔ ایک آنکھ کا بیٹن کہیں گر گیا ہو گا۔ جب اس کو آپریشن کے لیے آپریشن نیبل پر لایا گیا تو نر نے اس سے کہا کہ یہ بھالو مجھے دے دو لیکن اس نے دینے سے انکار کر دیا۔ اب Anaesthetist بھی پریشان تھا جس نے اسے بے ہوشی کی دوادیتی تھی اور اس کے بعد سرجن نے آنا تھا۔ ہم سب پریشان کھڑے تھے کہ سرجن آگیا۔ اس نے دیکھتے ہی صورت حال کو بھانپ لیا اور کہا کہ اچھا اتنا خوبصورت بھالو بھی ہے۔ نر نے کہا کہ سریا اس بھالو کو چھوڑنیں رہا ہے۔ تو سرجن نے کہا کہ نہیں یہ اس کے ساتھ ہی رہے گا۔ ابھی تو اس بھالو کی آنکھ کا آپریشن بھی ہونا ہے۔ یہ سن کر اس لڑکے کا دل خوشی سے معمور ہو گیا۔ جب اس لڑکے کا آپریشن جاری تھا تو ایک شخص کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ اس بھالو کی جو ایک آنکھ نہیں ہے اسے ابھی بازار سے لگوایا جائے۔ (یہ معمولی باتیں ہوتی ہیں لیکن ان کے اثرات دریا اور مستحکم اور گھرے ہوتے ہیں) ایک طرف اس پچ کا آپریشن ہوتا رہا تو دوسری طرف اس کے محبوب بھالو کی آنکھ ڈلوائی گئی اور پچ کے ہوش میں آنے سے پہلے اسے وہیں رکھ دیا گیا جہاں سے انخوایا تھا اور اس نئی آنکھ پر ایک خوبصورت پیٹی بھی باندھ دی گئی۔ وہ اس خوبصورتی سے باندھی گئی تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں کسی Living انسان کو بندھی ہوئی نہیں دیکھی۔ جب وہ پچ ہوش میں آیا تو اس پیٹی کو کیہ کر کہنے لگا کہ اس بھالو کو کیا کیا ہے؟ اسے پیٹی کیوں بندھی ہے؟

وہ مناف کہنے لگا کہ اس کی آنکھ کا آپریشن کیا ہے جو کامیاب ہوا ہے۔ اس پیٹی کو دو دن نہیں کھولنا۔ وہ خوش خوش بھالو کو لے کر چلا گیا۔ اس سرجن کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے آج بھی ہے۔ اس کا لمبا سا قد تھا اور اس کے اندر شفقت اور Greatness اور محبت دیوار ایسی بھری ہوئی تھی جو کہیں سے ملتی ہی نہیں ہے۔ مجھے اس تناظر میں اور بھی باقی یاد آ رہی ہیں۔

ماڈل ناؤن لا ہور میں ایک بڑا گول چکر ہے وہاں ایک بڑھا بابا ایک نیم کے پیڑ کے نیچے ٹھیکلا گاتا ہے۔ اس کے ساتھ اس کا ایک بینا ہوتا ہے جو اس کی مدد کرتا ہے۔ میری چھوٹی آپا ایک روز مجھے کہنے لگیں کہ میں ذرا اس ٹھیلے سے بزبری لے لوں۔ اس بذھے بابے کے لڑکے نے آپا کو کچھ گو بھی میلگاں اور کچھ ٹھاٹر بڑی احتیاط کے ساتھ دیئے اور آپا کی پسند اور کہنے کے مطابق الگ الگ لفافوں میں ڈال کے وہ رکھتا رہا۔ اب وہ لڑکا آپا جی کے پرس کی جانب دیکھ رہا ہے کہ وہ اسے پی دیں گی۔ لیکن آپا ایک چکر کاٹ کے اس لڑکے کے باپ کی طرف چلی گئیں گوئیا ایک معمولی اور عام سی بات تھی لیکن لڑکے کے چہرے کے تاثرات کیا تھے یہ آپ بھی بخوبی جان سکتے ہیں اور کوئی بھی صاحب دل جان سکتا ہے۔

کہ اس بچے کے دل پر کیا بھی ہوگی کیونکہ جس نے سروس کی تھی اس پر بھی اعتماد کیا جانا چاہیے تھا۔ اس بات کا میرے دل پر بڑا بوجھ تھا لیکن میں اس لڑکے سے زیادتی کو Compensate کیسے کر سکتا تھا۔ ایک دن میں اپنی بڑی آپا کے ساتھ گاڑی میں جا رہا تھا۔ یہ اس واقعہ سے تین چار ماہ بعد کی بات ہے۔ آپا نے اسی ٹھیلے کو دیکھ کر کہا کہ ”رکو اس ٹھیلے والے کے پاس تو کتنی اچھی شراب بری اور شہوت میں وہ لیتے ہیں۔ آپا نے ٹھیلے والے سے کہا کہ کالے شہوت ذرا کھٹے ہوتے ہیں، اس لڑکے نے کہا کہ نہیں جی۔ یہ بہت میٹھے ہیں۔ وہ شہوت بھی آپا نے لیے آپا نے وہ ساری چیزیں اپنے بھرے پن کے باوجود اچھے انداز میں لے لیں اور اسے پچاس روپے کا ایک نوٹ دیا اور ساتھ پوچھا کہ کتنے روپے ہوئے۔ اس نے اوپر خی آواز میں جھجھک کر کہا کہ اٹھارہ روپے اور کچھ پیسے ہوئے ہیں اور بڑی آپا نے اس لڑکے کو ہی پیسے دے دیے کیونکہ اس نے ہی سروس کی تھی۔ اس لڑکے نے قافت ٹھیلے پر سے رکھی بوری کا پہلو اٹھایا اور بقا یاری زنگاری نکال کر آپا کو دے دی۔ میں بھاں پھر دل کی اور دل میں پنہاں شفقت کے اس خانے کی بات کرتا ہوں جو خانہ کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ آپا اسے کہنے لیکن کا کا تو نے تو کمال کر دیا۔ فوراً حساب کر کے پیسے دیے مجھ تک کافی وقت لگ جاتا تو بڑے کمال کا پچ ہے۔ یہ تو نے کہاں سے سکھا تو اس نے کہا کہ جی ہمارا تو یہ روز کا کام ہے۔ اب اسے سیکھا ہے۔

خواتین و حضرات! اظاہر یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جو نصیب والوں کو ملتی ہیں لیکن ایسے لوگ اب بھی جگہ جگہ مل جاتے ہیں لیکن ہماری مصروفیات کا یہ عالم ہے اور ہمارے اور پر بوجھاتنے پر گئے ہیں کہ ہم اگر چاہیں تب بھی اپنے دل کے اس پنہاں خانے اور دل کے بٹوئے کو کھول کر اس میں جھاںک نہیں سکتے لیکن اب وہ کھلتا نہیں ہے اور اب جب ہمارا تعلق شاملی علاقہ جات سے ٹوٹ چکا ہے اور ہماری کمپنی یا حلقوں احباب کے بہت سے لوگ اس دنیا سے رحلت کر چکے ہیں اور اب ہم دوستیں باقی رہ گئے ہیں (یہ پروگرام اشراق احمد کے انتقال کے کچھ سال پہلے ریکارڈ کیا گیا تھا) اور ہم بھی اکیلے اکیلے ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ باتیں یاد آتی ہیں اور چلاس بھی یاد آتا ہے۔ میں چلاس کے لوگوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور ان کے لیے بڑی دعا کرتا ہوں۔ چلاس والوں نے ہمیں بڑی خوشیاں دی ہیں۔ بہت اچھے موسم عطا کیے ہیں۔ جب بھی اس علاقے سے گزرے اس نے بڑی بھتیں عطا کیں۔ اس رشتے سے چلتے ہوئے پیچھے آتے ہوئے اور اس نیم کے درخت تک پہنچتے ہوئے جہاں وہ بابا ٹھیلے والا اور اس کا بیٹا اب بھی ریڑھی لگا کر کھڑے ہوتے ہیں۔ یقیناً اب بھی دہماں شفقت کا مظاہرہ کرنے والے لوگ آتے ہوں گے لیکن دل میں کچھ خوف سا سٹ کے آتا ہے کہ شاید اب ایسے لوگ کم ہوتے جا رہے ہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمین۔ اللہ حافظ۔

تسلیم و رضا کے بندے

انسان عجیب عجیب قسم کی مشکلات میں بٹلار ہتا ہے اور اسے ان مشکلات کا کوئی مناسب حل سوچتا نہیں ہے۔ کوئی شخص اگر اپنے قد اور سوچ سے بڑی بات کرنے لگ جائے تو وہ پھر بری طرح سے پھنس جاتا ہے۔ مجھ سے لوگ آ کر پوچھتے ہیں کہ آخر ”خوش کیسے رہا جائے“ اور سکون قلب کے لیے کوئی طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔ اب ظاہر ہے کہ میرے پاس کوئی طب یا ہومیو پیٹھک کی دو اتوں نہیں ہے جو میں دے کر کہوں کہ اس کی چند خوراکیں کھاؤ تو سب تھیک ہو جائے گا۔ میرے پاس تو تجربات و مشاہدات ہی ہیں جن کی بنا پر میں ان سے کچھ کہہ سکتا ہوں گو تمام کے تمام واقعات مجھ پر گزرے نہیں ہیں لیکن میں ان کا شاہد ضرور ہوں۔ خواتین و حضرات خوش رہنے کے لیے ایک مشکل سا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں کو اپنی خوشی میں شریک کیا جائے۔ اب یہ بڑا مشکل کام ہے لیکن سامنے کے فارمولے کی طرح کہ پانی یا لیکوڈ اپنی سطح ہموار رکھتا ہے اس طرح کی کوئی بات خوشی کے حصول کے لیے دستیاب کرنا مشکل ہے بلکہ خوشی کے حصول کے لیے دوسروں کو شریک کرنا پڑتا ہے وگرنہ آپ خوش نہیں رہ سکتے۔ اگر خوش قسمتی کے ساتھ کوئی ایسی کیفیت اگر حاصل ہو جائے کہ آدمی کے پاس اتنا علم نہ ہو جتنا کر کے دنیا میں بھیجا ہے اس کیفیت یا صورت میں تو آسانی میسر آ سکتی ہے۔ اس طرح کا آدمی اپنے اردو گرد کو کیکہ کر بھی پریشان نہیں ہوتا بلکہ خوش رہتا ہے۔ آپ دیکھتے ہوں گے کہ درختوں کو قادر مطلق نے جس طرح کا پیدا کر دیا وہ وہاں ہی کھڑے ہیں۔ ایک درخت کبھی دوسرے درخت سے حاصل نہیں ہوتا۔ کبھی درخت یہ نہیں کہتا کہ ہمیں تو بھی آم کا درخت بنادیا اور لوگ ہمیں کھا کھا کر موجیں کر رہے ہیں اور ہمیں نوج نوج کرٹو کریاں بھر کر لے جا رہے ہیں۔ کاش خدا نے ہمیں شہرت کا درخت بنایا ہوتا اور مجھ پر رنگ بر لگے شہرت لگتے۔

خواتین و حضرات! انسان ہمیشہ اپنی قسمت پرشا کی رہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ مجھے ایسا ہونا

چاہیے تھا، کوئی کہتا ہے مجھے ویسا ہونا چاہیے تھا لیکن درخت ایسا شکوہ نہیں کرتا۔ کبھی درختوں نے یہ شکایت نہیں کی کہ جناب جب سے بیدا ہوئے ہیں وہیں گڑھے ہوئے ہیں۔ نہ کہیں سیر کی ہے نہ گھوم پھر کے دیکھا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ خوشی سے محروم رہتے ہیں اور آپ کو بھی خوشیاں عطا کرتے ہیں اور ہم باغوں کی سیر میں کرتے ہیں۔ ایسے ہی پرندے اور جانور ہیں جس کی شیر نے زیر بانی کی خواہش نہیں کی۔ یا کسی ہر ان نے کبھی فاختہ بننے کا نہیں سوچا۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کو بنا نے والا علیم مطلق بہتر سمجھتا ہے کہ ہمیں کیسا ہونا چاہیے۔ اگر میں اپنے آپ کو نہ بدلوں تو مجھے کہا جائے گا کہ اشFAQ صاحب آپ اپنے Status کا خیال رکھیں۔ ہمارے ہاں اس قسم کی عجیب و غریب Terms بن چکی ہیں اور وہ انسان کو شرمندہ کرتی ہیں۔ ہمیں زندگی میں کبھی کبھی ایسا انسان ضرور مل جاتا ہے جس کو دیکھ کر جیرانی ضرور ہوتی ہے کہ یہ کیسا بادشاہ آدمی ہے؟ یہ مالی طور پر بھی کمزور ہے۔ علمی و عقلی اور نفیقی طور پر کمزور ہے لیکن یہ خوش ہے۔ ہمارے علاقے ماذل ناؤن میں ایک ڈاکیا ہے جو بڑا اچھا ہے۔ اب تو شاید چلا گیا ہے۔ اس کا نام اللہ دتہ ہے۔ اس جیسا خوش آدمی میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔ اس کا عشق ڈاک بائٹنا اور ہر حال میں خط پہنچانا ہے۔ چاہے رات کے تو نج جائیں وہ خط پہنچا کر ہی جاتا ہے۔ وہاں علاقے میں کرٹل صاحب کا ایک کتا تھا۔ اللہ دتہ کو پتہ نہ چلا اور ایک روز اچانک اس کے نے اس کی ٹاگ پر کاٹ لیا اور اس کی ایک بوٹی نکال لی۔ خیر وہ ٹاگ پر رومال باندھ کر خون میں لٹ پت ڈاکھانے آ گیا۔ اسے دیکھ کر پوسٹ ماسٹر صاحب بڑے پریشان ہوئے۔ اللہ دتہ نے انہیں ساری بات سے آگاہ کیا۔ پوسٹ ماسٹر صاحب کہنے لگے کہ کیا تم نے کچھ لگایا ہی کہ نہیں!

وہ کہنے لگا نہیں جیسے بے چارہ پچکا ہی کھا گیا۔ میں نے وہاں کچھ لگایا تو نہیں تھا۔ اب وہ ناداں سمجھ رہا تھا کہ آیا پوسٹ ماسٹر صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ اس نے ٹاگ پر کتے کے کائنے سے پہلے کچھ لگایا ہوا تھا کہ نہیں۔ ہم اسے بعد میں ہسپتال لے کر گئے اور اسے ٹیکے دیکے لگوائے۔ وہ بڑی دیر کی بات ہے لیکن وہ مجھے جب بھی یاد آتا ہے تو خیال آتا ہے کہ وہ کتنا عجیب و غریب آدمی تھا جو گھبرا تا ہی نہیں تھا اور ایسے آدمی پر کبھی خواہش گھیر انہیں ڈال سکتی۔ انسان جب بھی خوش رہنے کے لیے سوچتا ہے تو وہ خوشی کے ساتھ دولت کو ضرور وابستہ کرتا ہے اور وہ امارت کو سرست سمجھ رہا ہوتا ہے۔ حالانکہ امارت تو خوف ہوتا ہے اور آدمی امیر دوسروں کو خوفزدہ کرنے کے لیے بننا چاہتا ہے۔ جب یہ باتیں ذہن کے پس منتظر میں آتی ہیں تو پھر خوشی کا حصول ناممکن ہو جاتا ہے۔ ہم ایک بار ایک دفتر بنا رہے تھے اور مزدور کام میں لگے ہوئے تھے۔ وہاں ایک شاید سلطان نام کا لڑکا تھا وہ بہت اچھا اور ذہین آدمی تھا اور میں مجس آدمی ہوں اور میرا خیال تھا کہ کام ذرا زیادہ ٹھیک ٹھاک انداز میں ہو۔ میں اس مزدور لڑکے کا

پچھے گرویدہ تھا۔ اس میں کچھ ایسی باتیں تھیں جو بیان نہیں کی جاسکتیں۔ ہم دوسرا مزدوروں کو تینیں روپے دیہاڑی دیتے تھے لیکن اسے چالیس روپے دیتے تھے۔ وہ چیز کی اتنی اچھی رگڑ ایسی کرتا تھا کہ چیز پر کہیں اور جو بھی یادھاری نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ایک دن دفتر نہ آیا تو میں نے ٹھیکنیڈار سے پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آیا۔ میں بھی دیگر افراد لوگوں کی طرح جس طرح سے ہم گھنیا درجے کے ہوتے ہیں میں نے اس کا پتہ کرنے کا کہا۔ وہ اچھرہ کی کچھی آبادی میں رہتا تھا۔ میں اپنے سیکرٹری کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر اسے لینے چلا گیا۔ بڑی مشکل سے ہم اس کا گھر ڈھونڈ کر جب وہاں گئے تو سیکرٹری نے سلطان کر کے آواز دی۔ اس نے کہا کہ کیا بات ہے؟

میرے سیکرٹری نے کہا کہ صاحب آئے ہیں۔

اس نے جواب دیا کیہا اصحاب!

سیکرٹری نے کہا کہ ڈاٹریکٹر صاحب۔ وہ جب باہر آیا تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا اور اس نے انہیں خوشی کے ساتھ اندر آنے کو کہا۔ لیکن میں نے اس سے کہا کہ میں سخت ناراض ہوں اور میں تمہاری سرنش کے لیے آیا ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ سر میں بس آج آئنیں سکا۔ ایک مشکل ہو گئی تھی۔ میں نے کہا کوئی مشکل تم ہمیں بغیر بتائے گھر بیٹھے ہوئے ہو اور اس طرح سے میری بڑی توہین ہوئی ہے کہ تم نے اپنی مرضی سے چھٹی کر لی۔

وہ کہنے لگا کہ سر آپ برائے مہربانی اندر تو آئیں۔ وہ مجھے زبردستی اندر لے گیا۔ اس کی بیوی چائے بنانے لگ گئی۔ میں نے اس سے کہا کہ میں چائے نہیں پیوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے چھٹی کیوں کی؟

وہ کہنے لگا کہ سر جب کل شام کو میں گھر آیا تو میں کنستر میں میں نے سورج کمکھی کا ایک پودا لگایا اور اس کی ڈوڈی کھل کے اتنا بڑا پھول بن گیا تھا کہ میں کھڑا کھڑا سے دیکھتا ہا اور میری بیوی نے کہا کہ یہ پہلا پھول ہے جو ہمارے گھر میں کھلا ہے۔

وہ کہنے لگا کہ سر مجھے وہ پھول اتنا اچھا لگا کہ میں خوشی سے پاگل ہو رہا تھا اور جب ہم کھانا کھا چکنے کے بعد سونے لگئے تو میری بیوی نے مجھے کہا کہ ”سلطان کیا تمہیں معلوم ہے آج ہمارا کا کاچنے لگا ہے اور اس نے آجھوں قدم اٹھائے ہیں۔“ اس وقت کا کام سوچ کا تھا لیکن جب میں صحیح اٹھا تو میں نے اپنے بیٹے کو بھی جگایا اور ہم میاں بیوی دور بیٹھے گئے۔ ایک طرف سے میری بیوی کا کے کو چھوڑ دیتی تھی اور وہ ڈگ کا تاہوا میری طرف چلتا ہوا آتا اور جب وہ مجھ تک پہنچتا تو میں اس کی ماں کی طرف اس کا منہ کر دیتا تو وہ ڈگ ڈگ کرتا مان تک پہنچتا اور ٹھاکر کے اس سے چمٹ جاتا۔ ہم بڑی دریتک اپنے بیٹے کو دیکھتے رہے۔ وہ کہنے لگا ”سر اتنا اچھا پھول کھلا ہو اور بچے نے ایسا اچھا چلنا سیکھا ہوا اور ایسا

خوبصورت دن ہو تو اسے چالیس روپے میں تو نہیں بیجا جا سکتا ہے نا! سر آج کا دن میرا ہے۔ اب میں شرمندہ سا ہو کرو اپس آگیا۔

خواتین و حضرات! اگر انسان میں اتنی طاقت ہو اور وہ ایسی صلاحیت رکھتا ہو تو پھر وہ خوشیوں کے ساتھ وابستہ ہو جاتا ہے لیکن اگر اس کی زندگی کی خوشیاں ایسی ہوں جیسی ہماری ہیں اور جن کے ہم قریب بھی نہیں پہنچ سکتے اور میں کے لئے میں لگا پھول ہمیں کبھی نظر ہی نہیں آ سکتا ہے۔ ہمیں خوشیاں باشنا آتا ہی نہیں۔ ہم نے یہ فن سیکھا ہی نہیں ہے۔

شیزٹر کرنا ایک ایسا مشکل کام ہے کہ ہمیں یہ کسی سکول، کالج یا یونیورسٹی نے سکھایا نہیں ہے۔ ہمیں اپنی چیزیں سنبھال کر رکھنے کی ہی ہمیشہ تلقین کی گئی ہے۔ جب پاکستان نہیں بنا تھا اس وقت تو ہمارے ہندو دوست کھانا کھاتے ہوئے اور پردہ ڈال لیتے تھے کہ کہیں کوئی اور کھانا نہ مانگ لے اور شریک نہ ہو جائے۔ اب ہمارے ہاں بھی ایسا رواج پر داں چڑھ گیا ہے اور ہمیں بھی چھپانا آ گیا ہے اور ہم شیزٹر کرنے سے گھبراتے ہیں اور ہماری گردنوں پر یہی بوجھ و بال بنا ہوا ہے۔ میں اکثر چھوٹے بچوں اپنے پوتوں پوتوں اور نواسیوں سے کہتا ہوں کہ تمہارا زیادہ قصور نہیں ہے۔ ہمارے سارے ہی علاقوں پر تیزاب کی بارش ہو رہی ہے اور جب باہر نکلو گے تو اس کے چھینٹے پر یہی گئے ہی اور آپ کوڈ پریشن کا شکار ہونا پڑے گا کیونکہ آپ اپنا آپ کھول نہیں سکتے ہیں۔ اللہ کہتا ہے کہ جس طرح کا میں نے تمہیں بنایا ہے تم ویسے ہی تھیک ہو۔ آپ اس ناک، آنکھ، کان اور بالوں کو دیکھ کر خدا کی تعریف کرو اور سبحان اللہ کو پھر دیکھو لکھتی نہیں آپ پر وار و ہوتی ہیں۔ جیسے جانوروں درختوں اور پرندوں پر وار و ہوتی ہیں۔ آپ نے کبھی دیکھا کہ پرندہ کس قدر رخوش نصیب ہے جو گاتے گاتے فوت ہو جاتا ہے۔ اس کی موت کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ ہم انسانوں کی طرح موت سے خوف زدہ ہو کر کئی دفعہ نہیں مرتا ہے۔ اسے فکر فردا نہیں ہوتی ہے۔ ہم فکر فردا کے عذاب میں بیٹلا ہو کر مرتے جا رہے ہیں۔

بانو قدیسی کی والدہ جو میری ساس تھیں وہ لمبے دوروں پر جایا کرتی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ ”کروشیا“ ضرور رکھتی تھیں (شاید ہمارے ان بچوں کو کروشیے کا پتہ نہ ہو۔) وہ سفر میں اپنے کروشیے کے ساتھ کھنا کھٹ بنتی جاتی ہوتی تھیں اور جب دورے سے لوٹ کر آتی تھیں تو ان کے پاس کچھ نہ کچھ بنا ہوا اور مکمل ہوا ہوتا تھا۔ جب کبھی ولاستی کی خواتین آتی تھیں تو انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوتی تھیں۔ ایک دفعہ ہم اسلام آباد جا رہے تھے تو انہوں نے اپنا کروشیا نکال لیا اور کچھ بننے لگیں۔ ان کے ساتھ ایک خاتون بیٹھی تھیں۔ وہ انہیں بڑے غور سے دیکھنے لگیں۔ (ان دونوں فوکر کا زمانہ تھا) وہ خاتون کہنے لگیں کہ آپ نے تو بڑے نکال کا ڈیزائن بنایا ہے۔ یہ بہت خوبصورت ہے۔ وہ گلاس کے نیچے رکھنے والی کوئی چیز تھی۔ میری ساس اس خاتون کو کہنے لگی کہ یہ اب مکمل ہو گیا اور یہ اب تمہارا ہوا۔ اس

نے بڑی مہربانی اور شکریے سے وصول کیا۔ جب میری ساس صاحبہ اس طرح کی کوئی دوسری چیز بنانے لگیں تو اس خاتون نے کہا کہ یہ تو میں حیر کو دے دوں گی اور میں چاہتی ہوں کہ اس جیسا ایک اور میرے پاس بھی ہو۔ میری ساس کہنے لگی کہ وقت تھوڑا ہے اور یہ بننیں پائے گا۔ آپ مجھے اپنا ایڈر میں دے دیں میں پہنچا دوں گی۔ لیکن انہوں نے بناتا شروع کر دیا۔ جب ہم پنڈی پہنچے تو اناؤ نسمنٹ ہوئی کہ بہت دھندہ ہے جس کی وجہ سے لینڈنگ ممکن نہیں ہے لہذا اس جہاز کو پشاور لے جایا جا رہا ہے۔ اس سے میری ساس بڑی خوش ہوئی کہ اسے مزید وقت مل گیا ہے۔ جب پشاور لینڈ کرنے لگے تو پائلٹ کی آواز آئی کہ ہم یہاں لینڈ کرنے آئے تھے لیکن جرانی کی بات ہے کہ اب یہاں کا موسم بھی پنڈی جیسا ہو گیا ہے لہذا ہمیں واپس پنڈی ہی جانا ہو گا کیونکہ ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہاں کا موسم تھیک ہو گیا ہے۔ جب ہم پنڈی آئے تو وہ چیز تھوڑی سی رہ گئی اور مکمل نہیں ہوئی تھی۔ پائلٹ کی آواز پھر گونجی کہ ہم لینڈنگ کرنے والے ہیں لیکن ایک دو چکروں کا نیس گے تاکر رن وے کا درست اندازہ ہو سکے۔ جب وہ چیز مکمل بن چکی اور دو چکروں کا نیس گے تو جہاز میں موجود ایک فوجی نے تالی بجائی اور میری ساس کو مخاطب کرتے ہوئے بولا کہ ”بیگم صاحبہ اب لینڈ کرنے کی کیا اجازت ہے۔“ میری ساس نے کہا کہ ہاں اب ہے کیونکہ یہ بن چکا ہے۔

ہم نے اور آپ نے کبھی شیر کرنے والا کام نہیں کیا ہے۔ ہم نے کبھی خوشیوں کو شیر نہیں کیا۔ آپ ہمارے لئے وی اشیش کے سٹوڈیو میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو ایک کوری ڈور کے درمیان میں ایک حصہ نبی اکرم کا ارشاد گرامی لکھا ملے گا کہ ”مسکراہٹ بھی ایک صدقہ جاریہ ہے۔“ لیکن ہم نے اپنی مسکراہٹ پر بھی کثریول رکھا ہوا ہے کہ جبرا در مسکراہٹ نہیں۔ جب ہم کانچ یونیورسٹی میں جاتے ہیں تو ہمارا منہ ایسے سوچا ہوتا ہے جیسے پہنچیں کیا غصب ہو گیا اور ہم کہتے ہیں کہ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے کہ ہم مسکراتے پھریں۔ ہمارا تو دین ہی سلامتی کے ساتھ تعلق رکھتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ جب ہم کسی کو السلام دیں تو پھر اس کو قتل نہیں کر سکتے۔

آپ کا اگر کسی کو قتل کرنے کا ارادہ ہو خدا نخواستہ تو پھر السلام و علیکم نہ کہنا (مسکراتے ہوئے) کیونکہ آپ اس شخص پر پہلے سلامتی بھیج دیں گے تو اسے قتل کیسے کریں گے۔ جب تک آپ خوشیاں بننیں گے نہیں خوشیاں پانہیں سکتے۔

(حاضرین محفل میں سے ایک صاحب بولتے ہیں) اشfaq صاحب ایک ہوالے سے حالی کا

ایک شعر ہے

پڑ طلب ہو کر مرے سے زندگی کرتے رہے
اس خاموشی نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

اشفاق صاحب: واداہ کیا بات ہے۔ (ایک اور صاحب گویا ہوتے ہیں)۔
شیئر کرنے میں ہماری سوسائٹی میں ایک خوف بھی پایا جاتا ہے کہ کہیں ہم سے کوئی کچھ چھین
نہ لے۔

اشفاق احمد: تھوڑے انہیں بہت زیادہ خوف پایا جاتا ہے لیکن اگر شارٹ مسکراہٹوں سے لیا
جائے چاہے وہ کروشیت سے ہی کیوں نہ ہو تو وہ تو خوف ناک بات نہیں ہے۔ ہمارے بابا جی نور والے
ایک دن کہنے لگے کے اشفاق میاں تمہارے پاس جو لکھنے والا ہیں ہے وہ کہتے کہا ہے۔ میں نے کہا
جناب جو میرے پاس ہے وہ ایک سونوے روپے کا ہے اور بہت اچھا ہے۔ وہ کہنے لگے جب بھی پین
خریدیں ستا خریدیں۔

وہ پوچھنے لگے کہ ستا کتنے کا آتا ہے؟

میں نے کہا کہ وہ ایک روپے اسی پیے کا آتا ہے۔ (اس زمانے میں آتا تھا)۔ فرمائے
لگے بس وہی لے لیا کرو۔ میں نے کہا کہ اتنا ستا چین خریدنا تو میری بڑی بے عزتی ہے۔ وہ کہنے
لگے پت جب کبھی آپ ڈاکخانے جائیں اور کوئی آپ سے چین مانگ لے کہ مجھے پڑھنا ہے اور وہ
بھول کر اپنی جیب میں لگا کے چلا جائے تو آپ کو کوئی غم نہیں ہو گا اور آپ آرام سے سو جائیں گے
لیکن اگر ایک سونوے روپے والا ہو گا تو آپ کو بڑا دکھ ہو گا۔ خواتین و حضرات اپنے دکھ اور کوتا ہیاں
دور کرنے کے لیے آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم تسلیم کرنے والوں میں مانے والوں میں شامل
ہو جائیں اور جس طرح خداوند تعالیٰ کہتا ہے کہ دین میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ میرا بڑا
بینا کہتا ہے کہ ابو دین میں پورے کے پورے کے پورے کے پورے داخل ہو جائیں تو میں اس کو کہتا ہوں کہ جس
طرح سے ہم بورڈنگ کارڈ لے کر ایئرپورٹ میں داخل ہو جاتے ہیں اور پھر جہاز میں بیٹھ کر ہم بے
فکر ہو جاتے ہیں کہ یہ درست سمت میں ہی جائے گا اور ہمیں اس بات کی فکر لاحق نہیں ہوتی کہ جہاز
کس طرف کو اڑ رہا ہے۔ کون اڑا رہا ہے بلکہ آپ آرام سے سیٹ پر بیٹھ جاتے ہیں اور آپ کو کوئی
فکر فاقہ نہیں ہوتا ہے۔ آپ کو اپنے دین کا بورڈنگ کارڈ اپنے یقین کا بورڈنگ کارڈ ہمارے پاس
ہونا چاہیے تو پھر ہی خوشیوں میں اور آسانیوں میں رہیں گے وگرنے ہم دکھوں اور کٹکٹش کے اندر رہیں
گے اور تسلیم نہ کرنے والا شخص نہ تور و حانیت میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ ہی سائنس میں داخل ہو سکتا
ہے۔ جو چاند کی سطح پر اترے تھے جب انہوں نے زمین کے حکم کے مطابق ورما چلا یا تھا تو اس نے کہا
کہ وہ ما ایک حد سے نیچے نہیں جا رہا۔ جگہ پھر میلی ہے لیکن نیچے سے حکم اور گیا کہ نہیں جھیں اسی جگہ
ورما چلانا ہے۔ وہ مانے والوں میں سے تھا اور اس نے بات کو تسلیم کرتے ہوئے اسی جگہ ورما چلا
اور اس کے بالا خروہ گوہ مقصود ہاتھ آ گیا جس کی انہیں تلاش تھی۔

خواتین و حضرات مانے والا شخص اس زمین سے اٹھ کر افلک تک پہنچ جاتا ہے اور وہ براق پر سوار ہو کر جو توں سمیت اور پہنچ جاتا ہے اور جونہ مانے والا ہوتا ہے وہ بے چارہ ہمارے ساتھ ہیں گھومتا پھرتا رہ جاتا ہے۔ سائندان کہتے ہیں کہ جب ہم یہ مان لیتے ہیں کہ زمین میں کششِ لُقَلْ ہے تو پھر ہم آگے چلتے ہیں اور ہمارا الگاسفر شروع ہوتا ہے جبکہ نامانے سے مشکل پڑتی ہے۔
اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”بھائی والی“ کا رشتہ

آج سے کئی یفٹے قبل میں نے اپنے بابا جی نور والے کا ایک واقعہ بیان کیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ تو نے رکشہ والے کوون سے پلے سے پیسے دیتے تھے۔ وہ دُتے میں سے ہی تو دیتے تھے، اگر سوا چار روپے بنتے تھے تو پورے پانچ روپے ہی دے دیتے ہوتے۔ ڈیرے پر جانے سے ہمارے دوست ابن انشاء بڑے ناراض ہوتے تھے۔ انہوں نے مجھے ناراض ہو کر کہا کہ ”تو وہاں کیا کرنے جاتا ہے۔ یہ ڈیرے فضول جگہیں ہیں، لوگ وہاں بیٹھ کے روٹیاں کھاتے ہیں اور باتمیں کرتے ہیں اور پھر انہوں کر چلے آتے ہیں انہیں وہاں سے کیا ملتا ہے۔“ میں نے رکشہ والا واقعہ ابن انشاء کو بھی سنایا اور اس نے اپنے ذہن کے نہایا خانے میں یہ واقعہ ایسے نوٹ کر لیا کہ مجھے اس دن کے واقعہ سے وہ کچھ نہیں ملا جو اس نے حاصل کر لیا اور وہ پھر ”دُتے میں سے دیتا رہا“ اور ابن انشاء کی زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آیا کہ وہ دے دے کر تنگ آ گیا اور اس نے کہا کہ اب میں کسی کو کہا تو دور کی بات مکنی بھی نہیں دیتا کیونکہ اس طرح دُتے میں سے دینے سے میرے پاس اتنے پیسے آنے لگ گئے کہ میں پیسے جمع کرانے کے لیے بینک کی سلیپیں بھی نہیں بھر سکتا (وہ بھی ہماری طرح سُست آدمی تھا) اس نے کہا کہ میرے پاس اتنے پیسے آنے لگے کہ میرے لیے انہیں سمجھانا مشکل ہو گیا۔ ہمارے سارے ہی بابے ایسی باتیں سمجھاتے رہتے ہیں۔ جب ہم اپنے بابا جی کے پاس ڈیرے پر جاتے ہیں تو وہاں ایک چھوٹی سی رسم ہوتی ہے جس میں بابا جی ایک شخص کو دوسرا شخص کا شراکت دار یا شریک بھائی بنادیتے ہیں جیسا کہ مدینہ شریف میں ہوا تھا۔ وہ بھی اسی واقعہ کی نقل کرتے ہوئے یا اس کی پیروی کرتے ہوئے ایک شخص کو کہتے ہیں کہ اب سے فلاں تمہارا شریک بھائی ہے۔ کئی دفعوں وہ شریک بھائی پسند آتا ہے اور بعض اوقات پسند نہیں آتا لیکن بابا جی کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے با امر مجبوری شریک بھائی کو ساتھ لے کر چلنا پڑتا ہے۔ میں نے زندگی میں یہ بات محسوس کی ہے کہ نہ صرف انسانی زندگی شیزرنگ میں مصروف ہے بلکہ شجر مجر پہاڑ پھر دریا بھی اس کائنات میں ایک

دوسرا کے ساتھ شیر کرتے ہوئے چلتے ہیں۔ شرکت کسی کو سمجھ دینے سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ کسی کو پیسے یا مثال کے طور پر دس لاکھ کا چیک دے کر تو آپ آزاد ہو جاتے ہیں لیکن ایک آدمی کے ساتھ شیر مشکل ہے۔ بہو کا اپنی ساس کے ساتھ شیر کرنا یا شوہر کا بیوی کے ساتھ شیر نگ کی زندگی زیادہ سخت ہے۔ یہ بتائیں ہمیں با بے لوگ ہی بتاتے تھے۔ ہمیں یہ بتائیں کہیں کتابوں میں تو نظر نہیں آئیں۔ بابا جی فرمایا کرتے تھے کہ درخت بھی ہمارے ساتھ شیر کرتے ہیں اور درختوں کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ”میں مسکی درخت پتیل اشFAQ احمد کے ساتھ شیر کر رہا ہوں۔“ یہ جتنی کاربن ذاتی آکسائیڈ چھوڑے گا میں اس کو بڑی خوشی دلی سے قبول کروں گا اور میں اس کے جواب میں اس کے لیے آکسیجن فراہم کرتا رہوں گا۔ چاہے میں کہیں بھی رہوں یہ رشتہ قائم رہے گا۔“

اس طرح بڑی بڑی چیزیں سورج چاند بھی شیر کرنے والوں میں سے ہیں۔ جب ہم اس وقت سٹوڈیو میں بینٹھے پروگرام کر رہے ہیں ہمارا کے۔ تو پہاڑ تقریباً ایک کروڑ ان برف کی پیڑھی باندھ کر ہر وقت شیر نگ کے لیے مستعد اور تیار ہے اور وہ سورج کو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ دروشی کی مزید کر نیں مجھ پر ڈال جھنگ میں پانی کم ہو گیا ہے اور مجھے چناب میں پانی بھیجا ہے۔ اس نے برف اپنے لیے اکٹھی نہیں کی یہ اس کا اپنا شوق نہیں ہے۔ اس کو تھوڑی زینت کا شوق تو ضرور ہے کہ لوگ میرانام لیں اور میرے درشن کرنے یہاں آئیں لیکن اس کا باقی تمام کام دوسروں کی خدمت ہے۔ سورج اپنی گرمی کا کوئی فائدہ نہیں اٹھاتا ہے۔ ایک فلاسفی نے بڑا خوبصورت فقرہ لکھا ہے وہ کہتا ہے کہ ”بڑھاپے میں انسان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے جیسے ڈوبتا ہوا سورج۔“

خواتین و حضرات! ڈوبتے سورج کی روشنی صرف اپنے آپ کو دوہکانے کے لیے درکار ہوتی ہے لیکن سارا دن وہ اپنی روشنی دوسروں کو ہی عطا کرتا ہے اور اسے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ اس طرح ہوا میں بادل سب شیر نگ کرنا جانتے ہیں۔ ہم نہیں جانتے۔ ہمارے دوست قدرت اللہ شہاب کی والدہ ”مال جی“ دو پہر کو کھانا کھا کے ایک خاص کونے میں ایک خاص چار پانی پر لیٹ جاتی تھیں اور انہوں نے ہلاکا سا ایک کمبل اوڑھا ہوا ہوتا تھا۔ اس گھر کی ملی جوانا حق جانتی تھی جیسے ہی مال جی سوتیں وہ ملی بھی چھلانگ مار کر چار پانی پر چڑھ جاتی تھی اور پھر آہنگی کے ساتھ اپنے دونوں پنجے لگا کر مال جی کو دھکیلتی تھی کہ مجھے بھی سونے کے لیے جگد دو۔ وہ بڑا کمال کا سین ہوتا تھا اور اکثر شہاب مجھے کہتے تھے کہ جلدی آؤ جلدی آؤ مال جی اور ملی کا مقابلہ ہو رہا ہے اور مال جی اسے ”دفع ہو، یا ذرا اس کوئی بات کہہ کر اس کے لیے جگہ چھوڑتی جاتی تھیں کیونکہ وہ ایک ایسا رشتہ تھا شرکت کا کہ وہ ملی کو کوستے ہوئے آگے ہٹکتی جاتی تھیں اور ملی اپنی پوری جگہ بنا کر شیر دراز ہوتی جاتی تھی۔ پیارے بچو! جب تک ہم انسانوں کے درمیان شیر نگ کا رشتہ قائم رہے گا یہ دنیا خوش اسلوبی کے ساتھ چلتی رہے گی لیکن جب

شیرنگ میں رخنه پر نے لگتا ہے جیسا کہ ہمارے ہاں پڑ رہا ہے تو بے زاری بڑھ جاتی ہے اور اس طرح سے آدمیوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا جا رہا ہے اور ”فکھیرا“ جا رہا ہے۔ یہ ایک خوفناک صورت حال ہے۔ ایک زمانے میں جب میں نے بی۔اے کری تو میں نے بھی گھروالوں سے لڑائی کی کیونکہ جب بچہ سیانا ہو جاتا ہے تو وہ گھروالوں سے لڑتا تو ضرور ہے۔ سیانا ہونے کے بعد وہ سب سے پہلے تھرڈ ایئر میں کیونٹ ہو جاتا ہے۔ دوسرا وہ گھروالوں سے ضرور لڑتا ہے۔ میں بھی کچھ ایسے ہی ناراض ہو کر گوجران خان چلا گیا۔ یہ میں آپ کو خفیہ بات بتا رہا ہوں۔ وہاں جا کر میں سکول ماسٹر گیا۔ وہاں ایک بڑے اچھے آدمی ہوتے تھے ان کا تھوڑا تصوف کے ساتھ بھی لگا تو تھا۔ ہم شام کو ان کی بیٹھک میں بیٹھتے تھے۔ وہاں اور بھی بہت سے لوگ آتے تھے اور پاتیں ہوتی تھیں۔ وہاں ایک آدمی نابی کمہار بھی آتا تھا۔ تھا تو وہ کمہار لیکن کو زہ گر کو خدا نے بڑی صلاحیتوں سے نواز ہوتا ہے۔ اس کی سوچ بڑی عجیب ہوتی تھی وہ ایک روز وہاں آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ صاحب جی یہ جوز میں ہے اس کا وزن کتنا ہے؟ اس کا کام مٹی کا تھا تو ظاہر ہے اس کی دلچسپی مٹی میں زیادہ ہوئی تھی۔ میں جسے اپنے علم پر بڑا ذمہ تھا میں نے کہا کہ زمین کے بوجھ بارے تو میں نہیں جانتا لیکن میں تمہیں کہیں سے دیکھ کر ضرور بتاؤں گا۔ میں نے سکول کی لا بیری سے انفارمیشن اور معلومات کی کتابیں نکال گکوں اور جوز جاڑ کے دیکھا اور اس سے کہا کہ بھی دیکھو زمین کا سائز کی رو سے وزن اتنے بڑا رہتے لاکھ اتنے کروڑ مٹن ہے۔ اسے ان کے بارے میں بھی بتایا کہ ایک ٹن 28 من کا ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میری طرف سے اس قدر مشکل سوال حل کر دیے جانے کے باوجود بھی وہ مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔ وہ مجھ سے پھر گویا ہوا اور اس نے مجھ سے بات پوچھ کر مجھے حیران کر دیا کہ

”جی ایہہ وزن بندیاں سمیت اے کہ بندیوں بگیر۔“

اس وقت تو میں اس کی بات پر چڑا بھی کہ یہ کیسی بات کر رہا ہے لیکن آج میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ہر چیز کی بندے کے ساتھ شرکت ہے۔ جب ہم سڑک پر گاڑی چلاتے ہیں تو دوسروں کو یکسر بھلا دیتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ بس ہم ہی ہیں میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی کہتا ہوں کہ بس میں ہی ہوں اور ”گلیاں ہوں جیسا تے بس میرا مزایا پھرے“ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے کیا پرواہ ہے کہ میں لین کے اندر چلوں یا سڑک کو شیسر کروں۔ اس کی وجہ ہے کہ ہم میں شیسر کرنے کا رجحان ختم ہو چکا ہے اور جس قوم یا گروہ انسانی میں شیرنگ کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے وہ سوسائی غرق ہونے لگتی ہے۔ ذوب بنے لگتی ہے۔ ہم شیرنگ کے بغیر چل نہیں سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا نظام ہی ایسا بنایا ہے۔ آج سے تین چار سال پہلے میں امریکہ گیا۔ میرا بیٹا وہاں پروفیسر ہے۔ ہم اس کی یونیورسٹی سے آرہے تھے تو ہماری گاڑی سے آگے ایک اور گاڑی جا رہی تھی۔ سڑک بالکل سنان تھی۔ میں نے اپنے بیٹے سے کہا

کہ یا راس سے آگے نکلو یہ تو بہت آہستہ جا رہا ہے۔ کہتا اچھا ابو گزرتے ہیں اور وہ آگے نکلنے میں بہانے بازی کر رہا تھا۔ میں نے غصے سے کہا کہ تم اس کو ہارن دو اور اسے ایک طرف کرو۔ وہ کہنے لگا کہ ابو سے ہوت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ یہ عمر سیدہ آدمی ہے جو گاڑی چلا رہا ہے۔ اگر میں ہارن دوں گا تو یہ گھبرا جائے گا اور کسی نقصان کا اندر یہ ہے۔ میں نے کہا کہ دفع کریار اگر نقصان ہوتا ہے تو اس کا ہونا ہے نہیں کیا۔ میرا بیٹا کہنے لگا کہ ابھی موڑ آجائے گا تو اس سے آگے نکل جائیں گے اور وہ ویسے ہی آہستہ آہستہ گاڑی چلاتا رہا۔ میں نے اس سے کہا کہ تم میری بات کیوں نہیں مانتے۔ وہ کہنے لگا کہ ابو بات یہ ہے کہ یہ میرا کو لیگ ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا کیا یہ تمہارے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھاتا ہے۔ اس نے جواب دیا نہیں۔ میں نے کہا کہ کیا یہ تمہارے ساتھ ایڈن فلشر پیش میں ہے۔ وہ کہنے لگا کہ نہیں۔ میں نے کہا کہ پھر یہ تمہارا ساتھی کیسے ہو گیا۔ وہ کہنے لگا ابو He is my road fellow اور میں اسے گھبرانا پسند نہیں کرتا۔ میں نے کہا کہ لخت احمدیں اس لیے پڑھنے بھیجا تھا کہ اس طرح کی فضول باتیں سکھ لے۔ ادھر لا ہو ریا کراچی میں آ کے گاڑی چلا اور کھنکھٹ کسی کے بیچ میں مار۔ یہ تو نے کیا نئی اصطلاح ”سرک کا ساتھی“ بنارکھی ہے۔ یہ کوئی رشتہ و شتری نہیں ہے۔

خواتین و حضرات! جب شیرنگ کی تاریخی ہے تو پھر اس قسم کی مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور نواب دین (نابی کمہار) جیسا کمہار پیدا ہوتا ہے تو وہ شیرنگ کے رشتے کو جوڑتا ہے جیسے کہ وہ مٹی کو جوز کر کوڑہ بنتا ہے بالکل اسی طرح ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ کسی کو کچھ دے دینا تو براہی سہل کام ہے شیر کرنا مشکل ہے۔ میاں بیوی کا خاص طور پر شیرنگ کا بہت عجیب رشتہ ہے۔ نہ بھی پسند ہوتا بھی تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ قرآن پاک میں بھی اللہ میاں فرماتے ہیں کہ تم کو اپنی بہت سی بیویاں ناپسند ہوں گی لیکن تم نے ان کے ساتھ رہنا ہے۔ جوڑنے والی اپنی جسمانی یا نفیاتی تکلیف کے باوجود کیا کچھ حاصل کرتے ہوں گے اس کا اندازہ ہمیں نہیں ہے لیکن ہمارے بارے کہتے ہیں کہ شیرنگ کرنے سے آپ کو ایک عجیب طرح کی تقویت ملتی ہے۔ ایسی ہی تقویت جو آپ آسیجن کی صورت میں درخت سے حاصل کرتے ہیں جس سے آپ تو ان رہتے ہیں۔ اگر آپ زندگی کے چھوٹے چھوٹے معاملات میں شر اکت اور ”بھائی والی“ کے اوپر غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ آپ کے اوگر کر کس طرح سے شیرنگ کا عمل جاری ہے لیکن یہ عمل توجہ دینے سے نظر آتا ہے اور جس وقت اس عمل کو اپنی زندگی میں شامل نہ کر لیا جائے مشکل ہو جائے گی اور ہم اس مشکل میں سے گزر بھی رہے ہیں اور ساری دنیا اس شیرنگ سے نکل رہی ہے۔ میرے ایک دوست کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی اس کا نام صائمہ تھا۔ جب ہم سن آباد میں رہتے تھے اس کی وہاں شادی ہو گئی پھر وہ سمن آباد سے شادی کے بعد لندن چل گئی۔ اس کا خاوند انجینئر تھا۔ وہ لندن سے پھر

کینیڈا شفت ہو گئے۔ جب ان کے ماشاء اللہ دو تین خوبصورت سے بچے ہو گئے تو پھر صائم نے کہا کہ ہم کتنی دیر باہر ہیں گے اور اس کے بعد وہ واپس گھر لا ہو رہا ہے۔ پہلے تو وہ پوش ایریا ڈیفس میں رہے پھر گلبرگ آئے اور آخ کارروہ میں آباد میں ہی آگئے حالانکہ یہ علاقہ ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھا اور نہ ہی یہ علاقہ ان کی بودویاں کے لیوں پر پورا تھا۔ ایک دن میں اپنے دوست اے حید سے ملنے کے لیے جا رہا تھا تو وہ مجھے راستے میں مل گئی اور اس نے مجھے بتایا کہ انکل آج کل میں میں آباد میں ہوں۔ میں نے کہا کہ تم نے یہ علاقہ کیوں نہیں بدلا۔ وہ کہنے لگی کہ انکل ایک تو اس علاقے سے میرے بچپن کی یادیں دیست ہیں اور یہاں سورج بھی برازند یک ہے جو چیز نہیں ہوتی ہے میں جھٹ سے لے آتی ہوں۔ میں نے کہا کہ میں آباد میں ایسا کوں سا اشیائے ضروری کا سورج ہے جس سے ہر چیز مستیاب ہے۔ وہ کہنے لگی انکل بہت بڑا ہے اور نہایت اعلیٰ درجے کا ہے۔ میں نے کہا کہ میں نے تو نہیں دیکھا۔ کہنے لگی اماں کا گھر میرے گھر کے قریب ہی ہے جس چیز کی ضرورت پڑتی ہے وہاں سے جا کے لے آتی ہوں۔ اس سے اچھا سورج مجھے کہیں ملا ہی نہیں۔ میں بڑی دیر اس سے با تین کرتار ہا اور خوش ہوتا رہا۔ شیرنگ اس طرح سے ہوتی ہے اور اس کی جڑیں کئی طرح سے ملی ہوتی ہیں۔ اب آپ کو اپنی ذات کے ساتھ یہ فیصلہ خود کرنا ہے اور ایسا فیصلہ کرنے کے لیے ایک وقت ضرور مقرر کرنا پڑے گا جس میں آپ اپنے آپ کا احاطہ کریں۔ لوگوں نے مجھ سے مراقبہ کے حوالے سے پوچھا بھی ہے اور میں انشاء اللہ کسی اور پروگرام میں مراقبہ کی تمام اقسام عرض کر دیں گا اور وہ اقسام اکتسابی طور پر ہی ہوں گی کیونکہ میں خود تو اس کا مہر نہیں ہوں۔ مراقبہ ایک خود احتسابی کا طریقہ ہی تو ہے۔ وگرنہ انسان لوگوں پر تقدیم کرتا ہوا ہی اس جہاں فانی سے گزر جاتا ہے۔ آپ کو شراکت کی بلکی بلکی ہمیں نہ صرف اپنے علاقے، گھریا ملک میں بلیں گی بلکہ آپ جہاں بھی چلے جائیں جہاں بھی انسان آباد ہیں اور جہاں بھی اللہ کے نظارے ہیں وہ نظارے اور فضائیں آپ کو اپنے ساتھ شیرنگ کرتی ہوئی ہی ملیں گی۔ آپ مری، بھور بن کیوں جاتے ہیں؟ وہ بھور بن آپ کا انتظار کر رہا ہوتا ہے کہ پلیز آ جاؤ بڑی دیر ہو گئی۔ میں آپ کے ساتھ کچھ شیرنگ کرنا چاہتا ہوں۔ جب آپ وہاں سے ہو کر آ جاتے ہیں تو آپ کو احساس ہوتا ہے کہ بھور بن میرے ساتھ کچھ شیرنگ کر رہا تھا کیونکہ آپ کا وہاں جانے کا پھر دل کرتا ہے۔ شراکت بہت بڑی نعمت ہے جو قدرت کی طرف سے ہمیں عطا ہوتی رہتی ہے۔ جب میں اٹھی میں تھا وہاں ایک اصول ہے کہ ہر سال ڈرائیونگ لائنس کی جب تجدید کروائی جاتی ہے تو آپ کو ایک بار پھر ڈاکٹر کے حضور میانی ٹیسٹ کرنے کے لیے پیش ہونا پڑتا ہے۔ میں بھی ڈاکٹر کے پاس گیا اور اس نے کہا کہ اور پر کی لائن سے پڑھتے ہوئے چھٹی لائن تک آؤ۔ آخری لائن بڑی باریک لکھی ہوئی تھی۔ میں نے پانچ بیس لائن تک تو کھٹا کھٹ پڑھ دیا لیکن جب میں چھٹی پر آیا تو رک گیا اور میں نے ڈاکٹر سے اطالوی زبان میں

کہا کہ یہ مجھ سے نہیں پڑھی جاتی ہے تو ڈاکٹر نے کہا کہ ”پاس۔“ یہ پانچ لاکھ پڑھنے تک کام ہے یہ چھٹی تو میں تمہیں اپنی طرف سے کہہ رہا تھا۔ اب میں اس چھوٹے سے رشتے کو محبت کے رشتے کو لیانا م دوں لیکن اس نے میرا دل پر باش کر دیا تھا اور اس کی معمولی سی محبت کی بات سے میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔ مجھے یہ بات محسوس کر کے بھی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ بہت سے لوگوں میں بہت کچھ جانتے ہوئے اور نہ جانتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ شیئر کیا ہے اور میں نے تو شیئرنگ کے فائدے بہت اٹھائے ہیں۔ میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس شیئرنگ سے میں نے کسی کو کیا دیا اب تہ بیہقیں سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس شیئرنگ کی بدولت بہت کچھ حاصل کیا۔

اللہ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا اور شیئر کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”گھوڑا اُ اکٹر اور بلونگٹر“

ہم اہلِ زاویہ کی طرف سے آپ کی خدمت میں سلام پنچ۔

ایک مرتبہ پھر اس ماحول میں پہنچ کر بیقینا آپ کو بھی ویسی ہی خوشی ہو گئی جیسی کہ مجھے اس وقت ہو رہی ہے۔ ایف۔ اے کے زمانے میں عام طور پر (یہ ہمارے زمانے کی بات ہے) سوڈنیش انگریز شاعر Oscar Wilde کی محبت میں بہت بتلا ہوتے تھے۔ اب زمانہ آگے نکل گیا ہے۔ اب شاید اس کی نظموں پر اس قدر توجہ نہ دی جاتی ہو۔ جس طرح سے ہم اس کی محبت میں بتلاتے ہیں ویسے ہی ہمارے رتی جناح (قائدِ عظم کی اہمیت) جو ہم سے کافی چھوٹی تھیں وہ بھی Oscar Wilde کی محبت میں بہت بری طرح سے بتلا تھیں اور اس کی نظیں وہ قائدِ عظم محمد علی جناح کی زبانی سنا کرتی تھیں۔ ان دونوں قائدِ عظم بڑے مصروف ہوتے تھے اور ان پر بہت زیادہ بوجھ ہوتا تھا اور وہ کام کا بوجھ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا لیکن وہ ایک ہی Request کرتیں کہ ”جناح مجھے اس کی ایک نظم اور سناؤ۔“ قائدِ عظم کا قد جیسا کہ آپ بھی جانتے ہیں کہ بہت خوبصورت تھا لیکن آپ شاید اس بات سے واقف ہوں کہ جب قائدِ عظم لندن بیرمنگھم پڑھنے کے لیے گئے تو وہاں ایک ایکٹر کی ضرورت کا استھارا آیا۔ یہ استھارا ایک Shakespearen Theatre Company کی طرف سے تھا۔ اب قائدِ عظم کو بھی اپنی انگریزی دانی اور اپنی آواز پر ناز تھا اور وہ بھی وہاں چلے گئے۔ وہاں تمام کے تمام امیدواروں میں تھے جو ستر کے قریب تھے۔ قائدِ عظم نے بھی ایک مکالمہ پڑھ کر سنایا اور اتنے سارے امیدواروں میں جس کو پڑھ گیا وہ قائدِ عظم ہی تھے۔ قائدِ عظم اس انتخاب پر بہت خوش تھے اور وہ اپنا مستقبل ایک کامیاب اور نامور ایکٹر کا دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اس کمپنی کا ذرا رامہ سائنس کریا اور گھر آ کر خوشی خوشی اپنے والد کے نام خط لکھا کہ ”میں اتنے زیادہ لوگوں میں سے منتخب کر لیا گیا ہوں اور ایک انٹرنشنل تھیٹر یکل کمپنی میں جگ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہوں۔“ اب ان کے والد پونجا جناح پر انی وضع کے آدمی تھے۔ انہوں نے جوابی خط لکھا (اب مجھے یاد نہیں کہ وہ خط بذریعہ جہاز گیا یا تار کے ذریعے بھیجا

گیا اور اس میں کہا کہ تم کو جس کام کے لیے بھیجا گیا ہے تم اس کی طرف توجہ دو۔ یہ تم نے کیا ایک نیا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ ”خبردار اگر تم نے اس طرح کی کسی سرگرمی میں حصہ لیا تو“ اب اس زمانے کے پچھے بھی بڑے نیک اور تابع فرمان ہوتے تھے اور خط ملٹے ہی قائدِ عظیم تو فکر پڑ گئی اور اس کمپنی کے مالک سے کہا کہ سر میں بہت شرمسار ہوں اور میں وعدہ کے مطابق پر فارم نہ کر پاؤں گا۔ انہوں نے پوچھا کہ آخر تم ہمیں کیا ہوا؟ قائدِ عظیم نے کہا کہ سر میرے والد صاحب نے منع کیا ہے اور وہ میرا اس طرح تھیز میں کام کرنا انہیں پسند نہیں ہے۔

کمپنی مالک نے کہا کہ تمہارے والد کو کیا اعتراض ہے۔ یہ تمہاری ذاتی زندگی ہے اور تم جو چاہو پیشہ اختیار کر سکتے ہو۔

قائدِ عظیم نے کہا کہ Sir you do not understand ہماری زندگی میں والد بڑے اہم ہوتے ہیں اور میں معافی چاہتا ہوں۔

رتی قائدِ عظیم سے Oscar Wilde کی نظمیں ضرور ستا کرتی تھیں۔ یہ پروگرام شروع ہونے سے قبل مجھے آ سکروا اینڈ کی ایک نظم کا مصروف یاد آ رہا تھا

Suffering is very long moment.

You can not divide it by time.

خواتین و حضرات! ایسی چیز ہے جو لحاظی ہوتی ہے لیکن اسے تقسیم کرنے کے لیے چاہے کتنے ہی موسم گزر جائیں وہ کسی صورت تقسیم ہونیں پاتے ہیں۔ پریشانی کا ایک چھوٹا سا لمحہ بھی طویل تر ہو جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی فرد یا اگر وہ انسانی Suffering کی پیٹ میں ضرور آ جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج کل ہم پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری ہو چکی ہے۔ ہم ایک بوجھتے دبے ہوتے ہیں اور ہمیں اس احساس نہادمت فے دبار کھا ہے جو کسی طرح سے ہمیں گھیر کر اپنے چنگل میں لے آیا ہے۔ یہ Pain اور sufferings و کھو الم تو انسانی زندگی کے ساتھ چلتے رہنا چاہیے لیکن ما یو سی اس کے قریب نہیں آنی چاہیے۔ مجھے خوشی ہے کہ جب میں اپنے ملک کے دوسرا ساتھیوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں آج کے Scenario میں دو چیزیں نظر آتی ہیں۔ یا تو انہیں غصہ آتا ہے اور یا انہیں اس بات کا دکھ ہے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں اور ہماری گردن پر ہاتھ رکھ کر زبردستی ہمارے سر کو نیچا کرنے کی کوشش کیوں کی جا رہی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ خدا کے کرم و فضل سے لوگ اس قدر ما یو سی کے عالم میں نہیں ہیں جیسا کہ ہمارا دشمن اندازہ کر رہا تھا۔

خواتین و حضرات! ما یو سی ہونے کی ضرورت نہیں لیکن دکھ تک جانے کا آپ کو حق حاصل

ہے۔ میں جب سکول میں داخل ہوا تو مجھے جس مس کے حوالے کیا گیا وہ بڑی خوش اخلاق تھیں۔ نہایت خوش وضع اور لمبے قد کی شفیق سی استاد تھیں۔ ہماری ماں میں ماسیاں بڑی سخت ہوتی تھیں اور اس استاد کی طرف سے ہماری طرف جو شفقت کا پکارا آرہا تھا وہ میرے لیے نیا تجربہ تھا۔ وہ ہمارے کھلینے کے لیے آسائش کا سامان بھی مہیا کرتی تھیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس استاد کے لیے دل میں ایک اسی محبت پیدا ہو گئی جس کا توزنا بڑا مشکل ہو گیا۔ ہمیں امام کے پاس رہنا تکمیل دہ ہوتا تھا لیکن اس مس کے پاس زیادہ آسانی محسوس ہوتی تھی۔ خواتین و حضرات گویہ ایک میری ذاتی سی بات ہے اور میں آپ کو اپنادکھ بتاتا ہوں کہ ان کی اس سکول سے یا ٹرانسفر ہو گئی یا پھر انہوں نے خود ہی سکول چھوڑ دیا۔ بہر کیف وہ ہم سے جدا ہو گئیں۔ میں اب اس بڑھاپے میں پہنچ چکا ہوں میں نے اب تک کی اپنی زندگی میں اتنا دکھ محسوس نہیں کیا جس قدر اس شفیق استاد کی جدائی سے مجھے ہوا۔ مجھے شاید یہ بات آپ کو بتانی چاہیے کہ نہیں کہ اس جدائی میں نہ کھانا اچھا لگتا تھا اور نہ ہی زندہ رہنا اچھا لگتا تھا۔ مجھے زبردستی سکول بھیجا جاتا تھا اور میں اپنی اس پیچر کی یاد اور محبت میں اس قدر بیٹلا ہو گیا تھا کہ میں جب عشق و محبت کے قصے پڑھتا ہوں تو مجھے خیال آتا ہے کہ میں اس وقت گوہہت چھوٹا تھا لیکن میں لا شعور میں آخر کس طرح اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ میں اپنی اس استاد کو ایک بہت ہی ارفع و اعلیٰ جملوق سمجھ کر اس کی پرستش کرنے لگا تھا اور جدائی کا دکھ بہت گہر امحوس کرتا تھا اور اس دکھ کے باوصاف میں مایوس نہیں تھا اور میرے دل کے کسی نہ کسی کونے کھدرے میں یہ بات ضرور تھی کہ میں ان سے ضرور ملوں گا اور پھر میں اپنا آپ اس شفیق استاد کی خدمت میں پیش کروں گا۔ وقت گزر گیا اور ان سے ملنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آیا۔ وہ جانے کہاں چل گئیں لیکن دل میں ان کا دکھ بڑھتا رہا۔ میں نے پھر میڑک کیا، ایف۔ اے۔ اے۔ کرچکنے کے بعد یونیورسٹی کا سٹوڈنٹس کیا تو مجھے ایک خاتون میں۔ بہت سنجیدہ سلیقہ شعار اور وہ لکھانے کا کام بھی کرتا رہا۔ جب میں لوٹ کر آیا تو مجھے ایک خاتون میں۔ بہت سنجیدہ سلیقہ شعار اور وہ بہت پڑھی لکھی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ میں کچھ لکھتی ہوں اور مجھے آپ کا شائل بہت پسند ہے اور میں چاہتی ہوں کہ آپ کی طرز کا لکھنا مجھے بھی آئے۔ میں نے ان سے کہا کہ جی میں نے لکھنا کہیں سے سیکھا تو نہیں یہ آپ کی مہربانی ہے کہ آپ میرے بارے ایسا فرمادی ہیں لیکن وہ محترمہ اصرار کرنے لگیں کہ آپ مجھے ضرور اصلاح دیں اور میری تحریروں پر Comments ضرور دیں۔ ان سے جب دوسری ملاقات ہوئی یہ جان کر میرے دل کی کلی کھل انہی کو وہ محترمہ میری وہی استاد تھیں جس کی جدائی کا دکھ میں اب تک دل میں لیے پھرتا تھا اور آج میں اپنی اس محبوب پیچر کا استاد بن گیا تھا۔ میرے اس وقت مایوس نہ ہونے نے مجھے اتنا بڑا اسہارا دیا اور میں ایک امید پر زندہ رہا۔ میں جب اپنے بچپن کی بات کرتا ہوں تو اگر آپ مجھے حق بولنے کی اجازت دیں تو میں بتاتا چاہوں گا کہ اس وقت دو مرتبہ مجھ پر

مایوس کا عالم بھی رہا تنا مایوس جس طرح ایک مرغی کی لفڑی گر جائے تو وہ ہو جاتا ہے۔ میں بھی اس قدر شدید مایوسی میں رہا لیکن اس کے بعد میں نے خدا سے کہا کہ اب بس یہ مایوسی مجھے زندگی کے بقیہ حصے میں نہیں ستائے گی۔ میں سکول میں پکی یا پہلی جماعت میں تھا۔ میرے پاس سے ایک تانگہ گزرا۔ اس تانگے کا کوچوان پچھے ظالم تھا اور وہ گھوڑے کو چھانے مار کر چلا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا اور چھانے لگنے سے بیچارہ گھوڑا اپکھڑ پیا اور بے ہوش ہو کر گر گیا۔ لوگوں نے جلدی سے گھوڑے کے بند اور راس میں کھول دیں اور لوگ اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگے لیکن وہ اٹھنے سکا۔ کسی نے کہا کہ گھوڑا اڈا کٹر کو پلاو۔ جب میں نے یہ بات سنی تو میں بہت خوش ہوا اور وہاں کھڑا ہو کر دیکھنے لگا اور گھوڑا اڈا کٹر کا انتظار کرنے لگا کہ گھوڑا اڈا کٹر آ کر کس طرح اس گھوڑے کو اٹھانے گا۔ اب میں نے مگر جانا تھا اور بستہ میرے ہاتھ میں تھا۔ گھوڑا اڈا کٹر کے انتظار میں آ دھنہ گز رگیا۔ پون گز رگیا اور پھر تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایک تانگہ آ کر وہاں رکا جس میں سے ایک آدمی اتر جو اس گھوڑے کی طرف چلا۔ اب میں کسی گھوڑا نما ڈاکٹر بارے سوچ رہا تھا لیکن وہ تو بندہ ڈاکٹر نکلا اور میرے ایک گھنٹے کا انتظار سخت مایوسی میں تبدیل ہو گیا۔ میں اس وقت واقعی یہ سمجھتا تھا کہ گھوڑوں کا علاج کرنے کے لیے گھوڑے ہوں گے اور کتوں کا علاج کرنے کے لیے کتنے ہوں گے۔ میں وہ مایوسی آج تک نہیں بھول سکا۔ وہ مایوسی میرے دل و دماغ سے جاتی ہی نہیں ہے۔

دوسری بار میں جب سخت مایوس ہوا وہ واقعہ پچھے اس طرح سے ہے کہ ہمارے سکول کے ہیئت ماضر کے میئے کے پاس ایک بڑا خوبصورت بلونگز (بلی کا بچہ) تھا۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں بھی یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میرے پاس بھی ایسا ہی کوئی بلونگز اہو۔ میں نے اپنے اباجی سے کہا کہ آپ مجھے بھی ایک بلونگز الا دیں۔ اباجی کہنے لگے کہ چھوڑیا رہو تو بڑی فضول چیز ہے۔ تجھے ہم اس سے بھی اچھی چیز لے دیں گے۔ میں نے کہا کہ نہیں آیا جی میں تو بلونگز اہی لوں گا۔ جب انہوں نے مجھے اور بھی اچھی چیز لے دینے کا وعدہ کیا تو میں بہت خوش ہوا۔ ان دنوں میری بڑی ہمشیرہ کے ہاں بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ اباجی نے کہا کہ اشفاقت تھیں ایک ایسی پیاری چیز ملے گی جسے تم اٹھا بھی سکو گے۔ وہ تمہیں پنج بھی نہیں مارے گی۔

میں نے کہا کہ مجھے اس سے اور اچھی چیز کیا چاہیے؟ خواتین و حضرات! مجھے اباجی اٹھا کے اور بڑی محبت کے ساتھ جھولاتے ہوئے ایک صبح ہمشیرہ کی طرف لے گئے۔ میں نے دیکھا کہ میری ہمشیرہ سر پر دمائل باندھے لیتی ہوئی تھیں اور ان کے پہلو میں ایک چھوٹا سا اور پیارا سا بچہ پڑا تھا۔ میرے اباجی نے وہ بچہ اٹھا کر مجھے کہا کہ لو دیکھو میں نے جب اسے دیکھا تو اس کا رنگ سرخ تھا۔ اس کی آنکھیں اور منہ ناک بند تھا۔ میں اسے تھوڑی دیر تودیکھا رہا اور میں نے پھر روتے ہوئے اباجی

سے کہا کہ نہیں اباجی مجھے بلوگنڈا ہی لے دیں۔ وہ دن بھی میری مایوسی کا دن تھا جو میں آج تک نہیں بھولا۔ اس کے بعد میں نے اپنے اللہ سے کہا کہ میں مایوس نہیں ہوں گا اور خدا کا شکر ہے کہ اب مجھ پر جو بھی کیفیت گزرے میں کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ یہ بھی خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہم سب تکلیف میں ضرور ہوتے ہیں، دکھ میں بتلا ضرور ہو سکتے ہیں لیکن ہم مایوس کی راہ پر نہیں چلتے اور یہی ہمارے دین نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہماری ساخت ان لوگوں سے مختلف ہے جو ہمارے پڑوں میں آباد ہیں۔ جن سے ہم نے یہ ملک پاکستان لیا ہے۔ آپ نے کیکر کا درخت تو دیکھا ہی ہو گا اس کی جو "مدھی" ہوتی ہے جہاں کیکر کی شاخیں آ کر گرتی ہیں۔ خواتین و حضرات سوکھا ہوا کیکر کا درخت اور سوکھی ہوئی کیکر کی "مدھی" پھاڑنی بہت مشکل ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا لکڑہارا بھی اسے آسانی سے نہیں چیر سکتا۔ اس مقصد کے لیے ایک خاص قسم کے کلہاڑے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں یہ واج کرتا رہا ہوں کہ خاص قسم کے کلہاڑے والے لکڑہارے جب اس پر کلہاڑے کی سو ضریب لگاتے ہیں لیکن وہ مدھی شس سے مس نہیں ہوتی کیونکہ مدھی میں تنے ایک خاص انداز میں ایک دوسرے کو جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور یہ سیرا مشاہدہ ہے کہ جب اس مدھی پر 101 ویں ضرب بڑتی ہے تو وہ مدھی چر جاتی ہے۔ پھر اس پر کسی سخت ضرط کی ضرورت ہی نہیں ہوتی وہ Continuous Effort اور اس مسلسل کوشش کے پیچھے ایک جذبہ کا رفرما ہوتا ہے جو اس سخت قسم کی مدھی کو جکڑے لکڑے کر دیتا ہے۔ انسان کو کسی دکھ تکلیف یا درد میں مایوس نہیں ہونا چاہیے اور ہمیں خداوند تعالیٰ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ تم ہر گز ہر گز مایوسی میں داخل نہ ہونا۔ لیکن چونکہ شیطان سے میری پرانی دوستی ہے اور روز اس سے میرا ملننا ہوتا۔ وہ مجھے کہتا ہے کہ دیکھوا شفاق الحمد تیرا یہ کام نہیں ہوا۔ تو تو کہتا تھا کہ میں یہ وظیفہ یا کام کروں گا تو خدا میرا افلان کام کر دے گا لیکن اللہ نے تیرا وہ کام کیا نہیں ہے۔ میں دکھی ہو کر اس سے کہتا ہوں کہ کام تو میرا نہیں ہوا، دعا تو میری قبول نہیں ہوئی لیکن سر میں آپ کی ذہی میں شامل نہیں ہوں گا۔ آپ مجھے مایوس کرنا چاہتے ہیں لیکن میں مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہوں۔

چاہے آپ جو مرضی کرلو۔ اب تک تو اس کے ساتھ یہ تعلق اور رشتہ قائم ہے کہ وہ مایوس کرنے کی پے در پے کوششیں کر رہا ہے اور میں مایوس نہیں ہو رہا ہوں۔ آپ زندگی میں جب بھی دیکھیں گے آپ محسوس کریں گے کہ شیطان اور پچھنیں کرتا صرف آپ کو مایوس کر دے گا کہ دیکھو تم نے اتنا پچھہ کیا لیکن پچھہ نہیں ہوا۔ لیکن جناب شیطان صاحب میں دکھی ہو سکتا ہوں، رنجیدہ ہو سکتا ہوں مایوس نہیں ہو سکتا اور یہ بھج پر اللہ کی بڑی مہربانی اور خاص عنایت ہے کہ میں بچپن کے دو واقعات کے سوا کبھی مایوس نہیں ہوا۔ میں آپ سے بھی بیکی توقع رکھتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ آپ مایوس کے گھیرے میں کبھی مت آئیے گا کیونکہ آپ اگر کبھی جہنم کے پاس شیرشاه سوری کے قلعے کے قریب گروبالا تھو

کے نیلے پر گئے ہوں وہاں چڑھائی چڑھ کر جانا پڑتا ہے اور وہاں جانے والے لوگ تو تانگے پر سوار بیٹھ رہتے ہیں لیکن کوچوان اتر کر گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ نہ اتریں اور گھوڑے کو اس بات کی تشغیل نہ ہو کہ میرا مالک بھی میرے ساتھ ہے تو وہ گھوڑا بھی اونچائی پر نہ چڑھ سکے۔ آپ لوگوں کی اس محبت کا شکر یہ کہ آپ یہاں تشریف لائے اور آپ نے میری بات سنی۔ اب میں اور آپ آج کے بعد کسی معاملے میں بھی مایوسی کے اندر داخل نہیں ہوں گے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

”لڑن رات ہو و چھڑن رات نہ ہو“

باؤ جو داں کے کہ ہر روز ابیر چھایا رہتا ہے لیکن بارش نہیں ہوتی۔ بارش کی آرزو ہم ہر روز کرتے ہیں لیکن یہ ہونیس پاتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو بہت کم کم۔ بارش اور جاندار کا چوپی دامن کا ساتھ ہے۔ جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے کہ سب جاندار پانی سے پیدا ہوئے، کچھ ایسے جو پیٹ کے بل چلتے ہیں، کچھ ایسے جو دنالگنوں کے ہیں اور کچھ ایسے جو چوپائے ہیں۔ خواتین و حضرات پانی سے ہی یہ ساری آبادیاں قائم ہوئیں اور علیم مطلق بہتر جانتا ہے کہ کب بارش کرنی ہے اور کب روکنی ہے لیکن ہم لاپچی بندے ہیں، ہم اپنے مقصد کو دیکھتے ہیں اور بارش کے لیے آرزو مند ہیں۔ ایک مرتبہ میں بذریعہ ریل کار لہاڑو سے پنڈی جا رہا تھا۔ اس وقت بارش ہو چکنے کے بعد دھوپ نکل آئی تھی لیکن ریل کار کے شیشے کے اوپر بے شمار بڑے بڑے بارش کے قطرے موجود تھے اور گاڑی ایک شیش پر رکی ہوئی تھی اور میں ان خوبصورت قطروں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایک قطرہ اپنی جگہ سے پھسلا اور درمیان میں آ کر کھڑا ہو گیا پھر ایک اور قطرہ ایک اور جانب سے آیا اور اس قطرے کے ساتھ شامل ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر کوڑ کے رہے اور پھر اس قطرے میں سے ایک قطرہ علیحدہ ہو کر شمال کی طرف چلا گیا۔ ایک جنوب کی سمت چلا گیا اور میں انہیں بڑی دیر تک دیکھتا رہا کہ اس میں سے وہ کون ہے؟ اور وہ دوسرا کون ہے؟ یعنی میں ان قطروں میں پہلے اور بعد میں آنے والے قطرے میں تمیز کرنے سے قاصر تھا۔ اس طرح انسان بھی اپنوں سے ملنے کی آرزو کرتا رہتا ہے۔ کسی نہ کسی صورت اس کا تعلق لوگوں سے ہو جائے لوگ یہ بحثتے رہتے ہیں کہ وہ پیسوں سے ہیں۔ ان کے پاس زیادہ دولت ہو وہ خیال کرتے ہیں کہ شاید زیادہ دوست ہونے سے ہمیں زیادہ آسانیاں ملیں گی اس لیے میرے اور آپ کے درمیان دولت حائل ہو گئی ہے جس نے ہمارے درمیان ایک خلیج بنادی ہے۔ ہم بڑی کوشش اور رہنمی کے باوجود ایک دوسرے سے اس طرح نہیں مل سکتے جیسے بے غرض اور بے لوث انداز میں بارش کا ایک قطرہ شیش پر سے پھسلتا ہوا دوسرے سے جاتا ہے اور پھر اس سے جدا ہو جاتا ہے اور پتہ ہی نہیں چلتا کہ کون کون تھا؟ اور کیا کیا تھا؟

اس معاملے میں ہم انسان قطروں سے پیچھے ہیں۔ ہم ایک دوسرے سے ملنے کی بجائے پیوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ یہ دور ہی ماڈی آگیا ہے بلکہ انسان کے بل ہی اتنے بڑھ گئے ہیں کہ وہ انہیں Pay ہی نہیں کر سکتا اور ان بلوں کے چنگل سے نکل ہی نہیں پاتا اور یہ مل ہماری ناجائز ضرورتوں کے باعث بڑھ گئے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ میری تجوہ یا آمدن کا سائٹ سے باسٹھ فیصلہ حصان چیزوں پر خرچ ہو رہا ہے جو 1960ء میں ہوتی ہی نہیں تھیں اور جیرانی کی بات یہ ہے کہ میں 1960ء میں بھی زندہ تھا اور میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ان سب چیزوں کے بغیر میں سن سائٹ میں حیات تھا۔ اس وقت شیپو کا تصور نہیں تھا اور ہم لاں صابن سے نہایا کرتے تھے۔ اب شیپو خریدنے کے پکڑ میں گھر کا بجٹ میرزا ہو جاتا ہے۔ اس وقت فونو ٹیکٹ نام کی کوئی مصیبت نہیں تھی اس وقت صرف لاہور کے اندر پونے دکروڑ کے قریب فونو ٹیکٹ کی مشینیں ہیں اور ایک اندازے کے مطابق دس سے بارہ لاکھ کی فونو کا پیاس روز ہوتی ہیں۔ (اتفاق احمد کا یہ پروگرام 2003ء میں نشر ہوا تھا اور یہ اندازہ اس وقت کا ہے) سکول کے بچے پہلے باتھ سے کام کرتے تھے اب فونو کا پیاس کرتے ہیں۔ عدالتوں میں جس کاغذ کی ضرورت نہیں بھی ہوتی اس کی بھی کاچپاں کرانے کی ہدایت کی جاتی ہے۔ یہ اضافی بوجہ ہم پر پڑا ہے۔ آج سے چند سال قبل موبائل فون کا کوئی چکر نہیں تھا ہر کوئی کافی کافی کافی تھا۔ زندگی ان کے بغیر بھی چل رہی تھی اور بڑی اچھی چل رہی تھی۔ یہ دباؤ ہیں جو انسان کے اوپر پڑا ہوا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ آدمی کبھی بھی پیسے کے بل پر چل کر دوسرے آدمی سے مل نہیں سکتا ہے۔ ہم انسانوں سے حد بھی کرتے ہیں، غصہ بھی رکھتے ہیں اور غربت بھی کرتے ہیں لیکن آدمی کا آدمی سے ملنے کو دل بھی ضرور کرتا ہے اور انسان انسان سے مل بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ کتاب لکھ دینے یا دانشور بن جانے سے انسان کمکل نہیں ہوتا۔ ایک آدمی بے چارہ تھا۔ سکول پیچر ہی ہو گا۔ اس نے بیوی سے کھانا مانگا۔ آگے سے انکار ہوا تو اس نے سوچا کہ چلو پیر صاحب سے مل آتے ہیں۔ تانگے والے سے کہا کہ پیسے نہیں لے چل لیکن اس نے بھی کہا کہ پیدل ہی چلو۔ اس نے بھی خیال کیا کہ میل ڈیز میل کا راستہ ہے پیدل طے کر لیتے ہیں۔ وہ کافی راستہ طے کر کے دریا کنارے گیا تو وہاں پر بھی پیسے طلب کیے گئے کہ گزرنا ہے تو پیسوں کی ادا میگی کرو۔ اب اس غریب نے اپنی دھوکی سر پر پیشی اور دریا میں چھلانگ لگا دی اور تیرتا ہوا دریا کراں کر گیا اور چلتا چلتا پیر صاحب کے حضور پہنچا۔ پیر صاحب اعلیٰ درجے کے ریشمی بستر پر جکیے لگائے ہوئے تھے اور ان کے اوگرہ پھلوں کے نوکے رکھے ہوئے تھے اور مٹھائیاں اور دیگر نعمتوں کے انبار لگائے ہوئے تھے۔ پیر صاحب مرید کو کہ کر خوش ہوئے اور ابھی وہ بے چارہ بھوکا پیسا گرتا پڑتا پیر صاحب کو درست طرح سے سلام بھی نہیں کر سکا تھا کہ پیر صاحب نے اپنی ناگن آگے کر دی کہ اس کو دابو۔ وہ مرید تھوڑی دیریناگ دباتا رہا تو پیر صاحب کہنے لگے کہ واہ بھئی واہ

ہم دونوں کو کتنا ثواب ہو رہا ہے۔

اس نے کہا کہ پیر صاحب خدا کا خوف کریں مجھے تو ثواب ہو رہا ہے آپ کو کہڑ سے ہو رہا ہے۔ پیر صاحب نے ناگواری سے ناگ اپنے کھچی اور کہنے لگے ”لے کا، ہی ثواب لئی جا۔“ (ثواب تم اکیلے ہی ثواب لیتے رہو۔)

اس طرح آدمی کو آدمی کی ضرورت رہتی ہے چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہو وہ انسان کو جلاش کرتا ہے۔

میری بھائی کی ایک بیٹی ہے جسے پیار سے بیلی کہتے ہیں۔ وہ سا ہیوال میں رہتی ہے۔ میری دوسری بھائی کی بیٹی مینا اور بیلی بڑی گھری سہیلیاں ہیں۔ وہ ہم عمر ہیں۔ مینا لا ہو رہیں رہتی ہے۔ کبھی کسی بیاہ شادی کے موقع پر ایسا بھی ہوتا ہے کہ سا ہیوال جانا پڑتا ہے اس طرح مینا ایک بار جب سا ہیوال گئی تو وہ دونوں ایک ہی بستر میں لیٹی ہوئی تھیں کہ آدمی رات کے وقت مینا کے رونے کی آواز آئی۔ بیلی کی ماں نے اس سے پوچھا کہ مینا کی بات ہے۔

مینا روتے ہوئے کہنے لگی کہ بیلی مجھے موگ پھلی نہیں دیتی۔ اس کی ماں نے کہا کہ بیلی کے پاس تو موگ پھلی نہیں ہے۔

تو وہ روتے ہوئے کہنے لگی کہ خالہ یہ کہتی ہے کہ جب بھی میرے پاس موگ پھلی ہوئی میں تمہیں نہیں دوں گی۔ وہ رورہی تھی لیکن بیلی کے بستر سے نکل نہیں رہی تھی کیونکہ نہ ہونے کے علقہ کو بھی انسان کھچی کے اپنی ذات کے ساتھ شامل کر لیتا ہے۔ لیکن اب بد قسمی سے ہم نے علقہ کا باعث پھر ساری دولت کو سمجھنا شروع کر دیا ہے۔ یہ جو خاندانی نظام آہستہ آہستہ ٹوٹ رہے ہیں اور لوگ ایک دوسرے سے بے خوب سدھ زندگی گزارنے کو ترجیح دے رہے ہیں اس کی وجہ روپے پیے کی بہتاب ہے۔ اس پیے نے نزدیکی کی بجائے دوریاں پیدا کر دی ہیں۔ جب میری آپا زبیدہ حیات تھیں تو جہلم میں ان کے پاس ایک ٹوی سیٹ تھا۔ ان کے گھر ایک ادھیز عمر شخص بیچ کس پلاس لے کر ان کا فی وی ٹھیک کر رہا تھا۔ وہ روزٹوی وی ٹھیک کرنے آتا۔ صبح صبح آ جاتا، دوپہر اور شام کا کھانا کھا کر چلا جاتا۔ میں بھی وہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں دو تین چاروں نکل دیکھتا رہا اور میں نے دیکھا کہ ساتویں دن وہ ایک نئی ٹوب لے کر آیا اس نے کہا کہ آپا جی اس نیلویژن کی ٹوب خراب ہو گئی ہے اسے یہ لگانے آیا ہوں۔ انہوں نے بھی کہا کہ ٹھیک ہے لگا دو۔ اس نے وہ ٹوب لگا دی تو وہ بنیک اینڈ وائٹ نیلویژن چلنے لگا۔ جب وہ چلا گیا تو میں نے آپا زبیدہ سے کہا کہ آپا یہ جو سات دن کوشش میں رہا اور آپ نے اسے کوشش کرنے دی اور اگر اس کی ٹوب ہی بدلتی تھی تو پہلے دن ہی بدل دی ہوتی۔ وہ کہنے لگی کہ نہیں اگر ایسا ہو جاتا تو پھر وہ بے چارہ اتنے دن کس سے ملتا۔ اس کا بھی اتنے دن دل لگا رہا اور ہمارے گھر میں بھی

رونق لگی رہی ہے۔

خواتین و حضرات! اب بندہ بندے سے ملنا پسند نہیں کرتا ہے۔ اس کا وہ پہلے سارش نہیں رہا ہے اور اب یہ تعلق اور رشتہ ایک خواب بن چکے ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ذہیر سارے ڈالر آجائے سے آپ Rich ہو جائیں گے۔ ہرگز ایسا نہیں ہو گا۔ آپ کے پاس پیسہ تو ہو گا لیکن آپ کی محرومیاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ اس کا سد باب ابھی سے کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر آپ آج اپنے بھائی بندوں سے دور ہوتے گئے اور ہمارے درمیان رخت آتا گیا تو خلیج بڑھ جائے گی اور دو طرح کے تعلیمی نصاب نے بھی ہمارے درمیان لکیر کھینچ دی ہے۔

اب آرٹ کے کلچر کے مظاہر اور شواہد میں بھی فرق ڈالا جا رہا ہے۔ بہاولپور میں ایک سکول ٹیچر جیب اللہ صاحب تھے۔ وہاں ایک کرم الہی صاحب بھی تھے وہ بھی استاد تھے۔ وہ ایک ساتھ کافی عرصہ اکٹھے پڑھاتے رہے اور ریاضت میٹ کے بعد جدا ہو گئے۔ ان میں بڑا پیار تھا۔ کرم الہی صاحب لا ہور آگئے جبکہ جیب اللہ صاحب بہاولپور میں ہی رہے۔ ایک دفعہ جیب اللہ صاحب بہاولپور سے ملتان گئے۔ ملتان بہاولپور سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے۔ وہ وہاں اپنا کام کرنے کے بعد رات کو بس پکڑ کر ساہیوال پہنچ گئے۔ ساہیوال بس سینڈ سے یکہ لے کرم الہی صاحب کے گاؤں چک گ۔ ب یا ای۔ بی۔ جو بھی تھا وہاں چلے گئے اور اپنے بیار قدم کے گھر پر دستک دی۔ جیب اللہ صاحب کہنے لگے کہ میں چائے تو لاری اڑے سے ہی پی آیا ہوں۔ چلیں اکٹھے چل کے نماز پڑھتے ہیں۔ (اس وقت فجر کی اذان ہو رہی تھی) انہوں نے کہا کہ ملتان آیا ہوں ساہیوال قریب ہی ہے چلو کرم الہی سے مل آتا ہوں۔ خواتین و حضرات بہاولپور سے ملتان اتنا سفر نہیں ہے جتنا ملتان سے ساہیوال ہے لیکن وہ اس سفر کو ”قریب ہی“ کا نام دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے بیار عزیز سے کہا کہ تم سے ملتا تھا مل لیا۔ تمہیں دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی اور اکٹھے فجر پڑھ لی اور اب میں چلتا ہوں۔ کرم الہی صاحب نے بھی کہا کہ: سمِ اللہ آپ کے دیوار سے دل خوش ہو گیا۔

خواتین و حضرات! ہم ایسے نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ایک ایسا بیچارہ شہر بھی ہے جہاں بڑے بھول اور با غم ہیں۔ وہ برا خوبصورت بھی ہے لیکن وہاں کوئی بھی کسی سے ملنے نہیں جاتا۔ بلکہ کام کی غرض ہی انسان کو وہاں لے جاتی ہے۔ وہ شہر اسلام آباد ہے۔ میں یہ کہتے ہوئے معانی چاہتا ہوں کہ میں بھی وہاں جب گیا ہوں کسی نہ کسی کام کے سلسلے میں گیا ہوں اور کام کے ہو چکنے کے فوراً بعد وہاں سے لوٹ آیا ہوں۔ مجھے اس بات کی وجہ سے اسلام آباد پر پیار بھی آتا ہے۔ وہاں میرے بہت پیارے دوست بھی رہتے ہیں جن میں نادر، عمر اور فراز بھی ہے لیکن وہاں جانا صرف کام کی غرض سے ہی ہوتا ہے۔

جوں جوں انسان کے درمیان فاصلے ہوتے جا رہے ہیں اور نظر نہ آنے والی درازیں پڑتی جاتی ہیں۔ انسان بیچارہ ان فاصلوں کو پیسوں کی کمی سے جوڑ رہا ہے اور اس نے سارا زور معاشر پوزیشن بہتر کرنے پر لگا رکھا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر معاشر صورتحال اچھی ہو گئی اور انسانوں کا منہ ایک دوسرے کے مقابل رہا تو پھر ان پیسوں داروں کا آخر کیا فائدہ ہو گا؟ اس لیے ہمیں اپنے طور پر سوچنا پڑے گا کہ چاہے ایک دوسرے سے لٹائی ہوئی رہے لیکن وچھوڑا تو نہ ہو جس طرح پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ ”لڑن رات ہو پر وچھڑن رات نہ ہو۔“

جب ہم کافی میں پڑھتے تھے تو ہم سینما دیکھنے جایا کرتے تھے۔ عام طور پر گھروالے ہمارا سینما جانا پسند نہیں کرتے تھے لیکن ہم چلے جایا کرتے تھے۔ ان دنوں سینما کی نکت خریدنے کے لیے کاشی چوک میں ایک قطار لگتی تھی۔ ایک دفعہ ہم قطار میں کھڑے تھے اور قطار بہت لمبی تھی۔ اس قطار میں ایک بڑی داڑھی والا آدمی بھی کھڑا تھا۔ اس نے پرانی سی داسکٹ پہنی ہوئی تھی اور اس کی بیت کچھ اچھی نہ تھی۔ نوجوان جو اس شخص کو اور اس جیسے دیگر لوگوں کو پسند نہیں کرتے ویسا ہی ایک نوجوان وہاں تھا۔ اس نے اس شخص سے کہا ”بابا جی تی فلم دیکھنی اے۔“

اس نے جواب نہیں دیا۔ تو نوجوان نے غصے سے کہا کہ پھر تم قطار میں کیوں پھنسنے کھڑے ہوئے۔ وہ کہنے لگا ”جی میں بندیاں دے کوں ہونا چاہتاں والے مینوں کوئی نیڑے نہیں آن دیندا۔“ (میں لوگوں کے قریب آنا چاہتا ہوں لیکن مجھے کوئی اپنی قربت اختیار نہیں کرنے دیتا ہے۔)

اس شخص نے کہا کہ میں اس غرض سے ہر روز لائن میں آکے کھڑا ہو جاتا ہوں اور اس طرح میرے ہر طرف آدمی ہی آدمی ہوتے ہیں حالانکہ میں نے نہ کبھی فلم دیکھی ہے اور نہ ہی دیکھنی ہے۔

ایسے ترستے ہوئے لوگ بھی ہیں اور اس قسم کے بے شمار لوگ ہمارے اروگرد ہیں جن کو انسانی کندھے کی ضرورت ہے لیکن بیچارے انسان کا یہ المیہ ہے کہ وہ ایسے ہی گھبرا یا رہتا ہے۔ مجھے وہ بابا باب بھی یاد ہے جو ایک دن اپنی 80 سال کی بورڈھی بیوی کو مر جا مر جا کہے جا رہا تھا۔ میں وہاں سے گزر رہا تھا۔ اس سے پوچھا کہ بابا آخر قصہ کیا ہے۔ تو وہ کہنے لگا کہ یہ دوائی دیکھی تو وہ عامہ ملٹی و نامن کی گولیاں تھیں۔ کسی خاص بیماری کی بھی نہیں تھیں۔ میں نے کہا کہ بابا تو نوے سال کا ہے اور یہ اسی سال کی بڑھیا۔ اب تو اسے مرنے دے تو نے اس کا کیا کرنا ہے تو وہ بابا کہنے لگا صاحب جی اس کی بڑی ضرورت ہے۔ یہ انتیں پا تھے والوں کی بیٹی ہے اور روزے اکٹھے کرنے والوں کی اولاد ہے۔

وہ کہنے لگا کہ صاحب جی ”ایسی دبی بڑی لوڑاے۔ جدوں میں سویرے سے شام تکر کنکر کنکر روڑے روڑے ہو جاتا ہوں تو چونکہ اس کو روڑے اکٹھے کرن داول آنداء اے اور ایہہ میرے روڑے

کنکرا کشٹے کر کر مینوں فیر زندہ کر دیتی ہے۔“

خواتین و حضرات! ایسے لوگ آپ کے شہر میں ابھی بھی موجود ہیں جو اس لیے قریب قریب بیٹھے ہیں جو دوسرے کو نکھرنے سے بچا لیتے ہیں۔

میری اپنی ذاتی آرزو ہے کہ پیغمبر واقعی ضروری چیز ہے لیکن انسان کا احترام زیادہ لازمی ہے۔ اس سے آپ کو زیادہ خوشی، محبت، حدت اور Love عطا کر سکتا ہے جو آپ کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ میری دعا اور آرزو ہے کہ ہم سب انسانوں کے قریب آئیں اور ان کو سختی کی کوشش کریں چاہے بلی اور ٹینا کی لڑائی کی صورت میں یا گورنمنٹ کالج کے عقب میں رہنے والے اس بڑھے بابے کی طرح جو اپنی بوڑھی بیوی سے لڑ رہا تھا اور اس کی لڑائی میں بے پناہ محبت پہنچتی اور وہ ایک دوسرے کے لیے زندہ رہنا چاہتے تھے۔

اللہ آپ کو آسمانیاں عطا فرمائے اور آسمانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

توکل

ہم سب کی طرف سے اہل زادہ کو سلام پہنچے۔ اس میز پر ہم گزشتہ کئی ماہ اور ہفتوں سے پروگرام کر رہے ہیں۔ اس میز پر کچھ کھانے پینے کی اشیاء ہوتی ہیں۔ ابھی ایک الحقول میں حاضرین سے درخواست کر رہا تھا کہ یہ آپ کے لیے ہیں اور آپ انہیں بڑے شوق سے استعمال کر سکتے ہیں لیکن ہم زندگی میں اتنے سیا نے محتاجِ عقل مند اور اتنے ”ڈر اکل“ ہو گئے ہیں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید اس میں کوئی کوتا ہی یا غلطی ہو جائے گی اور جب میں اس بات کو ذرا وسیع کر کے دیکھتا ہوں اور اپنی زندگی کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم صرف احتیاط کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں اور جب اس کو ذرا وسیع تردازے میں میں پھیلاتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے کہ میں اور میرے معاشرے کے لوگ سارے کے سارے ضرورت سے زیادہ خوفزدہ ہو گئے ہیں اور انہیں ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں ہم سے کوئی کوتا ہی نہ ہو جائے۔ ہم آج کل نقصان کی طرف مائل ہونے کے لیے تیار نہیں ہوتے اسی لیے اگر ہم کو کوہ پیائی کرنا پڑے۔ ہماری کی چوٹی سر کرنی پڑے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ تو برا ”رسکی“ کام ہے۔ رسک کا ہے کویا مہتر نہیں ہے کہ آرام سے رہیں اور چار پیسے بنانے کے لیے کوئی پروگرام بنائیں۔ چار پیسے بنانا اور اپنی مالی زندگی کو مزید مستحکم کرنا کچھ ضرورت سے زیادہ ہو گیا ہے۔ ہم تعلیم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ یہ ہم کو فائدہ دے گی یا ہم اس سے پیسے حاصل کریں گے اور تعلیم کا تعلق ہم نوکری کے ساتھ جوڑتے ہیں حالانکہ علم اور نوکری کا آپس میں کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر ایمانداری کے ساتھ دیکھا جائے تو پتہ یہ چلتا ہے کہ علم حاصل کرنا تو ایک اندر کی خوبصورتی ہے۔ جیسے آپ باہر کی خوبصورتی کے لیے پاؤ ڈر لگاتے ہیں اور میک اپ کرتے ہیں۔ لڑکیاں لپ اسٹک اور کاجل لگاتی ہیں اسی طرح انسان اپنی روح کو بالیدگی عطا کرنے کے لیے علم حاصل کرتا ہے۔ لیکن ہم نے علم کو نوکری سے وابستہ کر دیا ہے۔ آئے روز اخباروں میں چھپتا ہے کہ جی تین ہزار نوجوان ایم۔ بی۔ اے ہو گئے ہیں انہیں نوکری نہیں ملتی۔ ایک زمانے میں میں یہ بات سمجھنے میں پھنس گیا کہ صاحب علم کون ہوتے ہیں اور یہ بات میری سمجھو اور گرفت

میں نہیں آتی تھی۔

میں یونیورسٹی میں دوستوں اور پروفیسروں سے اس بابت پوچھا لیکن کوئی خاطرخواہ جواب نہ ملا۔ پھر میں نے ولایت والوں سے خط و کتابت میں پوچھنا شروع کیا اور ان سے پوچھا کہ

Who is Educated Person in the Real Sense of its Term.

ان کی طرف سے موصول ہونے والے جواب بھی ایسے نہیں تھے جن سے میں مطمین ہو جاتا۔ میرے پاس لوگوں کے اس بابت جوابات کی ایک موٹی فائل اکٹھی ہو گئی۔ ایک دن میں اپنے باباجی کے پاس ڈیرے پر گیا۔ اس دن ڈیرے پر گا جرگوشت پکا ہوا تھا۔ مجھے کہنے لگے کہ کھاؤ۔ میں نے کھانا کھایا اور وہ فائل ایک طرف رکھ دی۔ گرمیوں کے دن تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ اشراق میاں یہ کیا ہے۔ میں نے بتایا یہ فائل ہے۔

کہنے لگے یہ تو بڑی موٹی ہے اور اس میں کافی زندگی کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جی یہ آپ کے کام کے نہیں ہیں۔ یہ انگریزی میں ہیں۔

وہ دیکھ کر کہنے لگے کہ اس میں تو چھیاں بھی ہیں۔ ان پر نکٹ بھی لگے ہوئے ہیں اور ان پر تو بڑے پیسے لگے ہوں گے۔

مجھے سے فرمائے گئے کہ تو باہر خط کیوں لکھتا ہے؟ میں نے کہا باباجی ایک ایسا منکر سامنے آ گیا تھا جو مجھے باہر کے لوگوں سے حل کروانا تھا کیونکہ ہمارے باش ساری دلنش ختم ہو گئی ہے۔ وہ کہنے لگے اسی کوئی بات ہے میں نے انہیں بتایا کہ میں ایک مسئلے میں الجھا ہوا ہوں۔ وہ یہ کہ آخر صاحب علم کون ہوتا ہے؟

وہ کہنے لگے۔ بھی تم نے اتنا خرچ کیوں کیا۔ آپ میرے پاس ڈیرے پر آتے اور یہ سوال ہم سے پوچھ لیتے۔ ہمارے باباجی باوصف اس کے کہ زیادہ پڑھ لکھے نہیں تھے انہیں ایک لفظ "Note" آتا تھا۔ جانے انہوں نے کہاں سے یہ لفظ سیکھا تھا۔

مجھے کہنے لگے "Note"!

"صاحب علم وہ ہوتا ہے جو حضرت کے مقام پر اپنی جماعت میں سب سے آگے ہو اور جب انعام قسم ہونے لگے تو جماعت میں سب سے پیچھے ہو۔"

یہ سننے کے بعد میں برا خوش ہوا کیونکہ جب انسان کو علم عطا ہو جاتا ہے تو اس کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں اور ممکن ہے میرا یہ خیال غلط ہو لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے ہاں کسی نہ کسی طرح سے علم کی کمی ہو رہی ہے اور احتیاط کی زیادتی ہو رہی ہے۔ میں خود بڑا احتیاط ہوں۔ میرے پوتے، نواسے نواسیوں کی تعداد بڑھی تو میں ایک خوفزدہ انسان میں تبدیل ہو گیا کہ ان کا کیا بنے گا۔ یہ کہہ

جا میں گے؟ ایسے کیوں ہوگا؟ دھوپی کا خرچ کم کیسے ہوگا؟

میں ہر وقت یہی سوچنے میں لگا رہتا تھا۔ اس سے خرابی یہ پیدا ہوتی ہے جو میں اپنے میں اپنے دوستوں اور عزیز وقارب میں دیکھتا ہوں کہ خدا کی ذات پر سے اعتماد کم ہونے لگا ہے۔ جب آدمی بہت محاط ہو جاتا ہے تو پھر ذرا وہ گھبرا نے لگتا ہے اور ہم سب اس قسم کی گھبراہٹ میں شریک ہو گئے ہیں۔ اگر اس گھبراہٹ کو زرا آگے بڑھایا جائے تو اس کے نقصانات بھی بہت زیادہ دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ہم عموماً ایک جملہ بولتے ہیں کہ ”جی بڑا دنبر کام ہو رہا ہے۔“ اس کی وجہ بھی گھبراہٹ ہی ہے۔ جب ہم خوف اور گھبراہٹ کے پیش نظر یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں کہ کہیں مجھ میں مالی کمزوری پیدا نہ ہو جائے دنبر کام کرتے ہیں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ 1866ء میں ہندوستان کا ایک واپسی تھا۔ (میرا خیال ہے کہ لارڈ کرزن ہی ہوگا) اس کو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں جا کر Cultural Pattern تلاش کرنے کا بڑا شوق تھا اور بھارت میں میوزیم وغیرہ اس نے Sattle کیے تھے۔ وہ ایک دفعہ ایک گاؤں گیا۔ اس نے وہاں اپنا کمپ لگایا۔ اس کے ساتھ دواڑھائی آدمیوں کا اس کا عملہ بھی تھا۔ اس وقت واپسی تھے بڑی زبردست اور Powerfull چیز ہوا کرتی تھی۔ لارڈ کرزن لکھتا ہے کہ جب وہ اپنے کمپ میں سویا ہوا تھا تو آدمی رات کے قریب مجھے اپنے سینے پر بہت بوجھے محسوس ہوا۔ وہ بوجھا اس قدر زیادہ تھا کہ مجھے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ جب میں نے لیئے لیئے آنکھ کھوئی تو کوئی پچیس تیس سیر کا کوبراء میرے سینے پر بیٹھا ہوا تھا اور اس نے پھن انھیا ہوا تھا اور اس کو برے کا منہ میرے چہرے کی طرف تھا اور ہر لمحے ندگی اور موت کے درمیان فاصلہ کم ہوتا چلا جا رہا تھا لیکن میں ہلانہیں بلکہ اسی طرح خاموش لینا رہا اور کوئی حیج و پکار نہیں کی اور میں اس انتظار میں تھا کہ چونکہ خدا کی طرف سے بھی کبھی نہ کبھی تائید غیبی انسان کو پہنچی ہے اور میں اس کا انتظار کرنے لگا۔

خواتین و حضرات اس طرح کے لمحات میں اس طرح کی سوچ ایک بڑے جو صلے اور اعتماد کی بات ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے دوسرا ہی لمحے میں نے دیکھا کہ میرے کمپ کا پردہ اٹھا کر ایک آدمی اندر داخل ہوا۔ اس آدمی نے جب صورتحال دیکھی تو وہ ائمہ پاؤں و اپس چلا گیا اور اس نے دودھ کا ایک بڑا سامراجان لیا اور اس میں گرم دودھ ڈالا اور اس آدمی نے وہ دودھ بڑی ہمت کے ساتھ سانپ کے آگے رکھ دیا۔ جب سانپ نے دودھ کا مرجان یا جگ دیکھا اور اس نے دودھ کی خوبصورتی کی تو سانپ مرجان کے اندر داخل ہونے لگا اور مزے سے دودھ پینے لگا۔ جب سانپ اس کے مکمل اندر جا چکا تو اس شخص نے مرجان کو بند کر دیا۔ لوگوں کو جب واقعہ کا پتہ چلا تو ہر طرف حال دوہائی مچ گئی اور سارے اعلمه کمپوں سے باہر آ گیا۔ واپسی صاحب اس شخص سے بڑے خوش ہوئے اور کہا کہ اس شخص کو انعام ملنا چاہیے۔ اس شخص نے کہا کہ جی میں نے آپ کی جان بچائی ہے۔ میرے لیے یہ بھی

ایک بہت بڑا انعام ہے میں اور کچھ لے کر بھی کیا کروں گا۔ لوگوں نے دیکھا کہ یہ تو ہمارے عملے کا آدمی ہے ہی نہیں۔ یہ تو کوئی باہر کا آدمی ہے۔ پھر اس سے استفسار کیا کہ تم کون ہو؟ وہ کہنے لگا کہ بھی میں بندھر گھنڈ کا نامی گرامی چور ہوں۔ میں یہاں چوری کی نیت سے آیا تھا اور میں نے سوچا کہ واپس رائے جو کہ بادشاہ وقت کی طرح ہے اس کے کمپ سے قسمی چیزیں ملیں گی اور جب میں کمپ کے اندر داخل ہوا تو میں نے یہ میں دیکھا اور یہ اب آدمیت کا تقاضا تھا کہ میں اپنا پیشہ ایک طرف رکھوں اور جان بچانے کا کام پہلے کروں۔

خواتین و حضرات! اللہ کی مدد ایسے بھی آجاتی ہے اور اتنے محتاج ہونے کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن بھی بھی اپنے آپ کو آسودگی عطا کرنے کے لیے کچھ کچھ ڈھیلا رہنے کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی تھوڑا آرام بھی کر لینا چاہیے۔ کبھی کبھار سیٹی بھی بجائی چاہیے۔ میں جب اپنے مشوہد نے پچھوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا تم کویٹی بجائی آتی ہے تو وہ فنی میں جواب دیتے ہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ ان کے پاس سیٹی بجائے کا وقت ہی نہیں ہے۔ مجھے اپنے ساتھیوں اور ہم وطنوں کو تھی ہوئی زندگی گزارتے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو رسیوں میں جذب رکھا ہے۔ کوئی دن یا کوئی تھوڑا بھی انہوں کیا جاتا۔ بلکہ وہ ایک عذاب میں پڑے ہوئے ہیں۔

ایک مرako کا بادشاہ تھا۔ اس کی عمر کوئی اتنی سو برس کے قریب تھی۔ وہ ایک شخص سے ناراض ہو گیا اور اس بارے حکم دیا کہ اس کو زندگی میں ڈال دیا جائے اور کل صبح بجے جادا بلا کر اس کا سر قلم کر دیا جائے۔ اب وہ شخص صبح بجے کا انتظار کرنے لگا اور وہ خوفزدہ نہیں تھا۔ اس نے جیل کے داروغہ کو دیکھا جسے شترنج کھیلنے کا بڑا چکا تھا اور اس سے کہا کہ سرا آجا میں پیشیں ایک بازی تو لگ جائے۔ اس نے بھی کہا کہ آ جاؤ۔ وہ شترنج کھیلنے لگے اور اس بندے نے جس نے حکم شاہی کے مطابق قتل ہونا تھا نے داروغہ کو شکست دے دی اور داروغہ سے کہا کہ اب آپ آرام کریں صبح ملیں گے۔ جب اس کے قتل نے داروغہ کو شکست دے دی اور داروغہ سے کہا کہ اب آپ آرام کریں صبح ملیں گے۔ قتل و قتل تو روز کا کام ہے ہوتا ہی رہے گا۔ وہ قیدی اس سے کہنے لگا کہ تیراستیا ناس بادشاہ نے نہ صرف تیری توکری فتح کر دینی ہے بلکہ میرے ساتھ تھے بھی قتل کروادیا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی کھیلنے لگا۔ وہ صبح سے شام تک کھیلتے رہے۔ بازی پھنس جاتی تو اگلے دن پھر چلتی۔ اسی طرح چار راتیں ہو گئیں۔ (یہ میں آپ سے ایک Historical Fact بیان کر رہا ہوں)۔ اور اس کے قتل کیے جانے کا وقت بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ وہ ایک شام کو بیٹھے شترنج کھیل رہے تھے کہ ایک شخص دھول سے اٹا ہوا اور سر پت گھوڑا دوڑا اتا ہوا ان کی طرف آیا۔ وہاں پہنچ کر وہ اس قیدی کے قدموں میں گر گیا اور پکار کر کہنے لگا ”با ادب بالماحتظہ ہوشیار شہنشاہ جہاں فلاں فلاں، شہنشاہ مرako“۔

اب جیل کا داروغہ اور وہ قیدی حیران و پریشان کھڑے دیکھ رہے ہیں اور اس سے پوچھا کہ کیا ہو۔ اس نے بتایا کہ بلا یکوں نے مرako کے بادشاہ کو قتل کر دیا ہے اور آپ چونکہ اس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ اب آپ ہی تخت و تاج کے وارث میں لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایک اکیلے مجھے علم تھا کہ آپ زندہ وسلامت ہیں۔ چنانچہ اس کو بڑی عزت و احترام کے ساتھ گھوڑے پر بٹھا کر لا لایا گیا اور جس بادشاہ نے اس کے قتل کا حکم نامہ جاری کیا تھا اسی کے تخت پر بٹھا دیا گیا اور وہ بادشاہ بن گیا۔ یہ ٹینش اور ڈپریشن کا مرض اس قدر طالم مہلک اور خطرناک ہے کہ کوئی منزہ، کوئی گولی اور کوئی جادو لوٹنا آپ کی مدد نہیں کر سکتا اور جوں جوں خدا کی ذات پر بے اعتماد امتحنا جا رہا ہے یہ مرض بڑھتا چلا جا رہا ہے اور اس کو دور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ چلنے اپنی زندگی کے 365 دنوں میں چاروں توایے نکال لیں کہ واقعی ان دنوں میں اللہ پر اعتماد کر کے بیٹھ جائیں۔ میرے پیارے ملک کے پیارے لوگ اس قدر کچھاؤ میں ہیں کہ ہر وقت خوف کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے غالباً یہ وال را دھارا میا یا رابجہ جنگ کی بات ہے کہ وہاں ایک بینک مکلا۔ وہ چلتا رہا۔ ان علاقوں میں بینکوں کی ڈیکیتیاں عام ہیں۔ اب کسی ڈیکیت نے سوچا کہ یہ قبیلے کا بینک ہے اس میں آسانی سے واردات ہو سکتی ہے لہذا اس نے اپنی کلاشنوف لی۔ جیپ باہر کھڑی کی اور اس نے اس بینک میں ایک گولی فائر کی اور سب کوڑا کر ہینڈز اپ کر دیئے اور کیشیز کے آگے جتنی رقم تھی وہ اس نے اپنے قبیلے میں ڈال لی۔ اس رقم میں سارے ملے جلنے نوٹ تھے۔ جب وہ بینک سے باہر نکلا تو عجیب سماں تھا۔ اس کے فائر کرنے کی وجہ سے باہر لوگوں کو صورتحال کا اندازہ ہو چکا تھا اور ان گاؤں والوں نے اس بینک ڈیکیت کو اپنی عزت بے عزتی کا معاملہ بنا لیا تھا اور وہ اپنے گھروں سے اپنی پرانی بندوقیں نکال کر باہر لے آئے۔ کسی کے پاس رانفل بھی تھی اور وہ سارے اکٹھے ہو کر آئے اور آتے ہی اس ڈیکیت جیپ کے ٹائرز پچھر کر دیئے۔ پھر شور پھانا شروع کر دیا۔ اس ڈیکیت نے بھاگنے کی کوشش کی اور فائر بینگ کرتا رہا لیکن وہ لوگ بھی ارادے کے پکے تھے اور انہوں نے ٹھیڑا کر لیا۔ جب ڈیکیت کے ہاتھ سے روپوں والا تھیلا چھوٹا تو نوٹ بکھر گئے۔ اب لوگوں نے ڈیکیت کو تو جانے دیا لیکن روپوں کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا اور سارے نوٹ سنبھال کر بینک ملیجھ کو دے آئے۔

خواتین و حضرات یہ دنیا کی واحد بینک ڈیکیت ہے جس میں بینک کو 32 روپے کا فائدہ ہوا کیونکہ کئی لوگوں کی جیبوں سے گر کر پیسے اس رقم میں شامل ہو گئے تھے اور اس طرح بینک نے لوٹے ہوئے 28 ہزار کی جگہ 28 ہزار 32 روپے حاصل کیے۔

برداشت کرنے اور حوصلہ کرنے سے کچھ ایسے فائدے کی راہیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ پریشان ہونے کی اس لیے بھی ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ تو ہو کر رہے گا جو ہو کر رہے والا ہے۔

بہتر ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل
 لیکن کبھی کبھی اسے تھا بھی چھوڑ دے
 اب میں آپ لوگوں کو پختے ہوئے نہیں دیکھ سکتا اور میری آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ آپ ایک
 سہل زندگی بس کرنے کی کوشش کریں تاکہ بہت سے بڑے بڑے کام جوان تنظار کر رہے ہیں اور بہت سی
 فتوحات جو آپ نے کرتی ہیں وہ آپ کر سکیں اور یہ اسی صورت ممکن ہو گا کہ آپ خداوند تعالیٰ پر مکمل
 یقین رکھیں اور قلب کو بھی مانیں۔ آپ ۹۹ فیصد مادہ پرستی کو تھامے رکھیں اور صرف ایک فیصد تو اپنی
 ذات کو آزادی کی اجازت دے دیں اور کہہ دیں کہ اگر آج سور و پے کا نقصان ہونا ہے تو ہو لے کوئی
 بات نہیں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ آمين۔ اللہ حافظ۔

بانسری

ہمارے زمانے میں بڑی گھری گھنگور گھٹا کیں گھر کر آیا کرتی تھیں اور چھما چھم بارشیں ہوا کرتی تھیں۔ اب بڑی دیر سے ہم ویسی بارشوں کے انتظار میں ہیں اور آرزو میں لے کر بیٹھے رہتے ہیں لیکن ویسی بارشیں آتی نہیں ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں اور ضروری نہیں کہ میرا محسوس کرنا درست ہو۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ گھنگور گھٹا میں بہت گھمبیر خیالات کی صورت میں اب ہمارے وجود سے باہر کی بجائے ہمارے وجود کے اندر سانے لگی ہیں اور دماغوں پر اثر انداز ہونے لگی ہیں۔ میں یہ بات اس لیے کہ رہا تھا کہ ابھی پروگرام شروع ہونے سے پہلے ہم نیکلو اور پاڑنی کی بات کر رہے تھے۔ آج کی جو نئی نسل ہے وہ بہت زیادہ پریشانی کے عالم میں بنتا ہے۔ ایک تو یہ بات ان کے چہروں سے عیاں ہوتی ہے اور دوسرا ان کی پریشانی شہری اور درخشن مستقبل کی نوید اور امید نہ ہونے کی بدولت ہے۔ جب بچے پریشان ہوں تو ظاہر ہے کہ بڑے پریشان ضرور ہوتے ہیں۔ باوصف اس کے کہ بڑے اپنی بڑائی کی وجہ سے اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر چھا ایسے روئے اختیار کر چکے ہیں جن روایوں نے انہیں سکون عطا کر رکھا ہے لیکن وہ ان بچوں کی مد نہیں کر سکتے جنہوں نے بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کر رکھی ہیں۔ میں ان کے لیے ڈپریشن کا لفظ استعمال تو نہیں کرنا چاہتا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان کے اندر Negativity کے ایسے بادل چھا گئے ہیں کہ ان سے نکلا ان کے لیے بہت مشکل ہو گیا ہے جو بچے بچیاں مجھ سے ملتے ہیں تو ان کے خیالات ایسے تکلیف دہ ہوتے ہیں کہ میں انہیں آپ کے سامنے پوری تفصیل کے ساتھ بیان کرنے لگوں تو شاید آپ پر بھی ویسا ہی بوجھ پڑ جائے جیسا ان کے والدین یا میرے جیسے آدمی پر ہے۔

Negativity کی عام مثالیں بالکل سیدھی سادی یہ ہیں کہ ایک بچہ جس نے بی کام کیا ہے اور وہ تازہ ترین کمپیوٹر کے علم سے بھی آشنا ہے لیکن گھمبیر خیالات نے انہیں ایسے گھر رکھا ہے کہ وہ خیال کرتے ہیں کہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ میں کامیاب ہونے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا۔ یہ سارے

مسئلہ ہمارے گھرانے کے لیے ہی ہیں۔ ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ وہ اسی گھبراہٹ میں بتلا رہتا ہے۔ جو معیشت کے ماہر ہیں وہ پروگرام بناتے رہتے ہیں کہ توجہ انوں کو زیادہ تو کریوں کی ضرورت ہے لیکن میں بہت عاجزی کے ساتھ یہ سمجھتا ہوں کہ معیشت کے ساتھ ہی اس کا حل وابستہ نہیں ہے۔ انہیں کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے جو ہم بڑے انہیں دے نہیں رہے ہیں اور ان پھوپھو کے ذہنوں میں تکلیف وہ خیالات جنم لے رہے ہیں۔ تو جوان اس مایوسی میں ہیں کہ میں نے امتحان تو دے دیا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو سکوں گا۔ جو بال پھوپھو والے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میں نے بھی کی شادی تو کر دی ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ یہ بے گنی نہیں اور لوٹ کے گھر آجائے گی اور اس طرح کے خیالات ہر وقت ان کے ذہن میں گھومتے رہتے ہیں۔ ایسے خیالات کو زندگی سے نکالنا نہیں جاسکتا اور ان کا کوئی علاج بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ یہ غیر اختیاری رحمات یا خیالات ہوتے ہیں اس لیے آتے ہی رہیں گے اور ان پر ہمارا کوئی زور نہیں چلتا ہے لیکن انہی مخفی تصورات کا ایک علاج ضرور نکالا جاسکتا ہے کہ اے بچو بھلے آپ اپنے ذہنوں کے اندر ایسے مخفی خیالات کو تو رہنے دیں لیکن اپنے اندر ایک ایسا روایہ ضرور اختیار کریں جو ان مخفی خیالات کے ہونے کے باعث آپ کو ثابت انداز اختیار کرنے پر راغب کرے۔ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ جب بھی بے شمار مخفی خیالات میں گھریں اور آپ کو مستقبل تاریک نظر آئے تو آپ جس مقام پر بھی ہوں وہاں سے باہر نکل کر کھلی جگہ پر آ جائیں اور کھلی جگہ پر آ کر دونوں پاؤں کے درمیان ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ رکھیں۔ کندھے پیچھے رکھتے ہوئے سیدہ آگے نکال کر اور شہزادی اور پر اخشا کر آنکھیں آسان کے ساتھ ملا کر ایک بہت سی گمراہانس لیں (یہ ضروری ڈرل ہے جو خاص کراس مقصد کے لیے ہے) اور پھر اس گھرے سانس کو روک کر یہ کہیں کہ ”میرے اللہ مجھے طاقت عطا کرتا ہے اور میں طاقتوں ہوں۔“

بچو! یہ وہ مشق یا ڈرل ہے جو کی جانی چاہیے جس سے فائدہ پہنچتا ہے۔ جب آپ اس ڈرل میں داخل ہوں گے تو آپ کو طاقت آتی محسوس ہوگی۔ چینی لوگ اس بارے کہتے ہیں کہ یہ طاقت اللہ کی طرف سے انسان کو عطا کی گئی ہے یہ کائنات کے اندر ہر جگہ موجود ہے جسے آپ ہاتھ پھیلا کر سمیت سکتے ہیں اور اپنے اندر داخل کر سکتے ہیں۔ ہمارا ہاتھ پھیلا کر دعا مانگنے کا طریقہ ویگر مذاہب سے یوں مختلف ہے کہ چینی ایک مخصوص خدا کی طاقت کو جسے وہ ”چی“ یا ”کی“ بولتے ہیں معلوم نہیں اس کا اصل تنفظ کیا ہے۔ اس طاقت کو سمیت کر چہرے پر ہاتھ مل کر حاصل کرتے ہیں اور دعا مانگ کر کرتے ہیں کہ ہم نے اس قسم کی طاقت کو حاصل کر لیا ہے جو خدا نے ہمیں دی ہے اور آپ دعا مانگ کر ہاتھ چہرے پر پھیر کر اس طاقت کو Seal کر دیتے ہیں اور جو پانچ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں وہ اس طاقت کو Seal کر کے اپنے وجود میں ڈال کے مضبوطی اور کامیابی کے ساتھ سیل کر دیتے ہیں۔ میں

روپیوں کی بات کر رہا تھا کہ اگر منفی خیالات اور تھکادینے والے اور تکلیف دہ خیالات آپ کی جان نہیں چھوڑتے تو آپ اپنے روپیے میں تبدیلی ضرور پیدا کریں۔ معلوم نہیں آپ نے گزشتہ دنوں ایک ڈج گرنٹ کی شائع ہونے والی رپورٹ پڑھی ہے کہ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ میں افغانستان میں تھا اور کہیں دور نکل گیا اور میں نے چھوٹی پہاڑیوں کے سلسلے میں باسری کی بہت ہی خوبصورت آواز سنی اور میں محور ہو گیا۔ وہ آوازن کر میرے قدم خود بخود اس جانب اٹھنے لگے۔ آگے جا کر میں نے دیکھا کہ پہاڑی کے اوپر ایک نوجوان چڑواہا جو چھوٹی عمر کا تھا میبھا بانسری بخارا ہے۔ میں نے قریب جا کر دیکھا کہ اس کے پاس سیاہ رنگ کی ذرا سی بُنی بانسری تھی۔ میں اس کی زبان تو نہیں جانتا تھا۔ اشارے سے اسے بانسری دکھانے کو کہا تو اس نے وہ بانسری مجھے دکھائی اور یہ دیکھ کر میری جیرانی کی کوئی انتہاء رہی کہ وہ بانسری جس کو وہ بخارا ہے اور میرے قدم خود بخود اس کی طرف اٹھ رہے تھے وہ رائق کی ایک نال تھی جس کو اس نے کاٹ کر ایک طرف سے بند کر رکھا تھا اور اس میں سے چھ سو راخ بنائے ہوئے تھے اور اس میں سے ایک ہوادینے کا سوراخ تھا اور میں اسے دیکھ کر جیران و پریشان تھا کہ اگر اتنی بڑی منفی چیز جس نے کتنا ہی انسانوں کو مار دلا ہوگا اور اگر اس کا روپ یہ تبدیل کر کے اسے ثابت مقاصد کے لیے استعمال کر دیا جائے تو وہ مدھر ساز والی بانسری بن جاتی ہے جو لوگوں کو موت یا خوف کے بر عکس سکون اور اطمینان عطا کرتی ہے۔ اگر اسی طرح آپ منفی روپیوں کو تبدیل کرنے کے لیے پا زیوں اقدامات کرتے رہیں تو مایوسی کی فضاظم ہو جائے گی۔ اگر ہم ایک نیا اور اچھا انداز فکر اپنا کیں تو ضرور بہتر اثرات مرتب ہوں گے۔ Positivity کو Negativity میں بدلتا اندر کی ایک آواز کی وجہ سے ممکن ہے۔ خیالات تو غیر اختیاری طور پر آتے ہیں لیکن روپیاختیاری طور پر تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ بہت ہی زیادہ مایوس ہو جانے سے شیطان بہت ہی خوش ہوتا ہے اور جب بھی آپ منفی روپیوں میں داخل ہوتے ہیں (خدانہ کرے آپ اس بیماری میں داخل ہوں) تو پھر شیطان اس لیے خوش ہوتا ہے کہ میں نے بندے کو اللہ کی رحمت سے باہر نکال لیا ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے کہ ترجمہ: (اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہ ہو۔)

لیکن آپ پر مایوسی آجائے سے شیطان انسان کو اللہ کے اس فرمان کے یقین سے باہر نکال لاتا ہے۔ شیطان انسان کو چوری چکاری بے ایمانی اور گندی باتیں نہیں سکھاتا بلکہ وہ صرف اس بات پر مائل کرتا ہے اور ترغیب دیتا ہے کہ جس اللہ کو تو آج تک مانتا رہا ہے دیکھ اس نے تیرے ساتھ کیا کیا ہے۔ تو نے فوکری کے لیے Apply کیا تھا لیکن تیرا کام ہی نہیں بنا۔ تو نے اتنے اچھے پرچے دیے تھے لیکن تمہارے نمبر ہی کم آئے ہیں۔ شیطان کے پاس بس یہ ایک ہی Trick ہے۔ وہ جیسے جیسے آپ میں یہ بات پکی کرتا جاتا ہے آپ اللہ کے دائرے سے نکلتے جاتے ہیں اور شیطان کی ڈی میں آ جاتے ہیں

تو اسے پھر گول کرنے پڑے آسان ہو جاتے ہیں۔ آپ مایوس ہونے کی بات Neutral ہو کے اس قسم کا کام کریں جیسا کہ اس چرواہے نے بانسری بجا کر کیا تھا۔ روئے کو تبدیل کرنے اور اس پر حاوی ہونے کے لیے اتنی کوشش نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ آپ سمجھ رہے ہیں۔ صرف تہی کرنے کی بات ہے۔ جب آپ تھیسے کے کندے میں ہاتھ ڈال کر ایک دفعہ لٹک جاتے ہیں تو وہ کندہ اپ کو خود بخواہی لیتا ہے۔ آپ نے سرکس میں کرتب دکھانے والے دیکھے ہوں گے۔ ان کی بھی ہاتھ ڈالنے ہی کی مشق ہوتی ہے پھر انکا بدن خود بخواہی کو گھما تا پھرا تارہتا ہے۔ ہمیں روئے تبدیل کرنے کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ میں پہلے بھی آپ سے ایک علاقے کا بہت ذکر کرتا ہوں جو مجھے بہت پیارا ہے اور تمہر پار کر ریگستان کا علاقہ ہے۔ یہ عجیب و غریب علاقہ ہے۔ اس جگہ کئی مذاہب اور قوموں کے لوگ رہتے ہیں۔ راجپوت بھی ہیں، خانہ بدش بھی۔ کئی سال پہلے کی بات ہے۔ وہاں ہم نے ایک شخص کو دیکھا وہ لڑکا تو خیر نہیں تھا اس کے سر پر گیڑی تھی راجپوتوں جیسی لینک پڑے اس کے زیادہ اپنے نہیں تھے۔ اس کے ہاتھ میں ایک لبی "سوٹی" (چھڑی) تھی اور وہ کو براسانپ کو قابو کرتا تھا اور اس شخص میں بلا کا اعتاد تھا۔ وہ ایک ہاتھ لہرا کر سانپ کو فن اور اعتاد کے جادو سے مست بھی کرتا تھا اور کبھی کبھی کو برآ خوفناک ہو کر اس پر حملہ بھی کرتا تھا۔ جب سانپ اس پر حملہ کرتا تو وہ اپنی سوٹی جس کے آگے اس نے بیکر (بیکروہ) چیز ہے جس سے ہم سائنس کی لیبارٹریوں میں تجربات کرتے ہیں اور میں جس علاقے کی بات کر رہا ہوں وہاں کو براسانپ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں) باندھا ہوا تھا۔ سانپ کے قریب کر دیتا تھا اور جو نبی وہ سانپ کے قریب کرتا سانپ اس پر حملہ کر دیتا اور جیسے ہی سانپ اس شیشے کے بہت پر دانت گاڑتا وہ شخص فوراً سانپ کی گردن دیوچ لیتا اور سانپ کے دانت اس شیشے کے بیکر کے ساتھ لگائے رکھتا اور سانپ کے منڈ سے بالکل سفید رنگ کا زہر نکال لیتا اور ایک دم پھر اس موزی جانور سے چیچھے ہٹ جاتا۔ میں اور ممتاز مخفی یہ کھیل دیکھتے رہے۔ ہم نے اس سے پوچھا کہ تو اس زہر کا کیا کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ لیبارٹری والے اس سے وہ زہر خریدتے ہیں اور وہ ناگ کے اس زہر سے ادویات بناتے ہیں۔ وہ کہنے لگا کہ "سامیں بابا میں ناگ چوتا (دھوتا) ہوں۔ یہ میرا پیشہ ہے۔" اس نے بتایا کہ تین گھنٹے کے بعد ناگ میں پھر زہر پیدا ہو جاتا ہے اور اس نے بتایا کہ ایک وقت کے سانپ کے زہر سے گھوڑے کو مارا جا سکتا ہے اور اس نے بتایا کہ وہ شام تک دو تین "چلیاں" (2 تو لے کے برابر) بھر لیتا ہوں۔ دن پھر ناگ دو ہتا ہوں اور شام کو اپنی بکری دو ہتا ہوں اور میں پھر اس بکری کے دودھ میں گڑ اور پتی ڈال کے پیتا ہوں۔

خواتین و حضرات! میں روئے کی تبدیلی کی بات کر رہا تھا کہ اس نے ایک خوفناک چیز کو کس خوبی کے ساتھ ایک ثابت کام بیارہیے میں تبدیل کر لیا تھا اور وہ اس سے گھبرا تا نہیں تھا اور اس پر قائم

تھا۔ جب میں فرست ایئر میں تھا تو میں امریکہ کی اس انڈھی، گوئی اور بہری بچی ہیل کے بارے میں پڑھ کر جیران رہ گیا۔ اس کوقدرت نے کوئی صلاحیت نہیں دی۔ صرف ایک تو دے کی مانند تھی۔ اس کے پاس صرف خوبصورتی کو محسوس کرنے کی طاقت تھی۔ وہ اپنی خودنوشت میں ہوتی ہے کہ میں نے خود کو زندوں میں شامل کرنے کا ارادہ بتایا اور جو منی چیزیں مجھ پر وارد کرو گئی ہیں میں انہیں ثابت میں تبدیل کروں گی لیکن خواتین و حضرات وہ اس طرح نہیں گھبرائی پھرتی تھی جس طرح ہمارے بچے ایم۔ بی۔ اے کرنے کے بعد گھبرائے پھرتے ہیں اور چادرتان کے لیٹ جاتے ہیں۔ اس لڑکی نے اپنی ایک سیکلی کو بتایا کہ جب میں تمہارا ہاتھ اس طرح دباوں تو اس کا مطلب مثال کے طور پر ”اے“ ہو گا۔ دوسری طرح دباوں تو اس کا مطلب ”بی“ ہو گا۔ اس نے اپنی بات سمجھانے کے لیے اپنی دوست کو خود سے اشارے بتائے اور اس طرح اس نے ایک نئی زبان کو چشم دیا۔ وہ اپنی سیکلی کا ہاتھ دباتی جاتی تھی اور اس کی سیکلی اس کی باتوں کو سمجھتی جاتی تھی اور لکھ لیتی تھی۔ وہ اپنی خودنوشت میں کہتی ہے کہ میں اللہ کی بڑی شکرگزار ہوں اور میں ہر وقت اس کا شکردا کرتی رہتی ہوں کہ اس نے مجھے دنیا کی ان نعمتوں سے محروم رکھا ہے جو ساری کائنات کے لوگوں کو ملتی ہیں۔ اگر مجھ میں یہ خامیاں نہ ہوتیں تو میں اتنی نامور رائٹر نہ ہوتی اور میں ایک عام امریکی عورت کی طرح چولہے چونچے پر کام کرتی فوت ہو گئی ہوتی لیکن میری ساری خامیاں میرا بہت بڑا سہارا میں گئی ہیں۔ وہ پاکستان بننے کے دوسرے تیسرا سال لا ہو رآئیں۔ میری بھی ان سے ملنے کی بڑی خواہش تھی۔ خدا کا شکر کہ میری اس سے ملاقات ہوئی اور وہ اپنی اس دوست کے ذریعے ہم سے سوال جواب کرتی رہتی اور میرے Funny قسم کے سوالات پر وہ بے قاعدہ خستی بھی تھی اور ہمارے سوالوں کا کھٹا کھٹ جواب دیتی۔ وہ اپنی خامیوں پر فخر کرتی۔ میں بھی اپنے پیارے بچوں کو مایوس دیکھنا نہیں چاہتا۔ اگر میرے بچے اپنے خیالات کو ثابت انداز میں ڈھالیں اور خود کشی کرنے اور قتل کرنے والی راکفل کو بانسری میں تبدیل کر دیں تو وہ بہت سی مشکلات سے نکل سکتے ہیں۔ ان کی یہ گھبراہت بہت زیادہ انفارمیشن ملنے کی وجہ سے بھی ہے۔ میرے بچے رو اندزا کے بارے میں زیادہ جانتے ہیں اور اپنے بارے میں بہت کم جانتے ہیں۔ اپنی ذات کا مطالعہ کرنا بھی بہت ضروری ہے جس طرح سے کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے اپنے اللہ کو پہچان لیا۔ اس لیے خود کی پہچان کرنا بہت ضروری ہے۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

تحالف

پھولوں اور تھنوں کی دنیا بھی بڑی عجیب و غریب ہے۔ اس کو اگر Microscopically دیکھیں تو اس کے نہایت عجیب و غریب معانی نکلتے ہیں۔ میرے ہی ہم عمر میرے ایک دوست یا راتھے اور ہماری عمر کے لوگوں کو یہاں یا لگنا تو عام سی بات بھی ہے۔ ہم اپنے اس دوست کی عیادت کے لیے ہسپتال میں گئے تو وہاں ہمارے ایک اور دوست ان کے لیے پھولوں کا تحفہ لے کر آئے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاں پھول دینے اور لینے کا بڑا رواج ہو گیا ہے۔ جب وہ پھول دینے والے دوست وہاں سے چلے گئے تو میرے زیر علاج دوست یوسف کہنے لگے کہ یار یہ پھول بہت اچھی چیز ہیں۔ بڑے خوبصورت لگتے ہیں لیکن اشفاق تو ہمارے اس دوست کو تو کچھ نہ کہنا لیکن کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ بجائے پھول میرے سر ہانے رکھنے کے کچھ دری میرے پاس بیٹھتا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ لیتا۔ مجھے اس بات کی بڑی آرزو اور طلب ہے کہ میرے دوست عزیز میرے قریب آ کر مجھے وہ لمس عطا کریں جس کی مجھے بڑی ضرورت ہے۔ وہ کہنے لگا کہ میں پھولوں کا تحفہ برائیں سمجھتا لیکن پھول کے مقابلے میں قریب آنا زیادہ اچھا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ ولایت میں بھی پھول دینے کا بڑا رواج ہے۔ روم کی یونیورسٹی میں ہمارے استاد پروفیسر اونکار تی کہا کرتے تھے کہ میں کسی ایسے ملک میں رہنا نہیں چاہتا جہاں پھول بکتے ہوں۔ پھولوں کو بکنا نہیں چاہیے۔ خواتین و حضرات بات تو یہ بھی سوچنے والی ہے کہ پھول اور انسان کے درمیان ایک محبت کا رشتہ ہے۔ وہ رشتہ اب اگر ہونا چاہیے تاکہ ہم پھولوں کو جنس خریدار بنا کر پیش کریں۔ میں نے یوسف سے کہا کہ یہ تو تحفے کی بات ہے اور تحفے کو ہر حال میں قبول کیا جانا چاہیے۔

ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی ارشاد ہے کہ جب آپ کسی کے پاس جائیں تو کوئی تحفہ چاہے چھوٹا ہو یا بڑا ضرور لے کر جائیں۔ اس سے محبت بڑھتی ہے۔ تحفے اور تحفے دینے کی بھی کئی اقسام ہیں اور بعض اوقات تحفے عطا کرنے والا اسے ایسے عطا کرتا ہے کہ آپ کو یا وصول کرنے

والے کو احساس تک نہیں ہوتا کہ مجھے کچھ عطا کیا جا رہا ہے یادے رہا ہے اور تھنے کے بڑے روپ ہوتے ہیں۔ بعض روپ ایسے ہوتے ہیں جو سمجھنیں آتے لیکن تھنہ اس تک پہنچ جاتا ہے جسے عطا کیا جا رہا ہوتا ہے لیکن شوری محور پر اس کا علم نہیں ہوتا۔ جسم اس تھنے سے واقف نہیں ہوتا لیکن روح بہت حد تک واقف بھی ہوتی ہے اور اس سے بہت حد تک فائدہ بھی امکانی ہے۔ روح کو تو انائی اور تقویت بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ تھنوں کے بارے میں ضرور سوچا جائے اور وہ تھنے ایسے ہوں جن کو روح بھی قبول کرے اور جنم بھی۔ ایسے تھنے جاری رہنے چاہئیں۔ مجھے وہ وقت یاد آ رہا ہے جب میں مس آباد میں رہتا تھا اور میرا پہلا بیٹا پیدا ہوا تھا۔ اس کی عمر کوئی چھ ماہ ہو گی جب کا یہ واقعہ ہے۔ چیکو سلو کیہ کی ایک فلم "Precious Summer" تھی۔ میں نے اس کے بارے میں بہت پڑھ رکھا تھا اور وہ فلم دیکھنے کی مجھے بڑی آرزو تھی۔ میں اور بانو قدیسہ دونوں ہی وہ فلم دیکھنا چاہتے تھے۔ اس وقت اس علاقے میں کوئی بس بھی نہیں چلتی تھی۔ گھر کے قریب میرے ایک خالو جو ایک کوپرینجینک میں تھے وہ رہتے تھے۔ میں ان کے پاس گیا اور کہا کہ میں فلم دیکھنے جانا ہے اور اگر آپ ہمارے ہاں Baby Sitting کر لیں۔ تو انہوں نے کہا کہ کیوں نہیں، بسم اللہ۔ میں نے کہا کہ جی وہ ہمارا بچہ خیر زیادہ روتا تو نہیں ہے اور اس کی ماں اس کے لیے فیدر وغیرہ بنایا کر دے جائے گی۔ وہ میرے رشتے کے خالو اپنی بیوی سے اسی وقت کہنے لگے کہ "چل بھی حمیدہ اور چلیں" جب وہ گھر آئے تو میں نے انہیں گھر کی چیزوں کی بابت بتایا۔ لیکن وہ کہنے لگے کہ آپ لوگ بے فکر اور پرسکون ہو کر آسانی کے ساتھ جاؤ اور مزے اڑاؤ۔ وہ فلم ہماری توقع کے مطابق بڑی عجیب و غریب فلم تھی۔ اس فلم میں تین بڑھے تھے۔ ایک برکھا والی Summer تھی جس میں وہ بڑی محبت سے لوٹ پوٹ ہو جاتے ہیں۔ ان کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور انہیں سمجھنیں آتی کہ عشق میں کیسے متلا ہو جائے۔

ہم واپس آئے تو گھر میں ہمارے خالو اور خالہ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا شکر یہ ادا کیا لیکن وہ کہنے لگے انہیں ہم تو فارغ ہی تھے پھر بھی کبھی ضرورت پڑے تو کہہ دینا۔ میں نے شرارتا ان سے کہا کہ جی گو بر اسالگتا ہے لیکن Baby Sitting کی ایک فیس ہوتی ہے۔

وہ کہنے لگے ہاں ہوتی تو ہے۔

وہ کہنے لگے کہ آج کل وہ فیس کتنی ہے۔

میں نے کہا جی دس روپے ہے۔

ہم دونوں کی۔ خالو نے پوچھا۔

میں نے کہا کہ نہیں خالو آپ کے دس الگ اور خالہ کے دس روپے الگ۔

وہ کہنے لگے کہ ہمیں بیباں دو گھنٹے لگ گئے اور اس طرح چالیس روپے بن گئے۔ پھر انہوں

نے بغلی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چالیس روپے نکال کر ہم کو دے دیئے اور کہنے لگے کہ اتفاق سے میرے پاس پچاس ہیں دس میں رکھ لیتا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ کو Baby Sitting کے معانی نہیں آتے۔

وہ کہنے لگے کہ آتے ہیں لیکن انہیں واقعی اس کے معانی نہیں آتے تھے۔
وہ سمجھتے تھے کہ اگر بزرگ گھر میں Baby Sitting کریں گے تو انہیں اپنے پاس سے پہلے دینا پڑیں گے۔ انہوں نے بجائے لینے کے چالیس روپے ہمیں دے دیئے اور ہم نے وہ رکھ لیے۔
میری بیوی کہنے لگی کہ جلدی دیکھو کہ کیا کوئی اور اچھی فلم آ رہی ہے کہ نہیں کیونکہ آئندہ خالو اور خالہ کو پھر بلا کیں گے۔

خواتین و حضرات! اتنا وقت گزر گیا ہے اور ہم Baby Sitting کے پہلے لے پچھے ہیں تو مجھے اب خیال آتا ہے کہ ہم یہی سمجھتے رہے کہ ہمارے خالو پینڈو ہیں اور انہیں اس لفظ کے شاید معانی نہیں آتے لیکن حقیقت میں ایسی بات نہیں تھی۔ انہیں اس لفظ کے معانی بالکل ٹھیک آتے تھے اور اچھی طرح سے آتے تھے لیکن انہوں نے ہماری خوشنودی کے لیے ہمارے ہاں آنے کے لیے اور ہمارے سر پر ہاتھ رکھنے کے لیے چیزوں کی صورت میں تخفہ عطا کیا تھا۔ ایسے تخفہ آپ کی زندگی میں بھی آتے رہتے ہیں۔ اس کے لیے صرف ارش رہنے کی ضرورت ہے۔ یہ آپ کی زندگیوں کی بروشورتی میں روحانی، نفیتی اور جذباتی طور پر بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ مجھے اور آپ کو بھی یہ سوچنا چاہیے کہ تخفہ کس طرح سے دیا جائے کہ وہ لینے والے اور دینے والے کی روحانی و نفیتی نشوونما میں فائدہ پہنچائے۔ اس کا فائدہ محض جسمانی نہیں ہونا چاہیے کہ ہم کسی کو لحاف تھنے میں دے دیں۔

پچھلے سال گرمیوں میں میری بیوی کی شادی تھی۔ میں ان کے گھر کے صحن میں کھڑا ایک شامیانہ لگوار ہاتھا کہ اس میں لڑکیاں وغیرہ منہدی کی رسم کر لیں۔ میرے ساتھ میرے پچھے عنزیر بھی تھے۔ وہاں پر ایک عجیب سا آدمی آگیا جو ہمارے محلے کا نہیں تھا اور میں نے اسے پہلے بھی دیکھا نہیں تھا۔ اس نے خاکی رنگ کی شرت اور خاکی ہی پتلون پہنی ہوئی تھی۔ وہ آ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ ”بھی بیہاں کوئی شادی ہو رہی ہے؟“

میں نے کہا کہ ”بھی ہاں شادی ہو رہی ہے۔“

وہ کہنے لگا کہ ”کس کی؟“ میں نے کہا کہ ”میری بیوی کی۔“

وہ کہنے لگا کہ ”بھی کیا نام ہے اس کا؟“

میں نے کہا ”اس کا نام عظمی ہے۔“

وہ پھر کہنے لگا کہ ”شادی کب ہے بھی؟“

(وہ مجھ سے بچوں کی طرح ایک ایک سوال پوچھ رہا تھا)

میں نے کہا کہ ”پرسوں بارات آئے گی۔“

اتنی دیر میں ایک نوجوان آگیا جس کو میں پیچا نہ تھا۔ اس نے آتے ہی اس شخص سے کہا کہ آئیں آئیں چلیں۔ جلدی کریں۔ وہ نوجوان اس شخص کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے لے گیا۔ میں تھوڑا سا پریشان ہوا اور حیران بھی ہوا لیکن پھر میرے ذہن سے یہ بات نکل گئی۔ اگلی صبح وہی نوجوان جو اس شخص کو لے کر گیا تھا وہ میرے پاس آیا اور کہا کہ جی انہوں نے آپ سے کچھ ایسا تو نہیں کہا جو آپ کونا گوارنزر ہو۔ میں نے کہا کہ نہیں وہ مجھ سے شادی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔

وہ نوجوان کہنے لگا یہ میرے ماموں ہیں۔ یہ دماغی طور پر ذرا مادوں ہیں۔ میں اور میری والدہ اس لیے گھبرائے تھے کہ انہوں نے کچھ ایسی باتیں نہ کہ دیں ہوں جو آپ کونا گوارنزر ہوں۔ خواتین وحضرات اس نوجوان کے ماموں کا دماغی توازن تو ضرور بگزرا تھا لیکن اس پر ایک طرح کا پھرہ بھاہد یا گیا تھا۔ جب مہندی کی رسماں ہو چکی اور لڑکیاں ناق گانا کر کے فارغ ہو گئیں تو اس وقت وہ صاحب پھر آگئے اور بڑے گھیانے اور شرمدہ سے تھے۔ میں نے کہا کہ آئیے آئیے تشریف لائیے۔ میں تو آپ کا انتظار کرتا رہوں۔ وہ اب دونوں ہاتھ چیچھے رکھ کر جھوم جھوم کر باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں بیٹھنے کا کہا لیکن انہوں نے کہا کہ نہیں۔ میں نے چائے کا پوچھا تو انہوں نے اس سے بھی انکار کر دیا۔ پھر انہوں نے اپنا ایک ہاتھ فوراً آگے کر دیا۔ ان کے ہاتھ میں عام سے خاکی لفافے میں مرودی دے کر رکھی ہوئی کوئی چیز تھی۔ وہ کہنے لگا کہ میں بھی کے لیے یہ تحفہ لایا ہوں۔ میں نے کہا کہ بہت مہربانی اور ان سے تحفہ لے لیا اور وہ جیسے آئے تھے ویسے ہی شرمدگی کے عالم میں چلے گئے۔ مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ میں انہیں بھاہد بھی نہیں سکا۔

خواتین وحضرات! اس لفافے میں ایک چینی کا جگ تھا۔ وہ جگ عام سائز سے ذرا بڑا تھا۔ میں نے اپنی بھتیجی سے کہا کہ تمہارے لیے یہ تحفہ ہے۔ تمہیں دوسرے ملنے والے تحفے واقعی بڑے قیمتی ہیں اور ان کی پیکنگ بھی بڑی خوبصورت ہے لیکن اس تحفے کو بڑی محبت اور اعتماد کے ساتھ رکھنا یا ایک بہت بڑے آدمی کا تحفہ ہے۔ وہ نہ دی اور کہنے لگی پچاہی تو فضول سا ایک جگ ہے۔ میں اسے تحفے کی آئندمیں میں کہاں رکھوں گی۔

خواتین وحضرات! وہ شخص جو جگ لے کر آئے تھے وہ جگ تھا جس میں انہیں دو دھدیا جاتا تھا۔ اس کے پاس اس جگ کے سواد ہے کو اور کچھ نہ تھا۔ جب مجھے اس بات کا علم ہوا تو میں نے اپنی بھتیجی سے کہا کہ یہ سارے تحفوں میں سے قیمتی تھفہ ہے اور جس آدمی نے دیا ہے تم اور میں دونوں مل کر اس کے دل کی گہرائیوں کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ وہ جگ اس شخص کا سب سے قیمتی سرمایہ تھا۔ میں گز شدہ

سال جب کینیڈا آگیا (اب میری وہ سمجھی وہاں ہے) تو اس نے لکڑی کی ایک خوبصورت الماری میں اپنے تھنے رکھے ہوئے ہیں۔ اس نے اپنے دوسرے قیمتی تھفون کے درمیان میں لکڑی کا ایک چوکر پیدا کرنا کہ اس پر وہ جگ رکھا ہوا ہے اور اسے دوسرا تھفون سے اوچا رکھا ہوا ہے۔ مجھے وہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی۔ وہ کہنے لگی کہ چچا جوں جوں وقت گزرتا ہے میں اس کو دیکھتی ہوں تو میری اس سے ایک طرح کی Relatedness پیدا ہو گئی ہے۔ وہ کہنے لگی جب بھی کوئی مشکل پڑے تو اس جگ کو دیکھنے سے مشکل دور ہو جاتی ہے۔

خواتین و حضرات! ایسی باتیں جنمیں ہم ضعیف الاعقادی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایسی باتیں مانے سے آپ کی پختگی پر اچھا اثر نہیں پڑتا لیکن میں اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ایسے جگ کے ذریعے اور ایسے تھنے کے ذریعے جس کو آپ دیگر پیک کیے ہوئے تھفون کی طرح وصول نہیں کرتے۔ اس تھنے کی قیمت زیادہ یوں ہوتی ہے کہ جب آپ اس کے ذریعے کچھ Communicate کرنا چاہیں تو آپ کو وہ سب کچھ نصیب ہو جاتا ہے جس کی کمی محسوس کی جا رہی ہوتی ہے۔ یہ طاقت تھفون کی ہے اور اس کو عطا کرنے والوں کی ہے جو ہمیں میسر آتی ہے۔ ان سب چیزوں سے مل کر انسان کا پیشہ بنتا ہے اکیلا انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا چاہے وہ کتنا ہی زور کیوں نہ لگا۔ اس لیے اللہ ہمیشہ انسانوں کو جماعت کے رخ سے پکارتا ہے اور جماعت کے رخ سے ہی حوالہ دیتا ہے۔ جب آدمی ایک اکامی میں ہو تو اس کے لیے زندگی بس کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے تھفون کی استقامت اور اس کی معنوی طاقت کا سہارا پکڑنے کی شدت سے ضرورت ہے۔ چاہے کوئی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز ہی کیوں نہ ہو دکھاوے اور لائچ سے ہٹ کر تھنڈی میں دی جانی چاہیے۔ چاہے گڑ کی ایک ڈھیلی ہی سوغات کے طور پر ہی کیوں نہ دی جائے لیکن یہ شستہ تھنے اور باتیں ہماری زندگیوں سے نکلتی جا رہی ہیں اور ہم اس سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ ہمیں اس کے قریب ہونے کی ضرورت ہے۔ اللہ آپ کو آسمانیاں عطا فرمائے اور آسمانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

جیر ابلیڈ، ڈاکیا اور علم

اس پروگرام کے شروع ہونے سے ذرا ہی پہلے میں ایک نیا کینڈر دیکھ رہا تھا جس کے اوپر ایک بڑے شیر کی تصویر تھی اور وہ شیر ایسا خوفناک تھا جو میں نے یا آپ نے کبھی چڑیا گھر میں اپنی نظر سے نہیں دیکھا۔ اس کے نوکیلے دانت خیز کی طرح ہوتے ہیں اور اس کا پیڑہ بہت ہی خوفناک ہوتا ہے۔ یہ شیر اب تو نایاب ہے۔ یہ ڈائنسار کے زمانے میں ہوا کرتا تھا اور اپنے آس پاس اردوگرو جانوروں کو اٹھا کر خوار کے لیے لے جاتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ جانور کس طرح سے انسانوں کے ساتھ مل جل کر رہتے رہے ہیں اور پھر کس طرح سے ہمارے اوپر حادی بھی ہوتا رہتا ہے اور کس کن خصوصیات کی بنا پر یہ انسان سے بہتر ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا کر ماضی حال اور مستقبل کا جانور یہ انسانوں سے یوں بہتر ہے کہ اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہم آپ سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کی بصارت بڑی تیز ہوتی ہے۔ آپ ایک گوشت کا چھوٹا سا مگرزا یا بولی زمین پر رکھ دیں تو میں بھراو پنجی اڑتی ہوئی چیل فوراً جھپٹا مار کر اس بولی کو اچک لے گی لیکن وہ مجھے یا آپ کو نظر نہیں آ سکتی ہے۔ کبھی آپ صبح اٹھ کر چڑیوں کو دانا ڈالیں تو دور اڑتی ہوئی چڑیاں بڑی جلدی ان دانوں کو دیکھ لیتی ہیں اور جانوروں میں شکرا تو دیکھنے کی بہت زیادہ صلاحیت رکھتا ہے۔ اس طرح سے سننے کی قوت چگاڑ میں بہت زیادہ ہے۔ بہت ساری آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو ہمارے کان ان کو نہیں سن سکتے لیکن چگاڑ انہیں سن سکتے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ انہی چگاڑ رات کے اندر ہیرے میں اڑتے ہوئے Sound کو سنتی ہے۔ اسی طرح سے سونگھنے کی طاقت کتوں میں بہت زیادہ ہوتی ہے۔ وہ بندٹرک کے اندر پلاسٹک کے لفافوں میں بڑی مہارت سے بند کی ہوئی ہیروں کو بھی سونگھ لیتے ہیں۔ آپ نے چورپکڑنے والے سونگھے کتوں کے بارے بھی سناؤ گا۔ وہ ایک پاؤں کا نشان سونگھ کر اصل آدمی کو پہچان لیتے ہیں۔ جانوروں کی ان غیر معمولی صلاحیتوں کے باوجود انسان کی برتری اپنی جگہ پر قائم ہے۔ خونخوار شیر اور بھاری بھر کم ہاتھی انسانی

صلاحیتوں کو نہیں پاسکتا ہے۔ اللہ کی طرف سے جو ہمیں عقل سلم عطا کی گئی ہے، ہم اس پر اللہ کے شکر گزار ہیں۔ میں شیر کی تصویر دیکھ کر سوچنے لگا کہ بڑے پایانہ دیلی کے پاس یقیناً پرانے زمانے میں بڑے بڑے جہاز اور جنگل ہوتے ہوں گے جن میں بڑے بڑے شیر رہتے ہوں گے تو غار میں رہنے والے ”گجو“ نے اپنے کسی دوست ”بینڈی“ سے ضرور کہا ہو گا کہ یا ری یہ شیر بہت تجھ کرتا ہے اور اس علاقے کے جتنے بھی ہرن ہیں اس نے ختم کر دیتے ہیں۔ ہم اس کا کیا سد باب کریں۔ پھر بینڈی نے کہا ہو گا کہ تم مجھ سے یہ اپنا کیا دکھ بیان کر رہے ہو میں خود پر بیشان ہوں گے میری بیوی نے مجھے پکڑ کے دو چھٹے مارے ہیں اور غار سے یہ کہہ کر نکال دیا ہے کہ بچے بھوکے مر رہے ہیں تم ہر روز ایک چھوٹا سا خروش مار کر لے آتے ہو اور میرے انمارہ بنچے ہیں تم کوئی بڑا شکار کر کے لاو (اس زمانے میں یقیناً فیلی پلانگ کا کوئی تصویر نہیں ہوتا ہو گانا) اور اس نے کہا کہ میں تو رات بھر گھر سے باہر ہی سویا ہوں۔ اس وقت گجو نے بینڈی سے کہا ہو گا کہ دریا کنارے جہاں یہ شیر پانی پینے آتا ہے وہاں ایک بہت بڑا گڑھا ہے اور اگر ہم شیر کو چھاننے کے لیے اس گڑھے کے اندر گوشت کا کوئی تکڑا یاران وغیرہ رکھ دیں تو شیر یقیناً اسے پانے کے لیے چھلانگ لگائے گا تو بینڈی نے کہا کہ وہ بڑا جانور ہے۔ چھلانگ مار کر گوشت لے لے گا اور طاقت سے باہر نکل آئے گا۔ اس کا کوئی اور حل ڈھونڈا چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ ہم بانس کا ایک مضبوط اور نوکیلا سرکندہ لیتے ہیں اور اسے گڑھے کے درمیان میں کھڑا کرتے ہیں جب یہ شیر چھلانگ لگائے گا تو یہ بانس اس کے پیٹ میں دھنس جائے گا۔ اس منصوبے پر اتفاق ہوا اور دونوں نے ایک بانس کاڑ دیا اور گوشت رکھ دیا۔ شیر کو گوشت کی خوبیوں کی اور اس نے چھلانگ ماری تو وہ بانس اس کے پیٹ کے آر پار ہو گیا اور شیر کے مرنے کی خوشی میں انہوں نے وہاں لوک گیت بھی گائے ہوں گے کہ شکر ہے یہ بلاٹی۔ اب ان دونوں کے درمیان ایک اور بات طے ہوئی کہ یہ جو فل ہم نے کیا ہے اور یہ ہمارے ذہن کا کمال ہے اور اب اس ذہنی استراح کو آگے پھیلنا چاہیے اور لوگوں کو پہنچنا چاہیے کہ یوں بھی ہو سکتا ہے چنانچہ انہوں نے کسی پرانے چیقرے پر ملکے یا گھرے پر بجھے ہوئے کوئے کے ساتھ ایک ذیز اُن ساتیار کیا جس میں دکھایا گیا تھا کہ اگر ایسا دارہ بنے جس کے درمیان ایک بانس یا کوئی اور نوکیلی چیز گاڑ دی جائے تو اس طرح سے ذہن کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ان کا مقصد اپنے دیگر ساتھیوں کو اسے ظالم اور خونخوار جانوروں سے چھکارہ مل سکتا ہے۔ جب انہوں نے اس طرح ذیز اُن بنایا تو انہیں خدا کی طرف سے کچھ لکھنے کا احساس ہوا۔ جب انہیں لکھنا آگی تو انہوں نے پھر کی ٹھیکریاں استعمال کیں۔ اس طرح انسان کو جو سب سے بڑی نعمت میرا آگی وہ لکھنے کی تھی اور تیسری سب سے بڑی خوبی جو ہم میں ان دونوں صلاحیتوں کے امتحان سے ملی وہ

یہ بھی کہ ہم اپنے ذہن کے اندر ایک مشکل خیال پیدا بھی کر سکیں اور اس پیچیدہ خیال کو مزید گام تھیں بھی دے سکتے ہیں اور یہ خیال کہ شیر یا ہاتھی کے ذہن میں پیدا بھی نہیں ہوا۔ ہم میں چوتھی صلاحیت یہ پیدا ہوئی کہ ہمارے ذہن کا پیچیدہ خیال جب کسی دوسرے تک منتقل ہوتا ہے تو وہ بھی اسے بھج لیتا ہے۔ جب غالب کہتا ہے کہ

اگر تیرے دل میں ہو خیال

وصل میں شوق کا زوال

یادہ کہتا ہے کہ

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالب

شرم تم کو مگر نہیں آتی

جب میں سوچتا ہوں کہ یہ باقی غالب کے ذہن میں کیے آئیں اور جب اس سے ہو کر ہم تک پہنچیں تو ہم نے بھی فوراً یہ سمجھ لیا کہ غالب کیا کہنا چاہ رہا ہے۔

اقبال کا ایک شعر میری سمجھ میں آ جاتا ہے۔ شیکسپیر کا کوئی قول ہوتا ہے تو وہ بھی میں سمجھ جاتا ہوں اور میں اس کے ڈرامہ "ہمیلت" (Hamlet) میں To Be Or Not To Be کو بھی جانتے گا ہوں جیسا کہ یہ بات مصنف کے ذہن میں پیدا ہوئی تھی۔ ہم نے ان فتوؤں پر کبھی غور نہیں کیا۔ آج کیلئے رکی مہربانی سے مجھے خیال آیا اور یہ باقی میرے ذہن میں آئیں لیکن جب ہم پڑھنا لکھنا سیکھ گئے اور علم ہمارے لصرف میں آنے لگا تو پھر اس کے ساتھ ایک خدش بھی پیدا ہو گیا کہ یہی Tool اور تھیمار مقنی انداز میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی دعماً نگتے تھے یہی فرماتے کہ: "اے اللہ مجھے علم نافع عطا فرم۔"

وہ انسانیت کو فائدہ پہنچانے کا علم مانگتے۔ وہ نقصان دینے والے علم سے پناہ مانگتے۔ ہم سائنس کی ترقی کی بڑی بات کرتے ہیں اور اس علم کے فوائد کا ذکر جا بجا کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے بہت نقصان بھی ہیں۔ سائنس کی بدولت ذیزی کثر اور ایتم بم بنا کر انسانوں کی وسیع پیمانے پر ہلاکت کا سامان کیا گیا ہے۔ ہم سب کو بار بار سوچ کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے اور ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم علم نافع کی طرف جائیں۔ اس کی ہی آرزو کریں۔ آپ دیکھیں کہ تالا توڑ نے کا بھی تو ایک علم ہی ہے اور جیب کا شبا بھی ایک علم ہے۔ میرا ایک دوست اونکاڑہ میں رہتا ہے۔ اس کے چھوٹے بھائی نے ایف۔ اے کیا تو میں نے اس سے کہا کہ اسے بی۔ اے میں داخل کروانے کے لیے یہاں بھیج دیں لیکن اس نے اپنے بڑے بھائی سے کہا کہ میں بی۔ اے میں داخل نہیں لیتا چاہتا۔ آپ کے دوست اشfaq صاحب ہیں ان کا بڑے لوگوں سے ملا جانا ہے۔ آپ مجھے بس جیب کترے کا علم سکھا دیجیے میں آگے پڑاہ کر کیا کروں گا۔ آپ میں

سمجھا کہ وہ مذاق کرتا ہے لیکن اس نے مجھے فون کر کے بھی بھی کہا۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ اسے میرے پاس بھیجو۔ اس نے میرے پاس آ کر کہا کہ بھائی جان بی۔ اے کا ایک علم ہے تو جیب کاٹنا بھی تو ایک علم ہی ہے نا۔ میرے ایک تھانیدار دوست لشون روڑھانے میں تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ یا راس لڑ کے کا کچھ کرو۔ اس نے مجھ سے کہا کہ ایک پرانا بابا ہے اس سے پوچھتے ہیں۔ اس بابے نے کہا کہ میں جی پانچ سور و پیئے لوں گا اور باقاعدہ اسے شاگردی اختیار کرنی پڑے گی۔ ایک پگڑی اور سیر لہو پہلے دن بطور شاگرد اسے لانا ہوں گے۔ پھر کام سکھانا شروع کریں گے۔ انشاء اللہ تعالیٰ یہ نوماہ سال میں ”جیر الیڈ“ ہو جائے گا۔ مجھے یہ سن کر بڑی حیرت اور عبرت ہوئی کہ سکھانے والے بھی موجود ہیں اور سکھنے والے بھی۔

یہ ایک چھوٹی سطح ہے بڑے لیوں پر بھی یہ کام ہو رہا ہے۔ جسے آپ مافیا کہتے ہیں بڑے بڑے اور نیک نام ملکوں میں نقصان دہ علم کے فروع کا اور اس کے استعمال کا کام ہو رہا ہے۔ ہمارے اوپر Terrorism کا الزام دھرا جاتا ہے لیکن ان کے اپنے ہاں بھی ایک عجیب طرح کی وہشت گردی کا چلن موجود ہے۔ اس سے ایک خوف ضرور پھیل رہا ہے۔ مجھے اپنے پیچپن کا ایک واقعہ یاد ہے۔ میرے والد صاحب ڈاکٹر پڑھنے کے لیے لا ہو رہے۔ وہ 1890-1930ء کی بات ہو گی۔ اباجی بتاتے ہیں کہ وہ اپنی والدہ کو کارڈ ز لکھتے تھے کہ میں یہاں بخیریت ہوں اور پڑھائی وغیرہ تھیک جاری ہے۔ میری دادی ان پڑھ تھیں۔ خط یا کارڈ لانے والا ڈاکیا ہی اماں کو وہ خط وغیرہ پڑھ کر سنا دیا کرتا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ میرے والد کے خط میری دادی کو نہیں ملتے رہے تو وہ اباجی بڑے پریشان ہوئے کہ خط کیوں نہیں مل رہے تو انہوں نے کارڈ میں لکھا کہ ”اماں اس مرتبہ آپ ڈاکیے کو تنبیہ کرو۔“ کہ اگر اس نے خط پہنچانے میں کوتا ہی کی تو میں اس کے ساتھ تھی سے پیش آؤں گا اور میں اس کی شکایت کروں گا۔ اب وہ ڈاکیا کارڈ یا خط لے کر آیا تو ظاہر ہے کہ اس ڈاکیے نے ہی پڑھنا تھا اور وہ خط کو پڑھنے کا لیکن جب وہ اس مقام پر پہنچا تو وہ تھوڑا رُکا اور پھر وہ پڑھنے لگا کہ ابی جی ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں کہ ”اس ڈاکیے کو تنبیہ (جادو) دیجیے تاکہ یہ آپ کا شکر گزار ہو۔“ میری دادی نے کہا کہ ”میں اک دی بجائے دو تنبیاں لے دینی آں“ اور انہوں نے مشہور قسم کا لٹھائے کر دو اعلیٰ درجے کی شلواریں سلو اکر اس ڈاکیے کو دے دیں۔ اب آپ دیکھنے کے اس ڈاکیے نے ”تسبیہ“ کو کس طرح ”تنبیہ“ میں بدال ڈالا۔ دادی بتاتی تھیں کہ پھر اس کے بعد انہیں وقت پر خط ملتے رہے۔ اسی طرح لکھنے کے معاملے میں بھی تاریخ بھری پڑی ہے جس میں گروہ انسانی سے کوتا ہیاں ہوتی رہیں اور ان کی تحریروں سے لوگوں کو نقصان پہنچاتا رہا ہے لیکن جہاں کوتا ہیاں ہوئیں وہاں لکھنے سے فائدے بھی ہوئے ہیں اور علم نے ہی انسان کو ساری منازل طے کر کے یہاں تک پہنچایا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق اب علم، تعلیم Learning کا

قابلہ اس وقت تک آئے گئے نہیں چل سکتا جب تک اس کے ماتھ تربیت نہ ہو۔ تربیت کے لیے روح کی بالیدگی کی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور اس کی بابت بایوں سے پوچھنا چاہیے جو ان منازل سے گزرتے ہیں کہ یہ کیا چیز ہے اور ہم اپنی روح کو وہ سر بلندی کس طرح سے عطا کر سکتے ہیں کہ ہم اپنی نظر میں محترم ٹھہریں۔ ہماری سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ ہم اپنی نظر میں محترم نہیں ہیں جو شخص اپنی نظر میں محترم ٹھہر گیا وہ باعزت اور باوقار ہو گیا۔ اس کو توقیر ذات ملنے لگی لیکن یو ٹیوریٹیوں، مکتبوں اور دانش کدوں میں یہ تعلیم نہیں ملتی۔ اس کے لیے کھوج کرنی پڑتی ہے اور اس کے لیے اپنے آپ کے ساتھ بیٹھنا پڑے گا اور اپنے آپ کو Face کرتا پڑے گا پھر آپ میں وہ آسانیاں لکھنے لگیں گی جن کی ہم کو خواہش ہے۔ وگرنہ انسان تمبا کو کی بل دی ہوئی گئی یا "کھہڑا" کی طرح ہی رہے گا۔ جس سے اپنے ہی خم نہیں کھولے جاتے۔ میں جب اٹلی میں تھا تو میں اس وقت چھبیس برس کا تو جوان تھا۔ وہاں میرا ایک دوست اور ہم عصر ڈاکٹر بالدی بھی تھا۔ اس کے گھر میں اس کی ماں اور والد کی شادی کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ ہم نے وہاں سیک ویک اور چائے کافی سے لطف اٹھایا لیکن اس کھانے پینے سے پہلے ڈاکٹر بالدی کے باپ نے کہا کہ دیکھو بھی آج ایک اچھا دن ہے میں اپنی بیوی سے درخواست کرتا ہوں کہ اگر میں نے زندگی میں کوئی ایسی کوتا ہیاں کی ہیں جس کا مجھے علم نہ ہوا اور یہ انہیں جانتی ہو تو مجھے یہ بتائے اور میں اس حوالے سے ڈاکٹر کیوں کیش چاہوں گا۔ وہ کہنے لگا کہ میرے ساتھ جو زیادتیاں ہوئی ہیں وہ میں کہوں گا۔ ہم نے ان دونوں کو کاغذ دیا کہ وہ اگر کوئی ایسی بات ہوئی ہے تو لکھیں۔ دونوں نے جب لکھ لیا تو ہم نے ان سے کاغذ لے لیے۔ بالدی کی ماں نے لکھا کہ ایک بار ہم نے تھیز جانا تھا اور بالدی کے ابو نے کسی سرکاری کام کی وجہ سے تھیز جانے سے معدورت کی حالانکہ میرا اندازہ یہ ہے کہ اسے کوئی کام نہیں تھا۔ اس نے لکھا کہ یہ آج تے بیس برس پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت نوجوان تھی لیکن میرے شوہرنے جانے سے انکار کر دیا جس کا آج تک میرے دل پر بوجھ ہے۔ پھر بالدی کی ماں آئی اس نے کہا کہ وہ ہمارے ماں پارہ دن ٹھہرے گی لیکن وہ تیرہ دن رہی (خواتین و حضرات ساس تو دیسے ہی بری لگتی ہے اور دنیا میں آج تک کوئی خوبصورت ساس نہیں بنی ہے) اس کے بعد بالدی کے ابا جی کی تحریر تھی۔ جس میں سب سے پہلے انہوں نے لکھا ہوا تھا Love You I۔ دوسرا کاغذ پر بھی Love You II اور پھر تمام کاغزوں پر یہی فقرہ درج تھا۔

پھر لکھنے کا ایک یہ بھی انداز ہوتا ہے۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ڈاکٹر کی طرح تقریب میں بالدی کے ابو کی طرح تحریر میں لکھت اور پڑھت میں ہم ایسا کریں کہ اس سے دوسرے کو سکون اور نفع عطا کرے۔ اگر علم جیرا بلیڈ بنے والا ہے تو ہمارے کسی علم یا پڑھنے لکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور ہم جانوروں سے بھی بدتر ہوتے چلے جائیں گے۔ چڑیا بلبل گاتے ہوئے مرجاتے ہیں۔ ہم ایسے نہیں

کر سکتے۔ ہمیں ہر وقت کوئی نہ کوئی دھڑکا ہی لگا رہتا ہے۔

میری دعا ہے کہ اللہ ہمیں بھی خوش رہنے کی صلاحیت عطا فرمائے اور ہم ایسے ہو جائیں کہ ہم خدا کے ہر حکم کو خوشی خوشی بجالائیں اور اپنے Creator کے حکم زندگی گزاریں۔

اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

فونگ شوئی

جب میں زندگی میں پہلی مرتبہ ہانگ کا ٹنگ کیا تو جیسے ہر نے ملک اور شہر میں جانے کا ایک نیا تجربہ ہوتا ہے اس طرح میرا ہانگ کا ٹنگ جانے کا تجربہ بھی میری زندگی کے ساتھ ایسے چھوٹے ہوئے گزر اکہ میرے اندر تو شاید وہ سب کچھ تھا جسے اجاگر ہونے کی ضرورت تھی لیکن وہ باہر برآ آئندیں ہو پاتا تھا۔ میں وہاں جس دفتر میں جانا تھا وہاں کے بارے جس سے میں نے بڑا کائنٹنگ کے سلسلے میں ملاقات کرنا تھا وہ بیمار ہو کر ہسپتال میں داخل ہو چکے تھے اور اس کے دفتر والے کچھ پریشان تھے۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے یا کمر کے مہرے ایک دوسرے پر چڑھ گئے تھے۔ میں نے ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی لیکن دفتر والوں نے کہا کہ وہ بات کرنے کے قابل ہی نہیں ہیں اور کافی تکلیف میں ہیں۔ ان صاحب کا دفتر جو بڑا اچھا اور خوبصورت دفتر تھا۔ اس میں کچھ تبدیلی ہو رہی تھی۔ اس کی سیکرٹری چیزوں کو ہٹانے رکھنے یا جگہ بدلتے بارے ہدایت دے رہی تھی۔ وہاں ایک چھوٹے سے قد کا آدمی بھی آیا ہوا تھا جو Instructions دے رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ہم دفتر کی "فونگ شوئی" کر رہے ہیں اور یہ شخص "فونگ شوئی" کے Expert ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ہمارے دفتر کی فونگ شوئی بہت خراب تھی اور اس کی وجہ سے ہمارے بارے بارے بیماری کا جملہ ہوا۔ اب ڈاکٹر ان کے بارے کا ڈاکٹری انداز میں علاج کر رہے تھے لیکن وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اگر دفتر کی فونگ شوئی بہتر ہوتی تو ایسے نہ ہوتا۔

میں نے ان سے پوچھا کہ یہ فونگ شوئی کیا ہوتی ہے۔ تو انہوں نے بتایا کہ اس کا لفظی مطلب پانی اور ہوا ہے۔ اس دفتر کی آب و ہوانا مناسب تھی جس سے صاحب بیمار ہو گئے۔ ہمیں اس Expert نے کہا تھا اس دفتر کی کھڑکی کے سامنے جو عمارت ہے وہ اس انداز میں بنی ہے جو اس دفتر پر منقی انداز میں اثر انداز ہو سکتا ہے اور اگر اس کھڑکی پر ایک دیزی پر دھمکی لگتا رہے تو پھر اس کے اثرات سے بچا جاسکتا ہے۔ دوسری بات وہ یہ کہہ رہا تھا کہ اس کرے میں میں ایک شمشے کا بڑا حوض رکھا

جائے اور اس میں کالی چھپلیاں ہوں اور اس بارس کی جو میز اور کرسی ہے وہ جہاں اب ہے وہاں نہ ہو بلکہ دروازے کے ساتھ ہو۔

خواتین و حضرات! گوئی شگون کی سی بات کر رہا تھا لیکن زندگیوں میں شگون بجیب طرح سے اشانداز ہوتے ہیں۔ ان کو منطقی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ تعلق نہیں کہا جاسکتا۔ دفتر والوں کے مطابق ان کے بارے کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ بالکل دروازے کے ساتھ میز کری نہیں لگاو سکتے کیونکہ دنیا میں آج تک کسی بارے کی میز کری بالکل دروازے کے ساتھ نہیں ہوتی ہے لیکن فونگ شوئی مائیٹر کا اصرار تھا کہ اس دفتر کا جغرافی اس امر کا تقاضا کر رہا ہے۔ جب دفتر کی ساری تبدیلیاں ہو چکیں تو انہوں نے کہا کہ اب بارے کی طبیعت پہلے سے کچھ بہتر ہو گئی ہے تو میں نے کہا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کام یہاں ہو رہا ہے لیکن طبیعت وہاں بہتر ہو رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ آب و ہوا اور رُخ کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ہمیں بھی اللہ نے ایک رُخ کا آرڈر دیا ہے کہ تم اپنا رُخ ادھر کو رکھنا پھر عبادت کرنا یا کوئی قسم اٹھانا تو رُخ ادھر کر کے اٹھانا۔ اگر آپ کی سوئی متعین رُخ سے ادھر ادھر بیٹھی یا یا نتی ہے تو آپ کا عمل چاہے کتنا بھی اچھا ہو، علم کتنا بھی اچھا ہو تو مشکل پیدا ہو جائے گی۔ میں اس وقت یہی سوچتا رہا کہ ہمیں خدا نے کہا ہے کہ اپنا چہرہ قبلہ رُخ کر کے نماز پر ہو تو ظاہر ہے اس میں کوئی حکمت ضرور ہو گی جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ یہ بات سوچ کے مجھے اپنی جوانی کے اس وقت کا خیال آیا جب ہم ہر پر دیکھنے لگئے تھے۔ وہاں جو بستیاں بسائی گئی تھیں ان کا ایک زمانے کے لوگوں نے ایک خاص رُخ رکھا تھا۔ پانچ ہزار سال پہلے بھی ان بستیوں کا باقاعدہ رُخ رکھا گیا۔ ہماری طرح سے ناؤں پلانگ کیے گئے گھر تھے۔ اس فونگ شوئی کے تصور سے میرے ہاتھ ایک بہت اچھی بات آئی۔ وہ یہ تھی کہ میں ایک پڑھا لکھا آدمی ہونے کی حیثیت سے اعتراض کیا کرتا تھا کہ بھی آپ کیوں کہتے ہیں کہ کندھے سے کندھا ملا کر لائیں سیدھی کر لیں۔ جس طرح ہر نماز کے وقت امام صاحب کہتے ہیں میں کہتا تھا کہ اگر ایک انج ۲۳ گے یا چیچھے ہو بھی جائے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے تب احساس ہونا لگا کہ یقیناً فرق پڑتا ہے لیکن میں اس کو نہیں سمجھتا۔ میں اس بات پر بھی بہت چوتھا تھا اور میرے اور بھی بچے چلتے ہوں گے کہ ٹھنڈوں سے اوپا پا یعنی کیوں رکھیں۔ اس کا ہمیں کیوں کہا جاتا ہے۔ ہم کہتے کہ اس سے کیا ہوتا ہے لیکن فونگ شوئی کا دوسرا Saraprocess کے بعد میں نے سوچا کہ اس سے روح کی آب و ہوا میں ضرور فرق پڑتا ہو گا اور ہم کیوں نہ ایسا کر لیں جیسا کہ ہمارے بڑوں اور پرکھوں نے کیا ہے۔ ہم اپنے سر پر جوں کی بات توانستے ہیں اور اتنا ہی کٹ دیا جاتا ہے جیسے وہ کہتے ہیں۔ اس طرح روحانی آپریشن میں بھی بابوں کی یا بڑوں کی بات مان لی جائے تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ برطانیہ کا جو ایک جیوگر افک میگزین ہے اس میں لکھنے والے ان دونوں ایک Research کر کے جیراں ہو رہے ہیں کہ وہ مسلمان جو عرب

سے چل کر اسی عجیب و غریب بجھوں پر پہنچ جن کے جغرافی سے وہ آشنا نہیں تھے۔ ان لوگوں نے چودہ یا پاندرہ سو برس پہلے جو مساجد بنائیں تھیں ان کا رخ کس طرح سے کبھے یا حرم شریف کی طرف رکھا گیا تھا۔ کیونکہ ان کے پاس اطراف کا تعین کرنے والا کوئی آل نہیں ہوتا تھا اور کوئی قطب نہیں تھا۔ اس حوالے سے میگزین میں رسیرچ سلسلہ وار چھپتی رہی۔ ایک مضمون میں انہیوں نے لکھا کہ چونکہ وہ بھری سفر کرتے تھے اور ستارہ شناس تھا اس لیے وہ اطراف کا تعین درست رکھتے تھے اور مساجد کا رخ درست رکھتے تھے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ کشتیوں والے تاجر یا ملاں تو ان بابوں کو ان دیران علاقوں میں چھوڑ کر چلے جاتے تھے اور یہ مساجد وغیرہ یہ بابے ہی بناتے تھے۔ سینکیانگ ایک عجیب و غریب علاقہ ہے۔ اگر آپ کبھی شاہراہ ریشم پر گئے ہوں اور پھر آگے چین کے بارڈر تک جائیں تو وہ انتہائی غیر آباد علاقہ تھا۔ وہاں آنے والوں کو آخر کس نے بتایا تھا کہ اس مسجد کا رخ کبھے کی سمت کرنا ہے اور کعبہ کس طرف ہے؟

میگزین کے مطابق ایک اکیالا شخص انڈونیشیا گیا۔ اس نے بھی پھوٹس لکڑی پتھر جوڑ جاڑ کے ایک مسجد بنائی اور اس کا رخ بھی Correct کبھے کی طرف رکھا۔ میں نے جب یہ مضمون پڑھا تو پھر مجھے حیرانی ہوئی اور فونگ شوئی کا مسئلہ بھی ذہن میں آیا اور میں نے سوچا کہ رخ کا درست رکھنا اس قدر ضروری ہے۔ میں نے آج سے پہلی میں برس پہلے جب اپنا گھر بنا�ا تھا تو یہ رخ والی اور فونگ شوئی کی بات ذہن میں نہیں رکھی تھی البتہ اب یہ بات ذہن میں آتی ہے۔ اس وقت بانو قدیسہ نے کہا کہ ایک کرہ ایسا ہونا چاہیے جس میں ایک بہت اچھا اور خوبصورت قالین چھا ہوا ہو۔ میں نے کہا قالین تو بھی بہت مہنگی چیز ہے ہم کہاں سے لیں گے۔ وہ کہنے لگی کہ میرے پاس پانچ سات ہزار روپے ہیں اس کا لے لیں گے۔ میں نے کہا اتنے پیسوں سے قالین تو نہیں آئے گا البتہ اس کا ایک دھماگ ضرور آجائے گا۔ میرے ایک دوست حفیظ صاحب کا بہت بڑا قالینوں کا شوروم تھا جس کا نام ”بخارا کار پیس“ تھا، انہیوں نے کہا کہ آپ زحمت نہ کریں ہم لوڈر میں ڈال کر کچھ قالین بچھ دیں گے آپ کو اور آپ کو جو پسند آجائے وہ رکھ لیں۔ اب وہ قالین لانے والے ایک ایک کر کے قالین دکھاتے جاتے اور ہم جو دیکھتے وہ ہی اچھا اور بھلا لگتا۔ جس طرح لڑکیاں کپڑا خریدنے جاتی ہیں تو انہیں بہت سارے کپڑوں میں سے کوئی پسند نہیں آتا ہے بالکل سہی کیفیت ہماری تھی اور ہم سے کوئی فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا کہ کون نے رنگ کا قالین رکھیں۔ ابھی ہم شوئی میں ہی تھے کہ ہماری ٹیلی میاں کرتی ہوئی کمرے میں آتی اور وہ بچھے ہوئے قالینوں پر بڑے بخڑے کے ساتھ چلنے لگی اور ایک قالین پر آ کر بیٹھنے لگی اور پھر ریشم دراز ہو گئی۔ میں نے کہا کہ یہی مُحیک ہے۔ اگر اس نے چوکس کیا اور اللہ نے اس کو چوکس کی وہ صلاحیت دی ہے جو ہم میں نہیں ہے تو ہم اسی قالین کو رکھ لیں گے۔ وہ قالین اب تک ہمارے پاس ہے اور وہ زیادہ پرانا

ہو کر زیادہ قیمتی ہو گیا ہے۔
 بھارت کا ایک بڑا شہر کا نپور ہے۔ اس کے پاس ایک قصبہ تھا۔ اس قصبے میں ایک بزرگ آگر اپنے پیر و کاروں یا مریدین سے ملے۔ لوگ اپنے پیر کی عزت افرائی کے لیے دن بھر ان کے ساتھ رہے اور نمازیں پڑھتے رہے۔ شام کے وقت وہ پیر صاحب نے جب وہاں ایک چھوٹی سی مسجد دیکھی تو وہاں مغرب کی نماز پڑھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ ان کے پیر و کار کہنے لگے کہ جی، ہم اس مسجد میں نہیں جائیں گے۔ وہ کہنے لگے کہ آپ کو مسجد میں جانے سے کیا ہوتا ہے۔ وہ کہنے لگے کہ جی آپ ہمارے ہرے ہیں، ہم آپ کو مسجد میں جانے سے نہیں روکتے لیکن ہم آپ سے درخواست کریں گے کہ آپ یہاں نماز نہ پڑھیں تو اچھا ہے۔ وہ پیر صاحب فرمائے لگے کہ آپ لوگ کیسی بات کرتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز نہ پڑھوں۔ بہر حال وہ بزرگ مسجد میں تشریف لے گئے۔ وضو کیا اور نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر انہوں نے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اس مسجد میں نماز ادا کیوں نہیں کی تو لوگوں نے کہا کہ سراس کا قبلہ غلط ہے اور اس کا راخ خانہ کعبہ کی طرف نہیں ہے بلکہ نیڑھا ہے۔ ہم اس لیے یہاں نماز نہیں پڑھتے۔ اس سے محترم بزرگ کو بڑی تکلیف ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ یہ کوئی ایسا جواز نہیں ہے۔ وہ بزرگ محراب کے سامنے کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنی شروع کر دی اور وہ بڑی دیر تک دعا مانگتے رہے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ تھوڑی دیر بعد وہ محراب پھٹ گیا اور اس میں اتنا بڑا سوراخ ہو گیا جس میں سے ان لوگوں نے جو وہاں نماز ادا کرنے سے انکاری تھے دیکھا کہ سامنے حرم شریف ہے اور لوگ اس کا طواف کر رہے ہیں۔

خواتین و حضرات! جگہوں کی جغرافیائی صورت حال کا ایک عجیب اثر ہوتا ہے اور اس اثر سے یوں فائدہ اٹھانا چاہیے کہ ہمیں اپنے گھر کے اندر ایک مخصوص کونے میں تن ہنہ بیٹھ کر اٹھایا جانا چاہیے۔ وہاں آپ کو مفہاماً فلت ایسی ارتعاش ملے گی جو آپ کے روحانی سفر میں معاون ثابت ہوگی۔ مجھے ہانگ کانگ میں فونگ شوئی کو دیکھ کر بہت فائدہ پہنچا کہ جن چیزوں پر میں اپنی حمافت کے ساتھ معمق رض ہوتا تھا اور میں ان پر طنز بھی کیا کرتا تھا خدا مجھے معاف کرے۔ میرے پوتے وغیرہ اب بھی ایسی باتوں پر طرکرتے ہیں۔

خواتین و حضرات! جب مسلمانوں نے یہ طے کیا کہ ہم اپنے لیے U.N.O کی عمارت بنائیں گے اور ایک ایسی عمارت بنائیں گے جہاں جا کر ہم درخواست یا عرض داشت پیش کر سکیں یا جہاں ہم اپنے دکھ بیان کر سکیں اور اس کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنا ربط باہمی قائم رکھیں تو اس عمارت کے بنانے کے لیے کوئی آرکیٹیکٹ نہیں مانگاوے گئے تھے۔ سیانوں نے بیلو پرنس تیار نہیں کروائے تھے بلکہ فرمانے والوں نے فرمایا کہ ایک اونٹی کو چھوڑ دو وہ جا کر جہاں بیٹھ جائے گی وہی مقام

ہمارا مقام ہو گا اور مسلمانوں کے U.N.O کا صدر دفتر اور گھر ہو گا اور وہی ہماری آئندہ نسلوں اور پوری ملت کے لیے نگاہوں کا تور ہو گا۔

اس بات کو سوچنے کی بڑی ضرورت ہے۔ لوگ اب تک وہاں جا کر دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہوتے رہیں گے اور وہی جگہ ہمارے دل اور نگاہوں کا محبوب مرکز اور ہمارا سب کچھ ہے۔ آپ سے بس بہی درخواست کرنا چاہ رہا تھا کہ بہت ساری ایسی باتیں جن کا میرے جیسے پڑھنے لکھے بندے تحریک اڑاتے ہیں یا اپنی کسی کوتا ہی کی وجہ سے کچھ کہہ دیتے ہیں۔ حقیقت کا علم تو خدا ہی جانتا ہے، جب اذان ہوتی ہے تو سروں پر اور ہنیاں کیسے خود خود آجائی ہیں اور جو خاتون یا پنی اور جنی لیتی ہے وہ ہمارے ساتھ کی ہوتی ہے اور جو بد قسمتی کی وجہ سے نہیں بھی لیتی تو وہ ہے تو ہمارا ہی سرمایہ اور جان چکر لیکن اس کی فونگ شوئی میں کچھ ایسا ہی فرق پڑ گیا ہے۔ جیسا کہ ہائک کا گد والے باس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہروں میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن آرزو یہ ہوتی ہے کہ ایسی خرابی پیدا نہ ہو جو ہم کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دے۔ کبھی کبھی کوئی ایسی بات جو جوڑنے والی ہو اور آپ کو تالپند ہو تو اسے فوراً اختیار کر لینا چاہیے۔ ہمارے بابے کہتے ہیں کہ میا جھن کے اندر جھٹڑے اور ڈائیاگ میں کبھی آپ کو ایسی کمال کی بات سوچھ جائے جو آپ کے مقابل کو زیر کر دے اور سب کے سامنے رسو کر دے تو وہ بات کبھی نہ کرو اور بندہ بچالو۔ مت ایسی بات کرو جس سے وہ شرمندہ ہو جائے۔

ہم خدا سے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! میں ایسی شرمندگی عطا نہ کرنا جو ہم کو ہماری ملت اور امّہ سے توڑے یا ہمیں الگ الگ دانوں میں تقسیم کر دے۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ اللہ حافظ۔

دھرتی کے رشتے

میں بڑی درمندی سے اور بڑے دکھ کے ساتھ کہتا ہوں کہ یہ ہم نے اپنے ساتھ کیا کرنا شروع کر دیا ہے۔ ہم اپنے رشتتوں کو پیچانے کی کوشش نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیں بڑی ہی خوفناک جنم کی طرف لیے چلی جا رہی ہے۔ میرے گھر کے باہر لگا ہوا شہرتوں کا درخت میرا دوست، میرا عزیز اور رشتہ دار ہے اور وہ فاختا ہمیں جو ہماری منڈیر پر آتی ہیں میں انہیں جانتا ہوں۔ وہ مجھے جانتی ہیں لیکن میں انسانوں کو نہیں پیچانتا۔ میں ان سے دور ہو گیا ہوں۔ میں ان کے ساتھ ایک عجیب طرح کی نفرت میں بنتا ہو گیا ہوں۔ بہار کے موسم میں جب بہار اپنے اختتام کو پہنچ رہی ہوتی ہے اور گرمیوں کا شروع ہوتا ہے اس وقت ایک سہارا ساتھ چلتا ہے۔ وہ برکھاڑت کا سہارا ہوتا ہے۔ ساوان کا سہارا ہوتا ہے کہ بارشیں آئیں گی مینہ بر سیں گے اور پھر ہم جسمانی طور پر نہ کہی ذہنی طور پر پورے کے پورے بہہڑ ہو کر برستی ہوئی بارشوں میں نہایتیں گے اور پھر سے اپنے پیارے بچپن میں پہنچ جائیں گے۔ پچھلے دنوں تمام عالم میں "Water Day" منایا گیا۔ سنا ہے کہ دنیا سے پانی کم ہو رہا ہے۔ یہ بڑی خوفناک سی بات ہے۔ باوصف اس کے کہ انسان کی خدمت کے لیے سارے پہاڑ بڑی بڑی کروڑوں شن کی پکڑیاں باندھے ہر روز صبح اٹھ کر سورج کی خوشنامہ کرتے ہیں کہ خدا کے واسطے دو قین کر نیں ہماری طرف پھینکو ہم نے انسانوں کو پانی بھیجنा ہے۔ ہمارے بابے اور بزرگ بتاتے ہیں کہ جتنی بھی بے جان چیزیں ہیں یہ انسان کی خدمت کے لیے دیوانہ وار چل رہی ہیں۔ آدمی آدمی کی خدمت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے لیکن سورج بہت پریشان ہے وہ کہتا ہے کہ میری ساری کر نیں لے لوں گئنے اے پہاڑ و انسان کو کسی نہ کسی صورت پانی پہنچنا چاہیے۔ ایک ہمارا مزدور بابا ہے وہ مجھے کہتا ہے کہ اشFAQ صاحب آپ کو پہنچنی ہے کہ صبح کے وقت سٹھ کے اوپر سونی گیس ہوتی ہے۔ وہ نیچے کی سونی گیس کو آواز دے کر کہتی ہے کہ "لڑ کیو جلدی کرو اور پر کی طرف آؤ۔ لوگوں نے ناشتے بنانے ہیں۔ باہر نکلو اور انسانوں کی خدمت کرو۔" وہ گیس پھر فافٹ نکلی چلی آتی ہے لیکن انسان بے چارہ اپنے ساتھیوں کی خدمت نہیں کرتا۔

جب ہم یہ پروگرام کر رہے ہیں اور آپ یہ پروگرام دیکھ رہے ہیں اس وقت بہاولپور سے بکریوں کا ایک ریوز چلتا ہوا ملتان کی طرف آ رہا ہے اور جھوٹے چھوٹے پھرلوں (بکری کے کسن بچے) کی مائیں اور لیلوں (بھیڑ کے نئے بچے) کی مائیں اوپنی آواز میں کہہ رہی ہیں کہ پچھلے جلدی جلدی قدم اٹھاؤ صبح جا کر ذبح ہونا ہے اور ہمارا گوشت لا ہو تک جانا ہے۔ چوکی سا ہیوال اور کئی جگہوں پر جانا ہے اس لیے جلدی جلدی ملتان پہنچو۔ وہ کہتے ہیں کہ ماں ہم چل تو رہے ہیں آپ نہیں اور تیز چلتے پر کیوں مجبور کرتی ہیں۔ آگے سے وہ جواب دیتی ہیں کہ ہم انسان کی خدمت پر معمور ہیں۔ اس طرح جتنے بھی جمادات، حیوانات اور اللہ کی حقیقی بھی مخلوق ہے وہ ساری کی ساری انسان پر قربان ہونے کے لیے تیار ہے اور روز قربان ہوتی چلی جا رہی ہے۔ جب میں نے ملتان کا ذکر کیا تو مجھے خیال آیا کہ پاکستان کے اندر جتنے بھی شہر بہشت یا آموں کی دوسری قسمیں موجود ہیں آج تک کسی آم نے خود کو چوس کرنیں دیکھا۔ کبھی اپنی مخصوص خود محسوس نہیں کی۔ اپنا سارا کام سارا وہ جو دن انسان کو دے دیا ہے۔ بس یہ تو ہماری بدستی ہے کہ انسان انسان کے ساتھ والی محبت اور پیار نہیں کرتا جیسی کہ بے جان چیزیں رکھتی ہیں۔ جب پانی کا دن ملتا گیا اور اس خوف کا اظہار کیا گیا کہ پانی آئندہ اور کم جائے گا تو مجھے اپنے بچپن کا وہ ساون یاد آ گیا جب ہم نیکریں پہن کر بے تحاشا بھاگا کرتے تھے اور اپنے گاؤں کی گلیوں کے چکر لگایا کرتے تھے اور اپر سے پانی بر سار کرتا تھا۔ ہم خوشی سے گاتے۔

”کالیاں ایساں کاے روڑ“

”یہ برسا دے زور و زور“

ہمیں ان باتوں کا مطلب نہیں آتا تھا لیکن ہم بس گایا کرتے تھے۔ ہماری جو جھوٹی بینیں تھیں وہ اپنی گڑیا جوانی میں بہت پیاری ہوتی ہے اسے لے کر روتی ہوئیں پانچ چھوٹی تعداد میں آنسو بھاتی ہوئی چلتی تھیں اور موتوی میں لپٹی ہوئی پیاری گڑیا کو ماتھے سے لگا کر جلا دیتی تھیں اور وہ قافلہ بارش کی دعا مانگتا ہوا اور روتا ہوا چلتا تھا اور یہ گاتا تھا

”تو وس دے بدلا کالیا“

”اساں گڈی پٹولا ساریا“

(یہ ایک طرح کا بچوں میں شگون تھا کہ اس طرح گڑیا اور کپڑے سے بننے کھلونے جلانے سے بارش آ جاتی ہے)

وہ جھوٹی جھوٹی پیاری بچیاں انسانوں کے سکھ کے لیے اللہ میاں سے دعا کرتی تھیں حالانکہ انہیں بارش کے فائدے یا نقصان کا علم نہیں تھا۔ اب پانی کی کاکھ بہت زیادہ خوف پیدا کرتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اے اللہ میرے پوتے اور نواسے اس برکھاڑت سے واقف نہیں ہیں۔ انہیں پڑتے ہی

نہیں ساون کیا ہوتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں سرک کے کنارے کس طرح مینڈک آ کر بیٹھتے ہیں۔ کیسے مینڈکوں کی آوازیں آتی ہیں اور وہ بخت بارش کے بعد کس طرح سے آوازیں نکلتے ہیں۔

میں جب پانچویں چھٹی میں ہوتا تھا مینڈک کی آواز کو بڑی اچھی طرح سمجھتا تھا اور مجھے پڑھتا تھا کہ اب مینڈکیاں بولی ہیں اور اب یہ مینڈک بولے ہیں۔ اب بڑے سائز کے مینڈک بولے ہیں۔ اب درمیانے سائز کے مینڈک بولے ہیں اور وہ قطار در قطار بیٹھے بولنا شروع کر دیتے تھے۔ جب ہم سکول جاتے تھے تو میری پھوپھی کہا کرتی تھیں کہ ”اخفاق جاتے ہوئے ڈڈاں (مینڈکوں) نوں سلام کر کے جانا۔“

ہمارا ڈڈو کے ساتھ بڑا گھر ارشتہ تھا اور ہم سکول جاتے ہوئے پھوپھی کے حکم کے مطابق ”ڈڈو سلام ڈڈو سلام“ کہہ کر جاتے تھے اور وہ سرک کنارے بیٹھے ہوئے ایک آواز نکالتے تھے اس زمانے میں ہم مینڈکوں کی بولی جانے کی بھی کوشش کیا کرتے تھے اور ہم سے جو سینئر سوڈنٹ ہوتے تھے وہ ہمیں بتاتے تھے کہ جب بڑا مینڈک بولتا ہے تو وہ کہتا ہے:

”ویاہ کریے ویاہ کریے“

پھر مینڈکیاں بولتیں ”کدوں تک کدوں تک“
پھر مینڈکیاں ایک دوسرے سے کہتیں:

”نیود راپائیئے نیود راپائیئے“
اور ساتھ ہی چھوٹی مینڈکی کہتی:

”کنان کنان کنان“

اور ایک بڑا ڈڈو بولتا اور کہتا:

”مکا لکا مکا لکا“

اس طرح ایک پوری بولی ہوتی تھی جو ہم جانتے تھے اور مزید جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ خوبصورت زندگی ہوتی ہے جس سے ہم محروم ہو گئے ہیں۔ ہم نے قواب قتل و غارت گری کو اپنالیا ہے۔ ہم کی چڑیوں اور مینڈکوں سے ملیں گے۔ میرے گھر کے باہر جو شہتوں کا درخت ہے وہ پاکستان کا باشندہ ہے۔ وہ میرا عزیز ترین ہے لیکن میری آخری تھیں اتنی غیر ہو گئی ہیں اور میرے دیدے بے فور ہو گئے ہیں اور میں نے تو انسانیت سے محبت کرنی چھوڑ دی ہے۔ اس پیارے شہتوں کے ساتھ اور فاختاؤں کے ساتھ کیسے محبت کروں گا۔ ہم ہر روز ایسی ایسی خبریں پڑھتے ہیں جن سے روکنے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ آخر ہمیں ہو کیا گیا ہے۔ یہ کون سا ایسا خاطم ہے جس نے ہمارے اندر سے محبت اور شیرینی کی ساری خوشیاں اور انداز چھین لیے ہیں اور چاشنی چاٹ لی ہے۔

خواتین و حضرات یہ علاقے اور خطے جو ہوتے ہیں یہ انسان کی پیچان بنتے ہیں اور انسان ان خطوں کی پیچان بنتے ہیں۔ ہم علاقوں کو رسلے انسان سنجیلے انسان اور غصیلے انسان کے طور پر دیکھتے ہیں اور جس طرح کے انسان ہوتے ہیں اس خطے کے بارے میں بھی دیسا یہ تاثر قائم کر لیا جاتا ہے۔ بناتا ہے جڑی بومیاں اللہ کی طرف سے خود روانگے والے پوے اور جو ہم کوشش سے اگاتے ہیں ان کا بھی ہمارے ساتھ ایک رشتہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ گلاب چو اسیدن شاہ کا ہے۔ اس سے اچھا گلاب دنیا میں کہیں نہیں آگتا۔ ترکی والے اپنے گلاب کے بہترین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور وہاں کا گلاب ساری دنیا میں مشہور ہے۔ ان کی دنیا بھر میں گلاب کی بہت بڑی سپلائی ہے۔ میں نے ان کے گلابوں کے کھیتوں کو بھی دیکھا ہے۔ لیکن چو اسیدن شاہ کا گلاب منفرد ہے۔ میں یہاں لیے نہیں کہتا ہوں کہ میرا اور میرے پیارے ڈلن کا گلاب ہے بلکہ اس لیے کہ وہ بہت ہی اعلیٰ درجے کا ہے۔ آپ نے قصور کی میتھی سنی ہوگی۔ وہ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے۔ میں چیخ چیخ کر کہتا ہوں کہ میرے پیارے سیالکوٹ کے رہنے والوں اور گناہ کہاں گیا جو اتنا فرم اور میخا ہوتا تھا کہ جی چاہتا کہ چوتے ہی رہیں۔ انسان کا علاقے اور جگہ کا رشتہ انسان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ اسے چھوڑا نہیں جاسکتا۔ میں صرف اپنے رشتہ داروں سے وابستہ ہوں۔ میرے اور کئی عزیز اور میرے بہت ہی قریبی عزیز ہیں۔ میرے صرف مسلمان پاری، شیعہ، سُنی، بابری، عیسائی، میکوار، گیری ہی عزیز واقارب نہیں ہیں بلکہ وہ جانور بھی میرے عزیز رشتہ دار ہیں یہ مینا، اوٹ، فاختا، میں، درخت، کلکر، شہتوت، طوطے بھی رشتہ دار ہیں۔ جب میں ایک پودا ہن میں بوتا ہوں تو میں اس کے ساتھ اپنے آپ کو بھی بوتا ہوں۔ بکھری آپ غور کر کے دیکھ لیں کہ وہ پودا ہونے کے بعد میرے اندر بھی اس کی نشوونما شروع ہو جاتی ہے۔ جب آپ کسی چڑی مار سے طوطا لے کر اڑاتے ہیں اور وہ میں میں کرتا ہو تا گھر کو جاتا ہے تو آپ بھی گھر کو جاتے ہیں۔ جب طوطا گھر پہنچ جاتا ہے تو آپ کی روح اور وجود بھی مسكون کے گھر میں پہنچ جاتا ہے۔ لیکن میں ایک نہایت دردناک انداز میں اور آنسو پی کریے بات کروں گا کہ ہم اس علاقے کے لوگ تو بڑی محبت کرنے والے لوگ تھے۔ سندھ اور پاچ دریاؤں کے علاقے کے لوگ تو محبتیں باہنچے والے لوگ ہیں۔ ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ آج سے میں پہنچ برس پہلے جب ہمارے سامنی جھگڑے ہوئے تو یہاں کے جو پرانے اور ان پڑھ لوگ تھے وہ کہتے تھے کہ سندھ میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ تو سائیں لوگ ہیں پیارے لوگ ہیں۔ وہ کیسے جھگڑے سکتے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو بہت سمجھاتے تھے لیکن وہ کہتے تھے کہ نہیں سامنی جھگڑے نہیں ہیں۔ ہم سے کوئی اور غلطی ہو گئی ہے۔ یہ غلطی کسی اور بندے کی ہے۔ وہاں تو درگا ہوں پر گانے والے لوگ ہیں جو سلام کرنا اور رکوع میں جانا جاتے ہیں وہ بکھری ظلم نہیں کر سکتے۔ مجھے اس بات کا بہت دلکھ ہوتا ہے۔ خدا کے واسطے اس بات کو شدت سے محسوس کریں۔ گھروں سے نکل کر ہم نے زندہ رہنا کیوں چھوڑ دیا

ہے۔ ہم ایک خوفزدہ قوم بن کر رہے گئے ہیں۔ ہر وقت ڈر کے ساتھ وابستہ ہیں اور تو نتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے روٹھتے ہی چلے جا رہے ہیں۔ میری آپا زبیدہ جو جہلم میں رہتی تھیں وہ بچوں کو تعلیم دیتی تھیں۔ بہت معروف تھی تھیں۔ ان کے ملنے والی ایک خاتون تھیں یہ کوئی دس بارہ برس پہلے کی بات ہے۔ میں وہاں جہلم گیا تو وہ دونوں سہیلیاں وہاں گھر پر تھیں۔ وہاں آپا زبیدہ کی ملازمتی بی صغیری تھیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ دونوں کے گھر پر اللہ کا بڑا فضل ہے اور یہ بی بی صغیری باوصاف اس کے کہ کوئی علم نہیں رکھتی اور پڑھنی لکھنی نہیں ہے لیکن اس کا درجہ بہت بلند ہے۔ بڑی آپا کہنے لگیں کہ ہاں اللہ حیم و کریم ہے۔ وہ فضل کرنے والا ہے۔ اللہ حمن ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ وہ کہنے لگی کہ میں اپنے بارے میں تو کچھ کہہ سکتی ہوں صغیری کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ بہشت میں جائے گی یا نہیں۔

خواتین و حضرات یہ پہلا موقع تھا کہ جب میں نے ان میں ایک شگاف اور خلیج محسوس کی کہ انسان کے اندر اس قدر قریب رہتے ہوئے بھی اس قدر شگاف پیدا ہو سکتا ہے لیکن کبھی اللہ ہم کو استطاعت دے اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دے اور ہم اپنے بہت قریب دیکھ سکیں۔ آپ کو یہ بات سن کر بہت عجیب لگے گی کہ بہت سے ندی نالے اور پلیں بھی ہماری رشتہ دار ہیں۔ جب کبھی آپ ٹرین سے جاتے ہوئے خالی پل یا نالے پر سے گزرتے ہیں تو اس کی جو Sound آپ کو محسوس ہوتی ہے وہ بڑے معانی اور مطالب لے کر آتی ہے اور وہ آپ سے بات کرتی ہے۔ اس کی وہ آواز صرف آپ ہی کے لیے ہوتی ہے۔ کبھی آپ آدمی رات کو اوپنی آواز دے کر دیکھیں کسی سفان جگہ پر تو اس کی صدائے بازگشت آپ تک پھر لوٹ کر آئے تو پھر آپ کو پتہ چلتا ہے کہ انہیں رات کی آواز یہری رات کی آواز کیا ہوتی ہے اور دن کے وقت وہ آواز کیا ہوتی ہے۔ یہ گانے والے راگ کو سمجھنے والے جانتے ہیں کہ گرتی ہوئی آواز اور ڈائریکٹ آواز میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ میرے منہ سے آنے والی اور لوٹ کر آنے والی آواز بھی میری ہے اور ہم ایک رشتے میں بندھے ہوئے ہیں۔ خدا کے واسطے سمجھنے کی کوشش کریں کہ ہم نے اپنے ساتھ یہ کیا کرنا شروع کر دیا ہے؟ اور کیوں کرنا شروع کر دیا ہے؟ اس کے پیچھے کون آدمی ہے؟ آپ اپنے رشتتوں کو پہچاننے کی کوشش کریں اور انسانوں کے ساتھ یہ ایک عجیب طرح کی نفرت کا رجحان ہے۔ ہم اس مرض میں بیٹلا کیوں ہو گئے ہیں۔ پچھلے دونوں ملتان کے ایک بینک میں ایک اکاؤنٹ میں دردانہ عزیز احمد کے نام کا چیک آیا۔ بینک والوں نے اس چیک کو پاس کر دیا پھر اس کے ساتھ ہی اس پاس کرنے والے نے کہا کہ یہ دستخط تو دردانہ عزیز کے ہی ہیں لیکن اس پر جواکاؤنٹ نمبر درج ہے یہ وہ نہیں ہے۔ پچھلے چیک انہوں نے کمال کر دیکھے ان میں سیاہی کا رنگ بھی وہی تھا اور دستخط بھی وہی تھے۔ اب تھیں شروع ہو گئی یہ کیسے ممکن ہے۔ بعد ازاں پتہ یہ چلا کہ کہیں گڑ بڑ نہیں ہوئی مسلکہ

صرف یہ ہے کہ اس بینک میں دو دردناک عزیز ہیں۔ اب جو چیک آیا ہے یہ اس کا نہیں ہے جس کا خیال کیا جا رہا تھا۔ بینک شعبجہنے مزید قصہ دیتے کے لیے اور آئندہ کوئی غلطی کا احتمال نہ رہ جانے کی وجہ سے دونوں کو بینک بڑایا۔ وہ دونوں بینک آئیں۔ شعبجہنے مجھے بتایا کہ جب وہ دونوں بینک میں داخل ہوئیں تو ہم یہ دیکھ کر جیران رہ گئے کہ ان دونوں کا تد ایک جیسا تھا اور دونوں نے تقریباً ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ایک ذرا سی گوری تھی اور دوسری کا رنگ ذرا گندی تھا۔ ان کے دستخط بالکل ایک دوسری کے ساتھ ملتے تھے اور جو نیلے رنگ کی سیاہی ایک استعمال کرتی تھی دوسری بھی وہی رنگ استعمال کرتی تھی۔ ان کی کاریں بھی ایک ہی مادل، ایک کپنی اور ایک ڈیزائن کی تھیں۔ بس ان کی کاروں کے نمبر میں فرق تھا۔ ایک کی گاڑی کا نمبر 1715 MN تھا جبکہ دوسری کی کار کا نمبر 1571 MN تھا۔ وہ دونوں بھی ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئیں اور وہ آپس میں سہیلیاں بن گئیں۔ دونوں کے خاوندوں کا نام بھی عزیز احمد تھا، دونوں کے شوہر چشتیہ سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔

اللہ فرماتا ہے کہ ”اے لوگو! ایک دوسرے کے قریب آ جاؤ اور ایک دوسرے کو اپنے رشتہ دار جانو۔“ خواتین و حضرات! کسی نہ کسی حوالے سے اور کسی نہ کسی طریقے سے ہم ایک دوسرے کے رشتہ دار تو ہیں آخر۔

ہم جتنی بھی بھاگنے کی کوشش کریں ہم نے آخر کار توبابا آدم تک ہی جانا ہے۔ ہمارا حساب ”ڈاروں“ کے حساب کی طرح نہیں ہے بلکہ ہمیں لوٹ کر وہیں جانا پڑتا ہے جہاں سے چلے تھے۔ ہم اب اسی برکھاڑت کی دعا کرتے ہیں اور اللہ سے فریاد کرتے ہیں کہ اے اللہ ہمارے لیے وہی ہی بارشیں بھیج جیسی بارشوں میں ہم گلی محلوں اور کھیتوں میں بھاگ کرتے تھے۔ وہ ساون بھیج جس ساون میں ہم ”پوڑے“ (میٹھی روٹیاں) پکایا کرتے تھے۔ وہ موسم عطا فرمای جس کی حلاش میں ہم انتظار کی آنکھیں پھاڑ کر بیٹھا کرتے تھے۔ یہ ساری چیزوں ہم سے ناراض ہو گئی ہیں۔ ان کو ہم سے پھر سے ملا دے اور ٹوٹئے رشتے بحال کرو۔ مجھے یقین ہے کہ اگر دست بستہ رکوع میں جا کر یہ کہا جائے کہ ”اے پورا دگار تو ہمارے موسموں کو پھر ہمارے پاس لادے۔ ہمیں وہی پانی دے دے جو ہم کو شیرینی اور ٹھنڈک عطا کرتے ہیں اور ہماری فصلیں پکاتے ہیں۔“

لیکن یہ اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جب انسان انسان کے اتنا ہی قریب آئے جس قدر آنے کی ضرورت ہے۔ اللہ آپ کو خوش رکھ۔ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور میری بڑی آرزو ہے کہ اللہ ان آسانیوں کو تقسیم کرنے کا بھی شرف عطا فرمائے تاکہ ہم لوٹ کر پھر اس انسانی مقام پر پہنچ سکیں جہاں سے ہم نے اپنا سفر شروع کیا تھا۔ اللہ حافظ۔